جلد ۲۵ جنوری سنہ ۴۵ء نمبر ۱

اُردُو

انجمنِ ترقّیٔ اُردُو (ہند) کا سہ ماہی رِسالہ

ایڈیٹر:۔ عبدُالحق

شائع کردہ
انجمنِ ترقّیٔ اُردُو (ہند) دہلی

اُردو

جلد ۲۵ — جنوری سنہ ۴۵ء — نمبر ۱

فہرستِ مضامین

سید صلاح الدین جمالی منیجر انجمن نے جید پریس بلی ماران دہلی میں چھپواکر
دفتر انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی سے شائع کیا

اُردو میں علمی اصطلاحات

میرے علم اور تحقیق میں ہندستانی زبانوں میں اُردو ہی ایک ایسی زبان ہو جس میں زمانۂ دراز سے علمی اصطلاحات پر غور و فکر کیا گیا اور مختلف اوقات میں اس کے اصول وضع کیے گئے۔ ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ ہوا جب کہ دہلی کالج میں تمام جدید علوم مثلاً جغرافیہ، تاریخ، نیچرل فلاسفی، ریاضیات، معاشیات، قانون، طبعیات وغیرہ وغیرہ اُردو زبان کے ذریعے سے پڑھائے جاتے تھے۔ سارے ہندستان میں صرف یہی کالج تھا جہاں اس اصول پر عمل ہوتا تھا۔ اس وقت کے ماہرینِ تعلیم نے نیز سرکاری رپوٹوں میں اس امر کا اعتراف کیا ہو کہ کالج کے مشرقی شعبے کے طلبہ کی قابلیت اُن طالب علموں سے کسی طرح کم نہیں جو انگریزی کے ذریعے ان علوم کی تحصیل کرتے ہیں۔ کالج کی مجلسِ ترجمہ نے تخمیناً ڈیڑھ سو کتابوں کا ترجمہ کیا یا کتابیں تالیف کیں۔ صرف ترجمہ ہی نہیں کیا بلکہ اصطلاحات کے وضع کرنے کے اصول بھی تجویز کیے ہیں۔ یہاں اُن اصول کا مختصر ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

۱۔ جب سائنس کے کسی ایسے لفظ کا مترادف اُردو میں موجود نہ ہو جو سادہ خیال ظاہر کرتا ہو مثلاً سوڈیم، پوٹیسیم، کلورین وغیرہ تو وہ بجنسہٖ اُردو میں لے لیا جائے۔ یہی اصول اُن القاب و خطابات اور عہدوں کے متعلق بھی اختیار کیا جائے جن کا ذکر تاریخ میں آتا ہو۔

۲۔ جب سائنس کے کسی ایسے لفظ کا ہم معنی اُردو لفظ موجود ہو جو سادہ خیال ظاہر کرتا ہو تو اُردو لفظ استعمال کیا جائے۔ مثلاً آئرن کے لیے لوہا، سلفر کے لیے گندھک، منسٹر کے لیے وزیر، سمنز SUMMONS کے لیے طلب نامہ۔

۳۔ اگر لفظ مرکب ہو اور اس کے دونوں جُز انگریزی ہیں۔ اور دونوں میں سے کسی کا ہم معنی لفظ اُردو میں نہیں تو وہ لفظ بجنسہٖ اُردو میں منتقل کرلیا جائے مثلاً ہائی ڈرو کلورین کیوں کہ ہائی ڈروجن اور

کلورین کے ہم معنی لفظ اُردو زبان میں نہیں ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ پورے انگریزی جملے کو اُردو میں لے لیا جائے۔

۴۔ اگر لفظ مرکب ہو اور اُردو میں اس کا کوئی ہم معنی لفظ نہیں، مگر اس کے ہر دو اجزا کے الگ الگ مترادف اُردو میں موجود ہیں تو یا تو اِن دونوں کو ملا کر یا کسی دوسرے مساوی مفہوم کے الفاظ میں ترجمہ کرلیا جائے۔ جیسے کرانولوجی Chronology کا ترجمہ علمِ زماں۔ ہاؤس آف لارڈز کا کچہری امیروں کی، ہاؤس آف کامنز کا کچہری وکلاے رعایا کی یا صرف کچہری وکلا کی۔

۵۔ جب یہ قاعدہ یا قاعدۂ ذیل آسانی سے مطابق نہ ہو تو پھر غیر زبان کا لفظ اُردو میں لے لیا جائے۔ جیسے ہائیڈروجن، نائٹروجن وغیرہ۔

۶۔ اگر مرکب لفظ ایسے دو مفرد الفاظ سے بنا ہو جن میں سے ایک کا مترادف اُردو میں موجود ہو مگر دوسرے کا مترادف نہیں ہو تو ایک انگریزی اور دوسرے اُردو سے مرکب بنا لیا جائے۔

۷۔ بعض لفظ ایسے ہیں جیسے آرڈر Order کلاس، جینس Genus، سپیشیز Species جن کے مترادف اگرچہ کسی نہ کسی صورت میں اُردو میں پائے جاتے ہیں تاہم انگریزی الفاظ اُردو میں منتقل کرلیے جائیں تو مناسب ہوگا۔ کیوں کہ اُردو میں اس قبیل کے الفاظ ایک دوسرے کے مترادف ہوتے ہیں اور اس سے اصل مفہوم کے سمجھنے میں مغالطہ پیدا ہوجاتا ہو۔ حالاں کہ ان الفاظ کے معانی کا امتیاز نیچرل ہسٹری میں بہت اہم ہو۔

۸۔ درختوں کے انواع (یا خاندانوں) کے نام یا تو اس نوع خاندان کے کسی ممتاز فرد کے نام پر رکھے جاتے ہیں یا اس نوع کے بعض مشترک خواص کی بنا پر نام رکھ لیا جاتا ہو۔ اس قاعدے کی پابندی اُردو میں بھی کی جائے۔ اگر یہ زیادہ سہل اور کارآمد ثابت ہو کہ ہر نوع (خاندان) کے الگ الگ نام صرف اس کے خاص اور نہایت ممتاز افراد پر رکھے جائیں تو پھر یہی کیا جائے۔

اوپر کے قواعد میں اُردو مترادف سے ایسا لفظ مراد ہو جو ملک کے تعلیم یافتہ اور متوسط درجے کے طبقے میں معروف ہو۔ اگر ہماری مشرقی زبانوں کی لغات میں کوئی ہم معنی لفظ نہ ملے اور پنڈتوں

اور مولویوں سے پوچھنے کی ضرورت پڑے تو اس سے تو یہ بہتر ہے کہ انگریزی لفظ ہی اختیار کرلیا جائے۔ سائنس کا ترجمہ انگریزی سے کیا جائے گا اس لیے انگریزی الفاظ سے زبان کو بچانا ناممکن ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کی گئی تھی کہ جہاں تک آسانی سے ممکن ہو انگریزی الفاظ کے استعمال سے احتراز کیا جائے۔ جو شخص کسی سائنس کی کتاب کا ترجمہ کرنا چاہتا ہے تو اُسے چاہیے کہ اس سائنس پر جو کتابیں اس سے قبل لکھی جاچکی ہیں انھیں مہیا کرے اور جب تک کوئی خاص وجہ نہ ہو انھی الفاظ کے استعمال کرنے کی کوشش کرے جو ان کتابوں میں استعمال کیے گئے ہیں۔ جب کسی انگریزی جملے میں کسی خاص واقعے کی طرف اشارہ ہو جس سے اہلِ ہند واقف نہ ہوں تو مترجم کو چاہیے کہ حاشیے میں یا مناسب ہو تو متن میں اس کی مختصر طور پر تشریح کردے۔

مترجم کو لفظ بہ لفظ ترجمے کی کبھی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ ترجمے میں سب سے بڑی بات اصل مفہوم یعنی جملے کے معنے اور مطلب کو صحیح طور سے ادا کرنا ہے خواہ اس کی ساخت یا طرزِ ادا کیسی ہی مختلف کیوں نہ ہو۔

کیمسٹری کی اصطلاحات کے متعلق یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ تمام انگریزی اصطلاحی لفظ بجنسہٖ اُردو میں لے لینا مناسب ہوگا۔ البتہ جن کیمیائی عناصر کے نام اُردو میں موجود ہیں وہ ویسے ہی رہنے دیے جائیں۔ لیکن مرکبات میں انگریزی نام ہی رہیں جیسے ہائیڈرو سلفرک وغیرہ۔ چوں کہ اصطلاحی الفاظ کے مادّے تعداد میں زیادہ نہیں اس لیے اُن کی تفہیم میں کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگی۔

نباتیات کا ترجمہ بہت کٹھن ہے۔ یورپی مصطلحات کا لفظی ترجمہ بالکل مہمل ہوجائے گا۔ البتہ جو دوسرا طریقہ درختوں کے خاندانوں کے نام رکھنے کا بتایا گیا ہے وہ زیادہ بہتر ہے اور عام طور پر مستعمل ہے، خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ یورپ میں کسی خاندان کے نہایت ممتاز افراد وہی نہیں ہوتے جو ہندستان میں ہیں۔ بہرحال یہ نہایت ضروری ہے کہ کوئی صاحب جو نباتیات کا عام علم رکھتے ہوں اور اُردو بھی خوب جانتے ہوں اس کام کو انجام دیں ——— ....

یہ اصول اُس زمانے کے اعتبار سے بہت مناسب اور معقول تھے۔ یہ کالج اگر قائم رہتا تو

اُردو کی بہت بڑی خدمت کرتا اور یہی سب سے پہلی اُردو یونی ورسٹی ہوتا۔

اس کے بعد جسے کوئی ستّر سال کا عرصہ ہوتا ہو مولوی سید حسین بلگرامی (نواب عمادالملک مرحوم) نے ایک نہایت عالمانہ اور ناقدانہ مقالہ اس موضوع پر لکھا۔ اس مقالے کی تحریر کا باعث یہ ہوا کہ اس زمانے میں حکومت بنگال نے دیسی زبانوں میں طبّی رسائل کی تالیف کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔ کمیٹی کے دو ارکان نے اپنی تجویزیں پیش کیں۔ اُن میں سے ایک اُس وقت کے فاضل اور ماہرِ علم اللسان بابو راجندرا لال متر تھے۔ ان کی تجویز کے متعلق نواب صاحب لکھتے ہیں کہ "علمی اصطلاحات پر اس سے زیادہ مبسوط بحث پہلے کبھی میری نظر سے نہیں گزری"۔ دوسرے مُلک کے نامور طبیب مولوی تمیزالدین خان بہادر تھے جنھیں صوبۂ بنگال کی دونوں زبانوں میں علوم تشریح الابدان اور طب کی تعلیم کا بہت بڑا تجربہ تھا۔ تیسری تجویز راے سوہن لال مہتمم مدارس حلقۂ بہار کی تھی جن کا کلکتہ کی کمیٹی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان تینوں تجویزوں پر نواب صاحب مرحوم نے بڑی غائر نظر ڈالی ہو اور مفصّل تنقید کے بعد وضعِ اصطلاحات کے متعلق اپنے اصول پیش کیے ہیں۔

بابو راجندرلال متر اصطلاحات کے ترجمہ کرنے کے زبردست حامی تھے، لیکن وہ ترجمہ لفظی پابندیوں میں جکڑا ہوا نہ ہو۔ جیسے مکھی پر مکھی ماردی۔ بلکہ اس ترجمے سے ایسے الفاظ پیدا ہونے چاہییں جو اشیاے متذکرہ کے لیے علامات کا کام دیں۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ الفاظ اشیا کا دھندلا تصوّر ظاہر کریں جو قدیم زمانے میں کسی نسل نے غلطی سے اُن کے متعلق اپنے ذہن میں قائم کیا تھا جس وجہ سے غلط الفاظ اس کی زبان میں ہمیشہ کے لیے داخل ہوگئے اور زمانۂ قدیم سے مستعمل ہونے کے باعث اب تک مروّج ہیں۔

بابو صاحب نے اپنے مقصد کے لحاظ سے جُملہ الفاظ کو چھ قسموں میں تقسیم کیا۔ اس کا خلاصہ یہ ہو۔

پہلی قسم میں زبان کے وہ معمولی الفاظ ہیں جو کبھی کبھی بطور اصطلاحات استعمال ہوتے ہیں۔ ان کا ترجمہ اپنی زبان میں کیا جائے۔

دوسری قسم کے الفاظ میں جامد اسما اور مختلف چیزوں کے نوعی نام شامل ہیں۔ جیسے یسٹ (خمیر) بالٹ (شعیرِ منقوع) وغیرہ۔ گو یہ الفاظ نہایت عام فہم ہیں لیکن زیادہ تر ایک خاص فن میں استعمال ہونے کی وجہ سے انھوں نے نیم اصطلاحی شکل اختیار کرلی ہے۔ ان الفاظ کا ترجمہ کیا جائے یا مناسب ترمیم سے انھیں موزوں بنا لیا جائے اور بشرطِ ضرورت ان میں اصلاح کرلی جائے۔

تیسری قسم کے الفاظ سائنس کی اشیا کے غیر اشتقاقی نام ہیں مثلاً کونین، ٹیلیریم (دھات)، اسلینیم (دھات)، برومن (ایک مفرد مائع) وغیرہ۔ ابتدا میں جب یہ الفاظ وضع کیے گئے تو اکثر حالتوں میں جن چیزوں کے لیے استعمال کیے جاتے تھے ان کی کوئی خاصیت ظاہر کرتے تھے لیکن ان میں سے بہت سے الفاظ کے اشتقاقی معنے عرصۂ دراز سے مفقود ہوگئے اور یہ الفاظ دوسرے درجے کے جامد بن گئے ہیں۔ ان الفاظ کا املا خاص قواعد کی پابندی سے دیسی زبان میں لکھا جائے۔

چوتھی قسم میں نباتات وحیوانات کے مرکب علمی ناموں کا شمار ہے جو ابتدا میں اشتقاقی معنے رکھتے تھے لیکن بوجوہ چند درچند ان میں سے اکثر الفاظ کی اب یہ کیفیت نہیں رہی اور اب وہ کسی خاص نوع یا جنس کا نام ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً جونیسیا ایسوکا (JONESIA ASOKA)، کوئیس بھیکٹی COIUS BHEKTI وغیرہ۔ لہٰذا گزشتہ اقسام کی طرح یہ بھی جامد اسما تصور کیے جاسکتے ہیں۔ ان الفاظ کا املا خاص قواعد کی پابندی سے بلا تغیّر وتبدّل دیسی زبان میں لکھا جائے۔

پانچویں قسم سے اُن مفرد الفاظ کو تعلق ہے جن کے اشتقاقی معنے نہایت صاف وصریح ہوتے ہیں اور صرف اسی حد تک کارآمد ہیں جب کہ سامع پر اپنے اشتقاقی معنے بخوبی واضح کردیں۔ چوں کہ یہ الفاظ صرف علوم و فنون ہی میں استعمال ہوتے ہیں اس لیے انھیں خالص اصطلاحی سمجھنا چاہیے۔ ان الفاظ کا ترجمہ کیا جائے یا مناسب ترمیم سے انھیں موزوں بنا لیا جائے اور بشرطِ ضرورت اُن میں اصلاح کی جائے۔

چھٹی قسم میں وہ مرکب اصطلاحات شامل ہیں جن کا کم از کم ایک اور اکثر حالتوں میں ہر جز کچھ نہ کچھ اشتقاقی معنے ضرور رکھتا ہے۔ یہی معنے اُن اصطلاحوں کی جان ہوتے ہیں۔ اور اس شو

کی نوعیت معلوم کرنے کی غرض سے جن کے لیے کوئی اصطلاح استعمال کی جاتی ہو لازمی ہو کہ سامع ہر جز کا مطلب بہ خوبی سمجھ لے۔ ان الفاظ کا ترجمہ کیا جائے اور بہ شرطِ ضرورت ان میں اصلاح کی جائے لیکن آلات کے نام اس سے مستثنا ہیں، اُن کا صرف املا ہی دیسی زبان میں لکھا جائے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ (۱) اُن تمام اصطلاحات کا جو اشیا کی صفات ظاہر کرتی ہیں بغیر استثنا ترجمہ کیا جائے یا ضروری ترمیم سے مفید مطلب بنا لیا جائے۔ لیکن اگر ہندستانی زبانوں میں مترادف الفاظ نہ ملیں تو مفرد اشیا کے نام یورپی زبان سے لیے جاسکتے ہیں۔

(۲) اصطلاحات کے مکمل لغات تیار کیے جائیں جن میں دیسی زبان کے مترادف الفاظ یا اُن الفاظ کا املا دیسی زبان میں درج کیا جائے جن کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔

ڈاکٹر تمیز خاں اس بات میں تو بابو راجندر لال سے متفق ہیں کہ دیسی زبان کی اصطلاحات اگر مل سکیں تو ضرور اختیار کی جائیں۔ لیکن نئے الفاظ گھڑنے کے مؤید نہیں ہیں۔ وہ اسے غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ دیسی زبانوں میں مترادف الفاظ نہ ملنے کی حالت میں اصطلاحات وضع کرنے کے لیے عربی و سنسکرت سے کام لینے کی بجائے وہ بہتر یہی سمجھتے ہیں کہ مغربی اصطلاحات کو برقرار رکھا جائے۔ اُن کا خیال ہو کہ محض سنسکرت عربی فارسی لفظ کے جاننے سے ہمیں کسی چیز کا اُس تصور سے بہتر تصور نہیں ہوسکتا جو اس کے انگریزی، لاطینی یا یونانی نام سننے اور طالب علم کو یہ بتا دینے سے ہوتا ہو کہ فلاں لفظ فلاں شے کے لیے استعمال کیا جاتا ہو اور کسی دوسری چیز کے لیے نہیں بولا جاتا۔

تیسری تجویز رائے سوہن لال منتظم نارمل اسکول پٹنہ کی طرف سے پیش ہوئی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ تمام ادق اور ثقیل اصطلاحات نکال دی جائیں اور ان کی بجائے عام لوگوں کی بول چال کے لفظ اختیار کرکے سائنس کی تعلیم میں آسانی پیدا کی جائے اور اسے عامۃ النّاس کی دست رس میں کردیا جائے۔

ان تینوں تجویزوں کے ذکر کے بعد نواب صاحب مرحوم نے ان پر تبصرہ کیا ہو اور اُن کے عیب و صواب پر بحث کرنے کے بعد خود وضعِ اصطلاحات کے اصول قائم کیے ہیں۔

اُن کا یہ کہنا بالکل درست ہی کہ مروجہ اصطلاحات کے متعلق کوئی اختلافِ راے نہیں ہی۔ ساری بحث اُن الفاظ کے متعلق ہی جن کے مترادف معلوم نہیں۔ یہ مترادف معلوم کرنے کے لیے ہمیں یا تو

(۱) مغربی اصطلاحات کو بجنسہٖ قائم رکھ کر انھیں املا کے ایک دقّت طلب طریقے کے مطابق دیسی زبانوں میں منتقل کرنا چاہیے، یا

(۲) اُس خزانۂ الفاظ کو جو عربی و فارسی میں مدفون ہی فراخ دستی اور کشادہ دلی سے صرف کرکے ان اصطلاحات کا دیسی زبانوں میں ترجمہ کرنا چاہیے۔ یا

(۳) بعض مغربی اصطلاحات بجنسہٖ قائم رکھنے اور بعض کا ترجمہ کرنے سے ان دونوں طریقوں کو مخلوط کردینا چاہیئے۔

پہلا طریقہ ہرگز قابلِ التفات نہیں اس لیے بالکل نظرانداز کیا جاتا ہی۔ کوئی سمجھ دار ہندستانی ایک لمحے کے لیے بھی اس سے اتّفاق نہیں کرے گا اور نہ کوئی سمجھ دار یورپین اس کا مؤید ہوگا۔ اس سے ہماری زبان دوغلی ہوجائے گی۔ ہم اس بات کا بہ آسانی اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس طریقے پر عمل کرنے سے ہمارے آیندہ پنڈت لاطینی نما ہندستانی لکھیں گے اور ہندی نما لاطینی بولیں گے۔ اس کا تصوّر ہی اس قدر مضحکہ خیز اور عجیب و غریب ہی کہ ذہنیات سے اس کو عملیات میں لانے کی کچھ ضرورت نہیں۔ سوال فی الحقیقت صرف یہ رہ جاتا ہی کہ آیا ہمیں مغربی علوم کی تعلیم بہ واسطۂ انگریزی دینی چاہیے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہی تو سب الفاظ کا املا دیسی حروف میں لکھنے کے طریقے کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دینا چاہیے۔

اب رہا ترجمے کا سوال۔ اس کے متعلق وہ یہ فرماتے ہیں کہ اس اصول کو ایک بدیہی صداقت سمجھ کر ہم یہ تسلیم کیے لیتے ہیں کہ ترجمے میں ہمیشہ سادگی یکسانی اور صحت کو ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے۔ اب سوال یہ ہی کہ ان تینوں شرائط کو نہایت پابندی کے ساتھ پورا کرنے کے لیے ہمارے طریقِ عمل کے اُصولِ موضوعہ کیا ہوں اور ہماری رہبری کے لیے کیا قواعد مقرّر کیے جائیں۔ اس سوال کا جواب شاید یہ ہوسکتا ہی:۔

(۱) مفرد اشیا کے تعبیر کرنے میں مفرد الفاظ کو مرکب الفاظ پر ترجیح دی جائے۔

(۲) وہ مصطلحات جو اشیاے متذکرہ کی کوئی خاصیت ظاہر کرتی ہیں ان اصطلاحات پر جو کوئی خاصیت ظاہر نہیں کرتیں، مرجّح ہیں۔

(۳) اگر ہندستانی متعلّم کے لیے انگریزی اصطلاح اور اس کے ترجمے میں برابر کا اشکال ہو اور ایک کو دوسرے پر کچھ بھی فوقیت نہ ہو تو یک سانی کی خاطر دیسی اصطلاح کی بجائے انگریزی اصطلاح قائم رکھنی چاہیے۔

(۴) مرکب اشیا کے تعبیر کرنے میں مرکب اصطلاحات کو ترجیح دینی چاہیے اور یہ اصطلاحات ایسی ہوں کہ مرکب کے اجزا پر بھی کچھ روشنی ڈال سکیں۔

(۵) ایک ہی قسم کی چیزوں کو ظاہر کرنے کے لیے ایک ہی قسم کے مرکبات و مشتقات کو مرجّح سمجھنا چاہیے۔

(۶) مروّجہ اصطلاحات میں خواہ یورپی ہوں یا ایشیائی کوئی ایسی اصطلاح قائم نہیں رکھنی چاہیے جو کسی شو کی نوعیت یا خاصیت کی نسبت غلط خیال پیدا کرتی ہو۔"

یہ قواعد بہت کارآمد اور جامع ہیں لیکن سب سے بڑا اور مشکل مسئلہ یہ ہو کہ ان پر عمل کیوں کر ہو یعنی ان قواعد کی رو سے اصطلاحات بنائی کس طرح جائیں۔ اس کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ "ممکن ہو کہ یہ قواعد ناکافی ہوں اور شاید ان میں ردّ و بدل کی ضرورت ہو لیکن ان سے ہمیں اتنا ضرور معلوم ہوجاتا ہو کہ اگر ہم ایک قلیل مدت میں اپنی زبان کے لیے وہ کام کرنا چاہتے ہیں جسے مغربی زبانوں کے لیے کرنے میں عمریں صرف ہوگئی ہیں تو ہمارے طریقِ عمل کی حدود ہونی چاہییں۔ ہم یہ پہلے ہی کہ چکے ہیں کہ ہمارا اصول سادگی، یک سانی اور صحت ہونا چاہیے۔ سادگی اور صحت تو شاید پیدا کی جاسکتی ہو لیکن ہندستانی زبانوں کی اس کثرت کی صورت میں یک سانی کیوں کر پیدا کی جائے گی؟ ہم دور کیوں جائیں خود ہمارے چھوٹے سے صوبے میں اُردو اور ہندی کے جھگڑے کا کیا تصفیہ ہوگا؟ کیا ایک صوبے کے لیے ہم دو قسم کی اصطلاحات مقرّر کریں؟ اس مشکل کا پورا احساس ان دونوں فضلا میں سے جن کے تبصرنے اس رسالے

کی اشاعت کے محرک ہیں کسی کو بھی نہیں ہوا۔

اس کے بعد انھوں نے عربی اور سنسکرت کی ذاتی خوبیوں سے بڑی اچھی بحث کی ہو۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ ان دونوں زبانوں کے ادبی ذخائر ناپیدا کنار ہیں۔ خوبیٔ کلام، وضاحتِ معانی، اور خالص فلسفیانہ نکات کی چھان بین کے لیے سوائے یونانی کے دُنیا کی باقی تمام زبانیں میں یہ اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔ لیکن اگر ان دونوں کا مقابلہ کیا جائے تو ان میں اتنا ہی فرق ہو جتنا کہ نوعِ انسانی کی ان دو بڑی آبائی نسلوں کے دماغ، خصائل، جذبات اور تاریخ میں ہو جن کے اجتماعی، اخلاقی، ذہنی اور تمدنی تجربے کی یہ منظہر ہیں۔ خیالات کے صحیح اظہار اور تعیّن کے لیے یہ دونوں زبانیں اپنی اپنی جگہ نہایت موزوں ہیں۔ لیکن سنسکرت کو عربی پر یہ بہت بڑی فضیلت ہو کہ اس میں الفاظ کے بےشمار مرکبات و مشتقات بن سکتے ہیں۔ اور آگے پیچھے الفاظ بڑھاکر ان میں کئی طرح سے تبدیلی کی جاسکتی ہو۔ . . . عربی زبان اس اعتبار سے بہت کم مایہ ہو۔ اس میں صرف ایک سابقہ "ال" اور ایک لاحقہ "ی" ہو۔ اس میں مرکّب الفاظ بنانے کی صلاحیت بہت کم ہو۔ یہ اس لیے کہ اس کے مرکّبات کی صرف چار قسمیں ہیں جن میں سے دو ہمارے اغراض کے لیے محض بےکار ہیں۔ مشتقات کے لیے تو یہ قاعدۂ کلیہ مقرّر ہو کہ داخلی حروفِ علّت کو بدل دیا جائے لیکن نئے الفاظ بنانے کے لیے اس میں کوئی ایسا لچک دار قاعدہ موجود نہیں جو ہر حالت میں کام دے۔ جو مرکّب الفاظ اس زبان میں بن سکتے ہیں انھیں ہم سوائے ایک مشتبہ استثنا کے واحد کلمۂ صرفی قرار ہی نہیں دے سکتے۔ کیوں کہ ان مرکّبات کے اجزا کی انفرادی و ابتدائی حیثیت بہ دستور قائم رہتی ہو اور انھیں الگ الگ ہی سمجھنا پڑتا ہو۔"

عربی زبان کے اس نقص کو بتانے کے بعد انھوں نے ازروے انصاف اس کے دُوسرے پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہو۔ اور کم و بیش دو صفحے میں نہایت جامعیت، قابلیت اور اختصار کے ساتھ عربوں کے اُن حیرت انگیز کارناموں اور ایجادات کا ذِکر کیا ہو جو سائنس کی ترقی اور اشاعت میں اُن سے ظہور میں آئیں اور کس کس طرح نئے الفاظ وضع کیے یا دُوسری زبانوں سے مستعار لیے۔

اس تذکرے کے بعد اصل مقصد کی طرف رجوع کی ہو کہ مغربی اصطلاحات کا اُردو، ہندی، بنگالی

میں بہترین ترجمہ کیوں کر ہوسکتا ہے۔ اس بارے میں انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "نئی اصطلاحیں ایک دفعہ ہندی یا بنگالی میں داخل ہونے کے بعد اِن زبانوں کا جُز بن جاتی ہیں۔ اُردو اس مداخلت کی اس وقت تک متحمل نہیں ہوسکتی جب تک اس کے موجودہ نظام میں اصولی انقلاب نہ پیدا کیا جائے اور اُردو داں حضرات ہندی کی طرف زیادہ مائل نہ ہوں۔ ان امور سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی یہ تبدیلی ہمارے لیے باعثِ مسرت ہوگی۔ کیوں کہ ہمیں پورا یقین ہے کہ اُردو اور ہندی میں جتنا زیادہ اتحاد و تطابق ہوگا اُتنا ہی اُردو کو فائدہ پہنچے گا۔" لیکن مُلک کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے وہ بہت افسوس کے ساتھ اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ "اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کے لیے یک ساں اصطلاحات وضع کرنا فی الحال ناممکن ہے۔"

عربی سے اصطلاحی الفاظ لینے کے متعلق یہ وجہ بتائی ہے "ہم یہ بتا چکے ہیں کہ اکثر بڑے علوم کی ابتدا جو ترجمے کے قابل ہیں عربی میں ہوئی ہے اور جس قدر اصطلاحیں ان علوم کے مبادیات کے لیے ضروری ہیں تحقیقات سے عربی میں معلوم ہوسکتی ہیں۔ عربی ماخذ سے ہمارے علمی لغت میں بہت بڑا اضافہ ہوسکتا ہے۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے موجودہ اہلِ فرنگ بھی عربوں کے علمی انہماک کا اعتراف کرتے ہوئے منفعل نہیں ہوتے اور الکحل، الکیمی (کیمیا)، الجبرا، زینتھ (سمت)، ناڈر (نظیر)، الیکسر (اکسیر)، سیرپ (شربت) جولپ (جلّاب) اور اسی قسم کے متعدد الفاظ بہ کثرت استعمال کرکے اپنی ممنونیت ظاہر کرتے ہیں تو ہم اس ذخیرے کی تحصیل سے فائدہ اُٹھانے میں کیوں تامّل کریں۔"

اس کے علاوہ انھوں نے ایک دوسرے ماخذ کی طرف بھی توجّہ دلائی ہے کہ تمام یونانی الاصل لفظ جو طب اور دوسرے علوم میں مستعمل ہیں اس قدر ترمیم کے ساتھ جو ہماری ضروریات کے لحاظ سے لازم ہو، اختیار کرلینے چاہییں کیوں کہ قدیم زمانے کے عربوں نے یہ الفاظ مستعار لے کر ہمارے لیے ایک مثال قائم کردی ہے۔

ان زبانوں کے علاوہ وہ فارسی سے بھی مدد لینے کے بہت بڑے حامی ہیں کیوں کہ یہ زبان ہندی اور اُردو دونوں سے بہت قریبی تعلق رکھتی ہے اور اس میں مرکّبات اور مشتقات بنانے کا بھی بہت اچھا قاعدہ ہے۔ فارسی الفاظ اس غرض کے لیے بہت کار آمد ہوسکتے ہیں اور وہ نامانوس بھی نہ ہوں گے۔

اصطلاح کی غرض کے لیے انھوں نے حسبِ ذیل ماخذوں سے کام لینے کی رائے دی ہے:-

(۱) سنسکرت عربی فارسی اور ان مغربی الاصل الفاظ سے جو ہماری زبان میں مروّج ہیں۔

(۲) مصطلحات سے جو عربی کی کتابوں میں مذکور ہیں لیکن عام طور پر استعمال نہیں ہوتیں۔

(۳) عربی کے مرکبات و مشتقات جو خاص قواعد کی پابندی سے وضع کیے جائیں۔

(۴) یونانی یا لاطینی اصل کی علمی اصطلاحوں سے جن میں بہ تقلید اہلِ عرب ہماری زبان کی صوتی خصوصیات کے موافق ترمیم ہوجائے۔

(۵) مفرد مشتق یا مرکب الفاظ سے جو فارسی سے مستعار لیے جائیں۔

ان سب الفاظ کی مثالیں بھی دی ہیں۔ پہلی قسم کے الفاظ کی مثالیں جو عام ہیں مثلاً فلز یا دھات (Metal) قرع انبیق (Alembic or retort) ریہ، شُش یا پھیپھڑا (Lungs) مُدر (Diuretic)۔ بحران (Crisis) وغیرہ

دوسری قسم کے الفاظ جیسے کیمیا میں ملحیات (Saline bodies)، دُہنیات (The fixed oil) تخلخل (Porosity) مائع (Fluid)، سیال (Liquid)، مُخدرات (Palliatives) غدود (Glands) تعدیل (Equilibrium) محور (Axis) طول بلد (Longitude) عرض بلد (Latitude) وغیرہ۔

تیسری قسم کے الفاظ جیسے تکاثف (Density) معیار (Test) علم السکون (Statics) علم الحرکت (Dynamics) حرکت عمودی (Vertical motion) وضع افقی (Horizontal Position) وغیرہ۔

چوتھی قسم کے الفاظ اُن نمونوں کے مطابق اختیار کیے جاسکتے ہیں جو پہلے ہی سے موجود ہیں۔ جیسے Cornea کے لیے قرنیہ، Diabetes کے لیے ذیابیطس۔ Astrolabe کے لیے اصطراب اور اسمائے معرفہ میں Euclid کو اقلیدس۔ Isagogue کو ایساغوجی۔ Pythagoras کو فیثاغورث۔ اسی تقلید میں Morphia کو مرفیہ۔ Bromine کو برومین، Iodine کو

یو دین کہ سکتے ہیں ۔علیٰ ہٰذالقیاس ۔

ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جن الفاظ کا صحیح تلفظ ہم نے بدل دیا ہو وہ بعینہٖ اسی صورت میں اختیار یا قبول کرلیا جائے اور نہ ہم قدرت رکھتے ہیں کہ مغربی الفاظ کا املا دیسی زبان میں صحیح طور سے لکھ سکیں ۔ہم نے رواروی میں چند مثالیں پیش کردی ہیں کہ مغربی الفاظ جو مستعار لیے جائیں ہماری صوتی ضروریات کے مطابق بدل دیے جائیں تاکہ دیسی زبان کے علما کے ہاتھوں اُن کی زیادہ دُرگت نہ بنے اور جہاں تک صحتِ لفظی کا تعلق ہو اُن کی بےشمار جُداگانہ شکلیں پیدا نہ ہوں ۔

پانچویں قسم کی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں جیسے Air Pump کے لیے بادکش ۔ Water Pump کے لیے آب کش ۔Calyx کے لیے بیرونی برگ ۔ Corolla کے لیے اندرونی برگ Anthropomorphus کے لیے آدمی پیکر ۔ Genustubuloina کے لیے نَر نما وغیرہ الفاظ گھڑ سکتے ہیں ۔

نواب صاحب کو مولوی تمیز خان بہادر کی اس رائے سے مطلق اتفاق نہیں کہ "محض سنسکرت عربی فارسی لفظ کے جاننے سے ہمیں کسی چیز کا اُس تصور سے کچھ بہتر تصور نہیں ہوسکتا جو اس کا انگریزی لاطینی یا یونانی نام سُننے اور طالبِ علم کو یہ بتا دینے سے ہوتا ہو کہ فلاں لفظ فلاں شے کے لیے استعمال کیا جاتا ہو اور کسی دوسری چیز کے لیے نہیں بولا جاتا ۔" اس پر انھوں نے نہایت معقول تنقید کی ہو اور لکھا ہو "ہمیں نفسیات کا کوئی ایسا قانون معلوم نہیں جس سے ثابت ہو کہ جامد اسما اور بےمعنی مصطلحات معنی خیز اصطلاحوں یا اُن الفاظ کے مقابلے میں آسانی سے یاد رکھی جاسکتی ہیں جن کے مفہوم سے متعلّم آگاہ ہو اور جنھیں وہ سلسلۂ خیالات کی کسی زنجیر میں منسلک کرکے اپنے حافظے کے اندر محفوظ رکھتا ہو۔ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ایک مشرقی متعلّم کے لیے جو بہ واسطۂ زبان اُردو طبعیات اور طب کا اکتساب کررہا ہو ہندستانی الفاظ ذات الراسین یا دوسِرا اور بادکش کی نسبت بای سِپس اور ایرپمپ کا یاد رکھنا زیادہ آسان ہو ۔ حقیقت یہ ہو کہ غیر زبان کے الفاظ اگر بہ کثرت اختیار کیے جائیں تو اُن پر حافظے کو اتنی محنت کرنی پڑتی ہو جتنی اُس زبان میں کمال حاصل کرنے کے لیے کافی ہوسکتی ہو۔ اس

کے علاوہ غیر معمولی طور پر کام کرنے کے باعث یہ قوت ضرورت سے زیادہ نشو و نما پائے گی جس سے دوسری ذہنی قوتوں کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ کسی علم کی تحصیل میں اُس کی اصطلاحات کا سمجھ کر مطالعہ کرنا ازبس ضروری ہے۔ اگر کوئی متعلم اصطلاحات کے اس طویل سلسلے کو جو ان علوم میں آتا ہے مختلف اشیا کے نام تصوّر کرنے کے سوا اور کچھ نہ سمجھے اور ان کے اشتقاقی مفہوم و مطالب سے آگاہ نہ ہو تو ہمیں خوف ہے کہ ان بےشمار الفاظ کو رٹ لینے کے بعد وہ ویسا ہی کورا رہے گا جیسا پہلے تھا۔"

تیسری تجویز راے سوہن لال کی تھی۔ اُن کی رائے یہ تھی سائنس کی اصطلاحات عوام کی بول چال کی زبان سے بنائی جائیں۔ نواب صاحب نے راے صاحب کی علمی واقفیت اور قابلیت کا اعتراف کیا ہے لیکن ان کی راے کے سخت مخالف ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ہم خود اس بات کے بہت بڑے مؤید ہیں کہ اُردو عبارت میں ہندی عنصر غالب رہنا چاہیے کیوں کہ طرزِ تحریر میں وضاحت زور لچک پیدا کرنے کا یہ ایک یقینی ذریعہ ہے۔ اور لکھنوی انشا پردازوں کی ایجاد کردہ ثقیل اُردو کو جس میں عربیت اور فارسیت زیادہ ہو ناپسند کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ راے سوہن لال کی دہقانیت کے خلاف صداے احتجاج بلند کریں اور ایسی زبان کے رواج کی مخالفت کریں جو دیہات کے گنواروں ہی کو زیب دیتی ہے اور جسے ہندو مسلمان دونوں مہذب گفتگو میں کبھی استعمال نہیں کرتے۔ . . . ہمیں اس امر کا اعتراف ہے کہ بعض الفاظ کا انھوں نے نہایت مناسب اور موزوں ترجمہ کیا ہے۔ لیکن اس بات پر حیرت بھی ہے کہ حسبِ ذیل الفاظ کا اس قدر غلط ناموزوں سوقیانہ عامیانہ اور علمی ضرورت کے لحاظ سے محض بےکار ترجمہ کرنے کی انھوں نے کیوں کر جسارت کی"

جو الفاظ انھوں نے اپنی تنقید میں اس قسم کے پیش کیے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:-

ملے تلے ہوے زور	System of forces in equilibrium
کھیت	Plane
جانی ہوئی بدیا	Exact science
بچھی ہوئی بدیا	Experimental science

پہچان	Definition
برابر بازو تخط	Equilateral
جانی ہوئی بات	Axiom
دولٹا بجلی بل	Voltaic electricity
رگڑ بجلی بل	Friction electricity

یہ ہے خلاصہ اُس مقالے کا جو مولوی سید حسین بلگرامی (نواب عماد الملک) نے اُس زمانے میں لکھا تھا جب وہ لکھنؤ کے ایک کالج میں پروفیسر تھے۔ جب جامعۂ عثمانیہ کے قیام کی منظوری ہوئی تو اس کی افتتاح سے پہلے اور اس کی تیاری کے لیے دارالترجمہ (سررشتۂ تالیف و ترجمہ) قائم ہوا۔ سائنس کی کتابوں کے ترجمے کے لیے اصطلاحوں کی ضرورت ہوئی۔ اس وقت میری استدعا پر اس مقالے کے ضمیمے کے طور پر ہماری رہنمائی کے لیے نواب صاحب نے وضع اصطلاحاتِ علمیہ کے لیے چند اصول قلم بند فرمائے، جو یہاں درج کیے جاتے ہیں:۔

۱۔ اصلِ اصول وضع مصطلحات کا یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حافظے پر بار کم ڈالا جائے۔ اس لیے ایسے مصطلحات وضع کرنا جن میں لفظاً موضوع لہٗ سے کوئی مناسبت نہیں ہے بالکل نامناسب ہے، جہاں تک ممکن ہو اس سے احتراز کیا جائے۔

۲۔ زبانِ عربی میں جتنی مصطلحات قدیم زمانے سے موجود ہیں ان کو ترک نہ کیا جائے۔ اُن کے عوض جدید مصطلحات وضع کرنے کی ضرورت نہیں۔ مثلاً ہیئت، ہندسہ اور اس کے فروع حساب، جبر و مقابلہ، اقلیدس، مخروطات وغیرہ یا طب، تشریح، منطق وغیرہ میں ہمارے اساتذۂ فنون نے جو مصطلحات قدیم زمانے میں وضع یا کسی دوسری زبان سے اخذ کیں وہ بحالہا قائم رہیں۔ اُن کے عوض جدید مصطلحات تلاش کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ ادنا توجہ سے معلوم ہوجائے گا کہ بعض فنون کی متعدد عربی مصطلحات آج یورپ کی زبانوں میں رائج ہیں، پھر ہم کیوں اپنی مصطلحات ترک کردیں۔

۳۔ جو لغات غیر زبانوں سے لے کر قدیم زمانے میں معرب کرلیے گئے ہیں یا جو دخیل ہیں وہ اپنے

حال پر قائم رہیں، اصل کی طرف رجوع کرنا ضرور نہیں۔

۴۔ جدید مصطلحات اُردو زبان کے لیے وضع کرنے میں جہاں تک ممکن ہو امورِ ذیل ملحوظ رہیں۔ حتی الامکان ہندی، فارسی، عربی، انگریزی کے اُنھی لغات سے مدد لی جائے جو ہماری زبان اُردو میں مروّج ہیں۔ غیر مانوس جدید لغات سے احتراز کیا جائے۔

۵۔ ثقلِ تلفظ، رکاکت، تراکیب مغلق و غیر مانوس، توالیٔ اضافات وغیرہ سے پرہیز کیا جائے۔

۶۔ امالہ، ترخیم، فکِ اضافت اور دوسرے تصرفات سے بہ وقتِ ضرورت بے تامّل کام لیا جائے۔

۷۔ اسم سے فعل بنالینا ایک قسم کا تصرّف ہے جس کی بڑی ضرورت ہے۔ اس کو جائز رکھا جائے۔

۸۔ عربی اور ٹھیٹھ ہندی لفظوں کی ترکیب سے حتی الوسع پرہیز کرنا چاہیے۔

۹۔ جہاں دو یا تین یا زیادہ الفاظ کو ملاکر ایک مرکب لفظ بنانا منظور ہو جس طرح فنِ کیمیا میں اکثر ضرورت پڑے گی تو اس قدر تصرّف جائز رکھا جائے کہ ہر لفظ مفرد میں دو ایک حرف حذف کرکے مرکب اصطلاح میں اختصار پیدا کردیا جائے۔

۱۰۔ فنِ کیمیا میں سینکڑوں نام بسیط اور مرکب مادّوں کے مستعمل ہوں گے جن کے واسطے علامات کا مقرر ہونا ضرور ہے۔ یورپین زبانوں کی کتابت میں حروف علاحدہ علاحدہ لکھے جاتے ہیں اس لیے یورپین لوگوں کو اس میں کوئی دقت نہیں پیش آتی۔ اب سوال یہ ہے کہ اُردو میں مرکب مادّوں کے ناموں میں حروف الگ الگ لکھے جائیں یا ملاکر مثلاً کبیکج اور ک ب ی ک ج پر غور کیجیے۔ حروف کے الگ الگ لکھنے میں آسانی یہ ہے کہ ان کی مقدار کے اظہار کے لیے ہندسے لگا دیے جاسکتے ہیں۔ ملاکر لکھے جائیں تو ہندسے لگانا مشکل ہوجائے گا گو حروف کے علاحدہ علاحدہ لکھے جانے میں طوالت بے شک ہے۔"

نواب عمادالملک نے اس مقالے کے لکھنے میں بڑی وسعت و دقتِ نظر سے کام لیا ہے اور موضوع کے ہر پہلو پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس موضوع پر اس سے پہلے ایسا جامع رسالہ نہیں لکھا گیا تھا۔ ان اصحاب کے لیے جو علمی کتابیں ترجمے کرنے یا تالیف کرنے کا ذوق رکھتے ہیں، یہ اب بھی

رہنمائی کا کام دے سکتا ہے۔

اِس ضمن میں بعض اُن اداروں کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جنھوں نے اگرچہ علمی اصطلاحات کے متعلق کوئی اصول قائم نہیں کیے لیکن علمی اور ادبی کتابیں ترجمہ یا تالیف کرا کر شائع کیں۔ ان میں سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یہ سوسائٹی (سر) سید احمد خاں نے ۱۸۶۴ء میں قائم کی جسے اس وقت تقریبًا اسّی سال ہوتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ علمی اور ادبی کتابیں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرا کر مغربی ادب اور مغربی علوم کا مذاق اہلِ وطن میں پیدا کیا جائے۔ اگرچہ سوسائٹی نے اصطلاحی الفاظ کے لیے کوئی اصول نہیں بنائے تھے لیکن اس نے مختلف علوم مثلًا علمِ طبعیات، فلاحت، ریاضیات، معاشیات وغیرہ پر جو کتابیں شائع کیں، ان میں بہت سی انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ اُردو میں کیا گیا۔ اسی طرح انجمنِ پنجاب اور اورینٹل کالج لاہور نے بھی علمی کتابیں شائع کرکے بہت مفید کام کیا۔

علاوہ اداروں کے بعض اہلِ علم نے انفرادی طور پر قابلِ قدر کام کیا۔ ان میں امیرِ کبیر نواب شمس الامرا محمد فخرالدین خان بہادر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جن کی سرپرستی اور نگرانی میں سائنس کی مختلف شاخوں پر چھ رسالے شائع ہوئے۔ چوں کہ یہ چھ علوم پر مشتمل تھے اس لیے اس سلسلے کا نام ستۂ شمسیہ رکھا گیا۔ یہ رسالے ریورنڈ چارلس کی تالیف تھے جو ۱۸۱۵ء میں لندن میں شائع ہوئے تھے۔ ان کا ترجمہ انگریزی سے میر امان علی دہلوی غلام محی الدین حیدرآبادی اور مسٹر جونس اور موسیو تندوسی نے کیا۔ یہ رسالے علمِ جرثقیل، علمِ ہیئت، علمِ آب، علمِ ہوا، علمِ انظار اور علمِ برق و مقناطیس پر ہیں۔ اصل انگریزی رسالے مبتدیوں کے لیے سوال و جواب کی صورت میں لکھے گئے تھے، ترجمے میں بھی اسی صورت کو برقرار رکھا ہے۔ زبان صاف ہے۔ اصطلاحات کے لیے عربی فارسی کے مروجہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور جہاں کہیں عربی فارسی لفظ نہیں ملے تو اصل انگریزی لفظ اختیار کر لیے گئے ہیں۔ یہ رسالے ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء و ۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء میں حیدرآباد سے شائع ہوئے۔ ان رسالوں کے آخر میں حوالے کے ساتھ نقشے اور اشکال بھی دی ہیں تاکہ مضمون کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ یہ تقریبًا وہی زمانہ ہے جب کہ دہلی کالج میں جدید علوم کی تعلیم اُردو کے ذریعے سے دی جا رہی تھی۔ وہاں کی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی

کے لیے جو چندہ جمع کیا گیا تھا، اس کی فہرست میں امیرِ کبیر نواب شمس الامرا بہادر کا نام بھی درج ہی اور ان کے نام کے سامنے ۱۲۴ آنے ــــ ۲۰۸ لکھے ہیں۔ نواب صاحب کے فرزند نواب عمدۃ الدولہ محمد رفیع الدین خاں بہادر نے جو اپنے فاضل باپ کی طرح علم و فن کا ذوق رکھتے تھے، ایک کتاب فارسی زبان میں رفیع البصر کے نام سے لکھی۔ یہ علمِ مناظر پر مبسوط کتاب تھی۔ اس کا خلاصہ نواب صاحب کے قدیم ملازم رتن لعل ولد چھنا لعل نے منتخب البصر کے نام سے اُردو میں کیا جو ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء میں چھپ کر شائع ہوا اس میں بھی سوال و جواب کا ڈھنگ رکھا ہی اور متعدد نقشے اور شکلیں کتاب کے بیچ میں اور آخر میں دی ہیں۔ یہ کتابیں اُس زمانے میں بتدیوں اور عام شائقین کے لیے بہت مفید تھیں۔ ان میں بہت سی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں جن میں سے کچھ اب بھی کارآمد ہوسکتی ہیں۔

اُسی زمانے میں لکھنؤ کی رصدگاہ کے ایک معتمر کارکن مولوی کمال الدین نے رصدگاہ کے ناظم کرنل ولکاک کی نگرانی میں کوئی بارہ رسالوں کا ترجمہ کیا جو قوائے آلیہ، ہیئت، علم الہوا، علم المناظر، حرارت، طبعیات، آلاتِ ریاضی، قوتِ مقناطیسی، کیمیا وغیرہ پر تھے۔ یہ رسالے بہت مختصر تھے۔ اِس زمانے میں زیادہ کارآمد نہیں ہوسکتے۔ اب یہ نایاب ہیں ورنہ ان میں بھی بعض کام کی اصطلاحیں مل سکتی تھیں۔

بہت دن ہوئے ڈاکٹر محمد شائق نے کیمیا پر ایک کتاب لکھی تھی اور بڑی محنت اور قابلیت سے کیمیائی اصطلاحات کے وضع کرنے کے خاص اصول قائم کیے تھے اور اُن اصول کے مطابق کیمیاوی اصطلاحیں بنائی تھیں۔ یہ پہلی کتاب تھی جس میں انگریزی کیمیاوی اصطلاحات کے لاحقوں اور سابقوں کے مطابق اُردو میں سابقے اور لاحقے معیّن کرکے اصطلاحات بنانے کا ڈھنگ ڈالا تھا۔ دارالترجمہ جامعۂ عثمانیہ کے سابق رکن چودھری برکت علی مرحوم نے بھی اسی ڈھنگ پر اپنے قاعدے معیّن کیے تھے۔

اس موقع پر مَیں مولانا کرامت حسین مرحوم کا ذکر بھی مناسب خیال کرتا ہوں وہ علومِ عربیہ کے جیّد عالم تھے اور ان کا دماغ حکیمانہ واقع ہوا تھا فلسفہ وغیرہ سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ بہت سی اصطلاحیں جو آج کل ہمارے ادب میں عام طور پر مروّج ہیں اُنھی کی وضع کی ہوئی یا دی ہوئی ہیں جو ان کی تحریروں اور کتابوں میں استعمال ہوئی تھیں۔

تقریباً پچیس برس کا عرصہ ہوا کہ میری درخواست پر مرحوم ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے ایک مضمون وضع اصطلاحاتِ علمیہ پر لکھا تھا۔ ابتدا میں انھوں نے اقوامِ عالم کے حالات کو پیشِ نظر رکھ کر نہایت مدّلل طریقے سے یہ ثابت کیا تھا کہ جن قوموں نے غیروں کی زبان سیکھی اور اس کے ذریعے سے تحصیلِ علم کی کوشش کی وہ ہمیشہ زوال پذیر ہوئیں۔ کوئی قوم حقیقی علم اور آزادی حاصل نہیں کرسکتی جب تک وہ اپنی زبان کو ترقی نہ دے گی اور اس کے واسطے سے علم حاصل نہ کرے گی۔ اس کے بعد جدید و قدیم علوم، نصابِ تعلیم اور ترجمے کی اہمیت پر بحث کی ہے جو بہت دل چسپ ہے۔ آخر میں وضع اصطلاحات کے متعلق اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "مصطلحاتِ علمیہ کے متعلق بعض کا خیال ہے کہ ان کے انتخاب یا وضع کرنے والے ماہرین ہونے چاہییں یعنی جس علم وفن کی مصطلحات مطلوب ہوں اُن کو اُسی علم یا فن کے ماہرین بنائیں۔ لیکن یہ درست نہیں۔ ہمارے اکثر انگریزی یونی ورسٹیوں کے ہندستانی پروفیسر جو علومِ جدیدہ کی تعلیم دیتے ہیں اپنی زبان میں مصطلحات سے بہت کم واقف ہیں بلکہ خود انگریزی زبان میں بھی علم اللسان کے نقطۂ نظر سے یونانی اور لاطینی مصطلحات کے معنے نہیں جانتے۔" اُن کی رائے میں "اُردو زبان کی اس خدمت کے لیے ایک ایسی جماعت کے تیار کرنے کی ضرورت ہے جس میں ماہرین کے علاوہ عربی، فارسی، یونانی لاطینی انگریزی، فرنچ اور جرمن کے جاننے والے موجود ہوں۔"

ان کا خیال یہ ہے کہ ہمیں دوسروں کی تقلید میں یورپی زبانوں یا انگریزی زبان کی اصطلاحات کو بجنسہٖ اپنی زبان میں نہیں اختیار کرنا چاہیے۔ جس قدر اصطلاحات ہمیں اپنی قدیم اُردو فارسی عربی زبانوں کی کتابوں میں مل سکتی ہیں تلاش کرکے لیں اور جن اصطلاحات کے لیے لفظ نہ ملیں، ان کو خود بنانا چاہیے اور اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ انگریزی یا جس یورپی زبان کا لفظ ہو اُس کے اجزا کی تحلیل کرلی جائے، پھر اس کے لاطینی یا یونانی وغیرہ مادے کے لحاظ سے اس کا ترجمہ کرلیا جائے جیسے Phono = آواز، Graph = نگار۔ فونوگراف کے لیے آوازنگار اسی طرح ٹیلی فون کے لیے دورگو۔ آٹوموبیل کے لیے خودرواں وغیرہ۔

ان کی رائے میں جس طرح انگریزی لاطینی یا یونانی مصطلحات کا اختیار کرنا غلط ہے عربی مصطلحات کا اختیار کرنا بھی درست نہیں۔ عربی مصطلحات کے اختیار کرنے سے وہی قباحت جو انگریزوں کو لاطینی

مصطلحات کی وجہ سے عارض ہو باقی رہتی ہو اور وہ آسانی جو جرمنوں کو جرمن مصطلحات سے حاصل ہو پیدا نہیں ہوتی۔

ہندی الفاظ اور مصطلحات اختیار کرنے میں یہ دقت ہو کہ لطافتِ زبان بالکل جاتی رہتی ہو۔ مثلاً ایک منطق کے رسالے میں Contrary (نقض اجمالی) اور Contradictory (نقضِ تفصیلی) کا ترجمہ آدھا توڑ اور پورا توڑ کیا گیا ہو۔ ڈاکٹر بجنوری کی رائے میں فارسی زبان کو اس بارے میں عربی اور ہندی زبانوں پر زیادہ ترجیح ہو۔ افراط تفریط سے بچنے کے لیے سب سے اوّل جہاں فارسی مصطلحات موزوں بن سکیں اُن کو سب پر ترجیح دینی چاہیے۔ مثلاً کثیرۃ الرجل کے لیے کثیرپا، مستقیم الاجنحہ کی بجائے راست پر زیادہ موزوں اور عام فہم ہیں۔

آخر میں مَیں ایک ایسے صاحب فکر شخص کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس نے اس موضوع پر سب سے زیادہ محققانہ کام کیا۔ اس کی حیثیت اس بارے میں مجتہدانہ ہو۔ مولوی وحیدالدین سلیم عربی فارسی کے جیّد عالم اور اُردو کے بہت بڑے ادیب تھے۔ ان کی نظر وسیع، ذوق سلیم اور طبع جدّت پسند تھی۔ وہ الفاظ کی حقیقت، اُن کے اشتقاق و ترکیب اور نشیب و فراز اور ان کی وصل و فصل کی اہمیت سے کامل طور پر واقف تھے۔ یہ ان کا عمر بھر کا مشغلہ تھا۔ وقتاً فوقتاً کئی اخبار اُن کی زیرِ ادارت رہے، ان میں وہ نئے نئے خیالات اور اسما کے لیے نئے الفاظ گھڑ گھڑ کر استعمال کرتے رہے جن میں سے اکثر رفتہ رفتہ زبان میں رائج ہو گئے۔ مَیں اُن کے اس لسانی ذوق سے واقف تھا، اس لیے جب دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کا کام شروع ہوا اور اصطلاح سازی کی دُشواری پیش آئی تو میری تحریک پر مولوی صاحب نے وضعِ اصطلاحات پر ایک مستقل کتاب تالیف کی جو انجمنِ ترقیٔ اُردو کے سلسلۂ مطبوعات میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ہماری زبان کے ادب میں خاص اور منفرد حیثیت رکھتی ہو اس سے قبل ہماری کسی زبان میں اس موضوع پر ایسی جامع اور انقلاب انگیز کتاب نہیں لکھی گئی۔ اور اصطلاح سازی اور الفاظ سازی کے جو اصول و قواعد اس میں بیان کیے گئے ہیں وہ اس نہج و ترتیب سے کبھی تحریر میں نہیں آئے تھے۔

ابتدا میں مولوی صاحب نے اصطلاح کی ضرورت، اصطلاح سازی کے دو مختلف نظریے اور اُن کے حامیوں کے دلائل وضاحت سے بیان کیے ہیں۔ اس کے بعد اس امر پر بحث کی ہے کہ اُردو کا زبانوں کے کس خاندان سے تعلق ہے۔ پھر اس خاندان کی زبانوں میں الفاظ سازی کے مشترک اصول بیان کیے ہیں۔ اس تفصیلی بحث کے بعد جس میں اُردو زبان کی قدرتی بناوٹ کا خاکہ کھینچا ہے وضع اصطلاحات کی اصلی بحث شروع کی ہے۔ چناں چہ اول مفرد اصطلاحیں وضع کرنے کے اُصول بتائے گئے ہیں، پھر عملی طور پر اس قسم کی اصطلاحیں وضع کرنے کے طریقے درج کیے گئے ہیں۔ ان اصولوں اور طریقوں کے بیان کرنے کے بعد ایک نہایت اہم اور دل چسپ بحث اس باب میں یہ کی گئی ہے کہ ہماری زبان میں ترکیبِ الفاظ کے کون کون سے طریقے پائے جاتے ہیں۔ اس بحث میں مرکب الفاظ کا جو بیش قدر ذخیرہ درج کیا گیا ہے وہ الفاظ اور اصطلاحات کے بنانے کے لیے نہایت کارآمد ہے۔ غرض کہ اول سابقوں اور لاحقوں کے ذکر ہیں، پھر نیم سابقوں اور لاحقوں کے بیان میں مفرد اور مرکب الفاظ کا ایک ایسا اچھا سرمایہ جمع کر دیا ہے جو کہیں ایک جگہ نہیں ملے گا۔ ترکیبِ الفاظ کے طریقے مندرج کرنے کے بعد مرکب اصطلاحیں وضع کرنے کے اصول بیان کیے ہیں۔ آخر میں ایک ذیل ہے جس میں مرکب اصطلاحات کے بعض اُصول کا استعمال مثالیں دے کر بتایا ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ جس قدر الفاظ اور اصطلاحیں انھوں نے بنائی ہیں وہ انھی قواعد کے مطابق ہیں جو پہلے سے ہماری زبان کے الفاظ میں پائے جاتے ہیں۔

ہر شخص کے لیے جو نئے خیالات کے لیے نئے الفاظ اور نئے علوم کے لیے نئی اصطلاحات بنانا چاہتا ہے اس کا پڑھنا ناگزیر ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوگا کہ ہماری زبان میں کس قدر وسعت، گنجائش اور لچک موجود ہے۔ مولانائے مرحوم نے اس تین سو صفحے کی کتاب میں دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ چوں کہ کتاب چھپ چکی ہے اور بہ آسانی ملتی ہے اس لیے میں اس کی خصوصیات کے متعلق زیادہ تفصیل بیان نہیں کرنا چاہتا۔

اب وہ وقت آیا جب جامعۂ عثمانیہ کے قیام کی منظوری ہوئی۔ جب کبھی اُردو یا دیسی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا مسئلہ پیش ہوا تو یہ عذر کیا جاتا کہ جدید علوم کی تعلیم کے لیے کتابیں کہاں سے آئیں گی۔ اسی دُشواری

کا سامنا اب بھی تھا۔ اس لیے سررشتۂ تالیف و ترجمہ قائم کیا گیا کہ دو سال کے اندر انٹرمیڈیٹ کی ضروری کتابیں تیار کرکے جامعہ کا افتتاح کر دیا جائے۔ ان کتابوں اور خاص کر سائنس کی کتابوں کے لیے وہی پرانی بحث اصطلاحات کی پیش آئی۔ اس مسئلے پر بہت بحث رہی۔ اس میں دو گروہ ہو گئے۔ ایک جماعت کا خیال تھا کہ انگریزی اصطلاحات بجنسہٖ اردو میں اختیار کر لی جائیں، دوسری جماعت کی یہ راے تھی کہ ہمیں خود اصطلاحات بنانی چاہییں۔ آخر کثرتِ راے سے یہ طے پایا کہ ہمیں اردو میں خود اپنی اصطلاحات وضع کرنی چاہییں۔ اردو میں انگریزی کی تمام علمی اصطلاحات داخل کرنے سے جو خرابیاں واقع ہوتیں ان کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ خصوصاً نواب عماد الملک نے اس پر بہت مدلل اور معقول بحث کی ہے۔ اگر ایسا کیا جاتا تو ہماری زبان عجیب قسم کا ملغوبا ہو جاتی اور اس کی ساری لطافت اور حسن خاک میں مل جاتا۔ اس غرض سے وضع اصطلاحات کے لیے ایک مجلس بنائی گئی جس میں ماہرینِ فن اور ماہرینِ زبان دونوں شریک تھے۔

تقریباً اسی زمانے میں انجمنِ ترقیِ اردو نے بھی یہ کام شروع کیا تھا چوں کہ دارالترجمے کا ناظم اور انجمن کا سکریٹری ایک ہی شخص تھا اس لیے باہمی اتحاد سے یہ کام بہ حسن و خوبی انجام پایا اور سب سے اول انجمن نے فرہنگ اصطلاحاتِ علمیہ شائع کی۔ اس میں ہیئت اور نباتیات کی اصطلاحیں تو انجمن نے تیار کرائیں اور باقی علوم کی وہ تھیں جو دارالترجمے میں وضع کی گئی تھیں۔ چوں کہ یہ ابتدائی زمانہ تھا اور اُس وقت صرف انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں کے لیے کتابیں تیار کی جا رہی تھیں اس لیے یہ اصطلاحات مکمل نہ تھیں۔ تاہم یہ پہلی کوشش تھی اور مستحسن کوشش تھی۔ ان اصطلاحات کے وضع کرنے کے لیے ہم نے یہ اُصول قرار دیے تھے۔

۱۔ اصطلاحات کے وضع کرنے کے لیے ماہرانِ زبان اور ماہرانِ فن دونوں کا یک جا ہونا ضروری ہے۔ اصطلاحات کے بنانے میں دونوں پہلوؤں کا خیال رکھنا لازم ہے تاکہ جو اصطلاح بنائی جائے وہ زبان کے سانچے میں بھی ڈھلی ہو اور فن کے اعتبار سے بھی ناموزوں نہ ہو۔

۲۔ اصطلاحات بنانے کے لیے عربی فارسی ہندی میں سے کسی زبان کا بھی ایسا مادّہ لے سکتے ہیں جو سہل ہو یعنی جو مروّج اور موزوں ہو۔ الفاظ دوسری زبان سے لے سکتے ہیں لیکن ان الفاظ سے اشتقاق

یا ترکیب کے ذریعے جو الفاظ بنائے جائیں گے وہ اُردو صَرف و نحو کے بموجب ہوں گے۔ یعنی لفظ دوسری زبان سے لے سکتے ہیں لیکن اس کے نحوی قاعدے نہیں لے سکتے۔

۳۔ حتی الامکان مختصر لفظ وضع کیے جائیں جو اصل مفہوم یا اس کے قریبی معنوں کو ادا کرسکیں۔

۴۔ جس طرح اگلے زمانے میں اپنی زبان یا غیرزبانوں کے اسماسے مصادر بنائے جاتے تھے (مثلاً بدلنا، قبولنا، بخشنا وغیرہ) اسی طرح اب بھی حسبِ ضرورت اسماسے افعال بنا لیے جائیں۔

۵۔ ترکیب میں انھی اصولوں کو پیشِ نظر رکھا جائے جو اب تک ہماری زبان میں مستعمل ہیں۔ مثلاً ہندی لفظ کے ساتھ عربی فارسی کا جوڑ اور عربی فارسی سابقوں اور خصوصاً لاحقوں کا میل ہندی الفاظ کے ساتھ۔ مثلاً دھڑے بندی، اُگال دان بےکل وغیرہ۔ یا عربی قاعدے سے فارسی ہندی الفاظ کے اسم کیفیت جیسے رنگت، نزاکت کے طرز پر مزاجیت، ہردلیسیت وغیرہ۔

۶۔ ہماری زبان کی ایسی اصطلاحیں جو قدیم سے رائج ہیں اور اب بھی اُسی طرح کارآمد ہیں انھیں برقرار رکھا جائے۔ البتہ بعض اصطلاحیں جو صحیح نہیں اور رائج ہوگئی ہیں یا جن سے اشتقاق و ترکیب کی رُو سے آگے لفظ نہیں بن سکتے انھیں ترک کرکے ان کی بجائے دوسرے مناسب لفظ وضع کرلیے جائیں۔

۷۔ ایسے انگریزی اصطلاحی لفظ جو عام طور پر رائج ہوگئے ہیں یا ایسے لفظ جن کے اشتقاق مشکوک ہیں یا ایسی اصطلاحیں جو موجدوں یا تحقیق کرنے والوں کے نام پر رکھی گئی ہیں انھیں بہ دستور رہنے دیا جائے۔

۸۔ بعض انگریزی اصطلاحیں جو پہلے زمانے میں اُس وقت کی معلومات کی رُو سے تجویز کی گئی تھیں اور حال کی تحقیق سے صحیح نہیں رہیں اُن کی بجائے ایسے لفظ تجویز کیے جائیں جو جدید تحقیق کی رُو سے صحیح مفہوم ادا کرسکیں۔ اس میں انگریزی الفاظ کی تقلید نہ کی جائے۔

تقریباً چار سال ہوتے ہیں کہ یہ مسئلہ گورنمنٹ آف انڈیا کے سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن میں آیا۔ باعث اس کا یہ ہوا کہ کچھ عرصے سے حکومتِ بمبئی کے سامنے مقامی زبانوں میں سائنس کی اصطلاحات کا مسئلہ پیش تھا۔ اس لیے حکومت نے مسٹر پی۔ این سیل ڈپٹی ڈائرکٹر تعلیمات صوبہ بمبئی سے خواہش کی کہ

وہ اس مسئلے پر ایک یادداشت پیش کریں۔ چوں کہ یہ کُل ہند مسئلہ تھا اس لیے حکومتِ بمبئی نے یہ یادداشت سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کو بھیج دی کہ وہ ایسی مشترک اصطلاحات کا تعین کرے جو تمام ہندستان کے لیے قابلِ قبول ہو۔

مسٹر سیل کے نوٹ کا خلاصہ یہ ہے:-

۱۔ سارے ہندستان کے لیے سائنس کی مشترک اصطلاحات مقرر کی جائیں۔

۲۔ ان اصطلاحات کا مشترک اور بڑا حصہ انگریزی اصطلاحات ہوں جو بجنسہ اختیار کرلی جائیں۔

۳۔ ان اصطلاحات کے لیے ہر ہندستانی زبان میں تین خاص درجے ہونے چاہییں:

(ا) بڑا حصہ انگریزی اصطلاحات کا ہو جو عملاً سارے ہندستان کے لیے مشترک ہوگا۔

(ب) ہر ہندستانی زبان میں ایک بہت تھوڑی تعداد اُسی زبان کے ایسے الفاظ کی ہوگی جو اُس زبان سے مختص ہوں گے۔

(ج) سنسکرتی یا دراوڑی زبانوں کے لیے سنسکرت کی اصطلاحیں اختیار یا وضع کرلی جائیں اور پرسوعربک (فارسی عربی) زبانوں یعنی اُردو پشتو سندھی کے لیے عربی فارسی کی اصطلاحیں۔ لیکن یہ اصطلاحیں تعداد میں بہت تھوڑی ہوں گی۔

جب کبھی اُردو اور ہندی کے میل سے ہندستانی زبان وجود میں آئے اور وہ کُل ہند مشترک زبان مان لی جائے اور مروّج ہوجائے تو پھر ب اور ج کے حصے ایک ہوجائیں گے۔ مسٹر سیل کی رائے ہے کہ سنٹرل ایڈوائزری بورڈ کو ایک مستقل مجلس اس غرض کے لیے بنانی چاہیے۔ ان کی یہ قطعی رائے ہے کہ ہمیں بلاتامّل تقریباً تمام انگریزی اصطلاحات اپنی زبانوں میں اختیار کرلینی چاہییں۔ اور جس وقت اصطلاحیں مقرر ہوجائیں تو تمام نصابی کتابوں میں حکماً وہی استعمال کی جائیں۔

اس غرض کے لیے ایڈوائزری بورڈ نے ایک کمیٹی بنائی جس کا اجلاس ۱۵ اور ۱۶ اکتوبر سنہ۱۹۴۰ء کو سر اکبر حیدری مرحوم کی صدارت میں حیدرآباد میں ہوا۔ اس میں بعض صوبوں کے ڈائرکٹر تعلیمات، بعض یونی ورسٹیوں کے وائس چانسلر اور کچھ سائنس دان شریک تھے۔ مَیں نے اس کمیٹی میں ایک یادداشت

پیش کی جس میں یہ بیان کیا کہ سوائے حقیقی بین اقوامی اصطلاحات کے باقی اصطلاحات کا ترجمہ کیا جائے اور حسبِ ضرورت وضع کی جائیں۔ زبان کے لحاظ سے ان اصطلاحات کی دو قسمیں ہوں گی۔ایک آریائی زبانوں کے لیے جن کی اصطلاحیں ہندستانی یعنی اردو میں بنائی جائیں۔ دوسری دراوڑی زبانوں کے لیے جو وہ آپس میں مل کر بنالیں۔ یہ رائے کمیٹی نے تسلیم کرلی۔جیسا کہ اس کی رویداد سے جو ذیل میں درج کی جاتی ہے، معلوم ہوگا۔کمیٹی دو روز کے غور اور بحث کے بعد اِن نتائج پر پہنچی:۔

۱۔ بین قومی اصطلاحات (انگریزی الفاظ کی صورت میں) تمام ہندستان کے لیے استعمال کی جائیں گی۔

۲۔ عام تعلیم کی خاطر ہر ہندستانی زبان کی مخصوص اصطلاحات کا بہ وجہ معروف اور مروّج ہونے کے قائم رکھنا لازم ہوگا۔ لیکن تعلیم کے اعلا درجوں میں ع۱ و ع۲ کی اصطلاحوں کی بجائے وہ اصطلاحیں اختیار کی جائیں جن کا ذِکر ع۳ میں ہے۔

۳۔ کل ہند بنیاد پر اصطلاحات میں یک سانی پیدا کرنے کے لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک سنٹرل بورڈ آف ریفرنس مع ذیلی کمیٹیوں کے ایسا قائم کیا جائے جس کے فیصلے ان مسائل کے متعلق صوبائی حکومتوں اور دوسرے علاقوں میں قبول کیے جائیں۔

۴۔ اس خیال کی بنا پر کہ ہندستانی زبانیں دو بڑی قسموں یعنے (۱) ہندستانی اور (۲) دراوڑی میں تقسیم کی جاسکتی ہیں، ہر قسم کے لیے بورڈ مقرر کیے جائیں تاکہ وہ ہر تقسیم کی زبانوں کے لیے مشترک اصطلاحات تیار کرے۔

۵۔ یک سانی کی خاطر اُردو میں ریاضی کے سوالات اور مسئلے بائیں سے دائیں جانب کو لکھے جائیں۔

۶۔ یک سانی کی مدِنظر نیز منظور شدہ اصطلاحات کو زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے کے لیے اُن افسروں کو جو نصاب کی کتابوں کے منظور کرنے کے ذمّے دار ہیں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ اُن کتابوں میں صرف وہی اصطلاحات استعمال کی جائیں جو منظور کی گئی ہیں۔

اس کے بعد ۱۲ر جنوری ۱۹۴۱ء کو سنٹرل ایڈوائزری بورڈ کا اجلاس مدراس میں ہوا۔ اور کمیٹی

کے مذکورہ بالا فیصلے پیش کیے گئے۔ بورڈ نے کمیٹی کی سفارشوں کو مندرجۂ ذیل ترمیم کے ساتھ منظور کیا

۱۔ کمیٹی کی سفارش ع۱۲ خارج کردی جائے۔ کیوں کہ ع۱۳ کے ذریعے اس کی تکمیل ہوسکتی ہے۔

۲۔ ہندستانی زبانوں کو ہندستانی اور دراوڑی میں تقسیم کرنے کے بجائے انھیں سنسکرت اور پرسوعربک (فارسی عربی) میں تقسیم کیا جائے۔

۳۔ سفارش ع۵ میں ریاضی کے سوالات اور مسئلوں کی بجائے ریاضی کے عمل اور ضابطے لکھے جائیں۔

۱۵ر جنوری سنہ ۱۹۴۲ء کو سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کا ایک اور اجلاس ہوا اور اس میں تمام صوبائی حکومتوں اور علاقوں اور ہندستان کی یونی ورسٹیوں کی آراے دربارۂ اصطلاحاتِ سائنس پر غور کیا گیا۔ بورڈ نے اس امر پر اطمینان ظاہر کیا کہ ان سب نے رپوٹ کی سفارشوں سے عام طور پر اتفاق ظاہر کیا ہے البتہ زبانوں کی تقسیم کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایک سنٹرل بورڈ آف ریفرنس مقرر کیا جائے۔ اس بورڈ کو اختیار دیا جائے کہ وہ حسبِ ضرورت ماہرین کی ذیلی کمیٹیاں مقرر کرے۔ اور امید ظاہر کی گئی کہ ان کی رہ نمائی عام اصولوں کے متعلق اور ان کے فیصلے اُن مسائل پر جو ان کی رائے کے لیے پیش کیے جائیں گے، عام طور پر مقبول ہوں گے۔

نیز یہ طے پایا کہ ہندستانی زبانوں کی تقسیم کے مسئلے سے متعلق تمام امور کا فیصلہ (جہاں تک کہ ان کا تعلق سائنس کی اصطلاحات سے ہے) بورڈ آف ریفرنس کے اختیار میں ہوگا۔ یہ بھی طے پایا کہ ریفرنس بورڈ ایک صدر (جو لازماً سنٹرل ایڈوائزری بورڈ کا ممبر ہوگا)، دو سائنس دانوں اور دو ماہرینِ السنہ پر مشتمل ہوگا۔

بورڈ کے فیصلوں میں دو امور قابلِ غور ہیں۔ ایک بین قومی اصطلاحات، دوسرا ہندستان کی زبانوں کی تقسیم۔ بینِ قومی لفظ مبہم ہے۔ جب تک ماہرینِ سائنس (جن میں کچھ ایسے بھی ہوں جو انگریزی کے علاوہ دوسرے ممالک کی زبانوں اور وہاں کی سائنسی ترقی و حالات سے واقف ہوں) مل کر یہ فیصلہ نہ کریں کہ حقیقی طور پر بینِ قومی اصطلاحات کون کون سی ہیں اُس وقت تک یہ امر غور طلب اور غیر منفصل رہے گا۔ نیز جن ممالک نے (خواہ وہ یورپی ہوں یا ایشیائی) سائنس میں معقول ترقی کی ہے اُن کے متعلق کافی

معلومات مہیا کرنی پڑیں گی اور یہ دیکھنا ہوگا کہ انھوں نے سائنس کی اصطلاحات کے متعلق کیا رویّہ اختیار کیا ہے اور وہ کن اصطلاحات کو بینِ قومی سمجھتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ کثرت سے انگریزی اصطلاحات بینِ قومی نام سے ہماری زبانوں میں داخل ہوجائیں گی جو کسی حال میں دُرست نہیں۔

زبانوں کی تقسیم جس کی سفارش بورڈ نے اپنے فیصلے میں کی ہے اس سے ہمیں اختلاف ہے۔ ہمارے مُلک میں کوئی زبان پرسو عربک نہیں۔ پرسو عربک سے بورڈ کی مُراد اُردو، سندھی اور پشتو ہے۔ اُردو زبان کی ساخت اور اس کی صرف و نحو بالکل ہندی ہے۔ الفاظ میں بھی کثرت تعداد ہندی لفظوں کی ہے۔ یہی حال سندھی اور پشتو کا ہے۔ عربی فارسی الفاظ کے آجانے سے کوئی زبان عربی یا فارسی نہیں ہوسکتی۔ باقی زبانوں کو سنسکرتی خیال کیا گیا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں۔ اس تقسیم سے بورڈ کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُردو سندھی پشتو کی اصطلاحات عربی فارسی سے اور باقی زبانوں کی سنسکرت سے بنائی جائیں۔ اس سے ہمارا مقصد فوت ہوجاتا ہے جس کا منشا یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اصطلاحیں سلیس اور عام فہم ہوں۔ اگر سنسکرت اور عربی سے اصطلاحیں بنائی گئیں تو وہ ہمارے طالب علموں کے لیے ایسی ہی مُشکل ہوں گی جیسی انگریزی اصطلاحیں جو زیادہ تر لاطینی اور یونانی ماڈوں سے بنائی گئی ہیں۔ چوں کہ اس کا فیصلہ ریفرنس بورڈ پر چھوڑ دیا گیا ہے لہذا ہم اس پر اس وقت مفصل بحث نہیں کرنا چاہتے۔

ابتدائے قیامِ دارالترجمہ جامعۂ عثمانیہ سے مجلسِ وضعِ اصطلاحات برابر کام کررہی ہے اور بہ صرفِ کثیر ہزارہا اصطلاحاتِ علوم و فنون بنائی جاچکی ہیں۔ سوا ایک مختصر فرہنگ اصطلاحات کے جو ابتدا میں شائع ہوئی تھی وہ سارا انبار یوں ہی پڑا ہے۔ شدید ضرورت ہے کہ یہ تمام اصطلاحیں نظرِ ثانی اور اصلاح کے بعد شائع کی جائیں ورنہ اندیشہ ہے کہ اگر یہی غفلت رہی تو ایک مدت گزر جانے کے بعد یہ ساری محنت اکارت جائے گی۔

ایک مدت تک ان اصطلاحوں کی اشاعت کا انتظار رہا۔ انتظار کی ایک حد ہوتی ہے۔ جب اُس طرف سے مایوسی ہوئی تو آخر انجمنِ ترقیٔ اُردو ہند نے اس کام کا بیڑا اُٹھایا اور جامعۂ عثمانیہ کے بعض مستعد اور فاضل پروفیسروں کی مدد اور مشورے سے جہاں تک ممکن ہوا اس کام کو انجام دیا۔ چناں چہ کیمیا، طبعیات،

معاشیات، عمرانیات، تاریخ و سیاسیات کی اصطلاحیں شائع ہوچکی ہیں اور بعض دیگر علوم کی زیرِ ترتیب ہیں۔ انجمن نے علاوہ اِن علمی اصطلاحات کے پیشہ وروں کی اصطلاحات کی لغات سات جلدوں میں شائع کی ہے جو اپنی نوعیت کی بےنظیر کتاب ہے۔ اس زمانے میں جب کہ حرفت و صنعت پر خاص توجہ کی جارہی ہے یہ لغات بہت کارآمد ثابت ہوگی۔ اس طرح ہماری زبان کی ہزارہا خوب صورت، موزوں اور سبک اصطلاحیں فنا ہونے سے بچ گئیں۔

اصطلاحات کے معاملے میں ایک غلطی یہ ہوئی کہ جب کبھی اور جہاں کہیں یہ کام شروع ہوا، ہر ایک نے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنالی۔ پچھلوں کے کام پر نظر نہ ڈالی۔ ضرورت اس بات کی تھی اور اب بھی ہے کہ جو اصطلاحی الفاظ ہماری قدیم کتابوں میں آئے ہیں وہ تلاش کرکے جمع کیے جائیں نیز گزشتہ سو ڈیڑھ سو برس میں مختلف اداروں اور اشخاص نے جو کچھ کیا ہے اُسے بہ نظرِ غور دیکھا جائے اور ان میں جتنے موزوں اور کام کے لفظ ملیں انھیں اختیار کیا جائے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک لفظ جو پہلے سے مروّج تھا اس پر نظر نہیں پڑی اور نیا لفظ بنا لیا گیا جو پہلے کے مقابلے میں بھدّا اور ناموزوں تھا۔ یا مثلاً معاشیات میں بہت سے ایسے لفظ ہیں جن کا تعلق تجارت سے ہے یا بازاروں منڈیوں اور ساہوکارے میں بولے جاتے ہیں اُن سے واقف نہ ہونے سے نئے لفظ بنا لیے جاتے ہیں جو مقبول نہیں ہوسکتے۔ انجمن یہ تمام سرمایہ جمع کرنے کی کوشش کررہی ہے اور اس سے کام بھی لے رہی ہے۔

انگریزی زبان سے الفاظ مستعار لینے، قدیم الفاظ کے اختیار کرنے اور نئی اصطلاحات وضع کرنے کے اصول اور طریقے جو بیان کیے گئے ہیں اب مُسلّم ہوچکے ہیں۔ ماہرینِ فن اور ماہرینِ زبان کے اجتماع سے انجمنِ ترقیِ اُردو اور دارالترجمہ جامعۂ عثمانیہ میں کافی تجربہ ہوچکا ہے۔ لہٰذا اس تجربے کی بنا پر اور زیادہ تحقیق اور وسعتِ نظر سے کام لے کر جہاں تک جلد ممکن ہو اس کی تکمیل کی جائے۔ کیوں کہ علمی کتابوں کے پڑھنے اور لکھنے کا شوق روز بروز بڑھتا جاتا ہے اور اسی مناسبت سے مترجمین و مولفین کی ضرورتیں بھی بڑھ رہی ہیں۔ چناں چہ ہر مہینے انجمن کے سکریٹری کے نام

ایسے خطوط وصول ہوتے ہیں جن میں انگریزی الفاظ و اصطلاحات کے مترادف دریافت کیے جاتے ہیں۔ جہاں تک ہوسکتا ہے ان کی تعمیل کی جاتی ہے لیکن اس طرح کب تک کام چل سکتا ہے۔ اگر اصطلاحات کے متعین کرنے اور ان کی اشاعت میں تاخیر کی گئی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر مترجم اور مؤلف اپنے خیال اور قیاس کے مطابق الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہوگا اور یک سانی باقی نہ رہےگی۔ اس انتشار سے اُردو ادب کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ یہ کام صرف دو ادارے ہی کرسکتے ہیں۔ انجمن ترقیِ اُردو ہند اور دارالترجمہ جامعۂ عثمانیہ۔ اگر دونوں کے تعاون سے یہ اہم اور ضروری کام انجام پا جائے تو اُردو زبان کے حق میں ایسی عظیم الشان ترقی کا موجب ہوگا جس کے دوُررس نتائج کا اندازہ ہم اس وقت کافی طور پر نہیں کرسکتے۔

نئی کتابیں

فنِ صحافت

اُردو زبان میں فنِ صحافت کے اصول وضوابط اور اخبار کی تیاری کے مختلف مراحل کے متعلق کوئی کتاب موجود نہ تھی اور اُردو صحافت کا شوق رکھنے والے نوجوانوں کو انگریزی کا دستِ نگر ہونا پڑتا تھا۔ اس ضرورت کو محسوس کرکے اور نیز اس خیال سے کہ فنِ صحافت کی باضابطہ ترتیب کی طرف ہندستان کی یونی ورسٹیوں کی توجہ ہو چکی ہے۔ جناب چودھری رحم علی الہاشمی صاحب بی۔ اے نے جنھیں اخبار نویسی کا پچیس سالہ تجربہ ہے اس فن پر پہلی کتاب تیار کی ہے جو انجمن کی طرف سے شائع ہو رہی ہے۔ قیمت مجلّد تین روپے چار آنے (للعہ) بلا جلد دو روپے چار آنے (عہ)

مقالاتِ گارساں دتاسی

(حصۂ اول ودوم) گارساں دتاسی کے خطبات اس سے قبل انجمن شائع کرچکی ہے یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ اُردو ادب اور زبان کے متعلق ایسی بیش قیمت معلومات کا خزانہ ہے جو کہیں دوسری جگہ دست یاب نہیں ہوسکتیں۔ دتاسی نے خطبات کے بعد بھی اُردو زبان و ادب پر اپنے سالانہ تبصرے جاری رکھے اور انھی مقالات کا مجموعہ ہے۔ قیمت مجلّد (صہ) بلا جلد (للعہ)

اُردو شعر و ادب کا جائزہ

(جناب ڈاکٹر م۔حفیظ سید ام اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ)

ہر سال نیا سال شروع ہوکر ختم ہوجاتا ہے۔ اَن گِنت سال ماضی کی تاریکیوں میں گُم ہوچکے ہیں۔ وقت کے آہنی ہاتھ مستقبل کے اوراق اُلٹ رہے ہیں۔ زندگی رواں دواں گزر رہی ہے۔ زمان و مکان کی قیود سے بے نیاز۔ ہم لوگوں کے دُکھ درد، سُکھ چین سے بے پروا۔ ہم اگر چاہیں تو زندگی یا بہ لفظِ دیگر وقت کا ساتھ دے سکتے ہیں مگر وقت ہمارا ساتھ دینے کے لیے کبھی نہیں رُک سکتا۔ زندگی عبارت ہے حرکت سے اور اسی حرکت اور اسی روانی کو ہم وقت سے تعبیر کرتے ہیں۔ انقلابات، حادثات، داخلی اور خارجی، ذہنی اور جسمانی، تغیر و تبدل، ان سب کا نام وقت کی روانی ہے۔ حدیث شریف میں ہے وقت کو بُرا مت کہو۔ وقت ہی خُدا ہے۔

زبان بھی انسانوں کی طرح مختلف ارتقائی مدارج طے کرتی رہی ہے اور طے کرتی رہے گی۔ میرؔ کی زبان وہ نہ تھی جو ولیؔ کی تھی۔ غالبؔ کی زبان میرؔ کی زبان سے قدرے مختلف تھی۔ ناسخؔ و آتشؔ نے زبان کو سنوارا اور نکھارا۔ انیسؔ نے زبان کو بڑی حد تک پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ داغؔ نے زبان سے کُھجانا سکھایا۔ کبھو، کسو، تمئیں، جاگہ، ایدھر، جیدھر، تڑ، پچھے وغیرہ الفاظ متروک قرار دیے گئے۔ غرض کہ یونہی مختلف اوقات میں ضروریات اور مقتضیات کے تحت، بہت سے الفاظ کی درآمد، برآمد رہی۔ ان الفاظ کو قبول کرنا یا رد کرنا، کسی ایک فرد یا کسی ایک ادارے کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ ایک پوری ہیئتِ اجتماعی کے خارجی اور معنوی رُجحانات پر منحصر ہے۔ قدیم اور جدید کا سوال اس میں پیدا ہی نہیں ہوتا۔ یہ ارتقائی مدارج ہیں اور بس۔

ماضی ایک حد تک ہماری موجودہ زندگی پر کچھ عرصے کے لیے حاوی رہتا ہے اور یہ ماضی، بہت

اہم اور مفید نتائج "حال" کے بنانے میں بہم پہنچاتا ہے۔ ہم مستقبل کی عمارت ماضی ہی پر کھڑی کرتے ہیں۔ "ارتقا" کا ہر قدم اپنی جگہ بڑا اہم ہے۔ آج کل نوجوان شعرا کے ساتھ ساتھ پُرانے لکھنے والوں کا ایک گروہ اپنی وضع داری کے ساتھ نغمہ سرا ہے۔ قدامت پرستی کا دَور جلد ختم ہونے والا ہے مگر اس ماضی کے اثرات موجودہ اور آیندہ دونوں زمانے کی تشکیل میں کافی مدد دیں گے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ کلاسیکی ادَب مٹ جائے گا یا اس کی قدر و قیمت گھٹ جائے گی۔ زندگی کی بعض حقیقتیں ہر ملک اور ہر قوم میں یک ساں ہیں اور یک ساں رہیں گی۔ محبّت، نفرت، خوشی اور غم کے جذبے انسانی زندگی سے وابستہ ہیں۔ ان جذبات کی کام یاب ترجمانی کرنے والا ادَب زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ میرؔ و غالبؔ کو بھُول جانے کے معنی زندگی سے کنارہ کشی اور اُس کے حقائق کو جُھٹلانا ہے۔ ہمیں تو صرف یہ دکھانا ہے کہ اگر آج اِس دَورِ "آہن و بخار" میں کوئی شاعر مثنوی بدرِ منیر اور گُل زارِ نسیم لکھے تو اُسے شاید کبھی بھی مقبولیت حاصل نہ ہوگی۔ ہم جب ان مثنویوں کو پڑھتے ہیں تو اپنے ماحول کو، میرؔحسن اور نسیمؔ کے ماحول میں تھوڑی دیر کے لیے بدل دیتے ہیں۔ لیکن اگر آج کا ماحول، کوئی شاعر، میرؔحسن اور نسیمؔ کے ماحول بناکر پیش کرے۔ تو وہ یقیناً قابلِ اعتراض اور ناموزوں سمجھا جائے گا۔

زمانۂ حاضر میں بھی وہی اُردو بولی جاتی ہے اور لکھی جاتی ہے جو ہمارے بعض لکھنے والے بولتے ہیں۔ مگر جو چیز دَورِ جدید کی شاعری کو ممیّز و ممتاز کرتی ہے وہ جدید موضوعات اور مسائل ہیں۔ جن کو تاریخ، اقتصادیات، تمدن، سیاست، سائنس اور نفسیات نے ہمارے سامنے پیش کردیا ہے۔ اب عقل و شعور کی یہ گتھیاں محض "ناخنِ جنوں" سے نہیں سُلجھ سکتیں۔ ادَب اب خواص پسند اور تفریحی حدوُد سے باہر نکلنا چاہتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ ادب کو زندگی سے کوئی واسطہ نہیں ہے تو ادَب، چند خیالی اور فرضی داستانوں کا مجموعہ بن کر "طلسمِ ہوش رُبا" اور "الف لیلہ" کی جلدوں میں مقیّد ہوکر رہ جائے گا۔ یہ تاریخ کا بطلان ہوگا۔ ہمارے قصائد، ہماری مثنویاں، ہماری قدیم غزلیں، سب اپنے۔ اپنے دَور کے طبقاتی، سیاسی اور ذہنی رجحانات کی ترجمان ہیں۔ اسی طرح اگر آج کا ادَب، موجودہ زندگی کے متعدد شعبوں کو سمیٹ رہا ہے اور اس پر روشنی ڈال رہا ہے تو اس میں "کف در دہاں" ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

موجودہ دور میں بہت سے ایسے شاعر بھی مل جائیں گے جو شاعری کے بلند پایہ اُصول سے قطعاً بے بہرہ ہیں۔ جو شاعری نہیں کرتے بلکہ کسی دوا کا اشتہار لکھتے ہیں۔ اس طرز کے ادب کو ادب سے تعبیر کرنا بے ادبی ہوگی۔ بعینہٖ عہدِ قدیم میں بھی اسی قسم کے کم مایہ شعرا گزرے ہیں جن کا آج کوئی نام بھی نہیں جانتا۔

جہاں تک زبان اور عروض کا تعلق ہے، قدیم اور جدید شعرا دونوں اب تک اس پر عامل ہیں۔ اسی جگہ "نظمِ معرّا" (Blank verse) کا ذکر نامناسب نہ ہوگا۔ کیوں کہ "نظمِ معرّا" نے جو ادب ہم کو دیا ہے، وہ عقل و ہوش سے معرّا معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کوئی شاعر ایسا بھی اُٹھے جو ملٹن (Milton) اور شیکسپیر (Shakespeare) کی طرح اس میں بھی جان ڈال دے — ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ "جدید موضوعات" نے آج ادب کو ایک نئی راہ پر ڈال دیا ہے۔ یہ "موضوعات" مفروضات نہیں ہیں اور نہ گھڑے گئے ہیں۔ کش مکشِ حیات نے بہت سی تلخ حقیقتوں کو عُریاں کر دیا ہے۔ ہم ان سے آنکھیں نہیں چُرا سکتے۔ ان سے آنکھیں چُرانے کے معنی ہیں خود غرضی، بُزدلی اور پست ہمتی۔ ہیں ان کا مقابلہ کرنا ہے، سمجھنا ہے، سمجھانا ہے، اور ظاہر ہے کہ بغیر زبان کے نہ ہم سمجھ سکتے ہیں نہ سمجھا سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر نئی ترکیبیں اور نئے الفاظ، نئی معنویت اور وسعت کے ساتھ نہ لائے جائیں تو معنی و مطالب، پُورے طور پر ادا نہیں ہو سکتے۔ ۶

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

چکبست، اقبال اور جوش کی نظموں کے صرف عنوانات ہی ہمیں یہ بتا دیں گے کہ کس قدر نئے نئے مسائل اور کتنے جدید رُجحانات ہماری شاعری میں کامیابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ آ چکے ہیں۔ ہماری شاعری اب حُسن و عشق کے تجربات اور محسوسات ہی تک محدود ہو کر نہیں رہ گئی ہے۔ اس میں اب افلاس اور امارت کی ہول ناک داستانیں، طبقاتی کش مکش، جنسی اور نفسیاتی اُلجھنیں (Complexes) فلسفہ اور سائنس کا شعور آ گیا ہے۔ اس ادب میں کفر و الحاد بھی ہے اور مذہبی جذبات بھی۔ ہمیں کفر و الحاد کی شاعری سے چونک نہ پڑنا چاہیے اُردو کسی مذہبی زبان کا نام نہیں ہے۔ نہ یہ کسی مذہبی جماعت

کی ترجمان ہی۔ زبان کا مشرب ہمیشہ "صلح کل" ہوتا ہی۔ ہر جماعت کے افراد کو حق حاصل ہی کہ وہ اپنے نظریات اُردو کے ذریعے لوگوں تک پہنچائیں۔ مگر شرط یہ ہی کہ یہ نظریات سنجیدہ ہوں اور غور و تفکر پر مبنی ہوں۔ وقتی اور ہنگامی نہ ہوں۔ دِل آزاری اور طنز و تضحیک سے بری ہوں۔ کسی مرتب اور منظم فلسفے کے حامل ہوں اور سب سے آخری اور سب سے بڑی شرط یہ ہی کہ اعلا شاعری کے معیار پر پورے اُترتے ہوں۔ ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہی کہ ابھی دورِ جدید کے شعرا کے کلام میں یہ باتیں کم ملتی ہیں۔ پھر بھی ہمارا ادب سچا اور جان دار ہی اور مختلف النوع تحریکوں سے ہم آہنگ ہی۔

ہمارا نوجوان شاعر آج یوں نہیں کہے گا ؎

بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوے

وہ آج وقت کے ساتھ نغمہ سرا ہی ؎

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا — راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
اَن گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم — ریشم و اطلس و کمخواب میں بُنوائے ہوے
جا بجا کوچہ و بازار میں بکتے ہوے حُسن — خاک میں لتھڑے ہوے خون میں نہلائے ہوے
لوٹ جاتی ہی اِدھر کو بھی نظر کیا کیجیے — اب بھی دِل کش ہی ترا حُسن مگر کیا کیجیے
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا — راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

(فیض احمد فیضؔ)

آج کا شاعر اپنے کو بڑا شاعر نہیں سمجھتا۔ جو دُنیا کے ہنگاموں سے بے پروا اپنی ایک الگ دنیا بنائے ہوئے مست رہے۔ وہ خود کو عالمگیر برادری کا ایک ذمّے دار فرد سمجھتا ہی۔ اُسے اپنے فرائض کا احساس ہی۔ وہ جانتا ہی کہ اس کے نغموں کا سب سے بڑا صِلہ یہی ہوسکتا ہی کہ افراد کے دِلوں میں خودشناسی کا جذبہ پیدا ہوجائے۔ وہ خود فریبی سے نکلنا چاہتا ہی اور دوسروں کو بھی یہی سکھاتا ہی۔ اس میں شک نہیں کہ آج کل جو کچھ لکھا جا رہا ہی، وہ ایک حد تک ردِ عمل کے طور پر بھی ہی۔ اور یہی وجہ ہی کہ بعض اوقات لہجہ تند اور ناگوار حد تک دُرشت ہوجاتا ہی۔ غیظ و غضب اور استہزا کی بےشمار مثالیں جوشؔ کے کلام

میں پیش کی جاسکتی ہیں مگر اس غیر متوازن زمانے میں جب کہ ہر لمحہ ، ہر لحظہ ہندستانی جمود اور بے بسی میں اضافہ ہی کرتا چلا جاتا ہی ، اس تند و کرخت لہجے کو "داروے تلخ " کہہ کر برداشت ہی کرنا پڑے گا۔ یہ بھی صحیح ہی کہ ہماری شاعری میں تخریبی عنصر کی بھی ایک لہر دوڑ رہی ہی ، جو عدمِ تفکر اور اعصابی ہیجان پر دلالت کرتی ہی۔ مگر سعدی کا یہ کلیہ بھی اپنی جگہ اٹل ہی کہ " ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت " جوشؔ جب یہ کہتا ہی ؎

نسلِ انسانی کھڑی تھی ششدر و آتش بجاں　　　اک عبوری موڑ پر۔ دو عالموں کے درمیاں
بے ضیا پیغمبری تھی ۔ کافری تاریک و تار　　　کس غضب کی کش مکش تھی ، کس بلا کا انتظار

تو یہ بھی بشارت دیتا ہی ؎

آج لیکن عصرِ حاضر کا سماں کچھ اور ہی　　　اب زمیں کچھ اور ہی اب آسماں کچھ اور ہی
اس شبِ جاں میں ، صبح سیلِ احساسات ہی　　　اب بھی مانا رات ہی لیکن یہ پچھلی رات ہی
شب کے اس دھندلے اُفق سے ، باہزاراں آب و تاب　　　امن و آسایش کا طالع ہورہا ہی آفتاب

اس اقتباس سے یہ بھی پتا چلتا ہی کہ تاریخ کی قوتوں کا کتنا زبردست احساس ہمارے شعرا میں آچلا ہی اور نوعِ انسانی کی بہبودی اور بہتری میں کتنا اعتقاد پیدا ہوگیا ہی۔ اُردو شاعری میں " رجائی لہجہ " مستقل طور پر دورِ حاضر ہی میں آیا ہی۔ اس سلسلے میں ایک سوال اور اُٹھتا ہی۔ کیا ہر نام نہاد شاعر اس قابل ہی کہ اُسے محفلِ ادب میں جگہ دی جائے ؟۔ اور اگر نہیں ہی تو شاعروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو کیسے روکا جاسکتا ہی ؟۔ اس کا ایک ہی جواب ہی کہ زمانہ شاعر اور متشاعر کا فیصلہ خود کردے گا۔ حدیث شریف میں آیا ہی ، اَلْوَقْتُ سَیْفٌ ؛ اس وقت ادب جس بحرانی دور سے گزر رہا ہی ، اس میں سوچنا تو درکنار سانس لینے کی فرصت نہیں ملتی۔ خس و خاشاک کا آجانا لازم ہی مگر رفتہ رفتہ جب طوفان فرو ہوجائے گا ، گرد و غبار چھٹ جائے گا ، تو اس گلشن کے خوش نما پھول اپنی طرف متوجہ کرلیں گے۔

اسی کے ساتھ اس امر کی بھی ضرورت ہی کہ معیارِ تنقید بلند کردیا جائے ۔

معیارِ تنقید کیوں کر بلند ہوگا، اصولِ تنقید کی ساخت کیوں کر ہو؟ یہ بحث بہت طولانی اور تفصیل طلب ہے۔ مَیں یہاں صِرف چند اشارے کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

ہمیں ذاتیات سے قطعاً سروکار نہ ہونا چاہیے۔ افراط و تفریط اور پُرانے تقریظی رنگ سے دامن بچائے رکھنا چاہیے۔ نقاد کے واسطے ضروری ہے کہ نہ صِرف وہ اُردو ادب پر عبور رکھتا ہو بلکہ متعدد زبانوں کے ادب کا رچا ہوا مذاق بھی رکھتا ہو۔ اس کا دماغ ایک سائنس داں کا دماغ ہو جو بغیر کسی تعصب کے نہایت اطمینان کے ساتھ ہر مسئلے کو علاحدہ علاحدہ تقسیم اور تحلیل کر سکے۔ اس کا دل شاعر کا دِل ہو، تاکہ وہ شاعر کے محسوسات میں حتی الامکان شریک ہو سکے۔ اشعار پر صِرف خارجی لحاظ سے تنقید بے سُود ہوگی۔ زبان کی خامیاں یا اچھائیاں، عروضی نکات اور مختلف صنعتوں کا جائزہ لینا ہی تنقید نہیں ہے بلکہ یہ بھی دیکھنا ہے کہ شاعر کے مضامین میں تنوع کتنا ہے۔ عمق اور غور و فکر کتنا مِلتا ہے۔ صداقتِ احساس اور معنویت ہے یا نہیں۔ محض ہنگامی جذبات ہی اس کے کلام میں مِلتے ہیں یا آفاقی لہریں بھی دوڑ رہی ہیں۔ زندگی کے تجربات جو اس نے پیش کیے ہیں، وہ کس طرح اور کس زاویے سے محسوساتِ شعری میں منتقل کیے گئے ہیں اور ان تجربات کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے۔ ذہنی کیفیات کے کس کس پہلو پر بحث کی گئی ہے۔ زندگی کے سرد و گرم پر اس کی نظر کیسے پڑی ہے۔ جب تک نقاد ان تمام امور کو پیشِ نظر رکھ کر کلام پر نقد و تبصرہ نہ کرے گا، اُس کی تنقید مکمل نہیں کہلا سکتی۔ اس کے علاوہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ اُردو کے بڑے بڑے اُدبا اشتراکِ عمل سے تنقیدی اصول وضع کرلیں۔ جو ضروریاتِ وقت کے ساتھ بدلتے بھی رہیں گے۔ مگر متفقہ آرا کی معیت میں۔ یوں نہیں کہ جس نے چاہا بدل دیا۔

ادب کا انفرادی دوَر ختم ہو چکا۔ اب ادب کے اجتماعی دوَر کا زمانہ ہے۔ اگر ہم ان تمام باتوں پر عامل ہو جائیں تو ادب کی بہنگم روش بہت کچھ سدھر سکتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس قسم کے اُصول میں تغیر و تبدل کی کوئی گنجایش نہ ہونا چاہیے۔ ادب کو چند گنے اُصول کا پابند کر دینا، ادب کی وسعتوں کو ختم کر دینا ہے۔ بڑا شاعر یا نثار چند اصول کے گھروندوں میں گِھر کر نہیں رہ سکتا۔ مگر پھر بھی بغیر اصول وضع کیے چارہ نہیں۔ مستثنیات سے یہاں بحث نہیں۔ شاعری اور افادیت کے موضوع کو ذرا اور واضح کر دینا چاہتا

ہوں ۔ مجھے خوب احساس ہو کہ انھی موضوعات پر بحث کرتے وقت بعض احباب مجھے رجعت پسند قرار دیں گے۔ اور بعض "ترقی پسند" کے خطاب سے سرافراز فرمائیں گے ۔ مگر پھر بھی حقیقتِ امر کا اظہار نہ کرنا ادبی بددیانتی ہوگی ۔ بہ قول حضرت اقبال ؎

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش   میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

اتنا تو ہم سب جانتے ہیں کہ شاعری کا کام چند لایعنی اور دور از کار باتوں کا موزوں کردینا نہیں ہو۔شاعری عوام پسندی اور خواص پسندی کی قید سے آزاد ہو ۔ اس بارگاہ میں غریب اور امیر کا سوال نہیں اُٹھتا ۔ یہاں تو صرف چشمِ بینا اور گوشِ شنوا کی ضرورت ہو ۔ شاعری سازِ حیات کا وہ نغمہ ہو جس سے جھونپڑے اور محل دونوں گونج اُٹھتے ہیں ۔ شاہانِ کج کلاہ، اور گدایانِ بے نوا ، رندانِ خراب حال اور پیرانِ قباپوش سب ایک صف میں یہاں کھڑے کیے جاتے ہیں ۔ اس بارگاہ میں جس کی پذیرائی ہو، وہ حُسن ہو۔ کیٹس (KEATS) نے سچ کہا ہو۔ "حسین چیز ابدی مسرّت کا باعث ہوتی ہو۔"

مگر اس نظریے نے غلط فہمی بھی بہت پھیلائی ہو۔ یہیں سے "ادب برائے ادب" کا گُمراہ کن نظریہ نکلا ۔ جس کی وجہ صرف اتنی ہو کہ حُسن کو اس نظریے کے حاملوں نے محض تصوّر کی پیدا کردہ لطافتوں تک محدود کردیا ۔ اِنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر "حُسن" ایک ابدی مسرّت ہو تو اس کا وجود حقیقی ہو نہ کہ خیالی۔ زندگی سے بڑھ کر "حسین" شے کوئی نہیں ہوسکتی ۔ "حُسن" محض رخسارِ حبیب کا نام نہیں ہو۔ "حُسن" ان آنسوؤں میں بھی جھلکتا ہو جو فاقوں کی شدّت سے نکل آتے ہیں ۔ "حُسن" صرف پھولوں میں نہیں ، کانٹوں میں بھی پایا جاتا ہو۔ "حُسن" زرق برق لباس سے لدی ہوئی شہزادیوں میں بھی مل سکتا ہو اور پھٹے پُرانے کپڑوں میں چُھپی ہوئی بھکارن میں بھی ۔ "حُسن" قندِ مکرّر بھی ہو اور زہرِ ہلاہل بھی ۔ کارخانوں کے مزدور اور محلوں کے رہنے والے ، دونوں حُسن سے بہرہ مند ہیں ۔ "حُسن" نرم اور لطیف حکایتوں کا نام بھی ہو اور تلخ حقیقتوں کا بھی ۔ اسی کو ہیگل (HEGEL) جدلیات (DIALECTIES) سے تعبیر کرتا ہو۔ فلسفہ، منطق، سیاست ، اقتصادیات ، عمرانیات ، مذہبیات ، جُملہ چیزیں شاعری کے سانچے میں ڈھل کر حسین ہوسکتی ہیں ۔ "رخسار و گیسو" تو شاعری میں کافی جگہ پاچکے اور پاتے رہیں گے ۔ مگر ضرورت ہو کہ "رخسار و گیسو" سے

ہٹ کر بھی کچھ کہا جائے۔ مگر جو کچھ کہا جائے، جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے، شاعری کے دائرے سے باہر نہ ہو۔ اب سوال یہ اُٹھتا ہے کہ ہم ہر قسم کے موضوع کے لیے محض غزل والی زبان سے کام کیسے چلا سکتے ہیں۔ میری مُراد غزل کی اُس زبان سے ہے جس میں صرف اِس پر عمل کیا جاتا ہے کہ غزل کے معنی عورتوں سے بات چیت کرنا ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ موضوع کی نزاکت یا تعلقات کے لحاظ سے زبان، یا یوں کہیے لہجہ مختلف ہوتا چلا جائے گا ؎

رُخ پھیر کے یوں چلی جوانی یاد آگیا روٹھنا کسی کا

جلیل کا یہ شعر بھی اپنی جگہ خوب ہے اور اقبال کا یہ شعر بھی دلکش ؎

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں کارِ جہاں دراز ہے، اب مِرا انتظار کر

میر کا استغنا ؎

فقیرانہ آئے صدا کر چلے میاں خوش رہو ہم دُعا کر چلے

اور شاد عظیم آبادی کا دستِ طلب ؎

یہ بزمِ مے ہے، یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں، مینا اُسی کا ہے

دونوں شعر اہم ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اب تک ہم جمالِ یار ہی کے قائل رہے ہیں۔ اب ہمیں بدصورتی میں بھی حُسن دیکھنا ہے۔ جوش نے "سیاہ فام" سے مخاطب ہوکر کیا خوب کہا ہے ؎

اے کہ گیسو کی طرح نرم و سیہ فام ہے تو چشمِ بد دُور کہ خالِ رخِ ایام ہے تو

ہمیں ادب میں حُسنِ خیال ہی نہیں ڈھونڈھنا ہے بلکہ حُسنِ عمل بھی ؎ اکبر الٰہ آبادی

قرآن یہ شاہد ہے خدا حُسن سے خوش ہے کس حُسن سے یہ بھی تو سُنو حُسنِ عمل سے

یہیں سے ادب کا افادی رُخ سامنے آجاتا ہے

"ادب اگر زندگی کا ترجمان نہیں تو کچھ بھی نہیں"۔ زندگی کے تاریک اور روشن رُخ دونوں ادب کی جان ہیں۔ ادب مردہ اور افسردہ نہیں ہوتا بلکہ زندگی کی طرح زندہ اور متحرک۔ ہم اپنے کو کسی طرح زمانے کے اثرات سے نہیں بچا سکتے۔

ہمیں ادب میں نئے امکانات، نئی وسعتیں، نئے نظریے داخل کرنے پڑیں گے۔ ہم ان سے بچ نہیں سکتے۔ سائنس، فلسفہ، روحانیت، مادّیت ان تمام موضوعات کی ادب میں جگہ ہونی چاہیے۔ ہم انسانی برادری سے باہر نہیں۔ لہٰذا انسانی دُکھ درد، مفلسی اور تنگ دستی، تنگ نظری اور تنگ خیالی، سرمایہ پرستی اور غلامانہ ذہنیت، ان تمام امراض کا علاج ادب کے ذریعے سے کرنا پڑے گا۔ اگر ہم اِن فرائض سے غافل ہیں، تو ہمارا ادب خودغرضی، تنگ نظری مردم آزاری کی ہول ناک داستان بن کر رہ جائے گا اور دُنیا کے ادب میں اس کی کوئی جگہ نہ ہوگی، کوئی وقعت نہ ہوگی۔ یاد رکھیے یہ میری آواز نہیں ہے، یہ وقت کی آواز ہے جو آج دُنیا کے ادب میں گونج رہی ہے جو توپوں کی گرج اور بموں کی دھمک کے ساتھ ہم تک پہنچ رہی ہے۔

یہ زندگی کا مطالبہ ہے جسے زندہ رہنے کے لیے پُورا کرنا پڑے گا۔

سرسیّد خطوط کے آئینے میں

(بہ قلم جناب خواجہ احمد فاروقی ایم اے)

(بہ سلسلۂ سابق)

" ایک اور خبر ملی ہے جس کا مجھ کو کمال رنج اور فکر ہے کہ بابو شیو پرشاد صاحب کی تحریک سے عموماً ہندووں کے دِل میں جوش آیا ہے کہ زبانِ اُردو خطِ فارسی کو جو مسلمانوں کی نشانی ہے

ہٹادیا جائے۔ میں نے سُنا ہے کہ انھوں نے سائینٹفک سوسائٹی کے ہندو ممبروں سے تحریک لی ہے کہ بجائے اخبار اُردو کے ہندی میں ہو تو ترجمۂ کتب بھی ہندی میں ہو یہ ایک ایسی تدبیر ہے کہ ہندو مسلمانوں میں کسی طرح اتفاق نہیں رہ سکتا۔ مسلمان ہرگز ہندی پر متفق نہ ہوں گے اور اگر ہندو مستعد ہوئے اور ہندی پر اصرار ہوا تو وہ اُردو پر متفق نہ ہوں گے اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ہندو علاحدہ مسلمان علاحدہ ہوجاویں گے۔" [1]

بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ سرسید مرحوم نے انڈین نیشنل کانگرس کی مخالفت کی اِس وجہ سے یہ جھگڑا پیدا ہوا لیکن یہ بات بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ اس وقت کانگرس کا کہیں وجود بھی نہ تھا۔ سرسید نے علی گڑھ کے تعلیمی سروے میں بھی اِس نزاع پر روشنی ڈالی ہے۔ "تیس برس کے عرصے سے مجھ کو ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، خیال پیدا ہوا ہے اور ہمیشہ میری یہ خواہش تھی کہ دونوں مل کر دونوں کی فلاح میں کوشش کریں مگر جب سے ہندو صاحبوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اُردو زبان اور فارسی کو جو مسلمانوں کی حکومت اور شہنشہی ہندستان کی باقی ماندہ نشانی ہے مٹا دیا جائے۔ اس وقت مجھ کو یقین ہوگیا کہ اب ہندو مسلمان باہم متفق ہوکر ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کرسکتے۔ مَیں نہایت درستی اور اپنے تجربے اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا ہے اس کی ابتدا اِسی سے ہوئی۔"

جدید اُردو شاعری

اُردو شاعری کے جدید میلانات بھی ایک حد تک سرسید کے ممنونِ احسان ہیں۔ انھوں نے نیچرل خیالات نظم کرنے کی ترغیب اور تحریص دلائی اور یہی ہماری جدید شاعری کا دورِ اوّل تھا۔

جس زمانے میں مولانا محمد حسین آزاد پنجاب کے سررشتۂ تعلیم سے وابستہ تھے ان کی تحریک اور کرنل ہال رائڈ کی تائید سے ایک بزم ادب پنجاب میں قائم ہوئی۔ جس میں بجائے غزلوں کے نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ اِس انجمن کا پہلا مشاعرہ آٹھ مئی ۱۸۷۴ء کو منعقد ہوا۔ اور

[1] خطوطِ سرسید، ص۱۶۱

اِس بزمِ ادب کی سرگرمیاں گیارہ مہینے تک جاری رہیں۔ سرسید نے مولانا آزاد کو بنارس سے ایک خط ۱۹ر اکتوبر ۱۸۵۸ء کو لکھا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس کا سنِ کتابت ۱۸۷۴ء ہونا چاہیے اس میں تحریر فرمایا ہے:-

”میری نہایت قدیم تمنا اِس مجلسِ مشاعرہ سے بر آئی ہے۔ میں مدت سے چاہتا تھا کہ ہمارے شعرا نیچر کے حالات کے بیان پر متوجہ ہوں۔ آپ کی مثنوی خواب امن پہنچی۔ بہت دل خوش ہوا۔ درحقیقت شاعری اور زورِ سخن وری کی داد دی ہے۔ اب بھی اس میں خیالی باتیں بہت ہیں۔ اپنے کلام کو اور زیادہ نیچر کی طرف مائل کرو۔ جس قدر کلام نیچر کی طرف مائل ہوگا اتنا ہی مزہ دے گا۔ اب لوگوں کے طعنوں سے مت ڈرو۔ ضرور ہے کہ انگریزی شاعروں کے خیالات لے کر اُردو زبان میں ادا کیے جاویں۔ یہ کام ہی ایسا مشکل ہے کہ کوئی کر تو دے۔ ابھی تک ہم میں خیالات نیچر کے ہیں ہی نہیں۔ ہم بیان کیا کر سکتے ہیں۔ بعد رمضان انشاء اللہ تعالا ایک مضمون طویل اس باب میں لکھوں گا۔“ [۱]

سرسید کا ایک اور خط جدید اُردو شاعری کی تاریخ میں اہمیت رکھتا ہے۔ وہ مولانا الطاف حسین حالی کو لکھتے ہیں:-

”جناب مخدوم و مکرم من عنایت نامہ جات مع پانچ جلد مسدس پہنچے۔ جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی۔ جب تک ختم نہ ہولی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہولی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہوگئی اگر اس مسدس کی بدولت فنِ شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے۔ بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ، جھوٹ، تشبیہاتِ دور از کار سے جو مایۂ ناز شعرا و شاعری ہے بالکل مبرا ہے کیوں کہ ایسی خوبی و خوش بیانی اور موثر طریقے سے ادا ہوا ہے۔ متعدد بند اس میں ایسے ہیں، جو بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ حق یہ ہے جو دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے۔ نثر بھی نہایت عمدہ اور نئے ڈھنگ کی ہے۔ پُرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اُڑایا ہے یا ادا کیا ہے۔ میری نسبت جو اشارہ اِس نظم میں ہے اس کا شکر کرتا ہوں اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں اگر

---

[۱] خطوط سرسید، ص ۱۲۲

پرانی شاعری کی کچھ بو اس میں پائی جاتی ہے تو صرف ان ہی الفاظ میں ہے جن میں میری طرف اشارہ ہے۔ بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں ان اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا میں کہوں گا حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے۔ مسجدوں کے اماموں کو چاہیے کہ نمازوں میں اور خطبوں میں اسی کے بند پڑھا کریں۔"[1]

یہ خط ۱۰ر جون ۱۸۷۹ء کا لکھا ہوا ہے۔

۳- اسلوبِ تحریر

(ا) سرسید کی تحریر کی سب سے بڑی خصوصیت سادگی اور بے ساختگی ہے وہ Joseph Conrad کی طرح تمام ادیبوں میں سب سے زیادہ غیر ادیب واقع تھے ان کے یہاں فاضلانہ اور مشیانہ تراش خراش بہت کم نظر آتی ہے۔ تشبیہیں، تمثیلیں یا تلمیحیں جو کچھ ہیں وہ بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلا قصد و ارادہ مصنف کے قلم سے نکلی ہیں۔ یہ تصنع اگر ہے تو ایسا ہی ہے جیسے پھول پر شبنم یا تصویر پر آئینہ۔

نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں:-

"جناب مذہب اسلام تو آفتاب سے بھی زیادہ روشن اور سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ کوئی معما یا بدر چاچ کا شعر نہیں ہے جس کے حل کرنے کو مولوی امام بخش صہبائی اور میر حسن معمائی درکار ہوں"

نواب وقار الملک کو لکھتے ہیں:-

"آپ کو معلوم ہے کہ بھوپال اب تک ہمارے لیے کوفہ رہا ہے"

ایک اور خط میں نواب صاحب موصوف ہی کو لکھتے ہیں:

اپ کا عنایت نامہ بلا تاریخ پایا ۔۔۔ ۔۔۔ توذیش کہ وقتِ ماخوش کردی ء جس قدر دل کو مسرت

[1] خطوط سرسید، ص ۱۲۵

آپ کے خط سے ہوئی ہو بیان نہیں کرسکتا۔ اگر یوسف زلیخا کو یا لیلیٰ مجنوں کو ملتی تو شاید اسی قدر خوشی ہوتی۔ جس محبت سے لکھا تھا وہ اثر ان لفظوں میں موجود تھا اور آنکھ سے برابر دل میں پہنچتا تھا۔ میں محبت سے آپ نے اشعار لکھے تھے۔ ان کو پڑھ کر میں ایسا محوِ محبت ہوا کہ گویا یہ سمجھنا دشوار تھا کہ وہ شعر میں نے آپ کے حق میں لکھے ہیں اور اس کیفیت سے وحدتِ وجود کے مسلے کا عقدہ حل ہوتا تھا ؎

میان احمد و مہدی نہ ہیچ ہست حجاب　　تو خود حجاب خودی احمد از میاں برخیز[۱]

نواب محسن الملک کو ۲۶ر نومبر ۱۸۶۹ء کو خط میں لکھتے ہیں :۔

"محبت اور دوستی ایسی سخت اور مضبوط چیز ہے کہ کسی طرح نہیں ٹوٹ سکتی اور کوئی اس کو نہیں توڑ سکتا۔ مگر وہ نازک بھی ایسی ہے کہ باریک سے باریک شیشے اور حباب کو بھی اس سے نسبت نہیں ہے۔ وہ ہتھوڑوں اور ہزاروں صدموں سے نہیں ٹوٹتی اور ایک ادنا سی خلافِ محبت بات کرنے سے ٹوٹ جاتی ہے۔"[۲]

(ب) انشائے سرسید کی دوسری خصوصیت دل نشینی اور تاثیر ہے۔ بقول مولانا حالی یہ اثر محض سادگی کی وجہ سے نہیں پیدا ہوا۔ بلکہ "اُن کے کلام میں جو تاثیر تھی وہ درحقیقت ان کی سچائی اور حق گوئی کا نتیجہ تھی۔" یہی خلوص ہے جو ان کے خطوط میں بھی جلوہ گر ہے۔

سرسید کو مولوی زین العابدین صاحب سے بڑی خصوصیت تھی اس لیے ان سے سب سے زیادہ خفگی اور ناراضگی بھی رہتی تھی۔ ان کو لکھتے ہیں :۔

"مکرمی زینو بھیا! ابھی تمھارا خط پہنچا کچھ شک نہیں کہ تم کو مجھ سے جدا ہونے کا ایسا ہی رنج ہے جیسا کہ تم نے لکھا۔ مگر تم تو اس رنج کو کسی قدر لکھ بھی سکے۔ مگر مجھ کو تمھارے چلے جانے سے جو رنج ہے وہ لکھا بھی نہیں جاسکتا زبان کھجلاتی ہے اور کوئی نہیں کہ اس کو بُرا کہوں۔ دل میں غصہ آتا ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے جس پر غصہ نکالوں۔ ہاتھ کھجلاتے ہیں اور کوئی یہاں نہیں ہے جس کو ماروں۔ حقیقت میں تمھارے جانے سے مکان سونا نہیں ہوا بلکہ دل سونا ہوگیا۔ صبح اُٹھ کر خدا یاد نہیں آتا مگر تم یاد آتے ہو۔ "ای کہ ہرگز فراموشت نہ کنم" کا نقشہ ہوگیا۔"[۳]

---

[۱] خطوطِ سرسید، ص۲۸۔ [۲] ایضاً ص۹۴۔ [۳] ایضاً ص۱۱۸

سرسید کے خطوط بڑی حد تک سپاٹ ہیں۔ لیکن سچائی اور خلوص نے بے جان لفظوں میں جان ڈال دی ہو اور بعض وقت ایسا معلوم ہوتا ہو کہ ریگستان میں کوئی چشمہ پھوٹ نکلا ہو جو پورے جوش کے ساتھ اُبل رہا ہو۔ نواب وقارالملک کو لکھتے ہیں :-

"میں کامل یقین کرتا ہوں اور پورے ایمان سے کہتا ہوں کہ تم نے غلطی کی۔ قیامت میں خدا کے سامنے رسول کے سامنے کہوں گا کہ ای میرے دادا، رسولِ خدا میں نے بغیر کسی غرضِ دنیاوی کے تیری امت کی بھلائی کی کوشش میں کوئی درجہ باقی نہ رکھا تھا۔ جن لوگوں نے اس کو برباد کرنا چاہا من جملہ ان کے ایک یہ انتصار جنگ ہیں۔ آپ کہیے گا کہ میں نے نہایت نیک نیتی سے کیا تھا خدا یقینی آپ کو معاف کرے گا۔ گو میری اور میرے دادا کی تشفی نہ ہوگی۔ باللہ نہ ہوگی۔ ثم باللہ نہ ہوگی۔ یہ میری رائے ہو آپ کی نسبت"۔[1]

حالی کا شملہ آنے کا ارادہ ہو ان کو لکھتے ہیں :-

"آپ بلا تامل تشریف لائیں، مکان، دِل، آنکھیں سب حاضر ہیں"

(ج) سرسید کے خطوط میں بول چال کا بھی لطف پوشیدہ ہو اور بعض جگہ صحیح اور غلط۔ فصیح اور غیر فصیح کا بھی لحاظ نہیں کیا ہو۔ بہ قول مولانا حالی " جو لفظ یا جو جملہ بے اختیار قلم سے ٹپک گیا وہی ان کی زبان اور وہی بول چال تھی " اغلاطِ سرسید سے ہم نے آگے بحث کی ہو۔

سرسید نواب محسن الملک کو لندن سے لکھتے ہیں :-

"مسٹر مالک صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنا پتا لکھ دیا۔ دوسرے دن میں وہاں گیا وہ گھر پر نہ تھے۔ ملاقات نہیں ہوئی۔ آپ کو معلوم ہو کہ کرایے کی بگھی میں کیا خرچ پڑتا ہو۔ دس رُپے روز میں نے کہا "مرے"۔ اس لئے دوبارہ نہیں گیا۔ پھر کسی دن جاؤں گا"۔[2]

خان بہادر مولوی ذکاءاللہ کو لکھتے ہیں " واہ جناب واہ آپ نے خواجہ وجیہ الدین سے ملایا کہ گیارہ بجے کا وقت جو بجٹ میٹنگ کے لیے مقرر کیا ہو اچھا نہیں ہو۔ اگر ایک بجے

---

[1] خطوطِ سرسید۔ ص ۱۰۱ و ۱۰۰ [2] ایضاً ص ۲۹۔

کا وقت ہوتا تو اچھا تھا مطلب آپ کا یہ تھا کہ آپ نو بجے دلّی سے چلتے اور اجلاس میں شریک ہوکر اُسی دن واپس چلے جاتے۔" ۱؎

(د) خطوط سرسیّد مصنّف کی افتادِ طبع کا آئینہ ہیں۔ ان میں ظرافت جو سرسیّد کی فطرت کا خمیر تھی جا بہ جا چمکتی ہے۔ نواب محسن الملک کے خط میں مولوی س۔خ پر خفگی کا اظہار ہے لیکن یہ عتاب اور ملال بھی ظرافت کی چاشنی سے خالی نہیں ہے:-

"وہ بچّے ہیں۔ انھوں نے دُنیا نہیں دیکھی۔ دوستی اور محبّت کے معاملات اور برتاؤ سے محض ناواقف ہیں۔ وہ کسی رنڈی پر عاشق نہیں ہوئے۔ کسی لونڈے پر عاشق نہیں ہوئے ان کو مزہ دوستی اور محبّت کا مطلق معلوم نہیں ہے۔ سچ یہ ہے کہ جس شخص نے ایک گھڑی بھی عشق نہیں برتا وہ نہ خدا کی دوستی کا مزہ جانتا ہے اور نہ انسان کی دوستی کا۔" ۲؎

اسی خط کے آخر میں لکھتے ہیں:-

"مجھ کو مطلق یاد نہیں ہے کہ وہ کون سا خط ہے اور اس میں کیا مضمون ہے جس کو پڑھ کر میاں احسان صاحب روئے، امید ہے کہ آپ مطلع فرمادیں تو اس بات کو اپنی معجزات کی کتاب میں لکھ لوں۔" ۳؎

نواب محسن الملک ہی کو لکھتے ہیں:-

"آپ کو خوب معلوم ہے کہ میرے نزدیک مسلمان رہنے کے لیے اور بہشت میں داخل ہونے کے لیے آئمۂ کبار تو درکنار مولوی جبو کی بھی تقلید کافی ہے۔"

نواب صاحب موصوف کو لکھتے ہیں، انگریزی وضع اختیار کرنے کی بحث ہے:-

"تبدیلِ وضع کے باب میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ سب بجا ہے۔ بہ شرطے کہ میرا جادو، توبہ توبہ، میرا معجزہ، نعوذ باللہ، میری کرامت، لاحول ولا قوۃ الّا باللہ، میری حماقت، تم میں اثر نہ کرےگی۔ ذرا صبر کرو تین مہینے خیر سے گذر جائیں۔ جب الہ آباد کے اسٹیشن پر گلے ملوگے اور چھاتی سے چھاتی ملے گی۔ اس وقت پوچھیں گے کہ جانِ من (معاف کیجیے بے خودی میں یہ لفظ نکل گیا) قبلۂ من اب کیا ارشاد ہے۔"

۱؎ خطوط سرسیّد، ص۲۳۱ ۔ ۲؎ ایضاً ص۴۸ ۔ ۳؎ ایضاً ص۵۰ ۔

(۱۴) سرسیّد القاب مختصر لکھتے تھے۔ مثلاً جناب عالی، مخدومی، مکرمی، عزیزی، مشفقی۔ لیکن وہ جو کچھ لکھتے تھے رسمی طور پر نہیں بلکہ اس کی اہمیت پوری طرح سمجھتے تھے۔ نواب وقار الملک سے اختلاف رائے ہوا۔ اس لیے کچھ کشیدگی سی ہوگئی ۱۴ راگست ۱۸۹۶ء کو سرسید لکھتے ہیں:۔

"عزیزی و مکرمی

نواب صاحب والا جاہ! ابھی تک میرے دل نے قرار نہیں پکڑا ہے کہ دونوں القابوں میں سے کون سا القاب رہے۔ اس لیے دونوں لکھ دیے ہیں"

جب یہ کشیدگی رفع ہوگئی تو ۳۰ر نومبر ۱۸۹۵ء کو لکھتے ہیں "اب میرا دل تم سے صاف ہوگیا۔ مہدی حسن کے سامنے میں نے تم کو بہت بُرا بھلا کہا اور بخارات نکال لیے اس لیے میں تم کو وہی القاب لکھتا ہوں جو پہلے لکھتا تھا۔ عزیزی و مکرمی! مولوی مشتاق حسین۔۔۔۔۔"

غایتِ محبّت میں اس طرح کے بھی القاب ہیں۔ مثلاً "مکرمی زینو بھیّا" یا نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں:۔

"قبلہ گویم یا خدا یا کعبہ یا پیغمبرش اصطلاح عشق بسیار است و من دیوانہ ام
قبلہ میرے مخدوم میرے محبوب میرے محب میرے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"[1]

تصویر کا دوسرا رُخ

(۱) خطوطِ سرسید کی یہ رنگینیاں بالکل ایسی ہیں جیسے کسی بے آب و گیاہ سرزمین میں کہیں کہیں نخلستان کے ٹکڑے نظر آجائیں۔ پوری کتاب کو پڑھنے کے لیے دل پر جبر کرنا پڑتا ہے ورڈز ورتھ کے مجموعۂ نظم کی طرح کُل سے زیادہ اُس کا انتخاب دلچسپ ہے۔

سرسید کے بعض خطوط میں وہی بے نمکی ہے جو بالعموم ناصح اور واعظ کی گفتگو میں ہوتی ہے سراج الدین احمد بیرسٹر کے نام خطوط نمبر (۲) اور نمبر (۱۶) میں پند و نصیحت کے سوا اور کچھ نہیں

---

[1] خطوطِ سرسید صـ۳۳

ہے منشی احمد جان عنایت اللہ اور نیاز محمد خاں کے نام بعض خطوط بالکل رسمی، اطلاعی اور کاروباری قسم کے ہیں جو خطوط پُر از معلومات ہیں وہ بیش تر خشک اور بے نمک ہیں۔ بعض خطوط بالکل کسی مضمون یا مقالۂ علمی کا اقتباس معلوم ہوتے ہیں۔ میر واحد علی کو لکھتے ہیں :-

"کامن سنس ایک دوسری چیز ہے۔ اس کو اس تقسیم سے کچھ علاقہ نہیں ہے فطرت اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ انسان کی عقل کے لیے بھی ایک حد ہے اور خود عقل ثابت کرتی ہے کہ جو باتیں اس حد سے بالاتر ہیں وہ عقلِ انسانی سے مافوق ہیں بس عقل پر عقلِ انسانی کا اطلاق ہے۔ مگر یہ حد، عقلِ کامل کی ہے۔ بہت سے انسان ایسے ہیں جن کی عقل اِس حد تک نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ انسان کی عقل کے درجات متفاوت ہیں۔ بہ لحاظ ان درجاتِ متفاوتہ کے ہر شخص کی عقل کی نسبت عقل کا اطلاق کیا گیا ہے اور جب کہ اشخاص سے قطع نظر کی جاوے تو عقلِ کلّی کو عقلِ انسانی سے تعبیر کیا ہے۔ والسلام" [1]

اس کے علاوہ خطوطِ سرسیّد میں زبان اور قواعد زبان کی بعض بڑی غلطیاں ملتی ہیں۔ مولانا حالی نے لکھا ہے " وہ قواعد اردو کی پابندی سے فطرتاً آزاد تھے . . . . . . تحریر یا تقریر کی رو میں قواعد کی کچھ پروا نہ کرتے تھے . . . . اور ان غلط لفظوں کو جو عام فہم اور خاص و عام کی زبان پر جاری ہوں صحیح لفظ پر ترجیح دیتے تھے۔" ذیل میں ہم اغلاط کی ایک مختصر فہرست دیتے ہیں:

"میں نے یہاں بڑی غُل مچائی ہے" ص۲۲۰ غل مذکّر ہے مونّث نہیں۔ رشک کا مصرع ہے۔ ع

مے کدے میں غُل مچا آندھی سے چھپّر اُڑ گیا

ابراہیم ذوق فرماتے ہیں ع

بلبل کی تنگ حوصلگی تھی کہ غُل ہوا

"آپ فی الفور ص۵ بھیج دو" ص۳۵ بھیج دیجیے ہونا چاہیے

"دل کو باغ باغ خوش کیا" ص ۴۸

"میں دیکھتا ہوں کہ جوں جوں مخالفوں نے نیکی کا مقابلہ کیا ہے ووں ووں نیکی بڑھتی گئی ہے" ص۶۵

---

[1] خطوطِ سرسیّد، ص۱۶۷

"پانی پت میں جو ذی وجاہت اور معزز مسلمان ہوں ان کے پاس سے ہیں رائے آنی چاہتا ہوں" ص ۱۲۴

"چٹھیات" ص ۱۹۸

"نیبوؤ" ص ۲۰۰

سرسید نے بعض الفاظ ایسے ثقیل نامانوس اور غریب استعمال کیے ہیں جو جُملے کی فصاحت میں خلل انداز ہوتے ہیں۔ عربی اور فارسی کے جو الفاظ ٹھیٹھ اُردو میں کم مستعمل ہیں وہ بھونڈے طریقے سے استعمال ہوئے ہیں۔ اور ان کی غرابت بہ دستور موجود ہے۔ مثلاً محسن الملک کو لکھتے ہیں،

"دو سو رُپے ماہواری خرچ قیام ایں جا نہایت کافی ہے" ص ۳۱

بعض جگہ فارسیت کا ناگوار غلبہ ہے مثلاً

"آپ اس قدر عذرات مغائرانہ در باب اداے نمیت کیوں لکھتے ہیں" ص ۳۶

نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں۔ "ایک امر نہایت ضروری لکھتا ہوں۔ فی الفور بلا تامل سامنے اس کی تعمیل فرمائیے" ص ۶۸

ص ۹۲۔ پر لکھتے ہیں۔ "تعداد اسکالرشپ متعقب بتاؤں گا"

ص ۸۷ پر لکھتے ہیں "اس کو مسئلۂ شرعی ٹھہرانا اور اس کے مرتکبوں کو اکلِ حرام قرار دینا مضر اور اسلام کے پانو پر بہ دستِ خود تیشہ زدن ہے"

بعض جگہ اچھا خاصا اُردو میں خط لکھتے لکھتے فارسی کے جملے کے جملے شامل کر دیتے ہیں۔ نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں:-

"بعد چھاپہ چند نسخے (مواعظِ احمدیہ کے) آپ کے پاس بھیجوں گا تادانم کہ مخدوم چہ می گوید۔ خدایا مخدومم مہدی اگر مرا کافر و مرتد داند باک نیست۔ زیرا کہ ایں معاملہ مرا باتست نہ با مخدوم من مہدی" ۔۔۔۔۔۔۔ ص ۳۴۔

اسی طرح خط نمبر ۸ (صفحہ ۳۷) کو فارسی میں شروع کر کے اُردو میں ختم کرتے ہیں:-

اصل یہ ہی کہ سرسید نثرِ جدید کے پہلے رہنما تھے۔ اس وقت کی پیہم تبدیلیوں اور نئی نئی ضرورتوں کے ہنگامے میں حُسن کاری اور نقش طرازی کا کسے ہوش تھا۔ یہ دَور تو شکست و ریخت کا تھا۔ حالیؔ، آزادؔ اور شبلیؔ نے البتّہ اس زمین کی آب یاری کی اور اس میں چمن کھلائے۔ سرسید کا صرف یہ کارنامہ ہی کہ انھوں نے ظہوریؔ اور بےدلؔ کا طرز غیر مقبول اور ناپسندیدہ بنادیا اور ثابت کردیا کہ مافی الضمیر سادہ نثر میں بھی ادا ہوسکتا ہی۔ سرسید نے جو باتیں اُردو میں پیدا کیں ان کا ذکر خود انھوں نے 'تہذیب الاخلاق' کے ایک مضمون میں کیا ہی۔ لکھتے ہیں :-

"جہاں تک ہم سے ہوسکا ہم نے اُردو زبان کے علم و ادب کی ترقّی میں اپنے اِن ناچیز پرچوں کے ذریعے سے کوشش کی۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ رنگین عبارت سے جو تشبیہات و استعارات خیالی سے بھری ہوتی ہی اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہی اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا پرہیز کیا۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لُطف ہو مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دِل میں ہو وہی دوسرے کے دِل میں پڑے۔ تاکہ دِل سے نکلے اور دِل میں بیٹھے۔"

یہی انداز ان کا خطوط میں ہی۔ پیرایے سے زیادہ مطلب کی فکر ہی اور اسلوب سے زیادہ مضمون کی جستجو ہی۔ اور اس حد تک کہ بعض خطوط بالکل کاروباری اور رسمی سے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے اِنکار نہیں ہوسکتا کہ یہ خطوط سرسید مرحوم کی تمام زندگی اور ان کی عملی جدوجہد کے بھی آئینہ دار ہیں۔ انسان کے اندازِ طبیعت اور اس کے افکار کا صحیح پتا صرف خط و کتابت اور مراسلت ہی سے لگ سکتا ہی۔ یہ مکتوبات ان کی سوانح عُمری کا دِلچسپ اور مفید حصّہ بن سکتے ہیں۔

پنڈت گیا پرشاد شکل سنیہی و ترشول

(از حضرت اقبال ورما سحر ہتگامی مرحوم)

ناظرین کو شاعر کے دو تخلص دیکھ کر کسی قدر حیرت ہوگی، مگر اس کی وجہ ہے۔ شاعر عرصے تک ضلع اناؤ کے اسکولوں میں ماسٹر رہا۔ دل میں قومی اور سیاسی نظمیں لکھنے کا بھی شوق تھا۔ ادبی نظموں کا لکھنا تو برسوں پہلے سے جاری تھا اور اس سلسلے میں وہ اپنے پہلے تخلص کے ذریعے کافی مشہور و معروف ہوچکا تھا۔ پس اس کو اپنا دلی شوق پورا کرنے کے لیے مجبوراً دوسرا تخلص بھی اختیار کرنا پڑا۔ یہ مجبوری دراصل ملازمت کی تھی۔ اس وقت سے وہی روش جاری رہی اور اب سنیہی کے ساتھ ترشول سے بھی لوگ خوب واقف ہو گئے ہیں۔ ایک بات اور۔ ترشول کے تخلص سے نہ صرف مذکورہ بالا اقسام کی ہندی نظمیں لکھی جاتی ہیں بلکہ اکثر اُردو نظمیں بھی، اگرچہ آخرالذکر کے لیے ہندی رسم الخط ہی سے کام لیا جاتا ہے۔

پنڈت جی اُردو کے بھی اچھے شاعر ہیں۔ اگرچہ ہندی رسم الخط کے سبب اُردو کی ادبی دنیا اُن کے نام سے زیادہ تر ناواقف ہے۔ یوں تو زمانۂ حال میں ہندی کے کئی ایسے نامور شعرا ہوگزرے ہیں جو ابتداً اُردو میں لکھتے تھے، مگر پنڈت جی میں یہ خصوصیت ہے کہ ان کی مشقِ سخن دونوں زبانوں میں اب بھی اُسی طرح جاری ہے جیسی پہلے تھی۔ البتہ اُردو میں وہ مسدس لکھتے ہیں جو بہت موثر، پُرزور اور زیادہ تر وقتی ہوتے ہیں اور اپنے موضوع کے اعتبار سے ہر طرح موزوں۔ بندش کی چُستی کے ساتھ روانی اُن کا عام اور قدرتی خاصہ ہے۔ یہاں ہم اُن کے "آئینۂ ہند" نامی مسدس کے دو بند نمونتہً درج کرتے ہیں ؎

خوش بیاں ایسے تھے جادو کا اثر رکھتے تھے کوئی فن باقی نہ تھا علم و ہُنر رکھتے تھے
ہم کسی کا نہ کبھی خوف و خطر رکھتے تھے دلِ بَلا کا تو قیامت کا جگر رکھتے تھے
کوئی شمشیر و قلم میں نہ تھا ثانی اپنا
پانی پانی ہوئے دُشمن وہ تھا پانی اپنا

ایک جاں قوم تھی آپس میں محبت وہ تھی　　　فیض عالم کو پہنچتا تھا سخاوت وہ تھی
دلِ دشمن کو ہلا دیتے تھے قوت وہ تھی　　　موت سے بھی نہیں ہم ڈرتے تھے ہمت وہ تھی
سر پھرا جس کا دکھایا اسے اکثر نیچا
سر کے رکھتے نہ کبھی ہم نے کیا سر نیچا

ایسی ہی نظموں سے متاثر ہوکر بانگرمئو ضلع اوناؤ کے تعلقے دار رائے بہادر چودھری مہندر سنگھ آنریری منصف و مجسٹریٹ کہا کرتے تھے کہ "اردو میں ہمارے سیتھی ہمارے چکبست ہیں۔" موصوف نے ازراہِ قدردانی ۱۹۱۰ء میں ایک بڑا دربار منعقد کرکے پنڈت جی کو ایک طلائی تمغہ بھی نذر کیا تھا۔ اس وقت پنڈت جی وہیں ٹریننگ اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور اپنی شاعرانہ قابلیت کی بدولت چودھری صاحب کے زمرۂ احباب میں داخل ہوگئے تھے۔

پنڈت جی سنسکرت اور بنگلہ سے بھی تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں مگر چوں کہ اردو ہندی سے خاص رغبت ہے، پس آپ زیادہ تر ہندستانی زبان کے قائل ہیں اور جو نظمیں آپ عوام کے لیے لکھتے ہیں انھیں عام فہم بنانے کے خیال سے اسی زبان میں قلم بند کرتے ہیں۔ ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ کان پور میں پنڈت مالوی جی کے ہاتھوں سودیشی بازار کا افتتاح ہوا تھا، اس موقع پر ترشول صاحب نے ایک مسدس پڑھی تھی جس کے اوّل و آخر میں یہ دو بند ہیں ؎

آئے ہیں آج کھولیں گے بازار مالوی　　　دیں گے سبق، سودیشی کے اوتار مالوی
خادم وطن کے، قوم کے غم خوار مالوی　　　سچے سپاہی سورما سردار مالوی
دھن دیش کی وہ چھیڑی ترانہ بدل دیا
وہ مرد ہیں جنھوں نے زمانہ بدل دیا

ایمان "دیش پریم" ہو حق اپنا دھرم ہو　　　غیروں کے ہوں نہ دست نگر کچھ تو شرم ہو
حالت وطن کی دیکھ کے دِل اپنا نرم ہو　　　ایشور کرے سودیشی کا بازار گرم ہو
پھیلا ہر ایک گھر میں سودیشی کا نور ہو
صدقے میں اس کے فخرِ وطن کان پور ہو

آپ کا "مارچ سانگ" (کوچ کا گیت) بھی اس زبان کا ایک دل کش اور ترنم خیز نمونہ ہے۔ اوّل و آخر کے دو بند درج ذیل ہیں:۔

ہندُستان، ہندُستان!
پیارا پران، ہندُستان!
اُس کی آن اپنی آن   اُس کی شان اپنی شان
اُس کا تان اپنا تان   اُس کا گیت اپنا گان
پیاری تان پیارا پران   ہندُستان، ہندُستان!

وہ برباد، ہم برباد   وہ آباد، ہم آباد
وہ آزاد، ہم آزاد   زندہ باد، زندہ باد
ہندُستان، پیارا پران   ہندُستان، ہندُستان!

اِسی سلسلے میں ایک کبت بھی قابلِ ملاحظہ ہے:۔

سچے عاشقوں کے مُقدّر میں سُولی لکھی تم نہ دُکھاؤ دِل اُن کو دُکھانے دو
خم ابرو میں نہ تمھارے کبھی آنے پائے، ستم پہ ستم سنیہی انھیں ڈھانے دو
روکے رہو آہیں یہ اپنی فلک سوز، اگر ستاتا ہے فلک تو ستانے دو
ہارو یا کہ جیتے رہو، آس پر جیتے رہو خونِ دل پیتے رہو، آنسو مت آنے دو

خواہ اِسے عشقیہ سمجھیے یا سیاسی، آپ کو اختیار ہے، مگر ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ سنیہی جی نے اپنے خیالات کو کبت کا جامہ پہنا کر اُن میں ایک عجیب دِل آویزی پیدا کردی ہے۔

یوں تو آپ برسوں سے کان پُور میں مقیم ہیں، مگر وطن قصبہ ہڑہا ضلع اوناؤ ہے۔ جہاں آپ ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد پنڈت اوسیری لال شکل تھے جن کا سنیہی جی کے بچپن ہی میں انتقال ہوگیا تھا پس آپ کی پرورش و پرداخت کا سارا بار آپ کے چچا زاد بھائی پنڈت لال پرشاد شکل پر پڑا۔

جنھوں نے اپنے فرض کو بڑی محبت و فراخ دِلی سے ادا کیا۔ پنڈت جی کی ابتدائی اُردوٗ و ہندی تعلیم قصبے کے پرائمری اسکول میں ہوئی۔ پھر ۱۸۹۷ء میں ٹاؤن اسکول تیروہ ضلع اناؤ سے اُردو مڈل کا امتحان اوّل نمبر میں پاس کیا۔ وہیں آپ کے دِل میں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر پنڈت سَداشِکھ مِشر تھے، جو خود سخن سنج و سخن فہم تھے۔ انھوں نے ہونہار شاعر کے طبعی رجحان کو تاڑ لیا اور اُس کی حوصلہ افزائی کی۔

مڈل پاس کرلینے پر پنڈت کو پھر مناسب ماحول مِلا۔ وہ اپنے گاؤں میں رہ کر فارسی پڑھ رہے تھے کہ اسی اثنا میں لالہ گردھاری لال شری واستو جو فارسی اور ہندی کے شاعر بھی تھے، اپنی ملازمت سے سبک دوش ہوکر گاؤں تشریف لائے۔ ان کی محبت نے سنیہی جی کے سمندِ شوق پر تازیانے کا کام کیا۔ اکتسابِ فن کے ساتھ مشقِ سخن بھی زور پکڑتی گئی۔ نوعمر شاعر نے ہندی عروض کی باقاعدہ تعلیم بھی لالہ صاحب ہی سے حاصل کی۔ یہ سب کام تین برس تک ہوتا رہا۔

سنہ۱۹۰۰ء میں منشی رام سہائے تمنّا مرحوم ڈپٹی انسپکٹر مدارس ضلع اناؤ نے آپ کو ورناکیولر اسکول کی ماسٹری پر مقرر کردیا۔ مرحوم بھی آپ کے بڑے قدرشناس تھے انھی نے سنہ۱۹۰۵ء میں نارمل اسکول لکھنؤ بھیج دیا۔ وہاں سیّد ابراہیم حسین ناظم مدرسِ فارسی تھے جن کی صحبت سے سنیہی جی کو مستفیض ہونے کا موقع مِلا۔ وہی ان کی اُردوٗ نظموں کی اصلاح بھی کرتے تھے۔ اس طرح تعلیم کے ساتھ شعر و شاعری کا مشغلہ بھی برابر جاری رہا، اور نوجوان شاعر کے کلام میں روز بہ روز پختگی آتی گئی۔

سنہ۱۹۰۶ء میں نارمل اسکول کا امتحان پاس کرلینے پر آپ کو صفی پور میں سکنڈ ماسٹری کی جگہ مِلی، اور پھر مختلف مقامات میں رہنے کے بعد سنہ۱۹۰۸ء میں اناؤ آگئے جہاں تمنّا صاحب کے ساتھ ہر وقت کی نشست برخاست ہونے لگی۔ یہ دَور آپ کی اُردوٗ شاعری کے لیے بہت مبارک ثابت ہوا، اور اس میں خاطرخواہ ترقّی و کامیابی ہوتی گئی۔ ایک مفید نتیجہ یہ بھی نکلا کہ جہاں اُردوٗ اور ہندی میں ساتھ ساتھ لکھتے رہنے سے آپ کی زبان نے فی الجملہ ہندُستانی زبان کی صورت اختیار کی، وہاں آپ کی ہندی شاعری بھی اُردوٗ سے متاثر ہوکر کھڑی بولی کا ایک لاجواب نمونہ بن گئی۔ مگر اوّل اوّل یہ بات اس وقت ظاہر ہوئی جب سنہ۱۹۱۳ء میں کان پور سے

شری جت گنیش شنکر ودیارتھی مرحوم کی ادارت میں ہفتہ دار ہندی 'پرتاپ' جاری ہوا اور سنیہی جی نے اپنی کھڑی بولی کی پہلی نظم "کرشک کرندن" (کسان کی فریاد) اس میں چھپنے کے لیے بھیجی۔ قابل اڈیٹر نے نظم کی قرار واقعی داد دیتے ہوئے اُسے اپنے اخبار میں جگہ دی۔ نظم بہت طویل ہے اور کتابی صورت میں بھی چھپ چکی ہے۔ اس میں کئی ابواب و بحور ہیں، نمونہ ملاحظہ ہو ؎

چوری یا چھل کروں یہ میرا کام نہیں ہے — دھندا کوئی کروں گانٹھ میں دام نہیں ہے
جاؤں اب میں کہاں، کہیں وشرام[1] نہیں ہے — جینا دوبھر ہوا، کبھی آرام نہیں ہے
تھی جو معافی ایک سو وہ بھی ضبط ہوتی ہے
سبھی طرح سے عقل ہائے رے خبط ہوتی ہے

کیوں ہوتی یہ دُشا اگر میں کرشک[2] نہ ہوتا — ہوتا میں مزدور جوتتا اور نہ بوتا
سہتا کیوں یوں مار آبرو مفت نہ کھوتا — دن بھر کرتا کام رات میں سکھ سے سوتا
کیوں بکتی یوں ہائے مفت میں لوٹا تھالی؟
کیوں کھاتا یوں بات بات پہ ہر دم گالی؟

جسے دیکھیے ہے وہ آنکھیں دکھاتا — پیادہ بھی ہے شاہ بن بن کے آتا
نہ دو کچھ تو ہے دھمکیاں دے کے جاتا — "ابھی دیکھ اس کا مزہ تو، ہے پاتا"
ہے خالی ہوا ٹینٹ ہی دیتے دیتے
چڑھے بھینٹ ہم بھینٹ ہی دیتے دیتے

زمیں داروں کے پیٹ بھرتے نہیں ہیں — یہ کھاتے ہیں اتنا اپھرتے نہیں ہیں
کسانوں پہ کیا ظلم کرتے نہیں ہیں — اجاگے ہیں ہم ہائے مرتے نہیں ہیں
ضلع دار جی بھر ہمیں لوٹتے ہیں
نہ پٹواریوں سے بھی ہم چھوٹتے ہیں

---

[1] راحت
[2] کاشت کار

اس کے قبل تو سینہی جی اپنی نظمیں زیادہ تر برج بھاشا یعنی پُرانی ہندی میں لکھتے تھے، جو اُسی قسم کے ہندی رسالوں میں شائع بھی ہوا کرتی تھیں۔

'پرتاپ' میں اور بھی وقتی نظمیں چھپیں اور اُنھیں دیکھ کر رفتہ رفتہ پنڈت مہابیر پرشاد دُویدی کی توجہ اُدھر مائل ہوئی جو اُس وقت انڈین پریس الہ آباد کے مشہور ہندی رسالے 'سرسوتی' کے ایڈیٹر تھے اور پُرانی ہندی کو نئی ہندی یا کھڑی بولی میں تبدیل کرنے کے زبردست حامی۔ انھوں نے سینہی جی سے 'سرسوتی' کے لیے بھی نظمیں طلب کیں اور اگست ۱۹۱۴ء میں ان کی پہلی نظم جہیز کی مذمت پر 'سرسوتی' میں شائع ہوکر بہت مقبول ہوئی۔ پھر تو یہ سلسلہ جاری ہوگیا، اور اس کے لیے شاعر کو اڈیٹر صاحب سے معقول معاوضہ بھی ملتا رہا۔ مختصر یہ کہ اس طرح 'پرتاپ' اور 'سرسوتی' کے ذریعے سینہی جی جدید ہندی شعرا کی صف میں آگئے اور آپ کے وہ خیالات تیزی کے ساتھ نظموں کی شکل میں نمایاں ہونے لگے جو ابتدا میں سالہا سال تک ہندی اور اُردو کے مخلوط سانچے میں ڈھالے جا چکے تھے۔ اشاعت کے ساتھ شہرت و عزت میں اضافہ ہوتا گیا، جس نے بالآخر آپ کو اُستادی کی مسند پر بھی لا بٹھایا۔ اب پنڈت انوپ شرما ایم۔ اے۔ ال۔ ٹی۔ اور ہتیشی جی جیسے نامور ہندی شعرا کو آپ سے فخر تلمذ حاصل ہے۔ مگر سچ بات تو یہ ہے کہ پُرانی ہندی کی جس بسیط فضا میں آپ کی نشوونما ہوئی تھی اس کا اثر دِل سے بالکل زائل نہیں ہوگیا۔ چناں چہ آپ اب بھی کبھی کبھی برج بھاشا میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ایک عشقیہ کبت ملاحظہ ہو ؎

سنکت رہیے سے پیا اَنکت سندیسو وارے آنسو موتی آس پوری انکھین کی
نیلم اُدھر لال ہوے کے دمکن لاگے کھینچ گئی مدھو ریکھا مدھر ہنسن کی
شیام گھن[1] سُرت سُرس برسن لاگی آئی ہاتھ تھاتھی سی سینہی پریم پن کی
ماتھ سوں چھواتی ہیراتی لاے لاے چھاتی پاتی آگمن[2] کی بجھاتی آگ من کی

ہجراں نصیب سکھی کو اپنے پیارے کا خط ملتا ہے، جس میں آمد کی خبر درج ہے۔ اُسے پاکر سکھی کی جو حالت ہوتی ہے

---

[1] "شیام گھن" کے لغوی معنی "کالی گھٹا" مگر یہی اُلٹ کر پڑھنے سے گھنشیام ہوجاتا ہے جو کرشن جی کا اصطلاحی نام ہے۔ جن کا گوپیوں سے عشق ہونا مشہور بات ہے۔ اِسی عشق کو لے کر قدیم ہندی شعرا نے خوب خوب طبع آزمائیاں کی ہیں۔ سحر

[2] آمد

اُسے شاعر نے شاعرانہ طرز پر بیان کرتے ہوئے دِل کے مختلف جذبات کا ایک دل کش مرقّع پیش کر دیا ہی، جسے محاکات کا مجسمہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ کہتا ہی کہ "سکھی ڈرتے ہوئے دِل کے ساتھ اپنے پیارے کے تحریری پیغام کو پڑھتی ہی اور اُس پر آنسو کے موتی نچھاور کرتی ہی (کیوں کہ) اُس کی آس پوری ہو جاتی ہی۔ اُس کے نیلے ہونٹ سُرخ ہو کر چمکنے لگتے ہیں اور اُن پر شیریں تبسم کا خوش نما خط کھنچ جاتا ہی۔ گھنشیام کی یاد سُندر رس بن کر برسنے لگتی ہی اور اِی سینہی محبت کی دولت سی ہاتھ لگ جاتی ہی۔ (خط) کو ماتھے سے لگاتی ہوئی پسینہ پسینہ ہو جاتی ہی۔ (گویا اس طرح وہ) خطِ دل کی آگ کو بجھا رہا ہی۔ [آگمن اور آگ مَن میں صنعتِ تجنیسِ تام ہی۔] اضطراب و مسرّت، ادب و محبّت، حیا اور تسکین کا ایک نقشہ سا آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہی۔

سینہی جی نے ۱۹۲۱ء میں تحریکِ ترکِ موالات سے متاثر ہو کر ملازمت سے استعفا دے دیا تھا۔ اُس وقت آپ ٹاؤن اسکول اُناؤ میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ کان پور کے مشہور روزنامہ 'ورتمان' کی ملکیت میں آپ پنڈت رماشنکر اَوستھی کے ساتھ اُسی وقت شریک ہو گئے تھے، جب پنڈت جی نے اخبار مذکور کا اجرا کیا تھا۔ اس کے علاوہ کان پور کے مشہور کانگرسی کارکن سیٹھ پھول چند آپ کے دیرینہ قدر دانوں میں ہیں۔ بہرحال 'ورتمان' کی شرکت اور سیٹھ جی کے پیہم اصرار نے آپ کو ملازمت چھوڑتے ہی کان پور جانے پر مجبور کیا، اور تب سے آپ کا قیام کان پور میں رہتا ہی۔ یہ سکونت اِس قدر مستقل ہو گئی ہی کہ ہم بلا خوفِ تردید آپ کا شمار کان پور ہی کے مشہور ہندی شاعروں میں کر سکتے ہیں۔ وہاں رہتے ہوئے آپ صدہا "کوی سمّیلنوں" (ہندی مشاعروں) کے صدر ہوئے، اور آپ کی اَدبی شہرت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ ۱۹۲۸ء سے آپ "سُوکوی" نامی ہندی ماہ وار رسالہ بھی نکال رہے ہیں۔ جو اسی نام کے پریس سے شائع بھی ہوتا ہی۔ رسالے کا تقریباً کُل حصّہ ہندی نظموں ہی کے لیے وقف ہی اور اس میں بہ قول سینہی جی مبتدی اور منتہی دونوں کے کلام کی گنجایش ہی۔ اس کے علاوہ رسالۂ مذکورہ میں ہندی کے ساتھ اُردو نظمیں بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں، البتّہ اشاعت تو ہندی رسم الخط ہی میں ہوا کرتی ہی۔ آپ نئے شعرا کی نظمیں اشاعت کے قبل درست بھی کر دیتے ہیں اور ان کی حوصلہ افزائی پر ہر طرح آمادہ رہتے ہیں۔ آپ کا اخلاق بہت قابلِ تعریف ہی۔ مزاج اور وضع میں اس قدر سادگی ہی کہ گفتگو کرنے والے کو محسوس نہیں ہوتا کہ وہ ایک ہندی کے بڑے شاعر سے باتیں کر رہا ہی۔

آپ کی ذہانت و طبّاعی کا کیا کہنا۔ نظم لکھنے کے لیے زیادہ وقت یا تیّاری کی ضرورت نہیں۔ بلکہ یوں کہیے کہ تیّاری اور لکھنا، یہ دونوں کام ایک ساتھ ہی ہوتے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہی کہ آپ اپنے رسالے کے مرتّب کرنے کی ذمّے داری

رکھتے ہوئے بھی مُلک کے دیگر رسالوں کو اپنا کلام برابر بھیجتے رہتے ہیں۔ آپ کا رسالہ با اعتبارِ ضخامت بہت بڑا نہیں، پھر بھی چھپنے والی نظموں کی اصلاح کافی وقت لے لیتی ہی۔

اب ہم اخیر میں آپ کے جدید ہندی کلام کا بھی ایک اقتباس ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ بھگت کی ابھلاشا[1] کے عنوان سے لکھتے ہیں ؎

تُو ہی مہاتم[2] تلبیہ[3] تو مَیں ایک بوند سماں ہوں ۔۔۔ تُو ہی منوہر گیت تو مَیں ایک سُندر تان ہوں
تُو ہی سُکھد رت راج تو مَیں ایک چھوٹا پھول ہوں ۔۔۔ تُو ہی اگر دکشن پَوَن تو مَیں کسم کی دھول ہوں
تُو ہی اگر سرویش[4] تو مَیں ایک تیرا داس ہوں ۔۔۔ تجھ کو نہیں مَیں بھولتا ہوں، دُور ہوں یا پاس ہوں
تو جانتا من کی دشا، رکھتا نہ تجھ سے نیچ[5] ہوں ۔۔۔ جو کچھ کہ ہوں تیرا کیا ہوں اُچ[6] ہوں یا نیچ ہوں
اپنا[7] مجھے اپنا سمجھ تپنا نہ اب مجھ کو پڑے ۔۔۔ تج کر تجھے یہ داس جاکر دوار[8] اب کس کے اڑے؟

تجھ میں سما جا اس طرح تن پران کا جو طوَر ہی
جس میں نہ یہ کوئی کہے مَیں اور ہوں تُو اور ہی

شرح :-

پہلا شعر۔ (اے ایشور!) تو سمندر اور مَیں ایک قطرہ ہوں، تو ایک دل کش گیت اور مَیں اس کی ایک سُندر تان ہوں۔
دُوسرا شعر۔ تو سُکھ دینے والا موسموں کا راجا (بسنت) اور مَیں ایک چھوٹا پھول ہوں، تو اگر بادِ جنوب ہی تو مَیں زیرِ گُل۔

دونوں اشعار میں شاعر نے ہمہ اوست کے نظریے کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ایشور سے اپنا تعلق ظاہر کیا ہی اور بڑی شاعرانہ حقیقت و لطافت کے ساتھ۔ ہر مصرع میں تشبیہ کی غرض سے دو ایسی چیزیں لی گئی ہیں جو خدا اور رُوح کے لحاظ سے بڑی اور چھوٹی ہوکر بھی ایک دُوسرے سے وابستہ ہیں اور ساتھ ہی اسی لحاظ سے اپنا اپنا جلال یا جمال بھی رکھتی ہیں ــــــــ آخری شعر کو تو ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

کا ترجمہ ہی کہنا چاہیے جو بڑی صفائی اور سادگی سے کیا گیا ہی۔

---

(۱) خواہش۔ (۲) سمندر۔ (۳) سا۔ (۴) سب کا مالک۔ (۵) علاحدگی (۶) اونچا۔ (۷) اپنا بنالے۔ (۸) دروازہ۔

ہمارے گانو کی مثلیں

(از جناب چودھری رحم علی الہاشمی صاحب)

۱۰۱

اسلامی اور ہندی تمدن کے ہندستان میں اختلاط پر بعض عالمانہ مقالات و تصنیفات شائع ہوچکی ہیں، لیکن اس بحث پر ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے خاص کر ملک کے اندرونی حصوں اور دور افتادہ دیہاتوں میں اسلامی تمدن کے اثرات جو آج پائے جاتے ہیں اُن پر اس وقت تک بہت کم لکھا گیا ہے۔ شہریوں کے رہن سہن بول چال اور طرزِ معاشرت پر اسلامی تمدن کے جو اثرات پڑے اور ذات پات کی بندھنوں کو ان اثرات سے جو جھٹکا لگا وہ متعصب لوگوں کی تمام تر کوشش مغائرت کے باوجود دُنیا کے پیشِ نظر ہے۔ لیکن وہ مقامات جہاں آج ڈیڑھ سو سال کی انگریزی حکومت کے باوجود مغربی تمدن کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں پایا جاتا اور جو موجودہ دورِ ترقی کی رسل و رسائل کی سہولتوں اور آسایشوں سے بھی بہت دور بستے ہیں اُن کے حالات گم نامی سے نکال کر منظرِ عام پر لائے جائیں تو ظاہر ہوگا کہ اسلامی تمدن کے اثرات کتنے دور رس عمیق اور دیرپا ہیں۔ دوسری طرف خود مسلمان بھی ہندی تمدن اور رسم و رواج سے بہت متاثر ہوئے ہیں جن کا ذکر بہت ہوچکا ہے۔

اس سلسلے میں آج میں ایک ایسے گانو کے کچھ حالات بیان کرتا ہوں جس سے میرا قریبی تعلق ہے۔ یہ گانو جس کا نام تھلوارہ ہے ضلع بارہ بنکی کی تحصیل حیدرگڑھ میں ضلع کے صدر مقام سے ۲۴ میل اور لکھنؤ سے ۴۰ میل کے فاصلے پر دریائے گومتی کے قریب واقع ہے۔ سب سے قریب ریلوے اسٹیشن یہاں کا دریاباد ہے جو اس موضع سے ۱۸ میل کے فاصلے پر ہے۔ کچھ دن ہوے ای۔ آئی۔ آر کی ایک شاخ لکھنؤ سلطان پور ریلوے نکالی گئی تھی جو حیدرگڑھ ہوتی ہوئی گئی تھی اور اس سے کچھ دنوں تک یہاں کے لوگوں کو ریل سے نسبتہً کچھ قُرب حاصل ہوگیا تھا لیکن موجودہ جنگ میں اس کی پٹریاں اُکھاڑلی گئیں اور اب تھلوارہ تمدنی آسایش کی اُس منزل سے پھر اُتنا ہی دور ہوگیا جتنا پہلے تھا۔

قبل ازیں کہ اس دوُر افتادہ علاقے میں اسلامی تمدّن کے نفوذ کا حال بیان کیا جائے مختصر تاریخی پس منظر پیش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس نفوذ کے اسباب بہ آسانی سمجھ میں آجائیں۔ یہ موضع چودھریانِ سلیحہ کی تعلقےداری میں واقع ہے جن کے اجداد سیّد سالار مسعود غازی رحمۃ اللہ علیہ کے قرابت دار تھے اور ان کے ساتھ ہندستان آئے تھے۔ اُس وقت اس علاقے میں بھر قوم کی حکومت تھی جنھیں مسخّر کرکے انھوں نے یہاں اسلامی حکومت قائم کی اور قصبہ سلیمان پور آباد کرکے اُسے اپنا صدر مقام بنایا۔ غدر ۵۷ء سے کچھ پہلے اس خاندان کے مورثِ اعلا چودھری حسین بخش چار بھائی تھے جن میں سب سے چھوٹے چودھری اعظم علی (راقم الحرُوف کے دادا) جو انتظامی امور میں سب سے زیادہ ہوشیار تھے تعلقے کے منتظم تھے مگر بعض خاندانی مناقشات کی بنا پر یہ تعلقے کے انتظام سے دست بردار ہوگئے اور تھلوارہ میں آکر مقیم ہوگئے۔ یہاں ٹھاکروں کا غلبہ تھا جنھیں موصوُف نے اپنی شجاعت اور حُسنِ تدبیر سے مسخّر کرلیا اور ایک مزرعہ اپنے چھوٹے لڑکے (راقم الحروف کے والدِ ماجد) کے نام پر پوُرہ چودھری ناظر علی آباد کیا جس میں یوسف زئی پٹھان اور بعض دیگر مسلمان اور ہندو قوم کے لوگ بستے ہیں۔ چودھری اعظم علی کی اولاد اب بھی تھلوارہ میں آباد ہے اور بہ حیثیت گزارے دار ماتحت دار کے کچھ اراضی پر قابض ہے۔

چودھری اعظم علی صاحب جب تعلقے کے انتظام سے دست بردار ہوکر تھلوارہ میں مقیم ہوئے تو ان کو شروع شروع میں بڑی مشکلات سے سابقہ پڑا اور قرب و جوار کے ٹھاکروں سے جن کا اس جوار میں غلبہ تھا آئے دن ہنگامہ آرائیاں ہوتی رہیں جن کی وجہ سے چودھری صاحب موصوف کو چالیس مسلّح جوانوں کا ایک دستہ ہمہ وقت اپنے ساتھ رکھنا پڑا۔ لیکن رفتہ رفتہ انھوں نے اپنی شجاعت۔ سخاوت اور حُسنِ تدبیر سے تمام مشکلات پر قابو حاصل کرلیا اور اس خطّے کے باشندوں کو اس طرح مسخّر کرلیا کہ یہ جوار کے ٹھاکروں کی رعایا کو ان الفاظ میں طعنے دینے لگے:۔

"تمرے گانو کے ٹھاکر تماکو مَل مَل کھائیں، تھلوارہ کے چودھری ڈھولن پان چبائیں"
(تمہارے — تمباکو — ڈھولیوں)

اس سیاسی تسلط کا نتیجہ قدرتی طور پر تمدّنی ماحول پر بھی پڑا اور چودھری اعظم علی صاحب چوں کہ تھلوارہ میں مستقل سکونت کے خیال سے آئے تھے اس لیے جنگی فتوحات کی تکمیل کے بعد انھوں نے باشندوں سے برادرا

تعلقات بڑھانے شروع کیے، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج تمام سیاسی اور فرقے وار مناقشات کے باوجود جو تقریباً سارے ہندستان پر مسلط ہیں، اس چھوٹے سے خطّے کے ہندو مسلمان ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہیں اور چودھری اعظم علی کی اولاد سے آج بھی منھ بولی رشتے داریاں ہندو آبادی کے ساتھ قائم ہیں۔

سب سے پہلے اس سلسلے میں چند ایسے الفاظ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اس خطّے کے باشندوں میں رائج ہیں اور ان کے روزمرہ میں شامل ہیں۔ ان سے عربی فارسی زبان اور اسلامی تمدن کا اثر صاف نمایاں ہے:۔

الفاظ	معنی	قیاسی ماخذ
باٹ پری	ذلت کی بات ہوئی	باط ۔ تحقیر کی
مُرہا	شریر	مُرَحَ ۔ حد سے تجاوز کیا
مکر	فریب	مکر
رب	رب	رب
باگ	باغ	باغ
مرجات	حیثیت ۔ زمینداری	مزجاۃ ۔ حیثیت
مسال	مشعل	مشعل
مہرارو	عورت	ماہ رو ۔ مہررو
گریب	غریب	غریب
برکت	برکت	برکت
جورے	بیوی	زوج
جات	فرقہ	ذات (ہندی جاتی)
نورج	اللہ نہ کرے	نعوذ باللہ
پھجیت	ذلیل کرنا	فضیحت
بستر	کپڑا ۔ پوشش	ستر

الفاظ	معنی	قیاسی ماخذ
کُدرت	قدرت	قدرت
کسائی	قصائی	قصائی
ہُسیار	ہُشیار	ہُشیار
کریم	مہربان	کریم

یہ چند الفاظ میں نے یونہی سرسری طور پر لے کر لکھ دیے ہیں، لیکن اگر زرا تحقیق اور کوشش کی جائے تو ایسے بہت سے الفاظ ملیں گے جو اس خطّے کے لوگ روزمرہ استعمال کرتے ہیں اور وہ فارسی یا عربی سے ماخوذ ہیں یا اسلامی تمدّن سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔ چوں کہ یہاں کی تمام زبان تقریباً وہی ہے جو اودھ کے دیگر اضلاع کے دیہاتوں میں بھی بولی جاتی ہے اس لیے اس مضمون میں جو ایک خاص خطّے کے زبان و تمدّن سے متعلق ہے، زیادہ تفصیل سے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اب میں چند مثلیں پیش کرتا ہوں جو اس خطّے میں عموماً رائج ہیں، اور جن میں سے بعض تو جزواً فارسی ہی میں ہیں؀ ان مثلوں سے اُس ذہانت اور روشنی کا بھی اندازہ ہوسکے گا جو اس خطّے میں اسلامی تمدّن ہی کی رہینِ منّت ہیں:۔

۱۔ ادھ جل گگری (گھڑا) چھلکت جائے

یعنی جو برتن پورا نہ بھرا ہوگا وہ چھلکتا جائے گا۔ مطلب یہ کہ ادھورا علم یا نیم دولتی چھچھورا بنا دیتی ہے۔

۲۔ ایسک (عشق) نہ جانے جات (ذات) کوجات (بے ذات) بھوکھ نہ جانے جھوٹا بھات (چاول)

نیند نہ جانے ٹوٹی کھاٹ (چارپائی) پیاس نہ جانے دھوبی گھاٹ (میلی جگہ کا پانی)

یعنی عشق ذات پات کی قید کا پابند نہیں۔ بھوکھ اچھے برے کھانے میں امتیاز نہیں کرتی۔ نیند ٹوٹی چارپائی پر بھی آجاتی ہے اور پیاس لگی ہو تو میلی جگہ کا پانی بھی پی لیا جاتا ہے۔

؀ ان مثلوں کے جمع کرنے میں حکیم چودھری افضل علی صاحب (برادرِ راقم الحروف) نے جو کوشش کی وہ مستحقِ تشکّر ہے۔

۳۔ اہیر کے ساتھ گڈریہ یاتا بھیڑی کھائیں سیار
(چرواہا — متوالا — گیدڑ)

یعنی گوالے کے ساتھ چرواہا بھی بدمستیوں میں لگ گیا تو اس کے گلّے کی بھیڑیں گیدڑ کھا جائیں گے۔

۴۔ آم کے آم گٹھلی کے دام۔ یہ مثل عام ہے لیکن اس کی ساخت ہندی سے بالکل نہیں ملتی۔

۵۔ ایک داڑھی کوا لوکاون ایک داڑھی بھبھو ایک داڑھی کھلک بھچبت ایک داڑھی ٹھڈھو۔
(خلق — وضعیت)

داڑھیوں کی چار قسمیں یعنی بے انداز لمبی جس میں کوّا چھپ جائے، بے انداز گھنی، منتشر اور بے ڈول اور چھدّی۔

۶۔ ایک تو بونی بندریا دوجے کان اترے۔
(دوسرے — کٹے)

یعنی بدصورتی کی حد ہوگئی۔

۷۔ ایک تو کڑوا کریلا دوجے چڑھا نیم
(دوسرے)

یہ مثل عام ہے مگر اس کے مقدم و موخر سے مماثلت دکھانے کے لیے اسے درج کیا گیا۔

۸۔ ایک تو باگھ دوجے بندوک باندھے۔
(شیر۔ دوسرے — بندوق)

یعنی ایک تو آدمی طاقت ور اور پھر مسلح۔ اس کا مقابلہ کون کرے۔

۹۔ بوے کہوں کان منّائے کاٹے کہوں گوڑ کھجوائے
(کہیں — منمنائے — کہیں پیر کھجلائے)

یہ مچھر کے متعلق مثل ہے کہ کہیں بھی وہ بوے مگر معلوم ہوگا کہ کان میں منمنا رہا ہے اور کہیں بھی کاٹے پیر میں کھجلی معلوم ہوگی۔

۱۰۔ بھوکے بیر اگھانے گنّا۔
(بعد غذا)

یعنی بیر بھوک کے وقت کھانے چاہییں اور گنّا غذا کے بعد۔

۱۱۔ بھوجن کو بھوجن اَپاسے بھلا
(غذا — ناقص — فاقہ)

سنگت کو سنگت اکیلے بھلا
(صحبت — بری)

بستر کو نستر سے ننگے بھلا
(بچھونا — خراب)

یعنی ناقص غذا کھانے سے فاقہ کرنا بہتر ہی، بُری صحبت میں بیٹھنے سے اکیلا رہنا بہتر ہی، خراب کپڑا پہننے سے ننگا رہنا بہتر ہی۔

۱۲۔ باپت پوت پراپت گھوڑا بہت نہیں تو تھوڑے تھوڑا
باپ سے لڑکا ماں سے

۱۳۔ بوڑھی بلّی مکّر کریں نیچے کے دیدے اوُپر کریں
آنکھیں

یعنی بڑھاپے کے نخرے اور صورت بگاڑ دیتے ہیں۔

۱۴۔ بابا کی بھینسی بھتیجے کا توند۔ یعنی عزیز کی جایداد پر پھُولنا۔

۱۵۔ پاپ بڑیڑی چڑھ پکارت۔ یعنی گناہ کی بات مشتہر ہوکر رہتی ہی۔
چھت پکارے گا

۱۶۔ پانڈے جی پچھتائیں گے۔ پھر چنے کی روٹی کھائیں گے۔ یعنی چار ناچار یہ کام کرنا ہی پڑے گا۔

۱۷۔ پر کا گھوڑا بھوبیلے ٹھاڑھ۔
کل کھڑا

۱۸۔ پڑھیں پھارسی بیچیں تیل یہ دیکھو کدرت کے کھیل۔
فارسی قدرت کرشمے

۱۹۔ تپے مرگسرا بلکیں چار بن بالک اور پونچھ اوچھار
تڑپیں جنگل بچّہ مور بھینس

شروع برسات کے نچھتر مرگسرا میں جو شدید گرمی ہوتی ہی اُس میں جنگل، بچّہ، مور اور بھینس کو سب سے زیادہ تکلیف ہوتی ہی۔

۲۰۔ تن پہ نہیں لتّا پان کھائیں البتّا۔ یعنی مفلسی میں شوقینی اور بھی نازیب ہی۔
کپڑا البتّہ

۲۱۔ تیرہ کاتک تین اساڑھ۔ ان دِنوں میں ہل نہ چلانا چاہیے۔

۲۲۔ تناتنی، بگدا بگدی، دگا دگی۔ لڑائی کے تین درجے یعنی چشمک، تند گفتگو اور پھر دست و گریباں ہوجانا۔
سخت کلامی مارپیٹ

۲۳۔ جیکے متر بھانٹ بھکاری دِہکی بات گوسیاں پاری یعنی جو ذلیل لوگوں سے دوستی کرے گا وہ خود
جس کے دوست اُسے خدا ہی نے ذلیل کردیا
بھی ذلیل ہوجائے گا۔

۲۴- جب بھوئیں لوٹ چلے پُروائی تب جانو برکھا رُت آئی ۔
زمین گیر　برشگال موسم
یعنی جب زمین سے لپٹتی ہوئی پُروا ہَوا چلنے لگے تو سمجھو کہ برسات کا موسم آگیا۔

۲۵- جوَن گلی گئے دھان دھنا دہی گل گئے ماس چنا
جس　ماہ　ماش
یعنی جس طرح دھان کی فصل تباہ ہوئی اسی طرح ماش اور چنے کی فصل بھی گئی ۔یعنی مصیبت تنہا نہیں آتی ۔

۲۶- جیسی لوکی ویسے کدوا ہردو برادر الٹی کا پلوا ۔
بے ڈھنگے
اس مثل میں ہردو برادر کے خالص فارسی الفاظ قابلِ ملاحظہ ہیں اور یہ تھلوارہ کے قرب و جوار میں عام طور سے بولی جاتی ہے۔

۲۷- جہاں چار کسائی ہواں کہاں کبیر ساہی ۔ سنگ دِلوں کے مجمع میں نیکی کی بات نہیں سُنی جاتی ۔
قصائی　وہاں　شاہی

۲۸- جو گرجا سو برسا نہیں ۔ لفظی تغیر کے ساتھ یہ مثل عام ہے۔

۲۹- جیٹکا نکھت سوکھ گا اوسر　دودھ بھات مان پڑگا موسر
خشک ہوا پچھتر　گیا کھیت　چاول میں پڑگیا کیڑا
یعنی بارش کے موسم میں پانی نہیں برسا جس سے کھیتی خشک ہوگئی اور گھر میں جو کھانا رکھا تھا وہ بھی خراب ہوگیا۔

۳۰- چمڑی جائے دمڑی نہ جائے ۔ یعنی کھال کھنچ جائے مگر پیسہ پاس سے نہ جائے ۔
کھال　پیسہ

۳۱- چرواہن مان چھونکوا　ہرواہن مان موٹکوا
یعنی مویشی چرانے کے کام پر ہلکا پھلکا آدمی ہونا چاہیے اور ہَل چلانے کے لیے موٹا تازہ ۔

۳۲- چور سے کہیں چوری کر ساہ سے کہیں ہُسیار۔ تبدیلِ الفاظ کے ساتھ یہ مثل عام ہے۔
شاہ　ہشیار

۳۳- دن کا بدر رات نبدّر پروتیا چلے لِبّر لِبّر یا ہے جھورا کی نسانی ۔
بدلی　صاف　پروا　تیز تیز　خشک سالی
یعنی جب دن کو بدلی رہے اور رات کو مطلع صاف رہے اور پُروا ہَوا تیز تیز چلتی رہے تو یہ خشک سالی کی علامت ہے۔

۳۴- ڈھول کے بھیتر پول ۔ تقریباً انھی الفاظ کے ساتھ یہ مثل عام ہے ۔صرف درمیانی لفظ مقامی بولی کے لحاظ سے بدلتا ہے۔
اندر

۳۵- ڈھول پر ڈھول چھوٹی روٹی کی کانکڑاا تھونہ ٹوٹی۔ یعنی بجاتے بجاتے یکے بعد دیگرے کئی ڈھولکیں

پھٹ گئیں مگر کھانے کو ایک لقمہ نہ ملا۔

۳۶۔ ڈیڑھ بکائن میاں باگ تلے۔ یعنی بکائن کے ڈیڑھ درخت کے پاس بیٹھ کر میاں اُسے باغ کہیں۔
باغ

۳۷۔ رسری جل گئی اینٹھن نہ گئی۔ یعنی ساری گتّیں بن جانے پر بھی تکبّر نہ گیا۔ تبدیلِ الفاظ کے ساتھ
رسّی
یہ مثل عام ہے۔

۳۸۔ سات پانچ کی لاٹھی ایک جنے کا بوجھ۔ یعنی ہر آدمی ایک لکڑی لے لے تو چھڑی کا کام دے گی
آدمی
لیکن کئی آدمیوں کی چھڑیاں یک جا کردی جائیں تو ایک آدمی کا بوجھ ہوجائے گا۔ مقصد یہ کہ ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانے سے کام ہلکا ہوجاتا ہے۔

۳۹۔ سنگت ہی سے گن آوے اور سنگت ہی سے جائے۔ بانس پھانس مصری ایک بھاؤ بکائے
صحبت　ہنر
یعنی صحبت ہی سے ہُنر آتا ہے اور صحبت ہی سے بےہُنری۔ بانس کی تیلیاں جن پر مصری چڑھی ہوتی ہے مصری ہی کے بھاؤ بکتی ہیں۔

سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

صحبتِ صالح ترا صالح کند　　　صحبتِ طالع ترا طالع کند

۴۰۔ سوپ بولے تو بولے چھلنی کا بولے، جی میں بہتّر چھید
لیا　جس میں　سوراخ

۴۱۔ سوت نہ کپاس کوری سے لٹھم لٹھا۔ یعنی بےبات کی جھک جھک۔
دھاگا　روئی　پارچہ باف　جھگڑا تکرار

۴۲۔ سوکھونا سوکھے جائے کوّا رٹے جائے۔

یعنی کوّا چیختا ہی رہتا ہے اور جو چیز دھوپ میں رکھی جائے وہ سوکھتی رہتی ہے۔

۴۳۔ سنور کی ٹوٹی جوے کاتک کا ٹوٹا بیل کبھی نہ پنپے۔ یعنی زچگی کے دنوں میں جو عورت کم زور
کم زور　عورت　قوت پائے
ہوجائے اور کاتک کے مہینے میں جو بیل کم زور ہوجائے وہ کبھی تن درست و طاقت ور نہ ہوسکیں گے۔

۴۴۔ سیر سیر گھی بلثی کھائیں لڑے بیر تلائے جائیں۔ یعنی ملثی کھانا تو خوب مرغن کھائیں مگر جب
لڑنے کے وقت　رفع حاجت

لڑائی کا موقع آئے تو بہانہ کرکے کترا جائیں۔

۴۵۔ ستر کھیل بساون کھیلے جن کا سکھاویں چندا۔ یعنی سیکھے سکھائے ہوئے لوگوں کو نو آموز کیا سکھائے گا۔

۴۶۔ سر چڑھی ڈومنی گاوے تال بے تال

۴۷۔ سونا جانے کَسے مَنُس جانے بسے۔ یعنی سونے کا عیب دُہنر کسوٹی پر معلوم ہوتا ہے اور آدمی کا عیب د ہُنر ساتھ رہنے سہنے سے۔

۴۸۔ کھری بات کہیں ساؤلا کھان سب کے من سے اُترے رہیں۔
سعداللہ خاں

۴۹۔ کریا بانبھن گوریا سود کنجا ترک بھورا رجپوت۔ یعنی یہ لوگ قابلِ اعتماد نہیں ہوتے۔
کالا برہمن گورا مسلمان

۵۰۔ کہاں راجا راؤ کہاں گجوا باری۔ یعنی دونوں کی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

۵۱۔ کھاؤں گا گھی سے نہیں جاؤں گا جی سے۔ یعنی چاہے جان جائے یا رہے مرغن کھائے بغیر نہ رہوں گا۔

۵۲۔ کوئی جائے مڑک مڑک بندہ جائے بے دھڑک۔ بندے کا لفظ اس مثل میں قابلِ غور ہے جو خالص فارسی لفظ ہے۔

۵۳۔ لمبا گھونگھٹ چاپلے پاؤ گھونگھٹ بھیتر بڑا اُپاؤ۔ یعنی شرم و حیا کی نمائش ہی مکر و فریب کا پتا دیتی ہے۔
دبیتے اندر فریب

۵۴۔ کرکھا چھوڑ تماشے جائے ناہک چوٹ جلاہا کھائے
ناحق

۵۵۔ گا وہ تال جی ماں پڑ گئی کائی گا وہ کنواں جی پر لاگ اتھائی
گیا جس میں جس پر لگی
گئی وہ بہور جو پر گھر جائی گئی وہ جائی جو دانت بائی
بیٹی پرائے لڑکی نکالے

یعنی یہ چیزیں بے کار ہوگئیں۔

۵۶۔ لڑکوری کا لڑکا نہ پکڑے اور ہر دلہے کا ہل۔ یعنی ان باتوں سے لڑائی ہو جائے گی۔
لڑکے والی

۵۷۔ منڈھا مرد دورکتی جوئے وی گھر برکت کبھو نہ ہوئے
مدھم
یعنی جس گھر میں مرد کی طبیعت مدھم ہو اور عورت بدکلام ہو اُس میں کبھی برکت نہ ہوگی۔

۵۸۔ گھما کے برسے ماتا کے پرسے

یعنی گھما چھتر برستا ہے تو خوب کھل کر برستا ہے اور ماں کھانا دیتی ہے تو جی کھول کر دیتی ہے۔

۵۹۔ ماگھ پوس کی بادری اور کنوارا گھام جو سہے یہ دونوں وہ کرے پرایا کام
بدلی — کنوار کی دھوپ — دوسرے کا

یعنی دوسرے کی ملازمت کرنے کے لیے گرم وسرد برداشت کرنے کی قوت ہونی چاہیے۔ ماگھ پوس کی بدلی اور کنوار کی دھوپ بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔

٦٠۔ نربے گاؤں اونٹ آوا لوگ کہن پرمیسر آوا
دور افتادہ — آیا — لوگوں نے کہا — پرمیشور آیا

٦١۔ نیرے کی جوے سب کی سرہج۔ یعنی کم زور آدمی کی عورت سے سبھی مذاق کرتے ہیں۔

٦٢۔ نئی نادن بانس کا نہنا۔ یعنی نوآموز کاری گر کے اوزار بھی بےڈول اور کند ہوتے ہیں۔
ناخون گیر

٦٣۔ پتہ کھڑکا بندہ سڑکا۔ یعنی خطرے کا ذرا بھی اشارہ ملنے پر میں بھاگ جاؤں گا۔
کھسکا

٦٤۔ ہاتھی گھوڑا پالکی جے کنھیا لال کی۔

بارات کی دھوم دھام کے موقع پر بولتے ہیں۔ تین چیزیں اس میں خاص کر قابلِ غور ہیں۔ ایک تو قافیے و ردیف کا اہتمام بالکل فارسی طرز کا ادب دوسرے "پالکی" جو مسلمانوں کے تمدن کی خصوصیت ہے، تیسرے پھر اس کے ساتھ کنھیالال کی جے، یعنی ہندومسلم تمدنی امتزاج کی جے۔

بہت سی مثلیں جو اس علاقے کے علاوہ اور جگہ بھی بولی جاتی ہیں اور اُردو زبان کے محاوروں میں داخل ہوگئی ہیں وہ میں نے اس سلسلے میں درج نہیں کی ہیں مثلاً سونے پر سہاگہ۔ ہاتھ کنگن کو آرسی۔ ناچ نہ آئے آنگن ٹیڑھا۔ ہونہار بروا کے چکنے پات۔ سر مُنڈاتے اولے پڑے وغیرہ بہت سی مثلیں جو خالص مقامی حیثیت کی ہیں وہ بھی نظرانداز کردی گئیں اس لیے کہ ان سے متعلق کچھ مقامی واقعات بھی ہیں جن کی تفصیل بہت طویل ہوجاتی۔ تاہم جتنی مثالیں اوپر دی گئی ہیں اُن سے بہ خوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ زبان اورخیالات میں یہاں کے لوگ کس حد تک اسلامی تمدن سے متاثر ہوئے لیکن یہ اثر محض زبان اور خیالات تک محدود نہیں ہے بلکہ اس نے رہن سہن اور رسم و رواج میں

بھی نفوذ کیا ہی۔ مثلاً شادی کے بلاوے کے ساتھ دو عدد پان اور دو پیسے زمیں دار کو بھیجنا اور شادی پر بکرا اور دو رُپے کی نذر دینا، جس کے عوض میں زمیں دار انھیں انعام اکرام سے خوش کرتا ہی اور رسمی ضروریات و اخراجات میں مدد بھی دیتا ہی۔

بعض رسموں نے مسلمانوں کی معاشرت سے مخلوط ہوکر بہت ہی مذموم صورت بھی اختیار کرلی ہی جس کی اصلاح مسلمان زمیں دار اپنی مذہبی رواداری کے اصول کے پیشِ نظر نہیں کرسکے اور ہندو اصلاحی تحریکات کا چرچا زیادہ تر ایسے ہی شہروں تک محدود ہی جو کسی حکومتِ صوبہ کے صدر مقام ہیں۔ ان کا دُور افتادہ دیہاتوں تک پہنچنا کہاں خیال میں آسکتا ہی۔ ایک اہم رواج جو فوری توجّہ کا محتاج ہی وہ یہ ہی کہ ہندوؤں میں عقدِ بیوگان ممنوع ہی لیکن مسلمانوں کی دیکھا دیکھی اس کی یہ شکل پیدا کی گئی ہی کہ بیوہ عورت بلا عقد کے کسی مرد کے ساتھ رہنے سہنے لگے اور اس ارتباط سے جو اولاد پیدا ہو وہ مثل جائز اولاد کے متصور ہوتی ہی۔ عقدِ بیوگان کے متعلق ہندو مذہبی رواج میں جو قانونی ترمیم ہوئی ہی اس سے دُور افتادہ مواضع کے باشندوں کو روشناس کرنے کی ضرورت ہی۔

تیرھویں صدی کا اُردو ادب

(قسط سوم)

(جناب عقیل احمد صاحب جعفری، خیر آبادی)

[ریاض الاخبار گورکھ پور کے نکاہی ضمیمے ”فتنہ“ کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہندستان کے اس دوَر کی یادگار تھا جب ہمارا ہر اختلاف ”نزاعِ لفظی“ کے حدود میں تھا۔

”فتنہ“ بہ الفاظِ دیگر حضرتِ ریاض کی سیرت کا ایک آئینہ تھا۔ وہ ایک رند کی طرح باہمہ و بے ہمہ تھا۔ اس کا دِل سب سے صاف تھا اس کو محبت سب سے تھی مگر وہ منھ پر آئی ہوئی بات کہے بغیر نہیں رہتا تھا۔ دکھتی ہوئی رگ پکڑے بغیر نہیں چھوڑتا تھا۔

وہ سرسید، حالی وغیرہ کی دِل سے قدر کرتا تھا مگر ان کی لغزشوں پر ٹوکنا بھی اپنا فرض سمجھتا تھا اس کی پالیسی صلح کُل تھی مگر مذہب، سیاسیات اور ادَب میں بے راہ روی اس کی برداشت سے باہر تھی وہ ایک نقّاد تھا ادَب کا بھی اور صاحبانِ ادَب کا بھی۔

وہ ہنس ہنس کے رُلانے اور رُلا رُلا کے ہنسانے کے کمال میں اپنا ثانی آپ تھا۔

پُرانے زمانے کا ہندو، مذہب کے قواعد چھوت چھات وغیرہ کا تو سختی کے ساتھ پابند تھا لیکن اس کے دِل میں غیر مذہب والوں کی طرف سے کوئی حقیقی بغض نہیں تھا بالکل یہی ذہنیت ”فتنہ“ کی بھی تھی وہ لالہ شاہی اُردو اور مولویانہ اُردو دونوں کا یکساں مضحکہ اُڑاتا تھا۔ ”فتنہ“ کے اوراق ہمیں اس مرقّع کی سیر کراتے ہیں جب ہندو مسلمان مصلحتًا نہیں قلبًا متحد تھے اور جب اُردو کسی سیاسی بِنا پر نہیں بلکہ قدرتًا ان کی اپنی زبان تھی۔

ہم ”فتنہ“ کی ان خصوصیات کے بعض نمونے متفرّق عنوانوں کے ماتحت ایک سلسلے سے پیش کرتے ہیں تاکہ آپ ہمارے اخذ و اقتباس اور تنقید سے الگ ہوکر اپنے طور پر یہ تصویریں دیکھ سکیں۔

”فتنہ“ کے ان ہلکے پُھلکے منتخب مضامین کو من وعن شائع کردینے کا ایک فائدہ یہ بھی ہو کہ اس سے اس زمانے کا اندازِ تحریر نظر کے سامنے آجائے گا۔]

الف - نزاعِ لفظی

پہلے زبان و ادب اور لغت سے متعلق کچھ ٹکڑے پیش کیے جاتے ہیں :-

۱ - دہنِ عندلیب

جناب ضیا دہلوی کو حضرتِ جلیل جانشینِ جناب امیر مینائی مرحوم کے اس مصرع پر ؎

کچھ پھول جھڑگئے دہنِ عندلیب سے

اعتراض ہی - ہم کو انھوں نے لکھا تھا مگر ہم نے یہ کہہ کر قصہ ختم کردیا کہ جناب جلیل نے کچھ سمجھ کر کہا ہوگا۔ اب 'اودھ پنچ' میں وہی نوٹ شائع ہوا ہی اس لیے ہم کو اپنے دوست کو سمجھانا پڑا -

ان کا خیال ہی کہ طائروں کے لیے منقار موزوں ہی مگر اس کا کوئی سبب نہیں لکھا کہ بچارے طیور نے کیا قصور کیا ہی تلاش سے فارسی اور اُردو میں ایسے اشعار مل سکیں گے مگر ہم کو اتنی فرصت نہیں ہی کہ دیوان اُٹھیں اس لیے ہم اپنے دوست کی تسلی کے لیے حضرتِ سودا مرحوم کا ایک شعر لکھے دیتے ہیں جس سے طوطی کا دہن ثابت ہوتا ہی پھر اگر جنابِ جلیل نے بلبل کا دہن فرمایا تو کیا قباحت لازم آئی۔

مرزا سودا ؎ نہیں ہی بحث کا طوطی ترا دہن مجھ سے
سخن تو دیکھ، ہی رنگیں ترا چمن مجھ سے

اگر یہ بھی نہ ہوتا جب بھی اعتراض بے جا تھا۔

(۲)

جناب ضیا دہلوی کو ہمارے یہاں سے تسکین نہیں ہوئی انھوں نے 'اودھ پنچ' میں مکرر لکھا ہی۔ اب بحث دوسرا رنگ بدل رہی ہی اس لیے ہم اس کا ذِکر مناسب نہیں سمجھتے۔ عام رائیں ملک کے شعرا کی جلیل کے موافق ہیں یہاں تک کہ جناب داغ کے شاگرد ہی فرماتے ہیں کہ جلیل کا مطلع بےمثل اور نہایت صاف ہی خود حضرتِ جلیل نے ہی ہم کو لکھا ہی کہ 'فتنہ' میں جو لکھا گیا وہی درست ہی۔

اب جناب ضیا کو اس بات پر اعتراض ہی کہ پھول جھڑنا محاورہ ہی جلیل نے ماضی کا صیغہ کیوں استعمال

کیا، اُس کا جواب یہ ہو کہ اس قسم کے تصرفات جائز ہیں اور لکھنؤ اور دہلی کے اہلِ زبان روزمرہ اس قسم کے محاورے استعمال کرتے رہتے ہیں ہم سے چاہا گیا ہو کہ ہم جنابِ جلیل جناب تسلیم اور جناب داغ سے استفسار کریں۔ ہم نہیں جانتے کہ یہ لوگ اِس سے زیادہ کیا لکھیں گے جو ہم لکھ چکے ہیں — متاخرین و متقدمین شعرا کے اسناد سے زیادہ اور کون ثبوت درکار ہو۔

۲۔ ایجاد

ہم کو یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہو کہ بنگال۔ پنجاب۔ مدراس۔ بمبئی اور دکن کے ساتھ دہلی اور لکھنؤ کے اخبار نویس بھی اس لغت کو تانیث ہی لکھتے ہیں — برسوں سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ اساتذہ کے خلاف یہ رنگ ان روشن خیالوں نے اختیار کر رکھا ہو اس کا سبب یہی ہو کہ دہلی اور لکھنؤ کے ثقات کی صحبت یا تو ان کو نصیب نہیں ہوتی یا انھوں نے اس لغت کی تحقیق نہیں کی۔ کم سے کم اگر شعرائے دہلی و لکھنؤ کا کلام ہی ان حضرات نے دیکھا ہوتا تو بھی غلط فہمی رفع ہو جاتی۔

ایک دھوکہ ان لوگوں کو اس لغت کی جمع بنانے میں ہوا کرتا ہو اور اس وجہ سے یہ ہمیشہ "ایجادیں" تحریر کیا کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہو کہ جن لغات کی تذکیر قائم ہو چکی ہو ان کی جمع بنانے کا قاعدہ ان کو نہیں معلوم ہو — اکثر وقت تو واحد اور جمع بہ حالِ خود ہی رہتے ہیں مثلاً

اچھے اچھے ایجاد امریکہ والے کر رہے ہیں

ہم اپنے دوستوں سے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ آیندہ وہ اس غلطی کو رفع فرمادیں گے اور یہی گزارش روشن خیال پنجابیوں سے بھی ہو۔

نواب مرزا خاں داغ فرماتے ہیں ؎

ایجادِ ستم سے ہمیں برباد کریں گے
گر تین دن ایسے ہی وہ ایجاد کریں گے

شاید لوگ کہیں کہ داغ کی زبان پر لکھنؤ والوں کا زیادہ تر اثر ہو۔ وہ "فکر" کو مونث باندھتے ہیں اور قلم کو مذکر لکھتے ہیں — اس لیے ہم پُرانے شاعر نسیم مرحوم کا ایک شعر بھی درج کیے دیتے ہیں ؎

قبر پر آیا ہو دینے کو مبارک بادِ مرگ
یہ نیا ایجاد ہو میرے ستم ایجاد کا

اختراع بھی مثل ایجاد کے تذکیر ہو اس کو بھی اکثر احباب مونث لکھتے ہیں۔

(۲)

ایجاد کی بحث کے سلسلے میں خود "فتنہ" کی ایک صاحب نے ان الفاظ میں گرفت کی۔

ڈیر ایڈیٹر۔ آپ نے ایجاد کی بحث میں یہ فقرہ لکھا ہو کہ "ایجاد کو تانیث باندھتے ہیں" یہ صحیح نہیں ہو۔ یہ موقع تانیث کا نہیں بلکہ "مونث" کا ہو، فقرہ اس طرح ہونا چاہیے :-

اس وقت ایجاد کو مونث باندھتے اور لکھتے ہیں

تانیث مصدر ہو اور موقع استعمال صیغۂ مفعول کو چاہتا ہو راقم مقبول

(۳)

مقبول صاحب کی یہ اصلاح دیکھ کر ایک فاضلِ گرامی کا مہربان نامہ آیا "ایجاد کو تانیث باندھتے ہیں" اس پر جو شک ظاہر کیا گیا ہو وہ خلاف ہو۔ اگر مونث ہو تو بھی صحیح ہو تانیث ہو تو بھی صحیح۔ نثر و نظم میں برابر مستعمل ہو۔ آتش کہتے ہیں۔ ؎

لکھے گئے بیاضوں میں اشعارِ انتخاب
جاری رہے وہی کہ جو سکّے کھرے ہوے

انتخاب کی جگہ "منتخب" چاہیے۔

اس پر "فتنہ" نے جو مقبول صاحب کی رائے کو درست مان کر شکریہ ادا کرچکا تھا۔ لکھا:-

احتیاط اور صحت کا یہ حکم ہو کہ زبان شایستہ بنائی جائے اور غلط الفاظ زبان سے نکال ڈالے جائیں اس لیے ہم کو اعتراضِ مقبول سے اتفاق ہو۔

ہم ان لوگوں میں نہیں ہیں جو اپنے عیب پر خیال نہیں کرتے —— زبانِ اُردو علمی زبان اُسی وقت ہوگی جب وہ شایستہ بنائی جائے گی اور صرف و نحو کے قواعد زبان کے مطابق ٹھیک

کر لیے جائیں گے ۔

۳ ۔ سچا لطیفہ

ایک منشی جی کسی "محررِ خانہ" کے "مویشی" مقرر ہوکر تشریف لے گئے ایک رپوٹ بھیجی ہے جو اصلاحِ زبانِ اُردو کے سلسلے میں قابلِ ملاحظہ ہے :-

جناب عالی سلامت ۔ خاک سار ذرۂ بے مقدار عرض گزار ہے کہ بہ اقبال سرکار دولت مدار کل شبِ تیرہ و تار میں مادۂ گاؤ خوش گوار کے جس کو حمل تھا نورچشمی تولد ہوئی تھی، فقط دو گھنٹے تک بہ قیدِ حیات رہ کر جورِ فلکِ کج رفتار و بہ تقضاے پروردگار انتقال کر کے راہی ملکِ بقا ہوئی نہایت ہی حسین و فصیح و بلیغ تھی ۔ —— اطلاعاً عرض ہے ۔

۴ ۔ بھوپالی زبان

ارے خاں خط کا جواب نہیں پہنچایا، کھٹلہ تو اچھا ہے موٹا موٹی ڈوکرا ڈوکری کیسے ہیں بیاگھاپن کی دعا کہنا —— بول چال سُن لی اب وضع پر نظر فرمالیجیے —— رنگین کپڑے غلافی پاجامہ منھ میں گٹکا ہاتھ میں ہتھیار اینڈ یہ کہ ہم پٹھان ہیں ۔

۵ ۔ قبولیت ، مقبولیت

" خدنگِ نظر " میں قبولیت پر اعتراض جمایا گیا تھا کہ غلط ہے اور مقبولیت کی فضیلت ثابت کی گئی تھی ' ریاض الاخبار ' نے لکھا دونوں لفظ عربی قاعدے سے غلط ہیں اور واقعی دونوں غلط ہیں مگر لالہ صاحب نے اس کو نہ مانا بلکہ اپنی ضد پر قائم رہے ۔

اب نظر صاحب نے ' اودھ پنچ ' میں زورِ طبع دکھایا ہے اور فرمایا ہے کہ

دیہاتی سکے ابھی ایک صدی تک رائج نہیں ہوسکتے ۔

مگر ان کو یہ یاد نہ رہا کہ دیہاتیوں کو آپ شہنشاہِ سخن اور خاقانی اور انوری اور خدا جانے کیا کیا لکھ چکے ہیں اگر خوشامدانہ طور پر یہ بیان تھا تو حالی اقبال ریاض جلیل اختر مضطر اور آہ وغیرہ کو آپ کے بیان سے تنبیہ ہوجائے گی اور اگر دراصل صحیح بیان ہے تو آپ ہم کو لکھنؤ کے کسی مستند شاعر کی تحریر سے ثابت کردیں

کہ مقبولیت عربی قاعدے کے دائرے میں ہے۔ سید جلال ہی سے دریافت کرلیجئے۔ جناب امیر مرحوم کے چھوٹے صاحب زادے سے رفع شک کرلیجیے۔ فرنگی محل بھی قریب ہے۔

دیہاتیوں سے تو آپ گھبراتے ہیں مگر اودھ پنچ کو پُشت پناہ بناتے ہیں جو ایک دیہاتی ایڈیٹر کا اخبار ہے اور کسی طرح ریاض الاخبار سے زیادہ شہری ہونے کا دعوا نہیں کرسکتا۔ مجدد السنۂ شرقیہ نے بھی لکھ دیا ہے کہ دونوں لفظ بالکل غلط ہیں۔

قبولیت کا اُردو میں وہی درجہ ہے جو مقبولیت کا اور برابر اسی طرح مستعمل ہے جیسے مقبولیت۔ اور لوگوں کو تو آپ مانیں گے نہیں اگر آج ہم ایسا معقول جواب دیتے ہیں کہ آپ کو سکوت ہی اختیار کرنا پڑے گا۔ "اجابت" پر آپ نے بڑا زور دیا ہے اور وجاہت کو اپنے زعم میں بنایا ہے لہٰذا ہم آپ کی اجابت ہی سے ایک جواب دے کر اس بحث کا خاتمہ کرتے ہیں۔

امیراللغات حصّۂ دوم صفحہ ۶۹ کالم اوّل سطر ۲ میں لکھا ہے۔

اجابت۔ ع۔ مونث۔ معنی "قبولیت"

اس کے بعد منشی صاحب نے سند میں شعر دیے ہیں۔

کیوں جناب لالہ صاحب! منشی صاحب تو دیہاتی نہ تھے انھوں نے اجابت کے معنی مقبولیت کیوں نہ لکھے قبولیت کیوں تحریر فرمائے۔

منشی صاحب کا پایۂ تحقیقات صاحبِ غیاث وغیرہ سے بہت بڑھا ہوا تھا اس کو دُنیا مانتی ہے

۶۔ کھیل

کھیل بہ اتفاق دہلی و لکھنؤ مذکّر ہے مگر پنجاب میں اس کی جمع کھیلیں لکھی جاتی ہے یہ صریح غلطی ہے۔ یہ لفظ مفرد استعمال ہوکر بھی جمع کا فائدہ دیتا ہے مثلاً ہم نے بہت کھیل کھیلے ہیں۔ ع عجب تیری قدرت عجب تیرے کھیل — جمع اگر بنائی جاتی ہے تو — و — ن۔ سے بنتی ہے مثلاً اب کھیلوں اور تماشوں میں جی نہیں لگتا۔ پنجابی اخباروں میں زبان داں اور اہلِ زبان اڈیٹر بھی ہیں مگر ان کی نظر ان مضامین پر نہیں پڑتی ورنہ اصلاح ممکن ہے۔

۷۔ غشی

جناب حفیظ نے اپنی غزل کے مطلع میں غشی کو باتشدید استعمال فرمایا ہو اور پروفیسر اقبال نے اپنے ایک شعر میں بہ اخفائے نون "یوناں" نظم فرمایا ہو۔ حقیر نے اس وقت تک اساتذہ کے کلام میں کسی جگہ یہ الفاظ اس طرح نہیں دیکھے کیا ایسا ممکن ہو کہ ہردو اصحاب اس معروضے پہ غور فرماکے اساتذہ کے کلام سے کوئی مثال دینے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے۔ اگر واقعی اُردو نظم سے دل چسپی ہو تو بہ قول حضرت تسلیم لکھنوی محاورات پر عبور و خلاف محاورہ سے اجتناب لازمی ہو۔

حسن افضل بدر بدایونی

(۲)

جناب حفیظ کے ایک شعر پر اعتراض ہوا تھا کہ غشی کی ے باتشدید پڑھی جاتی ہو۔

غشی سے جب ہوش میں آتے ہیں ہم

اس مصرع میں اگر خیال کیا جائے تو "یں" اور "ی" دونوں ساکن ہیں۔

جناب حفیظ ہم کو اطلاع دیتے ہیں کہ مصرع یوں بھی ہوسکتا ہو ؎ جب غشی سے ہوش میں آتے ہیں ہم ملونا ن سکے۔ نون کا اعلان فصاحت میں ضرور داخل ہو اور ہمارے خیال میں اس سے جناب اقبال کو بھی اتفاق ہوگا۔

(۳)

غشی کے متعلق جناب مولوی محمد ظفر حسن خاں صاحب رئیس رسول پور تحریر فرماتے ہیں :۔

"جناب بدر بدایونی کو غشی باتشدید کا دھوکا ہوا ہو　　غشی کا لفظ عربی ہو اس کا تلفظ بہ سکون شین بہ فتح عین معجمہ ہو اُردو دانوں نے تصرف کرکے شین کو حرکت کسرہ دے دی ہو

؎　نبضیں چھوٹی ہوئی غشی طاری　　ایک فرقت ہزار بیماری

جناب پروفیسر اقبال نے بھی غشی کے متعلق صحت پر زور دیا ہو اور یونان کی نسبت وہ کنعان، بدخشان کی مثال پیش کرتے ہیں مگر ان بحثوں کی نسبت ہماری یہ رائے ہو کہ دیکھو اہلِ زبان کیا کہتے ہیں۔

۸۔ زنّار ۔ بوچھار

نہ ہوتی سلسلہ جنباں اگر زنّار تھوڑی سی

تعجب ہو کہ جناب شہیرؔ نے زنّار کو مونث کیوں باندھا حالاں کہ فصحائے حال زنّار کو مذکر بولتے ہیں اور اس کے مذکر ہونے میں دلّی و لکھنؤ میں بھی اختلاف نہیں ہو۔ دیکھیے لکھنؤ کے سب سے بڑے محقق اُستاد امیر مینائی مرحوم فرماتے ہیں ع "نئی صورت کا آکر دیر میں زنّار پہنایا" اور حضرت داغ دہلوی بھی رقم طراز ہیں کہ زنّار مذکر ہو چناں چہ ایک شاگرد کے مصرع کو ع

شیخ تسبیح برہمن کرے زنّار نئی

مونث ہی ہونے کی وجہ سے غزل سے علاحدہ کر دیا۔

رہی یہ بات کہ پہلے کسی نے مونث باندھا ہو جیسا کہ ناسخ مرحوم فرمائے ہیں تو وہ سند اب کافی نہیں ہو یوں تو کسی نے حشر کو مونث اور بُلبل کو مذکر بھی لکھا ہو

دوسرا لفظ بوچھار ہو۔ ع اِدھر بھی گالیوں کی آگئی بوچھار تھوڑی سی

یہ لفظ زنّار و دستار کے قافیے میں استعمال کیا گیا ہو مگر اہلِ زبان کے کلام میں رائے ثقیلہ کے ساتھ دیکھا گیا ہو۔ اگر کوئی خاص تحقیق جنابِ شہیرؔ کو ہو یا اور اصحاب کو تو آگاہ فرمائیں۔

۹ ۔ ایک عربی داں دوست کا خط

مخدوم المجالس الرطب والیابس ہوالاوّل والوساوس سلمہ اللہ القادر المجالس

بعد گوناگوں سلام مقرّرات مافی الضمیر معلوم می گردانم کہ نہ دست بدست کتاب آمدے نہ نعمت را چنہاڑ شدے معلوم باد درتکاہل اُفتاد ۔ سحرگاہ می روم نصف النہار ماحضر نوش می فرمائم۔ بی بی اڑواڑ مکاف دیوار بہ دیوار ملصق شدہ ۔ ادھار والبیوہار فرمودہ است ۔ جیی باد ۔ فقط۔

۱۰۔ نواویل

ایک تصنیف میں ناول کی یہ جمع دیکھ کر ہم کو پیسہ اخبار کا "مشرق الاقصائے" یاد آگیا جب تک یہ نہ ثابت کیا جائے کہ ناول عربی زبان کا کوئی لغت ہو اس وقت تک اس کے تسلیم کرنے میں ہم کو تامّل ہو

شاید مصنف کو

الا یا ایہا الساقی ادر کاسو و ناولہا

نے دھوکا دیا۔ یا اودھ پنچ کے مذاق کو وہ نہیں سمجھے ہیں جو اکثر اس قسم کے الفاظ محض ظرافتِ طبع کے لیے لکھ جاتا ہو مثلاً نیچر کی جمع نیاچر۔ لالہ کی جمع لوالیل۔

ناول زبانوں پر مذکر اور مؤنث دونوں طرح ہو مگر ایک قاعدے کے موافق مذکر کو ترجیح ہو اس لیے اس کی جمع ناولیں بھی غلط ہوگی ـــ یہ لفظ جمع کے موقع پر مفرد ہی استعمال ہوگا مثلاً

" شرر کے جتنے ناول ہیں سب اپنے حُسنِ بیان میں لاجواب ہیں "

اور موقع پر " و ـ ن " سے جمع بنائی جائے گی مثلاً

" آج کل ناولوں کی بہتات ہو "

(۲)

جناب اڈیٹر صاحب ۔ ۲۰ نومبر کے 'فتنہ' میں ناول کی جمع نوادیل کے متعلق آپ نے جو نوٹ دیا ہو اس میں لکھا ہو کہ وزن تو فعالیل کا ہو۔ اگر میں نے آپ کے الفاظ سمجھنے میں غلطی نہیں کی، تو اس کا مطلب یہ ہو کہ جو الفاظ ٹھیٹ عربی کے نہ ہوں یا اس میں بہ ذریعے تعریب نہ آئے ہوں ان پر عربی کے قواعد جاری نہیں ہوسکتے حالاں کہ ایسا نہیں ہو۔ خاص لفظِ ناول کی نسبت تو مجھے تحقیق نہیں ہو کہ حال کی عربی میں مستعمل ہو یا نہیں لیکن قطع نظر ناول کے دُوسرے عجمی الفاظ پائے جاتے ہیں جو اپنی اصلی ہیئت کے ساتھ عربی میں مستعمل ہیں۔ مُشتے از نمونۂ خروارے ایک انگریزی لغت "اسکول" ہو ـــــ رسالہ تمرین الادب فی ترقین العرب میں اس کی جمع " اساکیل " مستعمل ہو۔ اگر مسٹر فتنہ خاں بہادر کی نازک بدنی اس بھاری بوجھ کی متحمل ہوسکے تو سرسری تلاش سے اور بھی الفاظ پیش کرسکتا ہوں۔ باقی حصّۂ مضمون سے بہ لفظہٖ متفق ہوں ـــــ محمد مقتدا خاں شروانی بلونوی۔

(۳)

نوادیل کی نسبت صاحبِ مراسلہ کے تفحص و تلاش کی ہم داد دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ

گزارش کرتے ہیں کہ عرب، عجم اور ہند کے باشندوں کو تعریب۔ تفریس اور تہنید کا اختیار ہے اگر عرب نے اسکول کی جمع اساکیل بنالی تو اُردو والوں کے لیے یہ لازم نہیں ہے۔ اُردو انشاپرداز تو اپنے قاعدے سے جمع بنائے گا۔ اسی طرح ہم غیر زبان کے الفاظ میں جو تصرف کرتے ہیں دوسروں کو اس کا تتبع لازم نہیں ہے۔

ہم نے جب ایک قاعدہ غیر زبانوں کے الفاظ کے لیے بنا لیا ہے تو ناول کی جمع نوادیل لکھنا صرف ہنسی کی بات نہیں ہے بلکہ رونے کا مقام ہے۔

۱۱۔ ایک شعر

ناظرینِ "فتنہ" سے کوئی صاحب اس شعر کے حسن و قبح پر روشنی ڈالیں۔ ؎

ناز تقدیر پہ جن کو کہ ابھی کل تک تھا آج بیٹھے ہیں وہ رونے کو مقدر اپنا

تقدیر کا رونا رو رہے ہیں، مقدر کا رونا رو رہے ہیں، قسمت کو رو رہے ہیں۔ سیکڑوں پہلو سے اس محاورے کا استعمال ہے مگر بیٹھے ہیں رونے کو مقدر اپنا۔ ہیچ مداں کا خیال ہے کہ ردیف محاورے کے محلِ استعمال کو پہاڑ سے انگھڑ بنا رہی ہے۔

راقم ایک نووارد۔ جون پور

۱۲۔ مارواڑی

ایک مارواڑی کے ایک خاں صاحب مقروض تھے۔ سامنا نہیں کرتے تھے ایک دن مقابلہ ہوگیا۔ سیٹھ صاحب نے لال پیلی آنکھیں نکال دھوتی کو توند پر چڑھا آگے سے دبا کہا :-

"کھاں شاب۔ حشوب شے جو تھارا نکسے شو لے، اب حشوب سُن۔ تیڑے ڈیڑیں شاٹھ۔ آدھے دئے نائیں۔ باکی تیش اس میں سے دش دیں گے دش دلائیں گے دش کو دنیڑوں (دینا) ہی کیا۔

۱۳۔ الاپ اور آگ کے پھول

جب بزمِ عیش وطرب میں شاہدانِ ناز "الاپ" کا استعمال کرتے ہیں تو ان کے خوش نما اور دل فریب رخسارِ تاباں اور لبِ نازک کی قدرتی بناوٹ میں فرق آجاتا ہے اور چہرہ بگڑنے لگتا ہے بلکہ نازک نازک لب تو الاپ کی پیہم جنبش سے کچھ عجب نہیں کہ چھل جاتے ہوں۔ چھلتے نہ ہوں گے تو لمبی لمبی تانوں کے

مارے دب ضرور جاتے ہوں گے مگر اس سے زیادہ بدمزگی اور کرکراہٹ جب پیدا ہوتی ہو کہ "الاپ" کو کوئی صاحب مذکر باندھتے ہیں۔

آج کل اس پر بحث ہورہی ہو کہ الاپ مذکر ہو اور سند میں ایک شعر قدرت شاعرِ قدیم کا پڑھا جاتا ہو قدرت دہلی کے شاعر تھے اور میرحسن وغیرہ بھی دہلی کے شاعر تھے انھوں نے اور لکھنؤ کے تمام شعرا نے مونث باندھا ہو۔ جناب امیر مرحوم نے بھی اس کو مونث ہی لکھا ہو۔

دوسری بحث حروفِ علت کی ہو۔ شعرا حروفِ علت کو گرادینے میں قدرت رکھتے ہیں اور ان حرفوں کا دَب کر نکلنا ان کے نزدیک کوئی عیب نہیں مگر جن لوگوں نے ثقات شعرائے زبانِ اُردو کا کلام دیکھا ہو۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ الف کا یا کسی حرف کا دب کر نکلنا مکروہ ہو۔ جو صاحبِ کمال ہیں وہ اس قسم کے عیوب پر نظر رکھتے ہیں اور شعر کے حُسن وخوبی کو نہیں مٹاتے۔

آگ کے پھول ہیں یہ باغ کے کچھ پھول نہیں
شمع کو چور بنانا ہو بنالے بلبل

ڈیر فتنہ۔ میں نے شعرِ بالا پر اعتراض دیکھا مگر میری سمجھ میں مطلب نہ آیا کہ معترز کرم فرما جنابِ معترض کا مطلب کیا ہو شاید وہ خود بھی اعتراض نہیں سمجھے بہرحال اگر ان کو صرف مطلب کے سمجھنے میں غلطی ہوئی تو مطلب شعر کا یہ ہو:۔

"بلبل تلاشِ گُل میں نکلی شمع کے پھولوں کو دیکھ کر اسی کو چور بنانے لگی شاعر کہتا ہو کہ اے بُلبل عشق کی مدہوشی میں تو یہ بھی نہیں سمجھی کہ یہ آگ کے پھول ہیں تیرے باغ کے پھوُل نہیں ہیں۔"

اگر شمع کے پھوُل پر اعتراض ہو تو سُنیے جناب امیر مرحوم فرماتے ہیں ؏ یہ گِرتے ہیں لگن میں شمع سے پھول ——— ایک جگہ اور فرماتے ہیں ؎

جھونکا اِدھر نہ آئے نسیم بہار کا　　　　نازک بہت ہو پھوُل چراغِ مزار کا

معترض صاحب کو اپنے گرامی پایہ اُستاد سے دریافت کرلینا چاہیے ــــــــــــ ا ۔ ع ۔ لکھنؤ

فتنہ:۔ ہمارے دوست معترض صاحب کو "آگ کے پھول" پر شک ہوا ہو ۔ دہلی کے شاعر شاہ نصیر مرحوم فرماتے ہیں ۔ ؎

بلبلیں ترے جلیں گے خس و خارِ آشیاں
اُڑکر پڑا جو آگ کا اس گُل ستاں سے پھول

ظفر مرحوم ؎

لگ گئی جوشِ گُل و لالہ سے گلشن کو جو آگ   کہیں اس آتشِ رخسار کا کیا پھول پڑا

۱۴ ۔ آب دست

ہزہائی نس نواب صاحب بہادر رام پور کے دربارِ دُربار میں آج کل شعرائے زبانِ اُردو کا اچھا خاصا مجمع ہو ان شعرا میں لکھنؤ و دہلی کے مقلد و غیر مقلد دونوں شامل ہیں ۔

جہاں مجمع اربابِ کمال ہوتا ہو ہر قسم کی تحقیق ہوتی رہتی ہو ۔ شعرا کا بے کار گروہ صرف زبان کی بحث میں اگر وقت صرف کرے تو بڑا کام نکل جائے مگر بحث ہو سلیقے کی ۔ تہذیب کی اور زبان کی اصلاح کی نیت سے ہو اس بحث میں ذاتی رنجش اور عداوت کا شائبہ نہ آنے پائے ، مگر بدقسمت زبانِ اُردو کے لیے یہ مسئلہ اتنا مشکل ہوگیا ہو کہ اب کوئی صورت اس کے سنبھلنے کی نظر نہیں آتی ۔

ریاست رام پور ہمیشہ زبان اور علم کی حفاظت کرتی رہی ہو ۔ نواب خلد آشیاں کی پوری پیروی اس معاملے میں ہزہائی نس بہ القابہ فرمارہے ہیں ۔ اس موقع کو غنیمت جان کر اُردو کی ترقی کی کوشش کرنی چاہیے تھی مگر ہم دیکھتے ہیں شعرائے لکھنؤ میں اختلاف ہوگیا ہو ۔

میر مہدی کمال اور آغا مظہر میں یہ بحث چھڑی ۔ ایک صاحب آب دست کی تذکیر کے دعوے دار ہوئے دوسرے صاحب تانیث کے ۔ ایک محضر بنا کر لکھنؤ بھیجا گیا ۔ لکھنؤ میں کوشش کی گئی کہ آغا مظہر کی بات جانے نہ پائے ۔ جنابِ فصاحت اور جنابِ عارف سے بھی تانیث ہی پر سند لکھوائی گئی ۔

کیا یہ صریحی اندھیر نہیں ہو کہ آب دست کو اب تک کسی گنوار سے گنوار نے بھی مونث نہیں لکھا ہو ۔

جلال اور امیر جو زبانِ اُردو کے بڑے معلم اور ادیب ہیں وہ بھی تذکیر کے قائل تھے۔

میر انیس کے خاندان سے ایسی آواز تعجب ہو جو اس بات کا فخر کرتا ہو کہ ہمارا گھر زبان کی ٹکسال ہو دلی اور لکھنؤ میں آب دست بلا اختلاف مذکر ہی بولا جاتا ہو اگر لکھنؤ کے کسی گھر میں یہ مونث استعمال ہوتا تو امیرو جلال ضرور اس پر نوٹ دیتے یا امانت مرحوم اور انیس مرحوم کے کلام میں کہیں مونث نظر آتا —— ہم کو جناب فصاحت و جنابِ عارف سے تعجب ہو کہ محض پاسِ خاطر سے ایسا فتوا دیا جس سے بہت بڑا اختلاف پیدا ہوگیا۔

اگر آب دست مونث ہو تو پیشاب اور پاخانہ بدرجۂ اولا مونث ہو۔ میں نے پیشاب کی۔ میں نے پاخانہ پھری فرمایئے۔

یہ صحیح ہو کہ دلی اور لکھنؤ میں قدیم زمانے سے یہ اختلاف رہا ہو کہ دونوں شہروں میں دو دو تین تین زبانیں استعمال ہوا کی ہیں مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ متفق علیہ الفاظ اور محاوروں میں اختلاف کیا گیا ہو پانی کو ہمیشہ دونوں جگہ ہر فرقے نے مذکر ہی کہا۔ ہاتھ کو مذکر ہی کہا۔ یہ اور بات ہو کہ خاندانِ انیس و خاندانِ امانت میں جب آب۔ دست۔ مل جائیں تو مونث ہوجائے حالاں کہ اب ڈبل تذکیر ہوجانا چاہیے۔

۱۵۔ داغی

جس پھل میں بوسیدگی کے آثار پیدا ہو چلے ہوں اُسے کہتے ہیں۔ جس کے چال چلن پر کوئی حرف آگیا ہو اس کے لیے بولتے ہیں۔ کپڑے کاغذ یا دوسری چیز پر دھبہ پڑ جانے کے موقع پر مستعمل ہو۔ سزا یافتہ مجرم کی نسبت کہا جاتا ہو غرض کہ اس کا ہر ایک استعمال انھی معنوں میں دیکھا گیا —— یہ ذکر ہو رہا تھا تو ایک دوست بول اُٹھے کہ مشفق اس میں یائے نسبتی ہو اس کا بھی خیال رہے۔

۱۶۔ بنگلہ اردو

ابھی ایک سمن جو یوپی سے جاری ہوا تھا بنگال احاطہ سے تعمیل ہوکر آیا ہو قابلِ ملاحظہ ناظرین ہو۔

"لکھ امرت بہو یا ساکن منوہرپور اسٹیشن سربدا پر آگے سادھو چرن دو سو سولہ نمبر دیوانی مقدمہ کے سمن پروانہ لے کے آنے سے مدعا علیہ آل دھریا صاحب ساکن منوہرپور

سرزمین پہنچ کر تلاش کر لینے پایا نہیں کیا جانے کہاں گیا ہے۔ کون جگہ میں رہتا ہے۔ اس کا گھر دروازہ دیکھا نہیں۔ بول کر تلاش کیا پایا نہیں ہمن پروانہ مدعا علیہ ڈہریا صاحب کے نام کا عدالت کو واپس کیا اس لیے گواہاں مقابلے میں اقرار لکھ دیا۔ ذریعے ڈاک خانہ حضور میں عرض پرداز پہنچایا۔ حضور خاوند ہے۔

۱۷۔ وجہِ تسمیہ

عموماً طوائفوں کے سازندوں کو کئی نام سے سرفراز کیا جاتا ہے جن میں سے بغیر خیالِ مدارج و امتیاز چند حسب ذیل ہیں۔ مثلاً بھڑوے۔ قرم ساق۔ سازندے اور "سفردا" یا سفروائی۔ بالخصوص آخری نام کی بابت لوگوں کو خیال ہوگا کہ شاید عربی یا فارسی کا لفظ ہے سو جناب بندہ عرب میں اس کا وجود ہی نہیں وہاں تو صرف اسی کی گنجایش ہے

افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت

اور ایران میں امرد پرستی نے بھڑدوں وغیرہ کی ضرورت ہی نہیں رکھی اس لیے یہ لفظ نہ عربی ہے نہ فارسی بلکہ بقول میاں جی بنارسی خاص الخاص سنسکرت ہے جس کا صحیح تلفظ "سمبھروا" ہے۔

اس کے معنی ہیں جماعت، فرقہ، گروہ اور ٹولی اسی لیے گانے بجانے والی رنڈیوں کو مع نالہ و فغاں خلیفہ، طوائف اور ڈیرہ کہتے ہیں۔ آخری لفظ ڈیرے کا اطلاق خیمہ و خرگاہ یعنی ٹھیرنے کی جگہ اور جائے قیام پر ہوتا ہے۔

۱۸۔ دکھنی زبان کا مخمس

کھلنگے کی ناتھ تھا ہیے کچرا اٹھائے سیّل کو لیے ہاتھ میں گتا اُٹھائے
یہ بھی نکو نکو اجی جوتا اٹھائے مزدور بنیے خلق کا بوجھا اٹھائے
احساں کسی کا سر پہ نہ اصلا اٹھائیے

راقم بہ کہیں اصلاح نہ فرمائے گا

۱۹ "کو"، "سے"

آج کل ان دو حرفوں پر "اُردوے معلّٰی" نے بحث چھیڑ رکھی ہے۔ پروفیسر اقبال جو اُردو زبان کے ایک سچے بہی خواہ بلکہ عاشق ہیں انھوں نے ایک شعر میں یوں کہہ دیا ع

آرزو یاس کو یہ کہتی ہے

اعتراض ہوا کہ کہنا کا صلہ " سے " آتا ہے۔ پروفیسر اقبال نے مصحفی مرحوم اور امیر مرحوم کے شعروں سے سند دی۔ جناب حسرت نے مصحفی کے شعر کو غلط اور امیر کے شعر کو مستند مانتے ہوئے یہ کہا کہ جملۂ خبریہ میں کو صلے میں نہیں آتا ہے انشائیہ میں آتا ہے۔ اس طرح جناب امیر کا شعر صحیح ہو گیا اور مصحفی کا غلط رہا مگر اس پر مفصل اور معقول بحث یکم اپریل کے "تالیف واشاعت" میں کی گئی ہے اور پروفیسر اقبال کی غلطی تسلیم کر کے محل استعمال بتایا گیا ہے۔

اس ساری بحث کی پیچیدگیوں اور قواعد کے حوالوں سے تو بہتر یہ تھا کہ اہلِ زبان کے روزمرہ کو دیکھا جاتا کہ ان کی زبان پر کیا ہے —— جو مثالیں دی گئی ہیں وہ سب غلط ہیں اور دہلی لکھنؤ کے ثقات و خواص ہرگز کو کا استعمال ایسے محل و موقع پر نہیں کرتے، چاہے وہ جملہ انشائیہ ہو چاہے خبریہ۔ اور اسی بنا پر جناب امیر نے آخر زمانے میں اس سے ابا کیا ہے دوسرے دیوان میں اس کو کا کہیں پتا بھی نہیں ملے گا۔ کہاروں کو کھوڈولی لگائیں۔ بالکل غلط ہے، جناب حسرت کو منشی صاحب مرحوم کے شعر کے واسطے اگر یہ دردسری کرنا پڑی تو صرف وقت ہی نہیں ضائع ہوا بلکہ اور لوگ شک میں پڑ گئے۔ ہر شخص کے لیے اہلِ زبان کا روزمرہ عمدہ رہنما ہے اور ہر شخص خود بھی دیکھ سکتا ہے کہ ہم کیا بولتے ہیں۔ اڈیٹر تالیف و اشاعت نے بہ پابندیِ قواعد جو کچھ لکھا ہے وہ بہت کچھ قابلِ قدر ہے اور ہم شکر کرتے ہیں کہ ابھی مُلک میں ایسے محقق موجود ہیں لیکن ہم اپنے دوست سے بہ ادب عرض کرتے ہیں کہ زبان کو قاعدے کا پابند کرنے سے یہ بہتر ہے کہ قاعدہ زبان کا پابند کیا جائے۔ آخر میں ہم اس امر کا بھی شکر ادا کرتے ہیں کہ جناب اقبال نہایت منصف مزاج اور نیک دل ہیں اور جہاں تک ہم کو خط و کتابت سے دریافت ہوا ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہر اچھی بات کے تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں۔ ہمارے دوست حسرت کا مُلک پر یہ احسان ہے کہ انھوں نے زبان کی اصلاح

قصد کیا مگر ہم اپنے دوست سے یہ عرض کرنا مناسب سمجھتے ہیں کہ وہ بھی قدیم متروکات سے ابا فرمائیں تو اچھا ہو۔

۲۰۔ تار

ہمارے پنجابی اخبارات جس طرح ملک میں اُردو کی اشاعت کر رہے ہیں اگر زبان پر بھی کچھ توجہ کرتے چلیں تو بہت جلد اُردو کی اصلاح ممکن ہو مگر مشکل یہ آپڑی ہو کہ ہمارے دوست ذرا ٹوکنے پر بگڑ جاتے ہیں اور اُلٹی سیدھی سُنانے لگتے ہیں۔

پروفیسر شیخ محمد اقبال کی ہم تعریف کریں گے جو اس معاملے میں نہایت معتدل پالیسی رکھتے ہیں اور بھی اپنی غلطی پر اصرار نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہو کہ ان کی زبان صاف ہوگئی ہو اور وہ تھوڑے ہی دنوں میں ایک ماہرِ زبان ہوجائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ بات پنجاب اور بنگال کے رہنے والے حاصل کرلیں اس کے لیے کسی اُستاد کی بھی ضرورت نہیں ہو۔ شعرا کا کلام عمدہ آتالیق ہو۔

تار کا لفظ عام طور پر مذکر بولا جاتا ہو مگر یہ عجیب بات ہو کہ پنجاب کے اخبار اس کو مونث لکھتے ہیں تار ہو یا لوہے پیتل کا تار ہو یا شربت اور چاشنی کا تار ہو یا تارِ عنکبوت ہو یا سوت کا تار ہو۔ سب دہلی اور لکھنؤ میں مذکر کے دائرے میں ہیں معلوم نہیں پنجاب کے روشن خیالوں نے تانیث کا لباس اس کو کیوں پہنایا؟

ہم کو امید ہو کہ ہمارے پنجابی احباب اس قسم کے الفاظ پر خیال فرمائیں گے اور لگے ہاتھوں "طاعون" پر بھی ایک نظر ڈالیں گے۔

پروفیسر اقبال سے خاص طور پر ہم یہ استدعا کرتے ہیں کہ آپ اس غلط فہمی کو دور فرمانے کی کوشش کریں اور اڈیٹر صاحب "مخزن" سے یہ التماس ہو کہ 'مخزن' کے صفحات میں غزلوں اور نظموں سے اس قسم کی ضروری اصلاحیں زیادہ مفید ہیں۔

۲۱- غزلِ محمود

مرزا غلام احمد صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کے فرزند مرزا محمود احمد صاحب کی غزل پر ہم کو قلم اٹھانے کی ضرورت نہ تھی مگر ہم کو پرائیویٹ طور سے معلوم ہوا ہے کہ صاحب زادے صاحب یہ فرماتے ہیں کہ ہمارے مقابلے میں اہلِ زبان بھی کچھ نہیں کہ سکتے۔ گستاخی معاف ہو خود جناب کے والد صاحب کی تحریرات زبان کی لطافت سے خالی ہیں جن کی اس وقت اسّی کتابیں موجود ہیں اور جن میں سے ہر ایک مخالفینِ اسلام کے لیے ذوالفقا کا کام دیتی ہے۔

شاید آپ کو اور آپ کی سوسائٹی والوں کو اس امر میں شبہ ہو کہ میرا بیان غلط ہے تو ایک غزل کی اصلاح پیش کرتا ہوں اور یہ مُشتے نمونہ ہے۔

وہو ہذا

قصۂ ہجر ذرا ہوش میں آلوں تو کہوں
بات لمبی ہے یہ سر پیر جو پالوں تو کہوں

واللہ دہلی اور لکھنؤ دونوں مات ہیں۔ حضرت "یہ" دوسرے مصرع میں زائد ہے اور اہلِ زبان پیر نہیں بولا کرتے ہیں آج آپ نے پیر لکھا ہے کل "لات" لکھیں گے اور خیال فرمائیں گے کہ یہی زبان ہے۔ اہلِ زبان پیر کی جگہ پانو بولتے ہیں۔ معاف فرمائیے گا آپ اہلِ زبان نہیں ہیں۔ آپ کی والدہ دلّی کی ضرور ہیں مگر آپ نے پرورش پائی ہے پنجاب میں ـــ یہ شعر یوں ہونا چاہیے ؎

قصۂ ہجر ذرا ہوش میں آلوں تو کہوں
بات لمبی ہے سرا اس کا جو پالوں تو کہوں

ملاحظہ فرمائیے ذراسی اصلاح سے شعر کا پایہ کس قدر بلند ہوگیا۔

دوسرا شعر ؎ عشق میں اک گلِ نازک کے ہوا ہوں مجنوں　　دھجیاں جامۂ تن کی میں اڑا لوں تو کہوں

بندہ نواز اس شعر میں بھی ٹھوکر کھائی۔ دونوں مصرعوں میں تناسب نہیں ہے۔ بلبل "گلِ نازک" پر عاشق ہوتی ہے اور مجنوں لیلیٰ کے عشق میں ہوا کرتے ہیں ـــ علاوہ اس کے آپ پہلے مصرع میں اپنا حالِ زار بیان کرتے

ہیں۔ پھر دوسرے مصرع میں "اُڑالوں تو کہوں" کیوں لائے ہیں؟ لیجیے ہم آپ کے شعر کو بنائے دیتے ہیں۔

ایک لیلیٰ کی محبت میں ہوا کیوں مجنوں
دھجیاں جامۂ تن کی میں اُڑالوں تو کہوں

تیسرا شعر ؎ حالِ دل کہنے نہیں دیتی یہ بے تابیٔ دل آؤ سینے سے تمھیں اپنے لگالوں تو کہوں
بندہ نواز آپ اپنے کلام کو زوائد سے جب پاک نہیں کرسکتے تو شاعری کیوں کرتے ہیں۔ حضرت کسی کو آپ نے اپنا کلام بھی دکھایا ہے یا آپ خودرَو شاعر ہیں۔ یہ شعر یوں ہونا چاہیے ع ؎

حالِ دل کہنے نہیں دیتی ہے بے تابیٔ دل
آؤ سینے سے تمھیں اپنے لگالوں تو کہوں

ایک اور شعر ؎ رازداں اس کی شکایت ہو اسی کے آگے اس کی تصویر کو آنکھوں سے ہٹالوں تو کہوں
بندہ پرور، بے حرفِ ندا کے رازداں بے جوڑ ہے یہ شعر یوں ہونا چاہیے ؎

کس طرح اس کی شکایت ہو اسی کے آگے
اس کی تصویر کو آنکھوں سے لگالوں تو کہوں

۲۲۔ اُردو لشکر پر یورش

ہم نے اس سے پہلے کئی مضامین تحریر کیے ہیں جو 'کمال' دہلی، 'زبانِ اُردو' اور 'جلوۂ یار' میں شائع ہوچکے ہیں، پبلک کی نظر سے گزرے ہوں گے ان میں سوائے معلومات فنِ شعر و سخن کوئی دل لگی کی بات نہ تھی طبیعتیں خوش نہ ہوئی ہوں گی۔ غور و فکر سے کام لیا گیا ہوگا کبھی کتب لغات و محاورات کبھی کلامِ فصحا کو دیکھنا پڑا ہوگا اس لیے ہم اپنے پیارے ناظرین کو اس اُردو لشکر کے جن کے اشعار پر پہلے بحث کی گئی ہے چند ایسے اشعار دکھاتے ہیں کہ جن کو ملاحظہ فرماکر حظ حاصل ہوگا دس پانچ منٹ طبیعت خوش رہے گی بے ساختہ ہنسی آئے گی۔

ہمارے مشفق سید علی احسن صاحب احسنؔ مارہروی نے شاید اپنے ترکیب بند میں اسی غرض سے ایسے اشعار لکھے ہوں گے۔ آل انڈیا اُردو کانفرنس واقع بدایوں کا عظیم الشان جلسہ تھا۔ طولانی مضمون کا

ترکیب بند پڑھنا مدِ نظر تھا ضرور خیال ہوا ہوگا کہ سامعین گھبرا جائیں گے کچھ اشعار ایسے بھی لکھے جائیں کہ سُن کر طبیعتیں خوش ہوں ہنسی مذاق میں طوالت بارِ خاطر نہ ہو ۔

ایک رئیس اور باورچی کا مشہور قصہ جو اور بھی ایک جگہ کتاب میں لکھا ہوا ہے ناسخ التواریخ کے اس پورے قصے کا انگریزی ریڈر میں نصف ترجمہ دیکھ کر اسے نظم فرمایا ہے باورچی نے ایک دن بہت اچھی اور ایک دن بہت بُری غذا کی فرمایش پر دونوں دن زبان پکائی ۔ رئیس نے باورچی کی دانائی کی داد مرحمت فرماکر کچھ انعام بھی مرحمت فرمایا ۔ اس موقع پر جناب احسن فرماتے ہیں ؎

کہہ کے یہ مصروف اپنے کام میں وہ ہوگیا		کام کرتے کرتے آخر دن ڈھلا اور آئی رات

اس شعر میں کس مزے کا مضمون ہے ۔ جان صاحب لکھنوی کی تقلید فرمائی ہے باورچی کیا تھا سراپا . . . . تھا ۔ اپنے کام میں مصروف ہوئے ہوئے دن ڈھلا اور آئی رات مزے کی بات ہے ۔ ان کھلے ہوئے ذم کے پہلوؤں کے علاوہ لفظ کام پہلے اور دوسرے، دونوں مصرعوں میں ہے ۔ ایک ہی لفظ کا دونوں مصرعوں میں ہونا معیوب ہے اور پھر کہنہ مشق کے لیے ۔

اس کے بعد جناب احسن نے زبانِ اُردو کو ایک عورت مثلِ بیسوا کے بناکر اس کی زبان سے اس کے حالات ظاہر کیے ہیں جن کو سُن کر ناظرین بہت محظوظ ہوں گے ۔ سُنیے ؎

سب سے ملتی رہتی ہوں سب کو ملاتی رہتی ہوں		مَیں کسی سے بھی نہیں کرتی زرا بھی احتراز

کیا انکسار ہے اور کیا اخلاق ہے ۔ ہر شخص کی خوشی پر خوش ؎

جس نے مجھ کو منھ لگایا مَیں اسی کی ہوگئی		دوست ہوں دُشمن ہوں سب سے مجھ کو حاصل ہے نیاز

جب یہ صورت تھی تو پھر مجھ کو نہ ہوتا کیوں عروج		جب یہ حالت تھی تو پھر کیوں کر نہ ہوتی سرفراز

کس خوبی اور کس مزے سے سرفراز ہوئی ہے کیا کہنا ہے "سرفراز ہونا" کس قدر پُر لطف ہے ــــ ؎

آج سے کل تک مناسب ہے نہ ہو کچھ اور کام		میرے کاموں کے لیے ہیں وقف یہ ایامِ خاص

آج سے کل تک اور کاموں کا التوا "ایامِ خاص" کے باعث ایامِ معمولی کو ظاہر کرتا ہے ۔ لفظِ خاص جو ردیف

ہو اس نے اور بھی مضمون کو رنگین کر دیا ہو۔

اصل مطلب آپا دھاپی میں ہوا جاتا ہو فوت   کیا مصیبت میں پھنسی ہو میری بے چاری غرض

کیا مزے کی بات پیدا ہوتی ہو۔ آپا دھاپی، بے چاری، غرض سب الفاظ قابلِ غور ہیں اور قابلِ رحم ہونے کی صورت دکھاتے ہیں۔ ؎

کون ہو دُنیا میں وہ جس سے نہیں کچھ میری بات   ہر مسن سے رسم مجھ کو ہر جواں سے ربط ضبط

اس مدح کی زبانِ اُردو حضرتِ احسن کو بہت داد دے گی۔ مصرعِ ثانی میں بجائے (میرا) کے مجھ کو غلط ہو۔ ؎

کام کرنے والا ہونا چاہیے قابل کوئی   اس کی کچھ پروا نہیں سید ہو یا ہو نورباف

یہ شعر ہو یا راہِ مولا پر سبیل لگا رکھی ہو ثواب لینا منظور ہو۔ ہر ایک کے نیچے وقف تکیہ کا کنواں۔ دیکھیے اب زمانے میں ایسے کلام کو بے مثل و لاجواب کہتے ہیں اور بصد ناز تحریر کیا جاتا ہو کہ یہ کلام جملہ عیوب سے پاک ہو جس میں ترکیب فارسی عطف و اضافت بھی نہیں ہو۔ ہمیشہ بُری بات سے مطلع کرنے والا دوست ہوتا ہو پھر اس پر طرّہ یہ کہ ہم کوئی احسان نہیں جتاتے ——— بلبلِ تسلیم صبر رام پوری

۲۳۔ نیچرل شعر

ہمارے مولانا حالی صاحب ایک تو فصاحت سے خالی دوسرے آپ کی نیچرلٹی بھی انوکھی نرالی ہو۔ فرماتے ہیں۔ ؎

فصلِ خزاں ہو تس پر پھولی نہیں سماتی   مژدہ صبا نے یارب بلبل کو کیا سُنایا

"تس پر" کی فصاحت قابلِ داد ہو جس پر بے ساختہ ہنسی آتی ہو۔ فصلِ خزاں میں صبا کا ہونا گویا قانونِ فطرت میں اصلاح دینا ہو۔ بہار کو صبا سے اب کوئی لگاؤ نہیں رہا شاید پانی پت کی آب و ہوا نے اس اصول کو بدل دیا واقعی نیچرل شعر نیچر کے ٹھیکم ٹھیک مطابق اس سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا۔

راقم خزاں بقلم بہار

۲۴۔ "مت" روکات

خواجہ حالی صاحب کی عنایت سے یہ بات قریب تسلیم کے ہوئی جاتی ہو کہ متروکات کا استعمال زبانوں پر

رہے گا یہ ضدی مزاج فخرِ قوم و فخرِ پنجاب کبھی دوسرے کی رائے پر عمل نہیں کرتے۔ اس میں کچھ گناہ نہیں ہو اگر کسی کی رائے مان لی جائے مگر تفوق اور برتری میں ضرور فرق آتا ہو

"مت" کو آتش۔ ناسخ۔ نسیم، مومن، ذوق، غالب نے اپنے آخر دور میں ترک کر دیا تھا مگر جناب حالی کی اُپج اور زبان دانی کی بدولت ابھی اس کا ذکر باقی ہو اور بڑے افسوس کے ساتھ ہم کو لکھنا پڑتا ہو کہ "مصباح القواعد" میں بھی اس کو اونچی کرسی نصیب ہوئی۔ فاضل مصنف نے اپنی انشاپردازی کے سلسلے میں جہاں جہاں اس کو کھپایا ہو وہ لائقِ توجہ نہیں ہو مگر لطف یہ ہو کہ اس کتاب کو بڑے بڑے روشن خیالوں نے دیکھا ہو اور کسی سے تو ہم کو پوچھنا نہیں ہو ہاں مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی سے ہم ضرور درخواست کریں گے کہ انھوں نے اس کو کس طرح جائز رکھا۔

ایک لفظ جب نکال دیا گیا تو اب اس کو داخلِ قواعد کرنا کیا ضرور تھا اور اگر یہ جائز ہو تو قدیم زبان کے کل الفاظ قابلِ تسلیم اور داخلِ زبان کرنا لازم آئے گا اس میں مولوی فتح محمد صاحب جالندھری کا کچھ قصور نہیں صرف حالی صاحب کے کلام کی برکت نے زبان کو یہ دن دکھایا ہو۔

۲۵۔ بہت کہی

ہمارے جلے تن سر سید نے ایک خاص مضمون لکھا ہو۔

"سُن لو اے دور و نزدیک کے دوستو سُن لو۔ اے دکن کے اور اُتر کے دوستو سُن لو۔ اے پورب اور پچھم کے دوستو سُن لو۔ اے آسمانوں اور زمینوں کے رہنے والو سُن لو وغیرہ وغیرہ"

ہم اس پر کچھ لکھا ہی چاہتے تھے کہ ہمارے دوست 'اودھ پنچ' نے ہمارے منھ سے بات اس طرح چھین لی جیسے مولوی سمیع اللہ خاں نے مسٹر محمود کے لائف سکریٹری ہونے کا خیال ـــ

اب مندرجۂ بالا فقروں کی نسبت چہ مے گوئی ملاحظہ ہو :۔

"یہ تہذیب الاخلاق والے ریفارمر کی تحریر ہو یا کوئی سفلی عمل پڑھا جارہا ہو کہ پورب باندھوں پچھم باندھوں اُتر باندھوں دکھن باندھوں۔ زمین آسمان باندھوں۔ پَورن پانی باندھوں ـــ اگر کسر ہو تو صرف لونا چماری اور اسماعیل جوگی کی دہائی کی اس کے بعد یہ فقرہ ہو کہ :۔

"سید صاحب اپنے مخالفوں کو فرانس چلنے کی اس طرح دعوت دیتے ہیں جیسے بازاری گالی گلوج میں
بک اُٹھتے ہیں کہ چلو سڑک پر آؤ تو ہم تم سمجھ لیں ۔"

ب ۔ معاصرینِ عہد

"نزاعِ لفظی" کے ماتحت حالی اور سرسید کے ضمنی تذکرے کے سلسلے میں آئے اس وقت کے کچھ اور معاصرینِ "فتنہ" سے بھی ملتے چلیں ۔

۱۔ چندولال

مہاراجہ چندولال دکن میں شعر وسخن کا بہت شوق رکھتے تھے اور ان کا کلام، کلام الملوک ملوک الکلام سمجھا جاتا تھا بلا ناغہ شب کو ایک طبع زاد غزل سُنا کر حاضرین سے داد لیا کرتے تھے ۔ ایک دن حسبِ اتفاق لالہ صاحب کی طبیعت بگڑی رہی کچھ فکر نہ ہوسکی ۔ شوقین خوشامدی حسبِ معمول شام ہی سے بم کے گولے اور مدح کی آتش بازی لے کر آدھمکے ۔ لالہ صاحب نے حسبِ معمول دربار کیا دیر تک جب لوگوں نے سکوت دیکھا اور اُکتا گئے تو لالہ صاحب بھی تاڑ گئے ۔ لالہ صاحب نے فرمایا :۔

حاضرین آج بسبب ناچاقیٔ طبع

یہاں تک فرما چکے تھے کہ واہ وا سبحان اللہ ماشاء اللہ شعر اس کو کہتے ہیں کیا ذہن رسا ہے واللہ کیا طبیعت پائی ہے کے نعرے بلند ہونے لگے ۔۔۔ لالہ صاحب خفیف ہوئے کہ آج تک کن کرمہ مغزوں کو میں کلام سُناتا رہا اور فرمایا چپ رہو، نالائقو تم خاک نہیں سمجھتے افسوس مُفت اپنا دماغ آج تک تمھارے سامنے خالی کیا ۔

لالہ صاحب نے اس دن سے عہد کیا کہ اب ان بد دماغوں کو کچھ نہ سُناؤں گا بلکہ شاعری کا مشغلہ ہی ترک کر دیا ۔ ؎

تحسینِ ناشناس کا صائب ہے شکوہ سنج نفرینِ ناشناس کا ہم کیوں گلہ کریں (ریاض)

۲۔ دشمنوں کے کان بہرے

سُننے میں کیا ہے سمیع اللہ خاں صاحب بہادر سرسید پر والشنے والے ہیں ارے بھئی کیا؟ ہاں شاید فرانس میں

جا کر داخل ہوگی ۔ نہیں نہیں صاحب من کیا بندوق پستول سمجھے ۔ بھائی جان نالش دا غنے والے ہیں ۔ ارے میاں کہو تو کس بات کی ۔ بات کیا وہی مدرستہ العلوم کا ٹرسٹیز پل دعوا یہ ہوگا کہ جو قانون بے ضابطہ منظور کرالیا ہے خارج کیا جائے۔

ہم تو سمجھے تھے کہ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب خاموش ہو رہے اور اس کے ساتھ ہی ممدوح ذرا ہماری نظر سے کچھ اُتر سے گئے تھے کیوں کہ جب اس طرح چپ ہو رہنے کا ارادہ تھا تو ٹھائیں ٹھائیں کیوں کی تھی ۔ گھر جانی من مانی باتیں سید صاحب جو کچھ چاہتے کرتے آپ خبر نہ ہوتے مگر نہیں، معلوم ہوا کہ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب بہادر بھی دُھن کے آدمی ہیں اور دُھن کیا انصاف بھی ہے۔ ارے بھائی سید محمود ہزار بار سکریٹری مقرر ہوں عمر بھر کے لیے نہیں قیامت تک کے لیے ۔ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب بہادر بھی تو کہتے ہیں کہ جب وقت آئے گا تو سب سے پہلے سید محمود کی نسبت رائے دینے والا میں ہی ہوں گا ـــــ گفتگو تو یہ ہے کہ جو کچھ تصفیہ ہو وہ باضابطہ ہو اس لیے بے شک مولوی سمیع اللہ خاں صاحب بہادر کو آخر تک کوشش کرنا چاہیے مگر اس کا خیال رہے کہ جھگڑے کا اثر سرسید کے سوا مدرسے پر نہ پڑنے پائے ۔

نوٹ

'فتنہ' کے معاصرینِ عہد کا یہ تذکرہ تصویر کے دوسرے رُخ کی حیثیت سے تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔

لوگ سرسید اور مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کے اختلافات بھول گئے ہیں لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اختلاف کے باوجود قانونی خانہ پُری کے بعد مسٹر محمود کے لیے سب سے پہلے رائے دینے والے وہی مخالف مولوی سمیع اللہ خاں ہیں اور مولوی سمیع اللہ خاں کے طرفدار بھی ۔ آخر یہ کہے بغیر باز نہیں رہتے کہ "جھگڑے کا اثر سرسید کے سوا مدرسے پر نہ پڑنے پائے "

۳۔ بیگم بھوپال

ہندستانی ریاستوں میں بھوپال کی یہ خصوصیت کہ وہاں نسلاً در نسلاً صرف بیگمات دادِ حکومت دیتی رہیں تاریخِ عالم میں ایک امتیازِ خاص رکھتی ہے اور ان بیگمات میں نواب شاہ جہاں بیگم کا عہد بالخصوص چند درچند اسباب سے قابلِ لحاظ ہے ۔

سب سے اہم بات یہ کہ بیگم نے اپنی خوشی اور اپنی پسند سے اپنا دُوسرا نکاح اس وقت کے ایک بڑے عالم مولوی صدیق حسن سے کیا۔

مولوی صدیق حسن صاحب دنیوی حیثیت سے بیگم کے مقابلے میں ایک معمولی حیثیت کے آدمی تھے لیکن ان کا مذہبی غلو اور علمی وقار بل کے ایک بیگم کیا ریاست کیا تمام ہندستان پر اس وقت ان کا سکّہ چلائے ہوئے تھا۔

ملکہ وکٹوریہ کے متعلق مشہور ہو کہ ایک مرتبہ انھوں نے اپنے شوہر کے کمرے میں داخل ہونا چاہا۔ شوہر نے پوچھا کون کہا ملکۂ انگلستان! شوہر نے اندر آنے کی اجازت نہیں دی اور پھر پوچھا کون؟ اب ملکہ نے کہا آپ کی کنیز۔ بس دروازے کُھل گئے۔

بیگم بھوپال بحیثیت ایک خودمختار حکمراں پہلے بے نقاب و حجاب رہتی تھیں مولوی صدیق حسن خاں نے شوہر کی حیثیت سے انھیں حکم دیا کہ پردہ کرو اور بیگم نے بحیثیت ایک فرماں بردار بیوی کے مدت العمر اس حکم کی پابندی کی۔

مولوی صدیق حسن کے مذہبی شغف سے عام مسلمانوں کو اختلاف تھا۔ ان کے انتقال پر مخالف اور موافق ہر قسم کی رائیں شائع ہوئیں۔

'فتنہ' ایک ظریف پرچے کی حیثیت سے ایسے موقع پر کب باز رہ سکتا تھا دیکھیے کیا بات میں بات پیدا کی ہو۔

(۱)

نواب صدیق حسن خاں کا ماتم ختم۔ دسویں بیسویں چالیسویں کا نام نہیں یہیں سے کہا جاتا ہو وہابیت میں زندگی میں بھی خرابی اور مرنے پر ہزار خرابی۔

وزارت کا وہ حال کہ کبھی تو نوابی کی گدی اور کبھی اصطبل کی سائیسی۔

نواب صاحب کے مرنے پر ایام عدت تک کے لیے وزیر کو کل نظم و نسق کا اختیار دیا گیا تھا مگر رزیڈنٹ صاحب بیچ میں کود پڑے وزیر کو باہر توقف کا حکم دے کے سرکار سے ملاقات کی۔ کہا جب تک

پ کام نہ کریں صاحب ایجنٹ انچارج رہیں۔ نواب شاہجہاں بیگم ایک عاقلہ انھوں نے فوراً جواب دیا میں برابر کام رتی ہوں اور کروں گی۔ ایجنٹ صاحب کے تکلیف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اس دن سے تمام کام روبکاری میں ہوتا ہو منشی امتیاز علی صاحب کو کیا ان کی وکالت سلامت ہو پھر لکھنؤ میں براجیں گے البتہ یہ حکومت یہ شان و شوکت جاتی رہے گی۔

(۲)

نواب صاحب کے انتقال کے بعد ایام عدت کے اندر بیگم صاحب نے محتاجوں کو جوڑے تقسیم کیے اس خبر پر "درات کے خواب" کی سرخی قائم کرکے 'فتنہ' نے ایک نوٹ لکھا۔

(۳)

یہ نوٹ دیکھ کر میر ناصر علی اڈیٹر "صلائے عام" دہلی نے اڈیٹر 'فتنہ' کو لکھا:-

" اُردو اخبار دیکھنے کا اگر کوئی نتیجہ نہیں تو بھی 'فتنہ' میں کوئی نہ کوئی بات ایسی نکل آتی ہو کہ مدت کی محنت ٹھکانے لگ جاتی ہو۔ 'فتنہ' میں ابھی "خواب" دیکھا واقعی غضب کا لکھا ہو۔ دیکھیں بھوپال سے کیا داد ملتی ہو۔"

فتنہ :- واقعی وہ مضمون اس مزے کا تھا کہ ناصر علی سا شہنشاہِ سخن اس کی داد دینے کو بے تاب ہو، راقم مضمون کے لیے یہ کیا کم خوشی کی بات ہو کہ ناصر نے داد دی۔

بھوپال سے داد کی کیا امید ہوسکتی ہو اور ہوسکتی ہو تو یہی کہ راقم مضمون کو بھی شاید کوئی نیا جوڑا مل جائے — لیکن ہم خوش ہوں گے اگر کوئی "پھٹا پُرانا" جوڑا ملے پھر کیا ہو ان کی بھی چاندی ہو۔

(۴)

بلا ہو گھر برا دشمن کے گھر سے ہ وہیں آبیٹھنا اُٹھ کر ادھر سے

والیۂ بھوپال نے بطور مالک کے ایک لاکھ دے کر شاہِ اودھ مرحوم کے محلات کلکتہ میں جگہ پائی ہو۔ ضعیف شاہِ اودھ کی حیات میں اگر یہ خواہش کی جاتی تو دینے کے بجائے کچھ لے کر جگہ مل سکتی تھی کیا اس عبارت کے کچھ معنی ہوسکتے ہیں اگر یہ کہا جائے کہ شاہِ اودھ محلات کی طرف سے بہت خوش نصیب تھے وفات کے بعد پُرانا محل

دے کر نیا محل پایا۔

(۵)

سچی محبت والی بی بیوں کی کیا بات ہی۔ والیۂ بھوپال کی سی بی بی خدا ہر ایک کو دے۔ میاں کی خطابی عزت جب لوح کسوٹ میں پڑی تو کیا کیا تعلق کا اظہار کیا کسی پہلو کسی کروٹ چین نہ تھا ہر وقت انتشار سے تلے اوپر لیکن تقدیر کی بات جیتے جی اولادِ زینہ کی طرح یہ تمنا بھی حاصل نہ ہوئی میاں جب جنت کو سدھارے تو کسی طرح گورمنٹ نے آنسو پونچھے۔ اس عزت کی خوشی بیگم کو اس طرح حاصل ہوئی جیسے بے باپ کے بیٹے کی یعنی اس بیٹے کی خوشی جو پیٹ میں ہو اور باپ چل بسے۔

گورمنٹ نے اجازت دی کہ مرحوم کا نام سرکاری کاغذوں میں عزت کے ساتھ لکھا جائے خیر یونہی سہی یہ تو کہنے کو ہوا۔ کہ بیگم نے کہا کرکے چھوڑا۔

۴۔ جسے داغ کہتے ہیں دوستو اسی روسیاہ کا نام ہی

دکن دال منڈی کے ناٹک میں رنڈیاں اکثر جناب داغ کی غزلیں گاتی ہیں اور ناٹک کی رونق اس سے اور دوبالا ہوجاتی ہی کہ آپ بھی چراغ بزم بنے ہوئے اپنا کلام سننے میں ہمہ تن محو ہوتے ہیں۔ ایک روز غزل گائی جاتی تھی جب مقطع کی نوبت آئی تو رنڈی نے " جسے داغ کہتے ہیں دوستو" گاتے ہوئے ساری محفل کو متوجہ کرکے داغ کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

اسی روسیاہ کا نام ہی

وہ فرمائشی قہقہہ پڑا کہ کچھ نہ پوچھیے۔ سنا ہی اس ذکر سے جناب داغ بہت چراغ پا ہوتے ہیں مگر اس سے زیادہ نیک اختری و خوش طالعی کیا ہوسکتی ہی کہ محبوب شاہی ناٹک میں اپنا مقبول کلام اس طرح سنا جائے۔ راقم فقیرؔ فتنہ۔ دال منڈی کے ناٹک میں رنڈی نے لفظِ روسیاہ سے یہ ضرور دکھا دیا کہ دال میں کچھ کالا ہی۔

۵۔ علامۂ منطقی

شمس العلما مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی سے کسی نے کہا کہ اگر بہشت میں کسی کو حقے کی خواہش ہوگی! وہ بھی میسر آسکے گا ارشاد ہوا بہشت میں حقہ میسر آنا تو ممکن ہی البتہ اس کے واسطے دوزخ سے آگ لانے کی

زحمت لازمی ہے۔

۶۔ گائکوار بڑودہ

ایک مرتبہ گائکوار بڑودہ کو ایک انگلش کنٹری ہاؤس کے کرسمس بال میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا ممبرانِ بال نے گائکوار کو ایک نہایت خوب صورت لیڈی سے مِلایا۔ گائکوار نے اس لیڈی سے استدعا کی کہ تم میرے ساتھ ناچو۔ لیڈی نے منظور کیا جب دونوں ناچنے لگے تو گائکوار کی نظر ایک ایسے افسر پر پڑی جو ہندستان میں ایک مرتبہ ان کو دھوکا دے چکا تھا۔ گائکوار نے اس خوب صورت رقّاصہ سے کہا تم اس آدمی کو جانتی ہو میں اسے نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ لیڈی نے کہا وہ تو میرے شوہر ہیں۔

۷۔ ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات

مولانا عبدالحلیم شررؔ مرحوم نے "دل گداز" کے اجرا کے ساتھ یہ جدّت کی تھی کہ سن محمّدی کے حساب (بجائے ہجری) سے اسے جاری کیا تھا اور اسی سن کے اعتبار سے مہینے بھی محرّم وغیرہ کے عوض "حمل" وغیرہ قرار دیے تھے۔۔

سنِ محمّدی کے ماہِ "حمل" کو 'فتنہ' لے اڑا اور اس کی آڑ میں 'دل گداز' پر ریویو کرتے ہوئے وہ وہ لُطف لیے ہیں کہ واہی واہ۔

"حمل" کے پہلے ہی روز 'دل گداز' نے پیٹ سے پاؤں نکالے۔ خدا مبارک کرے۔ ملک و قوم کو چاہیے کہ اسے کنارِ شوق میں لے۔ ایسے ہونہار ہزاروں دُعاؤں پر بھی میسّر نہیں آتے۔ آج شررؔ اپنی قوم و ملک کے دل دادہ و شیدا نہ ہوتے تو ترقّی کُن خیالات کے اعتبار پر اس پرچے کی اور ہی صورت ہوتی۔ اس ہونہار کو حمل کے پہلے ہی روز لندن میں اگر پیٹ سے پاؤں نکالنے کا اتفاق ہوتا تو اس کو کیا کچھ حقوق اور یورپین برکتیں نہ حاصل ہوجاتیں۔ یہ امر بلا زحمت ممکن تھا کیوں کہ حسنِ اتّفاق سے جنابِ شررؔ کو لندن میں ایک مناسب زمانہ گزارنے کا موقع حاصل ہوا تھا۔ یہ بھی ضرور ذہن میں ہو کہ 'دل گداز' کے نکالنے کا خیال لندن ہی میں انھیں آیا ہوگا اور وہ اس خیال کو دل میں چھپائے یہاں لائے۔ یہ امر کہ 'دل گداز' کو لندن میں نکالنے کے عوض جنابِ شررؔ نے دکن سے نکالا محض مُلکی و قومی فخر حاصل کرنے کے لیے ہے ورنہ ترقّی کُن خیال والے لوگ ہونہار اولاد کے لیے "حمل" کے آخری ایام ولایت ہی

میں گزرنا پسند کرتے ہیں۔ جنابِ شرر باوصف قیامِ لندن قریب ہی زمانے میں یہاں چلے آئے کہ 'دل گداز' دکن ہی سے نکالیں۔ خدا کرے یہ ہونہار پرچہ ان زیوروں سے ہمیشہ لدا رہے جو جنابِ شرر بہ طور ہدیہ و تحفہ اپنے ساتھ لائے ہیں۔

۸۔ چند تصویرِ بُتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

ڈیر فتنہ۔ شرخی کے شعر کے متعلق لکھنؤ میں نیز صفحاتِ 'فتنہ' میں عجب عجب روایتیں گھڑی گئی ہیں بعض حضرات میر علیہ الرحمۃ کی طرف اس شعر کو منسوب کرتے ہیں اور بعض صفدر مرزا پوری کو اس شعر کا مالک بتاتے ہیں یہ دونوں باتیں غلط ہیں اصل میں یہ شعر ہمارے دوست وحید مرحوم کی ابتدائی مشق کا نمونہ ہے۔

آپ ایک معزز وکیل کے صاحب زادے تھے فارسی بہ ما علنہ در عربی میں بھی کامل استعداد رکھتے تھے اور انگریزی میں انٹرنس پاس تھے۔ طبیعت بلا کی پائی تھی فنِ شعر میں مولانا محمد اسحاق صاحب دربھنگوی کے شاگرد تھے ابتدا میں جیسا کچھ وہ کہتے تھے مظفر پور کے لیے باعثِ فخر تھا آخر۔ آخر قیام پٹنہ میں جو ان کی شاعری نے پلٹا کھایا تو اور ترقی ہوئی۔ افسوس مرحوم کی موت نے جلدی کی کل تیس پینتیس[۳۵] برس کی عمر میں دارِ فانی کو چھوڑ کر عالمِ بقا کو سدھارے۔ انتہائی فکر کے چند شعر میری زبان پر مرحوم کے ہیں ناظرینِ فتنہ ملاحظہ فرمائیں: ؎

خدا حافظ ترا مجنوں میں جاتا ہوں بیاباں سے — کہ اب تو ہوگیا ہوگا یہی نقشہ مرے گھر کا

کس رنگ میں ان کو دیکھ پایا — اک عمر سے پھرتے ہیں برہنا

عدو کو یادگار اپنی وہی رومال دیتے ہو — یہ آنسو تم نے پونچھا تھا ہمارے دیدۂ تر کا

دو کوڑی کی بات

(خواجہ محمد عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی زبانِ اردو کے ایک "مصلح استاد" کے علاوہ لکھنؤ اور "لکھنویات" کے ماہر کی حیثیت سے بھی اپنے ثانی آپ تھے ——— آپ کا قلم لکھنؤ کے ہر تاریک رُخ

کا روشن پہلو دکھانے میں کمال رکھتا تھا یہاں کی بٹیر بازی اور کنکوے بازی تک میں فنی اصطلاحی معلومات کے علاوہ برسبیلِ تذکرہ جو حُسن آپ پیدا کرتے تھے وہ صرف آپ ہی کا حصّہ تھا ـــ ان مضامین کا دیکھنے والا بجا طور پر "عشرت" کو لکھنؤ کے دورِ گزشتہ کا ایک رونے اور رُلانے والا ادیب ہی سمجھ سکتا ہے لیکن "فتنہ" میں آپ کا ایک ظریفانہ "چٹکلہ" بھی نظر سے گزرا یہ مضمون ان کے مرتبے اور ان کی خصوصیات کے اعتبار سے تو کچھ نہیں لیکن ان کی شخصیت کے اعتبار سے ضرور محفوظ کر لیے جانے کے قابل ہے)

جو میونسپلٹی کا ممبر ہوکر قومی مرچ اور مذہبی تعصب نہ کرے اس کی بات دو کوڑی کی۔

جو رپورٹر ہوکر زیٹ نہ اُڑائے اس کی بات دو کوڑی کی ۔

جو بنگالی ہوکر سودیشی کا "کوڑیا غلام" نہ ہو اس کی بات دو کوڑی کی۔

جو والیے ریاست ہوکر رزیڈنٹ بہادر کی کٹ پتلی نہ ہو اس کی بات دو کوڑی کی ۔

جو رئیس ہوکر گورمنٹ سے اعلا خطاب حاصل کرنے میں تمام دولت کو "خال" سے نہ لگادے اس کی بات دو کوڑی کی۔

اس کا کیا علاج

(از "شوخ رقم" بدایونی)

(خاص خاص علمی اور ادبی حلقوں میں میر محفوظ علی بدایونی کی جو خصوصیات مشہور ہیں یہ مضمونچہ انھی خصوصیات کا حامل نظر آتا ہے ـــ ممکن ہے اپنی شہرت "محفوظ" رکھنے کے لیے گمنامی کا یہ "شوخ" پردہ انھی نے ڈالا ہو۔)

آج صبح خفیف حرارت قبل دوپہر یا بعدِ زوال۔ حسبِ ذیل اضافہ۔

ـــــ نہایت زور دار جاڑا۔ شدید تپ، سخت بے چینی، بھیجے میں درد، ہذیان سہ پہر کو ڈاکٹر صاحب آئے انھوں نے فیور مکسچر تجویز کیا جس میں لکر ایمونیا، فیبٹرک ایتھر وغیرہ کے سوا دو ڈرام سوڈا ٹارٹ جس سے ایک پاخانہ ہو دو چار منم اسپرٹ کلوروفارم جو کلیجے میں ٹھنڈک ڈال دے ـــ فیس لی چلتے پھرتے نظر آئے اسپرٹ نے جب اپنا اثر کیا تو اعزہ گھبرا اٹھے ـــ آدھی رات کو پسینہ آیا تو آنکھ کھلی بخار ندارد۔ بھوک موجود۔ کھانا حاضر خوب چکھا۔ صبح ہوئی پھر ڈاکٹر صاحب کو بلایا اور ان کی رائے سے ایک اونس مگنیشیا نوش کر گئے پھر کیا تھا اسہال جاری اس کے ساتھ ہی

تو بھی۔ دن بھر دست تو رات بھر دست تو۔ صبح تڑکے گجردم پھر ڈاکٹر صاحب آئے ان سے شکایت کی کہ دست بند نہیں ہوتے اسی خوف سے یونانی قدح نوشی سے پرہیز کیا تھا کہ خیرہ بنفشہ ملیّن نے اس فصل میں غضب ڈھایا ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے پھر نسخہ لکھا پینے کی دیر تھی کہ دست بند۔ دستوں کا رُکنا کہ قیامت آگئی دھڑیوں بخار ہذیان کے بدلے غفلت۔ سرسام دوڑ پڑا لینے کے دینے پڑ گئے اب سر پر برف باندھی جارہی ہو بھاپیے رکھے جارہے ہیں مگر یہاں کچھ بھی خبر نہیں۔ دو گھنٹے تک یہ کارروائیاں ہوا کیں اسی عرصے میں حضرت عزرائیل نے وقت لے کیا چھٹی پائی۔

اب آپ ہی فرمائیے کہ اس حال کا کیا علاج ہو۔ حقیقت یہ ہو کہ بدایوں شریف میں ان دنوں سردی گرمی نے مل کر اپنی وہ ہَوا باندھی ہو کہ یونانی حکیموں کی عقلوں میں چھید اور ڈاکٹروں کے حواس باختہ کردیے ہیں۔ موٹی سمجھ والوں کو اتحاد و اتفاق کی خوبیوں کا اندازہ کرنے کا موقع اس سے اچھا مشکل سے ہاتھ آئے گا شاید "چچا" نے اسی وقت کے لیے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ ع دو دل یک شود بشکنند کوہ را

حجاز ریلوے

(مسلمانانِ ہند کو مسلمانانِ عالم کی مصیبت میں شریک ہوتے تو ہم نے بھی دیکھا ہو اور ان کی یہ خصوصیت مشہور بھی ہو لیکن مولانا ظفر علی خاں کی یہ نظم اس موقع مسرت کی ہو کہ جس میں تمام دُنیائے اسلام شریک تھی) ے

تا بہ بطحا چوں براقِ آتشیں ریل آمدہ — ریوٹر برق آشیاں با ایں بشارت در رسید
اس خبر کا غلغلہ کون و مکاں میں پڑ گیا — ساری دُنیا کے مسلمانوں کے گھر ہو آج عید
شکر میں جانیں کریں اپنی نچھاور کلمہ گو — یہ وہ وقتِ مبارک، ہو یہ وہ آنِ سعید
اہلِ یثرب نے سنی انجن کی سیٹی کان سے — اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی بھلا کوئی نوید
خوش ہو اے اسلام پہنچی ہو ترے مرکز پہ ریل — جس کو کہنا چاہیے قفلِ تمدن کی کلید
فائدہ اس سے اٹھائے گا عجم بھی اس قدر — جس قدر ہوگا عرب اس کے اثر سے مستفید
بند سپہر اس نے کیے وہ رہگزر اور کوہسار — عقل جن کی مشکلوں سے ہوگئی تھی نا امید

اس سے انکار اب بھی ہوگا بعض لوگوں کو اگر
کیا کریں مجبور ہیں یہ واقعہ ہے چشم دید

کون ہے وہ جس نے ناممکن کو ممکن کردیا
کون ہے جس نے سیہ کو کر دکھایا ہے سپید

ابرِ رحمت بن کے برسا نائبِ ختمِ رسلؐ
سایۂ یزداں امیرالمومنیں عبدالحمید

جس سے قائم ہے مسلمانانِ عالم کا وقار
ہے مئے جاں پرورِ اسلام کی جس سے کشید

جان کو اس کی ارادت سے ہے جتنا اتحاد
جسم سے ہرگز قریب اتنی نہیں حبل الورید

اے خدائے ذوالجلال اپنی کتابِ پاک میں
قربِ نصرت کا دیا تو نے ہیں قولِ سدید

آیۂ لَیَسْتَخْلِفَنَّ کو نہیں بھولے ہیں ہم
لام نے بخشا ہے جس کو حُسنِ تاکیدِ اکید

کرچکا ہے گرچہ تو وعدہ یہ پورا ایک بار
اور ہیں اس میں نہیں ہے موقعِ گفت وشنید

ہوچکے ہیں ایک بار اقوام میں ممتاز ہم
علم وحکمت میں فرید اور جاہ وحشمت میں وحید

ہم میں پیدا ہوچکے ہیں سنجر و اورنگ زیب
ہم میں ظاہر ہوچکے ہیں بوعلی و بایزید

تیری رحمت کی نہیں لیکن کوئی حد وحساب
کس لیے ہو پھر نہ ہم کو خواہشِ لطفِ مزید

بخشی قوت ہے یارب گر تجھے اسلام کو
جو نہیں ہرگز تری فرطِ عنایت سے بعید

عمر امیرالمومنیں کو دے صد وسی سال کی
دیر تک ہو سایہ افگن ہم پہ یہ فردِ فرید

عذرِ لنگ

"اکبر الہ آبادی مرحوم کا یہ قطعہ ؎

آتا نہیں ہے مجھ کو قبلہ قبلی
بس صاف یہی ہے کہ بھائی شبلی

تکلیف اٹھاؤ آج کی رات
کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات

حاضر ہے جو کچھ کہ دال دلیا
سمجھو اسی کو پلاؤ قلیا

مشہور ہے، لیکن اس کا جواب علامہ شبلی نعمانی کی زبان سے اب سنیے۔ شبلی مرحوم کا یہ عذر واقعی پاؤں کے سلسلے میں تھا۔"

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال
لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ معذور ہوں میں

آپ کے لطف و کرم سے مجھے انکار نہیں
حلقہ در گوش ہوں ممنون ہوں مشکور[1] ہوں میں

مگر اب میں وہ نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا
اب تو اللہ کے اقبال سے تیمور ہوں میں

دل کے بہلانے کی باتیں ہیں یہ شبلی. ورنہ
زندہ در گور ہوں مرحوم ہوں مغفور ہوں میں

فتنہ ۔ مشکور بمعنی شکرگزار غلط ۔

اولڈ بوائے

مولانا شوکت علی نے علی گڑھ کو یونی ورسٹی بنانے میں ایک ان تھک کھلاڑی کی طرح جو محنت کی وہ ایک ہی ثبوت مادرِ کالج سے ان کی محبت کا نہیں ہو۔

علی گڑھ کی اس زمانے کی زبان "اولڈ بوائے" کا دوبارہ اجرا بھی زیادہ تر انھی کی سعی و تحریک کا رہینِ منت تھا ۔

شوکت علی کے خواب کی مجسم تعبیر محمد علی اسی اولڈ بوائے کا خیر مقدم کر رہے ہیں ۔

ایک میدان کا سپاہی ایک رزم کا سورما دیکھیے بزم میں کیسے نرم لہجے میں دادِ شیریں بیانی دے رہا ہو۔

زمانہ جن کو بھلا چکا تھا وہ پھر فسانے سُنائے تو نے
ہوئے تھے جو دل سے محو نقشے ہیں دوبارہ دکھائے تو نے

بہت سنبھل کر بگڑ گئے تھے ہزاروں مل کر بچھڑ گئے تھے
بہت سے بگڑے ہوئے سنبھالے بہت سے بچھڑے ملائے تو نے

سبق اخوت کا بھول بیٹھے تھے گُم ہوئی تھی کتابِ اُلفت
پڑھایا آموختہ دوبارہ پُرانے گُر پھر بتائے تو نے

یگانے بیگانے ہوگئے تھے رہی تھی یاروں میں بھی نہ یاری
مگر بلا کا اثر ہو تجھ میں پرائے اپنے بنائے تو نے

ہَوا تغافل کی چل رہی تھی چمن میں مُرجھا رہی تھیں کلیاں
ہَوا چلائی کچھ ایسی آکر کہ سوکھے غنچے کھلائے تو نے

اگرچہ تھے کچھ نیاز والے مگر زیادہ تھے ناز والے
نیاز والوں کو گر نوازا تو لاکھوں روٹھے منائے تو نے

کہیں قیامت کا صور پھونکا کہیں پکارا کہ قم باذنی
ہزاروں سوتے جگائے تو نے ہزاروں مُردے جلائے تو نے

مگر یہ طرفہ ہو ابرِ رحمت چلا ہو کاشی سے سمتِ "کول"
یہ کیسی گنگا بہائی اُلٹی یہ کیا کرشمے دکھائے تو نے

---

[1] دیکھو "فتنہ" کا نوٹ

مرزا قتیل کا وطن

(بہ قلم مولوی سید ہاشمی صاحب فریدآبادی)

مرزا غالب مرحوم نے کلکتہ کے ادبی مناظروں میں کہا تھا کہ قتیل، فریدآباد کا کھتری تھا، مَیں اسے فارسی میں سند نہیں مانتا۔ انھوں نے یہی بات بعض خطوں میں بھی تحریر کی ہے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے اُن کے معاصرین میں سے کسی نے ان کو نہیں ٹوکا کہ آپ قتیل کا وطن فریدآباد کس طرح بتاتے ہیں؟ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ بلا وجہ "فریدآباد" کا نام کیوں لے دیتے! پنجابی، پوربی، یا محض ہندی اور کھتری کہ دینا اُن کے استدلال کے لیے کافی ہوسکتا تھا۔

مرزا غالب کو مرے ہوئے اسّی سال گزر چکے اور ان کی تعریض قریب ایک صدی کے پرانی ہوگئی۔ لیکن حال میں پھر یہ سوال تازہ کیا گیا ہے کہ قتیل کا وطن یا اصل مولد کہاں تھا؟

رسالۂ نگار، لکھنؤ کے ایک مقالہ نگار (مالک رام صاحب) نے قتیل کا خاندانی شجرہ بٹالہ (ضلع گرداس پور) سے بہم پہنچایا اور تحریر فرمایا کہ اس کے باپ کا نام درگاہی مل مسلّم ہے اور یہ نام سوائے پنجاب کے اور کہیں نہیں رکھا جاتا ـــــ اتفاق دیکھیے کہ اس وقت بھی فریدآباد کے جاٹ ذیل دار کا نام "درگاہی سنگھ" ہے۔ مذکورہ بالا شجرے میں "سنگھ" والے کئی نام درج ہیں۔ خود قتیل کا خاندانی نام دیوالی یا دیوانی سنگھ تھا۔

قتیل کے آبا و اجداد کی نسبت عام طور سے تسلیم ہے کہ ذات کے کھتری اور پہلے بٹالہ (پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ لیکن اس کے "جدِ سوم" یعنی پردادا نے دہلی کے قریب قصبۂ باغ پت میں سکونت اختیار کی اور اس طرح یہ خاندان پنجاب کی بجائے دہلی یا اس کے مضافات کا باشندہ ہوگیا۔

رسالہ نگار (جون ۱۹۴۴ء) میں مختارالدین صاحب آرزو نے بڑی محنت اور قابلیت سے قتیل کے حالات مختلف تذکروں سے جمع کیے ہیں اور زیادہ وثوق سے عاشقی عظیم آبادی کی شہادت پیش کی ہے جو قتیل کا ہم عصر اور اس کے ساتھ خط کتابت رکھتا تھا اور بڑی تفصیل سے اُس کے حالات تحریر کرتا ہے۔ اس نے قتیل کی ولادت

شاہجہاں آباد (دہلی) کی بتاتی ہے۔ بعض اور معتبر تذکرے بھی اس کی وطنیت اور ابتدائی نشوونما، دہلی کی تحریر کرتے ہیں مختارالدین صاحب کا بھی یہی خیال معلوم ہوتا ہے اور ہمیں ان کی تائید کرنے میں عذر نہیں، لیکن مضمون کے آخر میں جو وہ سوال کرتے ہیں کہ "آخر یہ فریدآباد اس کا وطن کیسے ہوگیا؟" جواب میں عرض ہے کہ اُس کے دہلوی کہلانے اور فریدآبادی ہونے میں کوئی تناقض نہیں ہے کیوں کہ فریدآباد، دہلی کے مضافات میں داخل اور دریاے لطافت میں اس کا نام نظام الدین، مہرولی وغیرہ کی طرح دہلی کے محلوں اور بازاروں کی ضمن میں تحریر کیا گیا ہے۔ (باب سوم۔ فصل اول) اور یہ وہ کتاب ہے جس کے آخری دو باب خود مرزا قتیل نے لکھے تھے۔

تاریخوں، تذکروں سے قطع نظر خود فریدآباد کا محلِ وقوع اور دہلی سے تعلقات ایسے رہے کہ اگر کوئی تذکرہ نویس قتیل کو ایک نواحی بستی کی تفصیل لکھنے کی بجاے، اجمالاً دہلوی لکھتا ہے تو اُسے غلط نہیں کہ سکتے۔

فریدآباد میں اس وقت بھی ایک کھتری خاندان موجود ہے جو کئی پُشت سے یہاں بود و باش رکھنے کے باوجود "دِلوال" یعنی دہلوی کہلاتا ہے اور اس کے خاندانی تعلقات نیز مذہبی مراسم اور تعلیم و تربیت اکثر شہر دہلی سے وابستہ رہے ہیں۔ چالیس پچاس برس پہلے تک ان کی تعلیمی اور ادبی زبان فارسی تھی اور اس سے ایک صدی پہلے یعنی قتیل سے کچھ بعد زمانے میں ان کی شاعری اور زبان دانی فریدآباد میں مسلّم تھی جیسا کہ قدرت اللہ قاسم وغیرہ بعض معاصرین کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے[1] قرینہ کہتا ہے کہ قتیل اسی خاندان سے تھے اگرچہ جوانی میں مسلمان ہوجانے کی وجہ سے ان کا اپنے خاندان سے قطع تعلق ہوگیا اور باقی عمر بھی انھوں نے سیر و سیاحت میں اپنے وطن سے باہر بسر کی۔

بہرحال اتنا یقینی ہے کہ غالب نے جو قتیل کے قریب العصر اور دہلی کے رہنے والے تھے، اس کے فریدآبادی ہونے کا حال کسی سے سُنا ہوگا۔ ورنہ خود وہ اس کا وطن تصنیف کرتے، یہ بہت بعید از قیاس بات ہے۔ پس جب تک ان کے کسی ہم عصر کی تردید میسر نہ آئے ہم حالیہ ردّ و قدح کو ان کے بیان کی تکذیب کے لیے کافی نہیں سمجھتے۔

---

[1] مثلاً دیکھو مجموعۂ نغز حالات عبدالصمد فدا فریدآبادی

تبصرے

ادبیات

اُردو غزل اور اس کی نشو و نما (سید رفیق حسین الہ آباد)

اس تحقیقی و تنقیدی مقالے میں جو جامعۂ الہ آباد کی ڈی، فل کی ڈگری کے لیے پیش کیا گیا ہے مصنف نے ابتدائی زمانے سے ۱۸۵۷ء تک اُردو غزل کی نشو و نما دکھائی ہے، جیسا کہ عنوان کی وسعت اور خود کتاب کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے مصنف نے اصل مآخذ کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے اور ان کی تلاش میں مختلف جہات میں شدِّ رحال بھی کیا ہے مگر ہماری رائے ناقص میں ان کی محنت کوہ کندن و کاہ برآوردن کے مصداق ہے، اُردو غزل کی تدریجی ترقی اور عہد بہ عہد کی تبدیلی جو اصل موضوعِ کتاب ہے محض ثانوی اور ضمنی درجہ رکھتی ہے، کُل مدت کو چھ دوروں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر دَور کے آخر میں دو دو تین تین صفحات میں عام خصوصیات کے عنوان سے غزل کا لفظی و معنوی تجزیہ کر دیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ اس سطحی تبصرے و تحلیل میں دادِ تحقیق کہاں تک دی جا سکتی ہے، تمام تر وہی خصائص جو متداول ادبی تاریخوں میں ملتے ہیں بہ اختلافِ الفاظ نقل کر دیے ہیں۔

رفیق صاحب نے ہر دَور کے ممتاز شعرا کے خد و خال، تحقیقِ نسب، حالاتِ زندگی، افتادِ مزاج وغیرہ کا شرح و بسط سے تذکرہ کیا ہے مگر کلام کی تنقید محققانہ شانِ نہیں رکھتی، موضوع کے لحاظ سے واجب تھا کہ ہر دَور کے شعرا کے کلام سے سیرِ حاصل بحث کی جاتی اور مقابلہ و موازنہ کیا جاتا، ہر شاعر کی فرداً فرداً سوانح نگاری خارج از موضوع ہے۔

مصنف نے دیباچے میں اپنے انکشافات کی جو فہرست دی ہے وہ فی نفسہٖ کتنے ہی وقیع اور مہتم بالشان سہی مگر ان کے مقصد سے زرا نسبتِ بعید ہی رکھتے ہیں مثلاً 'دیوانِ غالبؔ' کی طبعِ اوّل کے بارے میں کچھ معلومات' (۲) میرؔ و ناسخؔ و آتشؔ کے کچھ نئے حالات۔ (۳) جرأتؔ کے مراثی وغیرہ کی سراغ رسانی؛ (۴)

قلی قطب شاہ کے تخلصوں کی تحقیق وغیرہ وغیرہ۔

کتاب کے شروع کے پانچ بابوں میں کوشش کی گئی ہے کہ مشہور مغربی نقادوں کی تعریفِ شاعری نقل کرکے محاکمہ کیا جائے۔ نیز اُردو، عربی، فارسی، ہندی اور روسی و ترکی غزلوں سے بحث کی ہے مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ حصہ بیش تر خام اور کہیں کہیں مہمل ہے مثلاً جہاں فلسفیانہ شعر کے حدود بیان کیے ہیں یا میتھیو آرنلڈ اور ارسطو کے نظریاتِ شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ جہاں کسی شعر کے مطالب بیان کرنے میں اُپج کی لی ہے وہاں کہنا پڑتا ہے کہ شعرفہمیِ عالم بالا معلوم شد۔ ص۵۹ پر ے

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند الخ کی شرح ، ے

محرم نہیں ہے تو ہی نواہاے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

کی تعریف میں رفیق صاحب فرماتے ہیں کہ اس شعر کا صحیح لطف علمِ لاسلکی کے وجود میں آنے کے بعد اُٹھایا جاسکا ہے، آج سے صرف دس برس پہلے بھی پوری طرح حظ حاصل نہیں ہوسکتا تھا !!! آتش کی ایک غزل نقل کرکے فرماتے ہیں آتش کے متصوفانہ کلام کی وہی داد دے سکتے ہیں جو ڈیکارٹ، سپنوزا اور لائبنٹز کے فلسفۂ مابعدالطبیعات سے آشنا ہیں !!! العجب ثم العجب، ایک نئی تحقیق یہ بھی ہے کہ غالب کے بعض بہترین اشعار میرحسن کے اشعار سے ماخوذ ہیں، مستقبل میں غزل کی از سرِ نو مقبولیت و ترقی کی بہت پُرلطف توجیہ کی گئی ہے، از روے ارتماطیقی ثابت کیا گیا ہے کہ چوں کہ غزل پہلے اور دوسرے دور کے بعد تیسرے دور میں اور چوتھے پانچویں دور کے بعد چھٹے دور میں چمکی ہے (اس لیے نواں دور آنے پر) "بیسویں صدی کے آخر میں غزلوں کی طرف پھر رجحانِ طبع کا ہونا لازمی ہے"۔

بارھویں باب میں لکھنؤ اور دلی کی غزل گوئی کا موازنہ کیا گیا ہے اور لکھنؤ کی غزل گوئی پر شعرالہند کے اعتراضوں کا الزامی جواب دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اس قدر عرض کرنا کافی ہے کہ چوں کہ اعتراضات ناسخ و آتش اور ان کے شاگردوں کے کلام پر وارد ہوتے ہیں اس لیے مماثل اشعار دلی کے ہم عصر شعرا کے دینے مناسب تھے، دورِ ماسبق کے شعرا میر، سودا اور انشا کے مبتذل اشعار پیش کرنا زرا زیادتی ہے۔

(ش - ح)

مداوا (فرقت کاکوروی، یوسفی پریس، لکھنؤ، للعہ)

ادبی بے راہ روی کی اصلاح کا ایک موثر نیز پُرلطف طریقہ یہ ہے کہ کسی مصنف کی خامیوں پر اعتراض د

نکتہ چینی کرنے کی بجائے خود اسی رنگ میں اس انداز پر لکھا جائے کہ اس اسلوب کی بے اعتدالیاں مضحکہ خیز حد تک نمایاں ہوجائیں، اگر خاکہ اُڑانے میں دل آزاری کا پہلو نہ ہو تو مصنف ان غلطیوں کو جن کی طرف خود اس کی نظر کبھی نہیں گئی تھی درست کرلیتا ہو، فرقت کاکوروی صاحب نے اسی قسم کی کوشش کی ہو مگر ہماری دانست میں وہ ترقی پسندوں کو اعتدال پر لانے میں خود جادۂ اعتدال سے منحرف ہوگئے ہیں۔ انھوں نے موجودہ ترقی پسند شاعری کو عروض، ترنم، خوش آہنگی اور موسیقیت سے آزادی، اصولِ زبان سے بےزاری، نظمِ اُردو کے مناہج ارتقا سے روگردانی، جدید ترین مغربی ادب کی کورانہ تقلید، مسخ شدہ انقلابی خیالات کی تبلیغ، مبہم تحت الشعوری کیفیات کے مہمل بیان اور شہوانی جذبات کے بےشرمانہ اظہار کی مرادف ثابت کرنے کی کوشش کی ہو مگر فرقت صاحب نے اس مجموعے میں ایسے مضامین بھی شامل کیے ہیں جن کا موضوع زیادہ وسیع ہو اور جن میں جدید ادبی نظریات کی معقولیت ہی سے سرے سے انکار کیا گیا ہو مضامین کے انتخاب میں زیادہ سلیقے کی ضرورت تھی، بہت سے مضامین تو ایسے ہیں جو داخلِ کتاب کرنے ہی نہیں چاہیے تھے اور بعض میں ایک ہی بات کی مختلف پیرایوں میں تکرار ہو، معلوم ہوتا ہو کہ یہ کتاب عجلت میں مرتب کی گئی ہو، فرقت صاحب کی نظموں میں بھی بدیہہ گوئی کی خامی نظر آتی ہو، قلم برداشتہ لکھنے کی وجہ سے ان کی نظمیں محض بےتکی ہوکر رہ گئی ہیں ترقی پسند شاعری کا پوُرا پوُرا دھوکا نہیں ہوتا ع عیبہا جملہ شمر دی ہنرش نیز بگو۔

بہرنوع فرقت صاحب کی سعی مستحسن ہو اور امید ہو کہ مشکور بھی ہوگی، پاکیزہ مذاق طبقے میں جدید مزخرفات کبھی مقبول نہیں ہوئی تھیں مگر ضرورت تھی کہ خود ترقی پسند شاعر اپنے آئینے میں اپنی صورت دیکھیں اور تجدد پسند طبقہ اس بدعت پر متنبہ ہو۔ اس کتاب میں نیاز فتح پوری، سید مسعود حسن رضوی، رشید احمد صدیقی، جعفر علی خاں اثر۔ اور عندلیب شادانی کے مضامین سنجیدہ تنقید کے نمونے ہیں۔ خود سجاد ظہیر صاحب جو اس تحریک کے امام رہ چکے ہیں موجودہ روش کو مذموم قرار دیتے ہیں۔

آخر میں اتنا عرض کردینا کافی ہو کہ اس کتاب کا مطالعہ ترقی پسند شاعری کے مخالفوں اور موافقوں دونوں کے لیے سودمند ہوگا۔

(ش۔ ح)

نورتن یا ایک ایکٹ کے ڈرامے

(مصنفہ علی عباس حسینی، مکتبۂ جامعہ لکھنؤ، عہ)

اس گل دستے میں چھ ڈرامے تاریخی ہیں اور تین سماجی، مگر سب میں

جو چیز مشترک ہی وہ مصنف کی حب الوطنی ہو، تاریخی ڈراموں میں گوتم بدھ کے طریق تبلیغ، بغرا خاں کی پدری شفقت اور کیقباد کی سعادت مندی، جلال الدین خلجی کی سادہ لوحی اور علاء الدین کی محسن کشی، بابر کی ہمایوں پر سے جاں نثاری، سوتیلی ماں کی دسیسہ کاری سے تنگ آکر شیر شاہ سوری کی آبائی جاگیر سے دست برداری اور مُلک گیری کی ابتدا اور چاند بی بی کی شجاعت و سرفروشی کی حکایتیں بہت سادہ مگر دل چسپ پیرایے میں بیان کی ہیں جن کو پڑھ کر بچوں، بڑوں اور بوڑھوں سب کے دل میں شاہان سلف کی سچی قدر و منزلت پیدا ہوتی ہی۔

دل بہلاوا، سوانگ اور کیڑا تینوں اپنی اپنی جگہ خوب ہیں، اوّل الذکر مزاحیہ ہی جس میں یہ دکھایا ہی کہ خانہ نشین مستورات گھر بیٹھے کس طرح وقت گزاری بلکہ تفریح طبع کے سامان کرلیتی ہیں، سلما کی گفتگو نہایت چٹخارے دار اور بامحاورہ ہی۔

سوانگ مزاحیہ نیز اصلاحی ہی جس کا لب لباب یہ ہی چھوت چھات اور جات پات کی سختی بحالہ ہی صرف اس قدر ہوا ہی کہ اعلا طبقے کو اس کا احساس پیدا ہوا ہی اس خیال کا حقیقت بننا ابھی دور ہی۔

کیڑا میں اس ناقابل انکار حقیقت کو افشا کیا ہی کہ ازدواج کا حقیقی مقصد نفس پروری و عیش کوشی نہیں بلکہ افزایش نسل اور عورت کی خواہش اُمومیت کی تسکین ہی۔

کتاب میں ایک آدھ بات کھٹکتی ہی مثلاً جذباتی میں کیقباد کی محفل نشاط میں خواجہ حافظ کا جو زمانۂ مابعد کے شاعر ہیں شعر کیقباد سے پڑھوانا محل نظر ہی، ہر ملک ملک ماست میں خواطی سلیمان کی بلائیں لے کر اس کے سر پر تاج دیکھنے کی آرزو کرتی ہی حالاں کہ سلیمان کا باپ فرید خاں موجود ہی، بہ الفاظ دیگر فرید کو منہ در منہ کوستی ہی۔

فی الجملہ کتاب قابل تحسین ہی۔　　　(ش - ح)

نراس

(مصنفہ نور الحسن، حیدرآباد بک ڈپو، عہ)

ہمیں بادل ناخواستہ کہنا پڑتا ہی کہ اس مجموعے میں تمام کہانیاں معمولی درجے کی ہیں، قصے وہی فرسودہ ہیں کہ غریب لڑکی کی امیر رشتے داروں میں شادی نہیں ہوسکتی، لڑکا اور لڑکی دونوں آتش فراق میں جلتے ہیں، بے زبان لڑکی کی شادی کردی جاتی ہی مگر لاج کی ماری خوش اسلوبی سے نباہتی ہی گویا بہ یک وقت دو مردوں سے خالص محبت کرنے کا معجزہ دکھاتی ہی، یا یہ کہ عورت شوہر کے چال چلن پر بے جا شبہ کرتی ہی اور غلط فہمی کی بنا پر خودکشی کر بیٹھتی ہی، یا اس

کے برعکس شوہر معصوم بیوی کی پاک دامنی پر شک کرتا ہو اور آتشِ حسد سے بھڑک کر بیوی کو زد و کوب کرتا ہو حتیٰ کہ بیچاری موت کے گھاٹ اُتر جاتی ہو وغیرہ وغیرہ۔

مصنف نے بعض جگہ ٹھیٹ دکنی محاورے استعمال کیے ہیں، ہم مقامی بولیوں کے محاورات یا الفاظ برتنے کے خلاف نہیں، بہت سے دیہاتی الفاظ ایسے ہیں کہ کتابی اُردو میں ان کے مُرادف موجود نہیں، اسی خیال کو کسی اور پیرایے میں ادا کیا جائے تو ایک کی جگہ کئی لفظ لانے سے بھی وہ لُطف نہیں آتا کیوں کہ بلاغت مفقود ہوجاتی ہو مگر ہم ست بچھڑی اُردو کے ضرور خلاف ہیں۔ نورالحسن صاحب نے اس کتاب میں شمالی ہند کی زبان لکھی ہو اور خصوصًا دلّی کے محاورات برتے ہیں اس میں دکنی محاورات کا پیوند ان مِل بے جوڑ ہو مثلاً بھگت کاڑنا، کھڑے اُدبھے، اَیا اَبا (کلمۂ استعجاب)، ننھی پاپا، حسبہ، وغیرہ مقامی الفاظ کا صحیح مصرف مقامی رنگ پیدا کرنا ہو۔

بیانِ حکایت میں ضعفِ تالیف بھی پایا جاتا ہو مثلاً عمرِ رفتہ میں لئیق کو سلما کی بچپن کی سہیلی بتایا جاتا ہو مگر سلما اس کے سامنے اپنی ساری داستان اس طرح بیان کرتی ہو جیسے لئیق اس سے قطعًا ناواقف ہو، ایک موقع پر سلمان، سلما کو اسٹیشن پہنچانے آتا ہو، گاڑی روانہ ہونے کے کچھ دیر بعد رُک جاتی ہو، معلوم ہوتا ہو کہ ایک نوجوان جو دُلھن کو بیاہ کر لے جارہا تھا ریل میں سے گر کر مرگیا، سلما کو وہم ہوتا ہو کہ دولھا سلمان تو نہیں ہو جس نے زبردستی شادی ہونے پر گر کر جان دے دی ہو، تعجب ہو ایک گھنٹے کے اندر سلمان کی شادی بھی ہوگئی اور وہ اسی چلتی گاڑی میں برات لے کر بیٹھ بھی گیا تھا!!! (ش۔ ح)

ہماری گلی

(احمد علی، انشا پریس، دہلی، قیمت ۱۲؍)

احمد علی صاحب ترقّی پسند اُدبا کے زمرے میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، ان کی شہرت ہندُستان سے نِکل کر انگلستان تک پہنچ چکی ہو کیوں کہ ان کے افسانے اور مضامین جو اکثر اُردو سے ترجمہ ہوتے ہیں انگریزی کے موقّر رسائل میں چھپتے رہتے ہیں، ان کا ناول Twilight in Delhi. انگریزی حلقوں میں مقبولیت پاچکا ہو، اُردو داں طبقے میں بھی ان کی تحریروں کا چرچا ہو بلکہ آج سے بارہ سال قبل "انگارے" میں جو ان کے مضامین نکلے ان پر ہنگامہ بپا ہوچکا ہو۔ جنسیاتی مسائل کا بے باکانہ بیان آپ کی خصوصیت ہو مگر غنیمت ہو کہ مرورِ زمانہ اور پختہ سالی کے ساتھ ان کی تحریروں میں عریانیت کا عنصر کم ہوتا جارہا ہو، تاہم اِس نقص یا

وصف سے قطعِ نظر احمد علی صاحب کی کہانیوں میں جو شگفتگی و تازگی اور ماحول نگاری کا لُطف ہی وہ جدید انگریزی ادب میں عام سہی مگر اُردو میں اب بھی شاذ ہی۔

زیرِ بحث کتاب 'ہماری گلی' ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۳ء تک کے سات افسانوں کا مجموعہ ہی، جن میں بہترین ہماری گلی اور میرا کمرہ ہیں جو مختلف رسائل میں چھپ کر خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ میرا کمرہ میں موچی کی اور ہماری گلی میں مرزا دودھ والے، شیرا چنے والے اور نثار احمد موذن کی قلمی تصویریں ناقابلِ فراموش ہیں۔ میرا کمرہ میں جزئیات و تفصیلات نہایت خوبی سے بیان ہوئی ہیں خصوصاً شیطان اور لینن کا مکالمہ لُطف سے خالی نہیں، مگر افسوس ہی کہ مکالمہ تشنہ رہ گیا ہی مزید تبادلۂ خیالات دِل چسپ رہتا۔

مارچ کی ایک رات مجموعے میں سب سے لمبی کہانی ہی جس میں مصنف کا اصل رنگ عود کر آیا ہی، شاہدانِ بازاری کی زندگی کی جھلک واقعیت پر مبنی ہی اور اس طبقے سے نفرت دلانے کی بجائے اس پر رحم دلاتی ہی، اگر دو چار عریاں جُملے حذف کر دیے جاتے تو افسانے کی معنوی خوبیوں میں کوئی فرق نہ آتا۔

شکنتلا اور مسٹر شمس الحسن معمولی درجے کی کہانیاں ہیں۔ شکنتلا کی موت ناقابلِ یقین ہونے کی حد تک سفاکانہ ہی بے موقع نہ ہوگا اگر آخر میں انشا کے بارے میں کچھ عرض کیا جائے، گو زبان بہت خوب ہی مگر جملوں کی بندش کہیں کہیں چست نہیں ہی، صرف ربط اور ضمائر کی کثرتِ استعمال سے روانی میں کمی آگئی ہی، بعض الفاظ کا اِملا غلط ہی مثلاً کوابی، عزیز خیراتی، تن و مند محل میں مُدت لگ گئی، مغلّے زاد گالیاں، مطین، نیز ایک ادیب کے قلم سے "خرامہ روی سے ٹہلنا" نکلنا محلِ تعجب ہی، ایک جگہ ہٹلر کو اختناقی لکھا ہی، ذہن مرضِ اختناق الرحم کی طرف منتقل ہوتا ہی مگر اختناقی سے Hysteric. مراد لی ہی۔

سوا سو سے کچھ اوپر صفحات کے کتابچے کی قیمت ۱۲/۲ ذرا زیادہ ہی۔

(ش۔ ح)

سنگ و خشت

(مصنفہ کنہیا لال کپور، صفحہ ۱۵۸، مکتبۂ جدید لاہور، قیمت ۲/۸)

طنز قوم کے اخلاقی معائب، افراد کے نقائص، سیاسی بدعنوانیوں اور ادبی بے راہ رویوں کی اصلاح کا نہایت موثر و مجرب پیرایہ ہی، مگر طنز نگاری میں جادۂ اعتدال پر قائم رہنا نہایت مشکل ہی، اس کی شرطِ اولین یہ ہی کہ مصنف کی نیت خالص ہو یعنی مقصود بالذات تضحیک یا دل آزاری نہ ہو بلکہ غلطی پر متنبہ کرنا ہو،

طعنہ زنی سے کج روی پر مُصر کرنا نہ ہو بلکہ غیرت دلا کر راہِ راست پر لانا ہو، کنہیالال کپور صاحب کی کتاب سنگ و خشت اس اصول کا مصداق ہو، صاحب موصوف خود جواں سال انگریزی داں ادیب ہیں، چناں چہ انھوں نے اردو افسانہ نویسی اور جدید شاعری کی بے اعتدالی کا جو پُر لطف خاکہ اُڑایا ہو اُسے تعصب یا قدامت پرستی پر مبنی نہیں کہا جاسکتا بلکہ اس پر سے کیا لطف جو غیر پردہ کھولے ۔۔ جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے کا صادق آتا ہو ترقی پسند حضرات پر اُن کی تنقید مزاح آمیز مگر منصفانہ ہو، ان مضامین کا اصل مقصد آپ کی تفریح طبع ہو مگر ان کا مطالعہ فائدے سے بھی خالی نہیں۔ مثلاً علامہ ظہور میں ہماری مخصوص مُردہ پرستی کا اچھا مذاق اُڑایا ہو۔ اسی طرح اپنے وطن میں سب کچھ ہو پیارے میں ظرافت و سنجیدگی دونوں سموئے ہوئے ہیں شاعروں کی بھرمار، ادب کی ناقدری، تنقید کی پستی، فرقے دارانہ بھوٹ پر جائز چوٹیں کی ہیں۔ حفیظ جالندھری کے جس بند پر مضمون کی تان توڑی ہو اس میں لطیف طنز پنہاں ہو۔ اردو افسانہ نویسی کے چند نمونے اور فرقت صاحب مصنفِ 'مداوا' کے رنگ میں غالب جدید شعرا کی مجلس میں بہترین مضامین ہیں، قومی لباس میں خاصی جدت پائی جاتی ہو۔ ہندو مسلمانوں کی کج بحثی اور ہماہمی کا ظریفانہ انداز میں نقشہ کھینچا ہو۔

کپور صاحب جوہرِ قابل رکھتے ہیں نقشِ اوّل بتا دیتا ہو کہ مشقِ سخن جاری رہی تو نقشِ ثانی اس سے بہتر ہوگا۔ اگر زبان کی طرف توجہ کی جاتی تو انھی مضامین کا لطف دوبالا ہوجاتا۔ "ہم نے مسافر خانے یا ہوٹل میں ایک آدھ گھنٹے ٹھہرنا ہو۔" یا "قریب المرگ" یا "ایک بات مجھے سمجھ نہیں آتی" وغیرہ وغیرہ کو آپ کیا کہیں گے۔ کپور صاحب سے یہ شکایت کہ وہ انگریزی میں سوچ کر اردو میں لکھنے کی وجہ سے کبھی کبھی انگریزی محاوروں کا "تحت اللفظ" ترجمہ کرجاتے ہیں فضول ہو کیوں کہ آج کل جدید مصنف الا ماشاء اللہ سب اس میں مبتلا ہیں۔ دل چسپی لینا نتیجے پر پہنچنا اسی قبیل کی جدت نما نقالی ہو جس پر اعتراض کرنے کا یہ محل نہیں ہو۔

(ش ۔ ح)

شباب و انقلاب جناب عبدالخالق نہال سیوہاروی کا منظوم کلام۔ تقطیع		صفحات ۲۰۴ مجلّد، خوب صورت گرد پوش۔ کاغذ اور کتابت عمدہ۔ قیمت تین روپے۔ ناشر مشہور پبلشنگ ہاؤس دہلی۔

نہال صاحب کے مزاج کی طرح ان کا تخیل بھی سادہ ہو یعنی پیچ دار نہیں۔ وہ راست بیں

اور راست گفتار معلوم ہوتے ہیں۔ رنگیں بیانی اور لطیف فن کاری کے نمونے اس مجموعے میں کثرت سے ملتے ہیں لیکن غلو کی اُڑان اور تصنع کے غوطے بہت کم۔ زبان صاف دلی کی،جہاں وہ برسوں سے رہتے ہیں اس پر مرزا سائل کا مشورہ۔ طبیعت دار نوجوان تھے۔ مزاج میں شعریت تھی۔ دہلی آرہے۔ پھر کیا پوچھنا۔ اگر نئی اُردو شاعری کا موجد ذوق کا شاگرد اور نئی شاعری کو پروان چڑھانے والا غالب کا شاگرد اور فلسفۂ خودی کی تفسیر و تبلیغ کرنے والا داغ کا شاگرد ہوسکتا ہو تو سائل کے شاگرد کا آج کل کے رنگِ سخن میں نام پانا کون سی اعجوبہ بات ہو۔

نہال صاحب کا طرزِ سخن زعیمانہ ہو۔ کہیں کہیں انقلابی رنگ کی جھلک پڑتی ہو۔ خمریت بھی اعتدال کے ساتھ ہو جو کہتے ہیں اسے دل چسپ بنانے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ یہ مجموعہ مُصنّف کی نظر کی وسعت، دل کی فراخی اور تخیل کی بلندی کی شہادت دیتا ہو۔ اس میں غزلیں اور رُباعیاں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ نظمیں جامعیت پر حاوی معلوم ہوتی ہیں چناں چہ اگر بعض نظموں کے موضوع ہیں، رزمِ زندگی، نعرۂ مردانہ، نوائے وقت وغیرہ تو بعض کے موضوع ہیں، طلوعِ آفتاب، برسات، پروانہ۔ سماجی منظرکشی آج کل کے رنگ میں ہو اور خاصی ہو۔ نہ ان سے جوانی چھوٹی نہ غلاموں کی دنیا۔ ہمہ گیری ان دنوں عام میلان ہو اور نہال صاحب بھی اس میں ماہر ہیں۔ اگر کہتے ہیں:-

کون آگیا یہ زُلف کو برہم کیے ہوتے
سامان انتشار دو عالم کیے ہوئے
ساقی ایاغ بادۂ رنگیں کہ زُہد خشک
ہو عیش زندگی کو جہنم کیے ہوتے

تو یوں بھی سخن سرا ہوتے ہیں:-

تخیل مطمئن ہوتا نہیں اگلے حقائق پر
نمایاں جذبۂ تحقیق نو ہو نکتہ دانوں میں

رگوں میں جوش زن ہیں ولولے تسخیرِ عالم کے
جوانی کی اُمنگیں جاگ اٹھیں نوجوانوں میں

یہ زمانہ تنوع پسند ہے۔ معاشرت ایک عبوری دوْر سے گزر رہی ہے۔ ایسے عوارض میں انفرادیت کا سوال اٹھانا بے سوْد ہے۔ ہمہ گیری کے بعد ہی شاعر ایک رنگ پر اس مضبوطی سے ہاتھ ڈالتا ہے اور اسے اس طرح اپنا لیتا ہے کہ وُہی اس کا خاص کہلاتا ہے۔ یہ وقت نہال صاحب کی زندگی میں ضرور آئے گا۔ ان کا کلام زبردست امکانات کو لیے ہوئے ہے۔ فراری رنگ سے وہ کوسوں بھاگتے ہیں۔ انھیں کام کی بات اور مفید بات کہنے کا خیال رہتا ہے۔ یہ مجموعہ اُردوْ نظم میں ایک تازہ اور عمدہ اضافہ ہے جس میں ہر شخص کی دل چسپی کا سامان موجود ہے۔ (رک)

Vol. 25 January 1945 No. 1

THE URDU

The Quarterly Journal
OF
The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)

Edited by

ABDUL HAQ

Published by

The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)
Delhi.

جلد ۲۵ اپریل سنہ ۴۵ء نمبر ۲

اُرْدُو

انجمنِ ترقّیٔ اُردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر:۔ عبدُالحق

شائع کردہ

انجمنِ ترقّیٔ اُردو (ہند) دہلی

اُردو

جلد ۲۵ — اپریل سنہ ۱۹۴۵ء — نمبر ۲

فہرست مضامین

سید [illegible] منیجر انجمن نے جید پریس بلی ماران دہلی میں چھپوا کر
دفتر انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی سے شائع کیا

خواجہ میر دردؔ کے زمانے کی سیاسیات*

(جناب مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی)

خواجہ صاحب کی وفات کی تاریخ ۱۱۹۹ ہجری اس مصرع سے نکلتی ہو:

حیف دُنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب

ایک بیگہ ولادت ۱۱۳۳ ہجری لکھی ہو لیکن اگر اڑسٹھ سال کی عمر پائی، جیسا کہ اکثر تذکروں میں تحریر ہو تو سنِ ولادت کچھ پہلے ہوگا۔ عیسوی حساب سے، ہم اُن کا زمانہ اجمالاً ۱۷۲۰ تا ۱۷۸۴ قرار دے سکتے ہیں۔ انھی دنوں بادشاہ گر سادات کی سیادت گردش میں آئی روشن اختر محمد شاہ بادشاہ تختِ سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔ اسلامی نظر سے دیکھیے تو اس سے بھی زیادہ تابناک واقعہ یہ ہو کہ پُرانی دہلی میں، جسے انگریزوں نے اب دوبارہ نیا کر دیا ہو، شاہ ولی اللہ رح نے مسندِ ارشاد پر قدم رکھا اور تجدیدِ دین کے ایک نئے دَور کی ابتدا ہوئی۔

سنہ ۱۱۳۲ھ کے رمضان میں چند زلزلے اس شدت کے آئے کہ دلّی کی شہر پناہ کئی جگہ سے شق ہوگئی۔ مسجد فتح پوری کے تین کنگرے ٹوٹ کر گرے۔ بڑی بڑی عمارتیں جڑ بنیاد سے ہل گئیں۔ بعض لوگوں نے اِس آفتِ سماوی کو سلطنت کے حق میں فالِ بد بتایا۔ مگر سچ پوچھیے تو سب سے بُری فال خود لوگوں کے بد اعمال تھے۔ عربی مثل ہو جیسے اعمال ویسے عُمّال۔ تقدیر نے رنگ میں رنگ ملا دیا۔ یعنی رنگیلی رعایا کے لیے رنگیلے بادشاہ کا انتخاب کیا۔

ساداتِ بارہہ کا قلع قمع ہو جانے سے مغلوں کی بادشاہی ایک جھٹکا کھا کر پھر جم گئی اور آیندہ کئی برس تک، تختِ دہلی تو بہت اونچا تھا، کسی کو دُور کی زمینوں میں بھی علانیہ مسندِ شاہی بچھانے کی جرأت نہ ہوئی۔ البتہ امارت و وزارت کی کشاکش اور حصولِ جاہ و منصب کی کش مکش نے دربارِ دہلی کو دنگل کا نمونہ بنا دیا جہاں دن رات سیاسی پہلوانوں کے داؤ پیچ چلتے اور اُکھاڑ پچھاڑ ہوتی رہتی تھی۔ محمد شاہ کو نظم و نسق کی گتھیاں سلجھانے کا کبھی دماغ

* ایک مقالہ جو یومِ دردؔ، دہلی کے لیے لکھا گیا تھا۔

نہ تھا۔ سیدوں کی قید سے رہائی کیا پائی کہ رفتہ رفتہ عقل و شریعت کی سبھی قیود سے آزاد ہوگیا۔ شروع میں نظام الملک آصف جاہ کو قلم دانِ وزارت سپرد ہوا تھا مگر جب وہ دکن سے دہلی آیا، اور دربارِ شاہی کو قدیم آئین پر مہذب رکھنے کی کوشش کی تو بادشاہ کو اس کی ثقاہت سے وحشت ہونے لگی۔ خوشامدی امیروں نے بہکایا کہ وزیر آپ کا اتالیق بن گیا ہو، آپ کو لڑکا سمجھتا ہو۔ مسخروں نے نقلیں بنا بنا کر اُس کے سنجیدہ اوضاع و اطوار کا خاکہ اُڑایا تاکہ اس کی توقیر بادشاہ کے دِل میں اور قدم پائے تخت دلّی میں نہ جم سکیں۔ اُنھیں جتنی اپنے فاسد مقاصد میں کام یابی ہوئی، شاید اُسی نسبت سے بادشاہ کی زندگی اور انتظامِ سلطنت میں خرابی آتی گئی۔ مُلک کی سیاہ بختی سے، انھی دنوں بادشاہ کی دادی ملکہ مہر پرور کا نیرِ حیات بے نور ہوا۔ یہ ہوش مند خاتون عالم گیر کی عزیز بہو تھی۔ بادشاہ گروں کا کھیل بگاڑنے میں اُس کی تدبیر و رائے کو بڑا دخل تھا۔ جب تک وہ زندہ رہی محمد شاہ کو اس کے مشورے کے خلاف چلنے کی مجال نہ ہوئی۔ جب اُس نے وفات پائی تو محل سرا کا سارا انتظام بادشاہ کی رضاعی بہن رحیم النسا بنتِ شاہ محمد درویش کی جھولی میں آگیا۔ اِدھر بادشاہ کی عیاشی میں ترقی ہوئی۔ وقت کا زیادہ حصہ زنان خانے میں گزرنے لگا۔ احکامِ سلطانی رحیم النسا کی معرفت نافذ ہونے لگے۔ شاہی مُہر اسی کی تحویل میں رہتی۔ خود اُس کے دستخط سے اجرائے کار ہوتا۔ اس کے توسّط کے بغیر بڑے بڑے کام ملتوی رہتے۔ غرض یہ درویش زادی دیکھتے دیکھتے دولت کی ماتا بن گئی۔ ایک مدت بعد جب روشن الدولہ (بخشی) پر مقدمہ قائم ہوا اور کروروں رُپے کی رشوت کے دفتر کُھلے تو رحیم النسا بھی اس کی ہم راز پائی اور محل سرا سے نکالی گئی۔

بادشاہ کا شوقِ تعمیر و تزئین تک عیش پرستی کی لاگ سے خالی نہ تھا۔ "حیات بخش" اور "مہتاب باغ" گویا اسی لیے بنائے تھے کہ افکارِ سلطنت کی بو تک وہاں نہ جانے پائے۔ لیکن اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اس کی پیروی میں دس بارہ سال کے اندر دلّی کے باہر بیسیوں باغ نئے تیار ہوگئے۔ بادلی سے مہرولی تک مشجر کا حاشیہ لگ گیا۔ اور یہ بات قابلِ یقین ہو کہ اس شہر کی آب و ہوا ہی اور ہوگئی۔ کثرتِ اشجار کی بدولت یہاں بارش 'اوسط ماضی و مستقبل تا حال' سے غالبًا کہیں زیادہ بڑھ گیا۔

اوّل اوّل محمد شاہ کو شکار سے بھی رغبت تھی لیکن پھر خود ہی شاہد و شراب کا شکار ہوگیا۔ رعایا دینِ ملوک پر چلا کرتی ہو۔ بادشاہ اس طرف مائل ہوا تو امیر و وزیر سبھی اُدھر جھک پڑے۔ دارالخلافۂ دہلی میں اربابِ طرب

کی وہ ریل پیل اور اسبابِ عیش و تجمل کی وہ فراوانی ہوئی کہ پیرس و پیکن، استنبول و قاہرہ بھی، جو اُن دنوں دلی کی ٹکر کے شہر تھے، مات ہوگئے۔ سارا شاہ جہاں آباد خرابات کا مرقع بن گیا۔

ان سیہ مستوں پر عذاب کا پہلا کوڑا سنہ ۱۱۵۱ ہجری میں پڑا (مطابق سنہ ۳۹-۱۷۳۸ء) شامتِ اعمال نے حملۂ نادری کی صورت اختیار کی۔ آصف جاہ کے دکن جانے کے بعد سے دربار میں دوبارہ ایرانی اور ہندستانی امیر برسرِ اقتدار ہوے تھے۔ شاہی فوج کا سپہ سالار یا وزیرِ جنگ امیرالامرا خان دوراں خاں جتنا سپہ گری میں فائق تھا، اتنا ہی علم و عقل کے معرکے میں کوتاہ دست ثابت ہوا۔ نادرشاہ کے کابل و قندھار پر قبضہ کرنے کی خبر دلی آئی تو یہ امیر بہت ہنسا۔ خبر لانے والوں سے کہا تمھارے مکان شاید بہت اونچے پہاڑوں پر بنے ہوے ہیں کہ اتنی دور سے نادر کے قزلباشوں کو دیکھ لیتے ہو!

نادرشاہ نے پہلے کئی مراسلے اور قاصد بھیجے۔ ان کی بادشاہ تک رسائی کی نوبت نہ آئی، جواب کون دیتا؟ بعض درباری علانیہ کہتے تھے کہ یہ سب زکریاخاں تورانی صوبے دار لاہور کی چالاکی ہے اور وہی نادرشاہ کی طرف سے مصنوعی قاصد بھجوا رہا ہے۔ ایک مرتبہ بڑی دیر تک اس پر مباحثہ ہوا کہ جواب دیں تو اس غاصب لٹیرے کو القاب کیا لکھیں؟ وہ شہنشاہِ ہند کی مساویانہ مخاطبت کے لائق کہاں ہے؟

بادشاہ کے اصرار سے آصف جاہ دوبارہ دہلی آگیا۔ اس وقت کی سیاسی مصالح اور جملہ حالات کو دیکھ کر اس نے یہ صحیح رائے قائم کی اور باربار عرض کرنے پر محمد شاہ نے بھی مان لی کہ جب تک خود بہ دولت زحمت نہ کریں گے کوئی امیر یا سپہ سالار نادرشاہ سے عہدہ برآ نہ ہوسکے گا۔ چناں چہ کوچ کا حکم صادر ہوا۔ جنگی علم شہر کے باہر نصب کرادیے گئے۔ لیکن یہ مئی جون (سنہ ۱۷۳۸ء) کی گرمیوں کا زمانہ تھا جب کہ لاہور کا ریگستانی راستہ دن کے وقت آگ ہوجاتا ہے۔ اس مصیبت کے تصور نے اُن امیروں کو سراسیمہ کردیا جو سورج چڑھنے سے پہلے تہ خانوں میں اُتر جاتے تھے۔ انھوں نے پھر بادشاہ کو بہلایا کہ بھلا نادر کی یہ تاب کب ہے کہ اس دولتِ مغلیہ کی طرف نگاہِ گرم سے بھی دیکھے؟ محمد شاہ اُن سب سے بڑھ کر آرام کا خوگر، دل آرام کا گرویدہ تھا، دلی ہی میں رہا۔ بادلی کے میدانوں میں جنگی جھنڈے تمام گرمیوں لو میں کھڑے پھڑپھڑاتے رہے۔ وہاں نادری لشکر اٹک اُتر کر لاہور پہنچ گیا۔ زکریاخاں نے تھوڑی سی مزاحمت کے بعد اطاعت قبول کرلی۔ نادر کی طبعو

نہ تھا۔ سیدوں کی قید سے رہائی کیا پائی کہ رفتہ رفتہ عقل و شریعت کی سبھی قیود سے آزاد ہوگیا۔ شروع میں نظام الملک آصف جاہ کو قلم دانِ وزارت سپرد ہوا تھا مگر جب وہ دکن سے دہلی آیا، اور دربارِ شاہی کو قدیم آئین پر مہذب رکھنے کی کوشش کی تو بادشاہ کو اس کی ثقاہت سے وحشت ہونے لگی۔ خوشامدی امیروں نے بہکایا کہ وزیر آپ کا آتالیق بن گیا ہے۔ آپ کو لڑکا سمجھتا ہے۔ مسخروں نے نقلیں بنا بنا کر اُس کے سنجیدہ اوضاع و اطوار کا خاکہ اُڑایا تاکہ اس کی توقیر بادشاہ کے دِل میں اور قدم پایۂ تخت دلی میں نہ جم سکیں۔ اُنھیں جتنی اپنے فاسد مقاصد میں کام یابی ہوئی، شاید اُسی نسبت سے بادشاہ کی زندگی اور انتظامِ سلطنت میں خرابی آتی گئی۔ مُلک کی سیاہ بختی سے، انھی دنوں بادشاہ کی دادی ملکہ مہرپرور کا نیرِ حیات بےنور ہوا۔ یہ ہوش مند خاتون عالم گیر کی عزیز بہو تھی۔ بادشاہ گروں کا کھیل بگاڑنے میں اُس کی تدبیر و رائے کو بڑا دخل تھا۔ جب تک وہ زندہ رہی محمد شاہ کو اس کے مشورے کے خلاف چلنے کی مجال نہ ہوئی۔ جب اُس نے وفات پائی تو محل سرا کا سارا انتظام بادشاہ کی رضاعی بہن رحیم النسا بنتِ شاہ محمد درویش کی جھولی میں آگیا۔ اِدھر بادشاہ کی عیاشی میں ترقی ہوئی۔ وقت کا زیادہ حصہ زنان خانے میں گزرنے لگا۔ احکامِ سلطانی رحیم النسا کی معرفت نافذ ہونے لگے۔ شاہی مُہر اسی کی تحویل میں رہتی۔ خود اُس کے دستخط سے اجرائے کار ہوتا اس کے توسط کے بغیر بڑے بڑے کام ملتوی رہتے۔ غرض یہ درویش زادی دیکھتے دیکھتے دولت کی ماتا بن گئی۔ ایک مدت بعد جب روشن الدولہ (بخشی) پر مقدمہ قائم ہوا اور کروروں رُپے کی رشوت کے دفتر کھلے تو رحیم النسا بھی اس کی ہم راز پائی اور محل سرا سے نکالی گئی۔

بادشاہ کا شوقِ تعمیر و تزئین تک عیش پرستی کی لاگ سے خالی نہ تھا۔ "حیات بخش" اور "مہتاب باغ" گویا اسی لیے بنائے تھے کہ افکارِ سلطنت کی بو تک وہاں نہ جانے پائے۔ لیکن اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اس کی پیروی میں دس بارہ سال کے اندر دلّی کے باہر بیسیوں باغ نئے تیار ہوگئے۔ بادلی سے مہرولی تک مشجّر کا حاشیہ لگ گیا۔ اور یہ بات قابلِ یقین ہے کہ اس شہر کی آب و ہوا ہی اور ہوگئی۔ کثرتِ اشجار کی بدولت یہاں بارش کا اوسط ماضی و مستقبل تا حال' سے غالباً کہیں زیادہ بڑھ گیا۔

اوّل اوّل محمد شاہ کو شکار سے بھی رغبت تھی لیکن پھر خود ہی شاہد و شراب کا شکار ہوگیا۔ رعایا دینِ ملوک پر چلا کرتی ہے۔ بادشاہ اس طرف مائل ہوا تو امیر و وزیر سبھی اُدھر جھک پڑے۔ دارالخلافہ دہلی میں اربابِ طرب

کی وہ ریل پیل اور اسبابِ عیش و تجمل کی وہ فراوانی ہوئی کہ پیرس و پیکن، استنبول و قاہرہ بھی، جو اُن دنوں دہلی کی ٹکر کے شہر تھے، مات ہوگئے۔ سارا شاہ جہاں آباد خرابات کا مرقع بن گیا۔

ان سیہ مستوں پر عذاب کا پہلا کوڑا ۱۱۵۱ھ ہجری میں پڑا (مطابق ۳۹-۱۷۳۸ء) شامتِ اعمال نے حملۂ نادری کی صورت اختیار کی۔ آصف جاہ کے دکن جانے کے بعد سے دربار میں دوبارہ ایرانی اور ہندستانی امیر برسرِ اقتدار ہوئے تھے۔ شاہی فوج کا سپہ سالار یا وزیرِ جنگ امیر الامرا خان دوران خاں جتنا سپہ گری میں فائق تھا، اتنا ہی علم و عقل کے معرکے میں کوتاہ دست ثابت ہوا۔ نادر شاہ کے کابل و قندھار پر قبضہ کرنے کی خبر دہلی آئی تو یہ امیر بہت ہنسا۔ خبر لانے والوں سے کہا تمھارے مکان شاید بہت اونچے پہاڑوں پر بنے ہوے ہیں کہ اتنی دور سے نادر کے قزلباشوں کو دیکھ لیتے ہو!

نادر شاہ نے پہلے کئی مراسلے اور قاصد بھیجے۔ ان کی بادشاہ تک رسائی کی نوبت نہ آئی، جواب کون دیتا؟ بعض درباری علانیہ کہتے تھے کہ یہ سب زکریا خاں تورانی صوبے دار لاہور کی چالاکی ہے اور وہی نادر شاہ کی طرف سے مصنوعی قاصد بھجوا رہا ہے۔ ایک مرتبہ بڑی دیر تک اس پر مباحثہ ہوا کہ جواب دیں تو اس غاصب لٹیرے کو القاب کیا لکھیں؟ وہ شہنشاہِ ہند کی مساویانہ مخاطبت کے لائق کہاں ہے؟

بادشاہ کے اصرار سے آصف جاہ دوبارہ دہلی آگیا۔ اس وقت کی سیاسی مصالح اور جملہ حالات کو دیکھ کر اس نے یہ صحیح رائے قائم کی اور بار بار عرض کرنے پر محمد شاہ نے بھی مان لی کہ جب تک خود بہ دولت زحمت نہ کریں گے کوئی امیر یا سپہ سالار نادر شاہ سے عہدہ برآ نہ ہوسکے گا۔ چناں چہ کوچ کا حکم صادر ہوا۔ جنگی علم شہر کے باہر نصب کرادیے گئے۔ لیکن یہ مئی جون (۱۷۳۸ء) کی گرمیوں کا زمانہ تھا جب کہ لاہور کا ریگستانی راستہ دن کے وقت آگ ہوجاتا ہے۔ اس مصیبت کے تصور نے اُن امیروں کو سراسیمہ کردیا جو سورج چڑھنے سے پہلے تہ خانوں میں اُتر جاتے تھے۔ انھوں نے پھر بادشاہ کو بہلایا کہ بھلا نادر کی یہ تاب کب ہے کہ اس دولتِ عظمیٰ کی طرف نگاہِ گرم سے بھی دیکھے؟ محمد شاہ اُن سب سے بڑھ کر آرام کا خوگر، دل آرام کا گرویدہ تھا، دلّی ہی میں رہا۔ بادلی کے میدانوں میں جنگی جھنڈے تمام گرمیوں لو میں کھڑے پھڑ پھڑاتے رہے۔ وہاں نادری لشکر اٹک اُتر کر لاہور پہنچ گیا۔ زکریا خاں نے تھوڑی سی مزاحمت کے بعد اطاعت قبول کرلی۔ نادر کی طبعی

جرات کو دربار دہلی کی نااہلی بلکہ بے ہوشی مہمیز کرتی ہوئی، خاص دارالخلافت کی طرف لے چلی۔

کرنال میں افواج دہلی سے اس کا مقابلہ، اور مصالحہ، برہان الملک سعادت خاں کی شہ سے خلاف معاہدہ دہلی جانا، شاہی کارخانوں پر قبضہ جمانا، شہر کی غارت گری اور قتل عام، یہ سب واقعات مشہور اور ان کی تفصیل تاریخوں میں مسطور ہے۔ اس مضمون کے ممدوح یعنی خواجہ میر درد اُس وقت ۱۸، ۲۰ برس کے نوجوان ہوں گے۔ شاہجہانی دہلی کی پہلی تاراجی انھوں نے اپنی آنکھ سے دیکھی ہوگی۔ ممکن ہے خود ان کی خانقاہ اس دست برد کی جھپیٹ میں آگئی ہو اگرچہ قتل و آتش زنی کا زور قلعے کے سامنے کے بازاروں اور شہر کے شمالی محلوں میں زیادہ رہا۔ یہیں سب سے زیادہ قیمتی جواہرات و اقمشہ اور نادر ترین مصنوعات کی منڈیاں تھیں جن کا مثل دُنیا کے شہروں میں کم ہوگا۔ اور یہیں بہت سے امرائے کبار کی حویلیاں رزم و بزم کے ساز و سامان سے آراستہ پیراستہ دُلھنیں بنی کھڑی تھیں۔ قزل باشوں نے جو لوٹ مار کی، اس کی بے حساب مالیت کا صحیح اندازہ اور کوئی تفصیل کہیں تحریر نہیں۔ البتہ نادر شاہ کروڑہا رُپے کے ظروف و جواہر اور نادرات کے علاوہ جو رُپیہ نقد لے کر دہلی سے گیا اُس کا شمار اُسی کے ایک مقتدی مرزا مہدی، صاحب "نادر نامہ" نے پندرہ کرور بتایا ہے۔ اسی مصنف نے شہر میں نادری حکم کا شکار ہونے والوں کی تعداد تیس ہزار لکھی ہے۔ دوسری عصری تاریخوں میں ڈیڑھ لاکھ تک تخمینہ ملتا ہے۔ واضح رہے کہ اُس وقت نئی پُرانی دہلی کی آبادی دس لاکھ سے کسی طرح کم نہ تھی۔ دور دُور تک اس کا پھیلاؤ تھا۔ حتاکہ شدید و پیہم تاراجیوں کے بعد بھی انشاءاللہ خاں کے زمانے تک تغلق آباد، مہرولی شاہجہاں آباد کے محلے سمجھے جاتے تھے۔ فرید آباد کی براہی اور گڑگانوں کی ماتا کا شمار شہر ہی کے میلوں میں ہوتا تھا۔ (ملاحظہ ہو دریائے لطافت باب سوم)

نادر شاہ نے قتل عام کی سنت عید قرباں کے تیسرے یا چوتھے دن ادا کی تھی۔ تو ہر کربلا کا منظر اور ذی الحجہ کا مہینا محرم بن گیا تھا لیکن عبرت کا تماشا دیکھیے کہ خون کی یہ ہولی کھیل کر نادر نے اپنے منجھلے بیٹے کی محمد شاہ کی لڑکی سے شادی رچائی تو گھر گھر طبلے کھڑکنے لگے۔ ناچ رنگ، جلسے، دعوتیں۔ جہاں دیکھو محفل رقص و سرود برپا ہے۔ بھانڈ نقلیں کر رہے ہیں اور اُن میں خود اپنے امیروں کی نالائقی اور سپہ سالاروں کی بُزدلی کا خاکہ اُڑا رہے ہیں۔ تماشائی شرمانے کی بجائے ہنستے اور قہقہے مارتے ہیں۔ آصف جاہ کے ساتھیوں میں ایک سردار درگاہ قلی خاں

اسی زمانے میں دلی آیا تھا۔ اس نے "مرقع دہلی" کے نام سے ایک رسالے میں یہاں کا نقشہ کھینچا ہے۔ ہم لوگ جدید یورپ کے فسق و فجور کو نام رکھا کرتے ہیں۔ دو صدی پہلے ہمارے شہر میں اوباشی اور بدکاری کے جو کھیل کھیلے جاتے تھے اور مقابر اولیا کے جوار یا عرسوں میں جیسی کچھ فحاشی کا بازار گرم ہوتا تھا، لامذہب یورپ کی عیاشیاں بھی اس کے آگے پانی بھرتی ہیں۔ درگاہ قلی خاں کا "مرقع" چند سال ہوئے ایک اردو مقدمے کے ساتھ حیدرآباد میں چھپا اور "دہلی بارھویں صدی میں" موسوم ہے۔

اسی کا بیان ہے کہ نادر شاہی حملے سے محمد شاہ اتنا متاثر ہوا کہ راگ رنگ سے توبہ کی۔ ارباب نشاط کو موقوف کر دیا۔ عجب نہیں کہ یہ توبہ اگلی برسات میں ٹوٹ گئی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ کو نادر کے حملے اور تاخت تاراج سے جس قدر بھی صدمہ ہوا ہو، وہ کم تھا۔ حکومت کی سب سے چلتی تلوار، اس کا رعب داب ہوا کرتا ہے۔ اس آفاقی قزاق کا چند ہزار سوار لے کر ملک میں گھس آنا، پایۂ تخت پر قبضہ کرنا اور جامع مسجد میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوانا گویا ڈنکے کی چوٹ مغل بادشاہی کے خاتمے کا اعلان تھا۔ بنگالہ و دکن کے وسیع صوبے بجائے خود سلطنت اور کئی کئی صوبوں کا مجموعہ تھے۔ بہادر شاہ اول کے بعد ہی تخت دہلی سے وہاں کے والیوں کی اطاعت رسمی رہ گئی تھی۔ اب یہ رسم بھی خالی دکھاوا نظر آنے لگی۔ مرہٹوں کی ظاہری اطاعت ان کی کھلی ہوئی بغاوت پر پردے نہ ڈال سکتی تھی۔ اس آگ کو غارت گری کی حرص و ہوا نے بھڑکایا تھا اور اب یہ قوم خود اپنی مرکزی رہنمائی کے قابو سے باہر ہوئی جاتی تھی۔ نادر کے حملے سے پنجاب کے نظم و نسق کی کلیں ڈھیلی ہوگئیں۔ فرخ سیر کے عہد میں سکھوں کی مذہبی دیوانگی کو تلوار کی فصد سے فرد کیا گیا تھا، ان کے دور دست علاقوں میں دوبارہ وحشت و شورش کے آثار پیدا ہونے لگے۔

ان تمام افتادوں کے باوجود محمد شاہ نے مرتے دم تک بادشاہی کو خاصا نباہ دیا۔ چناں چہ مرض الموت میں بھی ولی عہد احمد شاہ کو معقول فوج اور توپ خانے کے ساتھ وزیر الممالک قمر الدین خاں کی معیت میں احمد شاہ ابدالی سے لڑنے کے لیے روانہ کیا۔ نادر شاہ کے ہلاک ہونے کے بعد یہ افغانی سردار کابل و خراسان کا تاج دار بن گیا تھا اور نہ صرف سندھ و کشمیر بلکہ قدم بڑھا کر پنجاب پر قبضہ جما رہا تھا۔ لشکر دہلی نے سرہند پر اس کا مقابلہ کیا اور اسے سلاطین تیموری کی آخری بڑی لڑائی سمجھنا چاہیے جس میں ابدالی کو شکست ہوئی اور وہ پنجاب چھوڑ کر ہٹ گیا۔ لیکن تقدیر کے گماشتوں

نے اِس جیت کی ایسی بھاری قیمت وصول کی کہ دولتِ مغلیہ کا دِوالہ نکل گیا ۔ یعنی قمرالدین اسی معرکے میں کام آیا۔ برہان الملک سعادت خاں کا بھتیجا، صفدر جنگ اس کی بجائے سرلشکر اور وزیرِ سلطنت نامزد ہوا۔ اور محض اس کی ذاتی رقابت اور حسد کے طفیل، پنجاب کا بے یار و مددگار نیا صوبے دار معین الملک اور یہ وسیع صوبہ دوبارہ ابدالی کے پنجے میں دب گیا۔ اس سے بھی بڑھ کر انقلاب یہ کہ فتح سرہند کے دوسرے ہی مہینے (ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء میں) محمد شاہ کا انتقال ہوا اور بادشاہی احمد شاہ کی وراثت میں آئی۔ جو اپنے نااہل باپ سے بھی زیادہ نااہل تھا۔ ہفتوں بلکہ مہینوں محل سرا سے باہر نہ نکلتا۔ اندر اُس کی ماں اودھم بائی نے آفت اُٹھائی تھی باہر جاوید خواجہ سرا کی آقائی تھی۔ اِس مخلوط حکومت سے صفدر جنگ اِس قدر تنگ ہوا کہ دعوت کے بہانے گھر بُلاکر اُس نے جاوید کو نابود کردیا مگر بادشاہ کو بھی سخت ناخوش کرلیا۔

سلطنت کو تقدیر کی ایک اور ٹھوکر یہ لگی کہ محمد شاہ کے دو مہینے بعد ہی نظام الملک آصف جاہ نے دکن میں انتقال کیا۔ مرحوم کا خلفِ اکبر شہاب الدین خاںؔ دربارِ دہلی میں باپ کا قائم مقام اور بخشیِ ممالک تھا۔ وہ منجھلے بھائی ناصر جنگ سے باپ کی مسندِ ولایت چھیننے اورنگ آباد چلا اور اپنے فرزند غازی الدین کو یہاں نائب بنا گیا۔ شہاب الدین قضائے آسمانی سے راستے ہی میں راہیِ مُلکِ عدم ہوا۔ بیٹے نے سولہ برس کی عمر میں باپ کی جگہ مستقل عہدہ اور خطاب عماد الملک سے سرفرازی پائی۔ پھر منصبِ وزارت کے لیے اِس فتنے نے وہ فساد اُٹھائے کہ خود بادشاہی بازیچۂ طفلاں بن گئی۔ صفدر جنگ کی اصل خدمت اور قوت اودھ کی صوبے داری سے تھی۔ اس کے مغربی اضلاع میں افغانی رُہیلے جو اورنگ زیب کے زمانے سے جوق در جوق ہندی فوجوں میں بھرتی ہوتے آتے تھے یہیں بس گئے۔ انھی کے نام سے یہ علاقہ رُہیل کھنڈ موسوم اور اُن کی اولاد سے معمور ہوا۔ صفدر جنگ کی عقل کو خود غرضی نے ایسا مغلوب کیا کہ رُہیلوں سے لڑنے کے لیے مرہٹوں کو مدد پر بُلایا۔ یہ سُبک پا قوم امداد کے بہانے قدم جمانے کے فن میں طاق تھی۔ ایک دفعہ دوآب میں کیا آئی کہ اُس کی رو پنجاب تک دوڑ گئی اور وہاں ابدالی حکومت سے جا ٹکرائی۔

اِدھر صفدر جنگ کے پائے تخت سے ٹلتے ہی شاطر عماد الملک نے اپنی بساط جمائی۔ رُہیلوں سے سازباز کیا۔ مرہٹوں کو صفدر جنگ سے توڑ لیا۔ نواحِ دہلی و اکبرآباد کے جاٹوں سے جبرًا مال گزاری وصول کرنے گیا۔ پھر انھی کو اپنا معاون و مددگار بنا کے تخت گاہِ دہلی پر چڑھا لایا۔ اس توڑ جوڑ سے اوّل تو صفدر جنگ کو وزارت سے

بے دخل کیا اور آگے چل کر خود بادشاہت کی جڑ اکھیڑ دی۔ احمد شاہ کا شاہی اقتدار خالصے لگا لیکن راج ہٹ باقی تھی۔ نیا وزیرِ سلطنت انتظام الدولہ خاں خاناں بھی غازی الدین کا ماموں تھا اور بھانجے کے آگے سر نہ جھکاتا تھا۔ غازی الدین مرہٹوں کی فوج لایا اور پہلے وزیر کو اپنے اختیار سے برطرف کیا۔ پھر ایک مجلس منعقد کی۔ اس میں احمد شاہ کی نالائقی پر خطبہ دیا اور علما سے فتوا لیا کہ یہ بدکردار بادشاہ معزول کیا جائے۔ چناں چہ پہلے قید خانے میں ڈالا پھر اس کی اور اس کی شوخ دیدہ ماں دونوں کی آنکھیں نکال لیں۔ شہزادہ عزیز الدین، عالم گیر ثانی کے لقب سے اپنے لاثانی پرداداکا نقلی جانشین بنایا گیا (شوال ۱۱۶۷ھ ۱۷۵۴ء) مرزا غالب کے مؤقلم نے مصائبِ روزگار کا جو خیالی نقش آراستہ کیا ہے، وہ اِس عہد کے ہندستان کی حقیقی تصویر چشمِ تصوّر کے سامنے پھرتا ہے ؎

ہوا مخالف و شبِ تار و موجِ طوفاں خیز
گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفت است!

اب وہ زمانہ ہے کہ دہلی کے شمال مشرق میں رُہیلے سردار آزاد و خودمختار ہیں اور جنوب کی جانب جاٹ کسان راجگی کے دعوے دار ہیں۔ جس طرح ممالکِ دکن میں مسلمان بادشاہوں نے مرہٹوں سے ہل چھڑوا کر تلوار چلانی سکھائی تھی، جاٹوں کو اُمرائے دہلی کی اندھی رقابت نے سپہ گری و سرکشی کے راستے دکھلائے۔ حکومت کا وارث کوئی نہ رہا تو دربان اور پہرے دار اس کے مالک بن گئے۔ اس وقت غازی الدین کو آسانی سے مُلک و مال ملنے کی راہ یہ نظر آئی کہ برات کے حیلے سے پنجاب پر فوج لے کر چلا جہاں معین الملک کی وفات کے بعد سے اس کی بیوہ ابدالی کی منظوری سے حکومت کرتی تھی اور اس کی بیٹی غازی الدین سے منسوب تھی۔ بیٹی کو اس نے پورے ساز و سامان کے ساتھ رُخصت کر دیا تھا لیکن داماد نے ساس کو بھی سوتے میں پکڑوا منگایا اور پنجاب کی صوبے داری اپنے گرگے آدینہ بیگ خاں کے تفویض کر دی۔

دغا کی بازی کھیلنے میں غازی الدین بڑا بے باک شاطر تھا لیکن تلوار کے سامنے ایسی چالیں نہیں چل سکتیں۔ احمد شاہ ابدالی کو دہلی میں طوفانِ بے تمیزی بپا ہونے کی خبریں ملیں تو سیلاب کی طرح اٹک سے چلا اور سازشی کمینوں کو خس کی طرح بہاتا ہوا بے روک ٹوک جمنا تک پہنچ گیا۔ عماد الملک نے اُسی ساس کے دامن میں پناہ لی جس کی ردائے حکومت کھسوٹ لایا تھا۔ بڑی خوشامد درامد سے قصور معاف کرایا۔ شاہ و وزیر کی جان اور منصب بچ گئے

مگر نادر ... دلی کی دولت کو جھوٹے افغانی کی طرح ... [illegible] دل اطمینان سے شہر کو لوٹا اور دو مہینے میں بڑے
بڑے امیروں کو محتاج فقیر بناکر واپس گئے۔ یہ ... [illegible] سے ٹھیک ایک صدی پہلے
۱۷۵۷ء (م ...ھ) کا واقعہ ہے۔ اسی سال [illegible] دلی سے انگریزوں نے پلاسی کا معرکہ جیتا
اور بنگالے میں قدم جما لیے۔

احمد شاہ ابدالی واپس گیا تو نجیب الدولہ خاں [illegible] اور امیر الامرا یعنی وزیر جنگ بنا گیا۔ لیکن
غازی الدین حکم رانی کا دیوانہ تھا۔ اسے بادشاہ کا دخل [illegible] امیر وزیر کی شرکت کی تاب [illegible] لاتا اور
مل جل کر حکومت کرتا، یہ اس کی فطرت کے خلاف تھی [illegible] ہوئی سلطنت اور ایک لٹی ہوئی دولت کے لیے
بھی سازش و آویزش کیے گیا۔ اور اجڑی دلی کو اور [illegible] باشندے شہر چھوڑ کر، اودھ، بنگال، راجپوتانہ
دکن، غرض جہاں سینگ سمایا وہاں چلے گئے۔ وہ بستے [illegible] محلے جن کی حفاظت کا معقول انتظام نہ تھا،
چانڈال، اور سپاہی تلنگیوں نے لوٹ لیے۔ پائے تخت [illegible] مسدود تھی بزرگوں کے اندوختے
... دولت سے خزانے بیرونی اور ملکی غارت گر [illegible] بسر بُرد مشکل ہوگئی۔ حریف امیروں
کے مسلح جتھے کوچہ و بازار میں خون خرابہ کرتے اور [illegible] اور امن و عافیت رخصت ہو جائے
تو اسبابِ معیشت و رفاہ خود بخود گم ہو جاتے ہیں۔ [illegible] ایسا تھا جب کہ عماد الملک نے فساد
کی ایک اور آگ بھڑکائی جس پر عالم گیر ثانی کے خون [illegible] کام کیا اور آخر یہ آتش سوزندہ لاکھوں مرہٹوں
کے لہو سے پانی پت کے میدان میں فرو ہوئی۔

مغلیہ سلطنت کی بوسیدہ عمارت کو توڑنے اور [illegible] الدین خان نے جو حصہ لیا اس کی تفصیل
تاریخ کی کتابوں میں ملے گی لیکن اتنا کچھ بگاڑنے اور [illegible] وجود ایک مدرسے کی بنیاد کچھ ایسی نیک ساعت
اور نیک نیت کے ساتھ رکھی تھی کہ اس کا فیض ابھی [illegible] اور اسی کے احاطے میں آپ بیٹھے دہلی کی یہ
داستان سن رہے ہیں۔ یہیں مسجد سے متصل اس کا [illegible] اگرچہ اس کی اپنے معاصر شاہ و شہریار سے
کبھی نہ بنی، لیکن اقلیم سخن کے تاج دار میر تقی میر [illegible] نوازش سے پیش آتا تھا۔ چناں چہ میر
صاحب اس کے بڑے معترف بلکہ معتقد ہیں حالانکہ [illegible] ریزی اور بادشاہ کشی سے بخوبی باخبر تھے۔ یہ

تفصیل بھی انھی کی کتاب "ذکرِ میر" … لکھتے ہیں کہ جب عالمگیر ثانی کو ایک درویش باخدا … بہانے
فیروز شاہ کے کوٹلے میں لاکر، سرکاٹ لیا اور لاش باہر پھینک دی تو وہ دن بھر بے گور و کفن … رہی۔ رات
کے اندھیرے میں چند شہزادوں نے جان پر کھیل کر اسے اُٹھایا اور ہمایوں کے مقبرے میں … (۱۱۷۳ھ / ۱۷۵۹ء)

عالمگیر ثانی کا وارث شاہزادہ عالی گوہر وزیر کے پنجۂ ستم سے بچ کر … بہار و بنگال کی طرف … چلا گیا تھا
قتل ہونے کے بعد شاہ عالم ثانی کے نام سے بادشاہ بنا۔ احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو پانی پت میں … شکست دینے
کے بعد، اسی بے سروسامان اور بے خانماں کا حقِ بادشاہی تسلیم کیا اگرچہ اسے میر صاحب کے الفاظ … "تہمتِ
بادشاہی" کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ وہ نو دس برس تک ممالکِ مشرق میں گشت لگانے اور بےکار پڑے … رہنے کے
بعد اپنی اُجڑی دِلّی دوبارہ آیا بھی تو بادشاہِ بے مُلک ہی رہا۔ حتّی کہ ذوالفقار الدولہ نجف خاں … کا
تو درباری نشست کی صورت قائم ہو جاتی تھی ورنہ بادشاہ سلامت چند مصاحبوں کو لیے بیٹھے … شعر
شاعری سے دل بہلاتے تھے۔ کئی صدی پہلے خاندانِ سادات کا ایک بادشاہ شاہ عالم گزرا ہے اس … گیا
گھٹتے گھٹتے چند میل کے دائرے میں رہ گئی تھی اور غالباً یہ مثل اسی کے لیے کہی گئی کہ "بادشاہی … دہلی تا
پالم"۔ وہ اب دوسرے شاہ عالم پر چسپاں ہوگئی۔

یہ خواجہ میر درد کی پیرانہ سالی کا زمانہ ہے جب کہ ہندستان کی حکومت مغلوں کی مٹھی سے نکل … کئی
ریاستوں میں بکھر گئی۔ مرہٹے، جاٹ، راج پوت، سکھ، سب اپنے اپنے گھروں میں شیر ہو گئے … ہندستان
میں مرہٹوں کی پانچ گدیاں جم گئیں۔ ان میں گوالیار کے سندھیا راجا کا اثر دلی … ہے
پر شاہ عالم الہ آباد چھوڑ کر دلی آیا۔ سندھیا ادھر مستقل مُلک …
سجائی۔ لیکن تقدیر نے مغلوں کی وراثت کے لیے فرنگی تاجروں کو چُنا تھا اور … بنگال …
حکومت بچھا کر اب آگے تک پاؤں پھیلا رہے تھے۔

میر تقی میر ایامِ فتنہ و فساد میں راجا ناگرمل دیوان کے ساتھ، شہر چھوڑ کر جے پور کی سرحد … کاماں
چلے گئے تھے۔ وہیں دلی کے ہزاروں باشندے مدتوں ڈیروں میں یا عارضی جھونپڑیوں …
کہ شہر میں نجف خاں نے امن امان قائم کیا اور ان خانہ بدوشوں کو پھر دلی آنا نصیب ہوا۔ مگر ابدالی …

پڑ در پڑ غارت گری نے شہر کو کھنڈر کر دیا تھا۔ میر صاحب نے اِس تباہ حالی پر جگہ جگہ آنسو بہائے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ ایک دن شہر کے کسی تازہ ویرانے پر جا نکلا تو قدم قدم پر رویا کہ وہ عالی شان عمارتیں، کہاں مٹ گئیں۔ وہ یاروں کے جم گھٹے اور ہا و ہو کے جلسے اور وہ پیارے دوست آشنا کدھر ناپید ہو گئے ؎

از ہر کہ سخن کردم گفتند کہ ایں جانیست
از ہر کہ نشاں جستم گفتند کہ پیدا نیست

خانہ ہا نشستہ۔ دیوار ہا شکستہ۔ خانقاہ بے صوفی۔ خرابات بے مست، خرابۂ بود ازیں دست تا بہ آں دست ؎

ہر کجا افتادہ دیدم خشت در ویرانۂ
بود فردِ دفترِ احوالِ صاحب خانۂ! "

غرض بڑی اذیت اُٹھائی اور قسم کھائی کہ آیندہ شہر کی سیر کو کبھی نہ نکلوں گا۔ (ذکرِ میر ص ۹۹، ۱۰۰)

میر صاحب نے تو اور صدہا افراد کی طرح آخر اس خانہ برباد شہر کو خیرباد کہی اور ان صاحبوں کے خاندان تک انھی پردیسوں کی خاک میں مِل گئے۔ لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ خواجہ میر درد جنھوں نے ہزار آفتوں کے باوجود یہ در نہ چھوڑا تھا، ان کی اولاد آج بھی اپنی بارہ دری کے گرد بستی ہے۔ شہر کے باہر کی باغچی مفقود ہوگئی، لیکن میر درد روڈ سے نئی دہلی میں ابھی اُن کی یاد موجود ہے۔ طرفہ تر یہ کہ اُس عہد کے اکثر شاعر و مصنف اُس عہد کے مصائب کا دُکھڑا روتے ہیں لیکن خواجہ صاحب اپنے نام ور ہم مشرب مرزا مظہر جانِ جاں کی طرح کہ وہ بھی خواجہ صاحب کے انتقال سے چار سال پہلے شاہِ عالم ہی کے عہد میں شہید ہوے، شکایتِ روزگار کا ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالتے۔ اُن کی زندگی میں کیا کیا قیامت کے تہلکے اور گرد و پیش کیسے کیسے ہول ناک ہنگامے اور اشتلم بپا ہوے مگر اُن کے صبر و سکون کی پیشانی پر بل نہ آیا۔ وہ اس مادّی دُنیا کے رہنے والے ضرور تھے لیکن معلوم ہوتا ہے ان کے محسوسات کا عالم دوسرا تھا۔ دیوانِ درد اور دوسری تصانیف جن میں علم الکتاب ہزار صفحات سے زیادہ ضخیم ہے، سامنے رکھیے تو گمان ہوتا ہے کہ جن تاریخی واقعات کو ہم سُننے سُنانے میں مشغول ہیں، خواجہ صاحب کو ان سے کوئی سروکار بلکہ شاید اُن کی خبر بھی نہیں تھی! ان کی حیات و موت ٹھیک اِس شعر کی مصداق ہے:- ؎

شورے شد و از خوابِ عدم چشم کشودیم دیدیم کہ باقی ست شبِ فتنہ، غنودیم!

۔۔۔۔۔۔ ا ہیچ ا ۔۔۔۔۔۔

اُردو میں خطوط نویسی کا ماضی وحال

(بہ قلم جناب ثاقب رزمی صاحب)

---(٭)---

اُردو زبان موجودہ ماحول سے بڑی سُرعت کے ساتھ متاثر ہورہی ہو۔ وہ ادب کے ہر راستے میں بہت کچھ ترقی کرچکی ہو اور اب ٹکنیکل میدانوں میں اپنا قدم نہایت کام یابی اور جرات سے آگے بڑھارہی ہو۔ لیکن ابھی اُردو میں ایسی ہزاروں خلائیں ہیں جن کا بھرنا باقی ہو۔ اُن خلاؤں میں سے ایک خطوط نویسی سے بے توجہی ہو۔ ابھی تک اُردو خطوط نویسی کی اصلاح و ترقی کی طرف کوئی قدم نہیں اُٹھایا گیا۔

خطوط نویسی پر ادبی حیثیت اور نفسِ فن دو پہلوؤں سے نظر ڈالی جاسکتی ہو۔ اُردو میں یہ دونوں رُخ تاریک پڑے ہیں۔ خطوط نویسی کو ادبی حیثیت سے لیا جائے تو اُردو میں مکتوباتی مواد بہت کچھ مل جاتا ہو جو بکھری ہوئی حالت میں پڑا ہوا ہو، لیکن نفسِ فن کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اُردو کا دامن اِس سے قطعی طور پر خالی ہو۔ ہندُستان کے اپنے نئے دَور میں قدم رکھنے سے لے کر اب تک خطوط نویسی کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی گئی اور نہ اب دی جاتی ہو۔ یہی وجہ ہو کہ اُردو میں اِس طرف کوئی قدم نہیں اُٹھایا گیا۔

کیا خطوط نویسی ایک ناگزیر ضرورت ہو؟ باہمی اظہارِ خیال اور پیغام رسانی سوسائٹی کا ایک فطری تقاضا ہو۔ انسانی معاشرت کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہو کہ انسانی گروہوں نے اپنے اپنے عہد کے ارتقاے ذہانت کے ماتحت باہمی اظہارِ خیال کو زیادہ آسان اور واضح بنانے کے لیے کیا کیا کوششیں کیں۔

اگر باہمی اظہارِ خیال کو ایک مستقل صورت دینے کی کوششوں پر گہری نظر ڈالی جائے تو ہم دیکھیں گے کہ اِس سلسلے میں انسانی ذہن کی ترقی کس طرح زینہ بہ زینہ ہوئی ہو۔ پہلے پہل اظہارِ خیال کے لیے آوازوں اور اشاروں سے کام لیا گیا۔ اِس کے بعد اِسی مطلب کو پورا کرنے کے لیے مختلف اشکال نے جگہ لی۔ پھر حروف کی نوبت آئی اور اس طرح عہد بہ عہد مختلف زبانوں نے جنم لیا۔

[illegible] کی وسعت اور ترقی کے ساتھ ساتھ ضرورت محسوس ہوئی کہ باہمی اظہارِ خیال اور پیغام رسانی کے [illegible] اس مقصد کی تکمیل کے لیے تہذیب کے ہر نئے دور میں مختلف [illegible] نے مواصلات کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور زمان و مکان [illegible] زمان سے ہمیشہ کے لیے اٹھا دیا۔ آج سائنس نے رسل و رسائل اور نقل و حمل [illegible] ایجاد کیے ہیں کہ اتنی وسیع دنیا ایک چھوٹا سا گھر معلوم دیتی ہے۔ واٹرلو کے مقام پر نپولین [illegible] کی خبر چھ ماہ تک امریکہ میں نہ پہنچ سکی، لیکن آج عہدِ سائنس میں ایک خبر چند سیکنڈ میں [illegible] ایک کونے تک پہنچ جاتی ہے۔

[illegible] فطری تقاضا ہے جو آج زیادہ ترقی [illegible] اہم صورت میں ہمارے سامنے [illegible]

[illegible] خطوط کی اہمیت اپنے انتہائی نقطے پر پہنچ چکی ہے جب کہ انسانی زندگی کے سامنے نئے [illegible] ہوئے ہیں۔ معاشرت، تجارت، سیاست اور صنعت حتیٰ کہ زندگی کے ہر شعبے میں چھوٹے [illegible] تمام امور کی انجام دہی کے لیے خطوط کی آمد و رفت ایک جزوِ لاینفک ہے۔

تجارتی کاروبار کے بدلتے ہوئے جدید راستوں اور موجودہ کش مکش کے عہد میں خط ایک عالم گیر آلہ ہے [illegible] بڑی تجارتی طاقت ہے۔ ایک مدلّل، بامعنی اور سادہ تجارتی خط ایک کارخانے کے پیش کردہ مال [illegible] کی تشہیر کرتا ہے اور اس کی شہرت اور ساکھ بناتا ہے، مال بیچتا ہے اور اعتماد بڑھاتا ہے۔

[illegible] کارخانے کے خالص نفع کا انحصار اس کی عمارت یا مال پر نہیں بلکہ اس کی کاروباری گفتگو اور خطوط [illegible] زمانۂ حال میں ایک ترقی پسند تجارتی ادارے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو ممتاز بنانے کے لیے [illegible] شستہ زبان کے استعمال میں زیادہ سے زیادہ استعداد حاصل کرے اور اپنے تجارتی خطوط اور گفتگو کو [illegible] اسالیب میں ڈھالے۔

خطوط نویسی [illegible] کا ایک اہم حصہ ہے۔ جس طرح ایک مضمون لکھتے ہوئے سادہ زبان، فقروں اور جملوں کی صحیح ترکیب اور اچھے اسلوب کی ضرورت ہے، اسی طرح ایک خط مسوّدہ کرتے ہوئے ان لوازمات کے

بغیر چارہ نہیں۔ کیا ایک اہم خط مسودہ کرنے بغیر اہتمام نہیں کرنا پڑتا؟ کیا زبان، گرامر اور خطوط نویسی کے اصول سے واقفیت کے بغیر ایک فصیح اور موثر خط لکھا جاسکتا ہے؟

سچ پوچھیے تو دوسری تحریروں کی نسبت خط مسودہ کرتے ہوے زیادہ احتیاط، زیادہ موثر اسلوب اور زیادہ شستہ زبان کی ضرورت ہے کیوں کہ ہمارا تخاطب ایک خاص فرد کی طرف ہوتا ہے جس کے جذبات اور رجحانات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ایک خط کی مسودہ نگاری کے لیے راقم کو گرامر، زبان اور فنِ تحریر سے پوری واقفیت کے ساتھ نفسیات میں بھی دست رس ہونی چاہیے۔

خطوط نویسی کی ادبی حیثیت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادبِ جدید میں کتنا اہم مقام رکھتی ہے۔ خطوط گفتگوؤں کا مرقّع ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم اُن سے اندازہ لگاسکتے ہیں کہ کسی قوم نے ثقافت کے راستے کے ساتھ ساتھ کتنی ترقّی کی ہے۔ ایک خط سے راقم کی پبلک زندگی سے لے کر خانگی حالات، ذاتی رجحانات اور اس کے ذہنی ارتقا کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

ہندستان میں حکومتِ مغلیہ کے دور میں خطوط نویسی کو بہت کچھ ترقّی دی گئی اور مکتوباتی ادب خوب پھلتا پھولتا رہا لیکن یہ ترقّی کسی اور راستے پر ہوئی۔ خطوط نویسی کی ایک غلط ادبی حیثیت پر زور دیا گیا۔ خطوں میں مقفا اور مسجع فقرے ترتیب دیے گئے اور مطالب کو ثقیل الفاظ اور غیر ضروری لسانی پیچیدگیوں میں مدغم کیا گیا۔ خط و کتابت کی تمام قِسموں، ذاتی، تجارتی اور سرکاری میں ایک ہی نوعیت کا پُرتکلّف، مرصّع اور مبہم اسلوب اختیار کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس عہد کا مکتوباتی ادب ایک جامد، غیر فصیح اور بے جان انبار بن کر رہ گیا، اگرچہ اُس میں تاریخی واقعات موجود تھے۔

بعد میں اُردو خطوط نویسی بھی اُسی ماحول سے متاثر ہوئی۔ اُس میں بھی وہی طوفان اُمنڈ آیا۔ وہی پانچ سطر کے القاب اور دس سطر کے آداب کے بعد مدّعا کے تین الفاظ لکھنے کا طریقِ عمل شروع ہوگیا۔ اگرچہ اُردو میں خطوط کے مطالب کو زیادہ دقیق نہ بنایا جاسکا، مگر تحریر میں وہی رنگینی، لفظی شان و شوکت، پیچیدہ فقرے اور دور از کار باتیں اُبھر آئیں۔

آخر ایک مدّت کے بعد مرزا غالب کی جدت پسند نظر نے عالمِ خطوط نویسی میں ایک انقلاب برپا کردیا۔ اُس نے

خطوط نویسی کے رینگتے ہوئے بے جان راستوں کو یک سر بدل دیا اور اس کے اسلوب میں ایک نیا جوبن، ایک نئی شگفتگی بھر دی۔ مرزا غالب اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔"

ایک اور خط میں خطوط نویسی کی قدیم روش کی مذمت کرتے ہوئے :-

"جاننے والے جانتے ہیں کہ میرا طریقۂ تحریر یہ ہے کہ جب قلم و کاغذ ہاتھ میں لیتا ہوں تو مکتوب الیہ کو اس لفظ کے ساتھ جو اس کی حالت کے موافق ہے صفحے کے شروع میں پکارتا ہوں اور اس کے بعد مطلب لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ القاب، آداب، خیریت گوئی اور خیر و عافیت طلبی زائد و بے کار ہے اور تجربہ کار زوائد کو کچھ وقعت نہیں دیتے۔"

مرزا غالب کا نام اُردو کے مکتوباتی ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ عالمِ خطوط نویسی میں مرزا غالب کا یہ تجدد اِس قابل تھا کہ اُسے بنیادی پتھر قرار دیتے ہوئے خطوط نویسی کو ادبی اور فنی دونوں اعتبار سے ترقی دی جاتی، لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔

حکومتِ مغلیہ کے زوال کے بعد جب سرزمینِ ہند میں انگریزی جھنڈا لہرایا اور انگریزی تہذیب نے اپنے قدم جمائے تو تمام ملک پر ایک خود فراموشی چھا گئی۔ ہر عہد کی بلند خیالی اُس عہد کے حکم راں طبقے کے خیالات ہوتے ہیں۔ اس عالمگیر حقیقت کے ماتحت ہر فرد اپنی دُنیا کو بھول کر ان نکلتی ہوئی شعاعوں میں محو ہو گیا۔ جب انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا گیا تو ملک کے ہر گوشے میں اس کے حصول کے لیے ایک گرم جوشی پھیل گئی۔ زندگی کے تمام شعبوں میں لسانی ضروریات کی انجام دہی کے لیے انگریزی زبان ایک جزوِ لازم بن گئی اور اپنی زبان کی ترقی اور نشو و نما دب کر رہ گئی۔ چوں کہ تمام ملک میں رسل و رسائل کا ذریعہ صرف انگریزی زبان تھی، اس لیے لسانی ضروریات کے لیے ایک قائم مقام بل جانے پر کسی اور طرف توجہ نہ کی گئی۔

مغربی تعلیم و تقلید کے باوجود اس فن کی طرف اہلِ ہند کو کچھ توجہ نہیں ہوئی۔

انگریزی زبان میں خطوط نویسی کے فن پر لکھی ہوئی سینکڑوں کتابیں انگریز قوم کے کاروباری تمدن کا پتا دیتی ہیں۔ اُردو میں خطوط نویسی کے فن پر کسی جدید معیاری کتاب کا وجود نہیں۔ یہاں تک کہ بیرونی پتا لکھنے کی بھی کوئی ترتیب مقرر نہیں ہے۔ بہ خدمتِ اقدس یا بہ خدمت شریف امد بہ مقام خاص کے بعد ضلع، تحصیل، شہر اور مکتوب الیہ

کے نام خلط ملط کر کے لکھ دیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں چند ٹوٹی پھوٹی کتابیں بازار سے مل سکتی ہیں جو نہایت ناکافی مواد لیے ہوے ہیں اور جو موجودہ وسیع ضروریات کی انجام دہی میں قطعی طور پر کم مایہ ہیں۔ اُردو زبان میں خطوط نویسی پر ایک با اصول مبسوط اور مکمل کتاب کی ضرورت ہے جس کا مطالعہ قاری کو خطوط نویسی کے متعلق اپنے علم کی اصلاح و ترقی میں مدد دے اور آیندہ مراسلاتی ضروریات کو پورا کرے۔

چند سال پہلے اُردو ایک چھوٹی سی خاموش، بے حس و حرکت دنیا کی زبان تھی، لیکن اب وہ ہنگاموں اور نئے افکار سے بھری ہوئی دُنیا کی زبان بن چکی ہے۔ اُس نے زندگی کے بدلتے ہوے نئے نئے دھاروں پر اپنا قدم رکھا ہے۔ ہمیں اپنی مسلسل کوششوں سے اُس میں استقامت اور مضبوطی بھرنا ہے تاکہ وہ ان تیز رو دھاروں پر چٹانوں کی طرح جم کر رہ سکے۔

اُردو کو تمام میدانوں میں ایک ترقی یافتہ اور پُر استعداد زبان بنانے اور اُس کی بنیادیں تکمیل، انقلابیت اور تجدید پر استوار کرنے کے لیے ہم اپنے سامنے مسلسل کام اور سخت محنتوں کا ہجوم دیکھتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اس دَور کے کٹھن سفر کا احساس کرتے ہوے وقت ضائع کیے بغیر اپنے آپ کو کام پر لگائیں اور مشکلات کے طوفانوں میں اپنا راستہ بنائیں۔

ہمیں اُردو کی تمام کمیوں کو جتنی جلدی ہو سکے، پُورا کرنا ہے تاکہ وقت آنے پر ہم اُسے ایک جدید اور مکمل زبان کی حیثیت سے پیش کر سکیں۔

اُردو زبان ہم سے بہت کچھ چاہتی ہے۔ ہمیں اُس کے مطالبوں کو پُورا کرنے کے لیے اپنی پوری کوشش صرف کر دینا چاہیے، یہاں تک کہ تمام ہندستان عظمتِ اُردو کی غلغلہ اندازیوں سے گونج اُٹھے۔ ہماری قومی، سیاسی، ادبی اور ثقافتی زندگی کا انحصار، اُردو کی زندگی پر ہے۔ اگر اُردو زندہ نہ رہی تو ہماری زندگی مجموعی طور پر ہمیشہ کے لیے منجمد ہو کر رہ جائے گی۔ ہمیں سورج اور چاند کی شعاعوں کے نیچے اپنی مسلسل محنتوں سے اُردو کو ایک زندۂ جاوید زبان بنانے کا عزم کرنا چاہیے۔

مشاعرے کا ارتقا اور اس کی اہمیت

(بہ قلم جناب محمد داؤد صاحب رہبر)

تمہید فارسی اور اردو میں مشاعرہ جس قدر اہمیت رکھتا ہے اسی قدر مورخین ادب نے اس کی تحقیق میں بے اعتنائی برتی ہے۔ اس علمی بے نیازی کا الزام فارسی سے زیادہ اردو کے محققین کے سر ہے نہ صرف اس لیے کہ ان کی زبان انھی مشاعروں کی بدولت دو سو برس کے قلیل عرصے میں کل دنیا کی زبانوں کی ہم پلہ ہوگئی ہے بلکہ اس لیے کہ یہ مروجہ (.Institution) صرف اردو زبان ہی میں ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے اور رکھے گا۔ جس طرح شاعری کی کم وبیش تمام خصوصیات اردو نے فارسی سے ورثے میں پائی ہیں اسی طرح مشاعرے بھی ایران ہی سے ہمارے ملک میں آئے ہیں لیکن آج ایران میں مجلسِ مشاعرہ کے نام سے یا اس سے ملتی جلتی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ انجمنِ ادب طہران میں جہاں علمی اور ادبی مقالے پڑھے جاتے ہیں بعض شعرا اپنا کلام بھی سناتے ہیں لیکن اس شعرخوانی کو ہمارے مشاعروں سے نسبت دینا بالکل غلط ہے اور یہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ مشاعرہ ایک خالص ہندستانی چیز ہے اور اردو کی ملکیت ہے۔ ہندی والوں نے اس کے مقابلے پر دیکھا دیکھی کوی سمیلن اور سکھوں نے پنجابی میں کوی دربار کی بنا ڈالی ہے لیکن انھیں اردو مشاعروں کی مقبولیت سے کوئی نسبت نہیں۔ البتہ مشاعرے پر میں نے صرف دو مضمون دیکھے ایک رسالہ زمانہ میں چھپا ہے لیکن یہ مشاعرے کی تاریخ پر روشنی نہیں ڈالتا دوسرا مولوی عبدالسلام صاحب ندوی کا ہے۔ یہ مضمون اپریل ۱۹۲۲ء کے 'معارف' میں چھپا تھا۔ لیکن یہ موضوع اس سے بہت زیادہ توجہ کا مستحق اور محتاج ہے۔ میں نے مولانا کے اس مقالے سے کافی استفادہ کیا ہے۔

مشاعرے کے معنی مشاعرے کے لفظی معنی باہم شعر کہنے یا پڑھنے کے ہیں اس لحاظ سے اس کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ عربی کے عروضیوں نے ان صورتوں کے اصطلاحی نام تجویز کیے ہیں مثلاً مشاعرہ

مفاخرہ ، منافرہ ، مطارحہ ، مسامرہ ، مساجلہ ، مباہرہ ، مناظرہ ، مماثلہ ، مباتنہ وغیرہ وغیرہ۔ میرے نزدیک اس کی چار صورتیں سب سے اہم ہیں :-

۱۔ یک جا ہوکر یعنی محفل میں شعرا ایک دوسرے کو اپنا کلام سُنائیں۔ یہ کلام سخن کے کسی صنف سے تعلق رکھتا ہو۔ ۱؎

۲۔ ایک ہی طرح یعنی زمین میں شعر کہنا۔ یہ ضروری نہیں کہ شعرا مقابلے کے لیے اہتمام سے طرح دے کر غزلیں یا قصیدے لکھیں۔ اگر متاخرین اپنے متقدمین کی غزلوں اور قصیدوں کی زمین میں نئی چیزیں پیش کریں تو اسے بھی مشاعرہ کہا جائے گا۔ مولانا عبدالسلام صاحب اسے مطارحہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

۳۔ تیسری شکل رواجی ہے جس میں شعرا کا یک جا ہونا اور پھر ایک ہی زمین میں اشعار کہنا یہ دونوں چیزیں موجود ہیں اور مشاعرے کی مکمل کیفیت اسی میں پائی جاتی ہے۔

۴۔ چوتھی صورت میں ' شعرا کا اجتماع ' اور ' ایک ہی موضوع کی نظمیں '۔

مَیں نے مشاعرے کی ان مختلف ممکن صورتوں کو ایسی ترتیب میں رکھا ہے جو ارتقاے مشاعرہ کے چار مدارج دکھاتی ہیں۔ اپنے اس نظریے کے ثبوت کے لیے ہم تاریخی شہادت کی طرف جھکتے ہیں۔

مشاعرے کی قدامت

۱۔ شعرا کا یک جا ہوکر پڑھنا۔ اگر ہم محض قیاس دوڑائیں مشاعرے کی یہ شکل شاعری کی پیدایش کے ساتھ ہی ظہور میں آنی چاہیے۔ صاحب کمال اپنے ہم پیشہ سے اس کی داد چاہتا ہے اور اس سے مشورہ کرتا ہے چناں چہ شاعر شاعر کو ضرور اپنا کلام سُناتا ہوگا۔

شعرا کے یک جا ہونے کی سب سے قدیم روایت ہمیں جاحظ کے ہاں ملتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ نوروز اور متھرا یعنی مہرگان کے جشن پر شعرا نوشیرواں کی مدح میں اس کے دربار میں قصیدے پڑھتے تھے جو خاص اس موقع کے لیے لکھے جاتے تھے۔ ۲؎

قسم اوّل کے ان مشاعروں کی زیادہ باضابطہ شکل ہمیں زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے ہاں نظر آتی ہے۔ یہ مشاعرے عکاظ اور ایسے ہی میلوں میں ہوتے تھے۔ مختلف قبائل کے شعرا یک جا ہوکر فخریہ اشعار سُناتے تھے۔

۱؎ ۔ دیکھو بدائع البدائع

۲؎ ایران بہ عہد ساسانیان ص۴۲۵ بہ حوالۂ جاحظ

السید محمود شکری الآلوسی البغدادی 'بلوغ الارب' میں لکھتے ہیں :-

كَانَ لِلْعَرَبِ أَسْوَاقٌ يُقِيمُونَهَا فِي شُهُورِ السَّنَةِ وَيَنْتَقِلُونَ مِنْ بَعْضِهَا إِلَى بَعْضٍ وَيَحْضُرُهَا سَائِرُ الْعَرَبِ بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْمَآثِرِ وَالْمَفَاخِرِ ..... [۵۱] مِنْهَا سوقُ عُكاظ وَهُوَ موسمٌ معروفٌ للعربِ بل كان مِن اعظمِ مواسِمِهِم واسواقِهِم وَهُوَ نخلٌ فِي وادٍ بين نخلةَ والطايف وهو الى الطايف اقربُ بينهما عشرةُ اميالٍ - وهُوَ وراءَ قَرْنِ المَنَازِلِ بمرحلةٍ مِن طريقِ صنعاءِ اليمن .... وكانوا يتبايعونَ فيها ويتعاكظون ويتفاخرون ويتحاجّون وتنشد الشعراء الشعر وقد كثُر ذٰلك في اشعارِهِم كقول حسّان ؎

سَأَنْشُرُ إِنْ حَيِيْتُ لَهُمْ كَلَامًا سَيَنْشُرُ فِي المجامعِ من عكاظ ....

وفيها علقتِ القصايدُ الشهيرة افتخاراً بفصاحتها على من يحضر الموسمِ من شعراء القبايل إلى غير ذٰلك وكان كلّ شريفٍ انّما يحضُر سوقَ بلدهٖ إلّا سوقَ عكاظ فانهم كانوا يتوافون بها من كلّ جهة ... [۵۲]

اس قسم کے مفاخرے منڈیوں کے علاوہ اور جگہوں پر بھی ہوتے تھے ۔ جہاں کہیں دو شخصوں میں نسبی فضیلت وغیرہ پر جھگڑا ہوجاتا۔ جھٹ قبیلے کے شاعر جمع ہوجاتے اور مفاخرت اور منافرت میں قصیدے پڑھتے۔ یہ قصیدے عموماً فی البدیہہ تصنیف کیے جاتے تھے ، ان کے محاکے کے لیے حکّام مقرر کردیے جاتے جو قبیلوں کے سربرآوردہ بزرگ ہوتے تھے ورنہ اکثر یہ مشاعرے طویل اور خوف ناک جنگوں پر منتج ہوتے تھے ۔

میں آپ کی دل چسپی کے لیے ایک مختصر سا مفاخرہ پیش کرتا ہوں ۔ مفاخرے کی یہ کوئی اچھی مثال نہیں لیکن بخوف طوالت نے اسی پر قناعت کرنے پر مجبور کیا ہے ۔ یہ مفاخرہ نعمان بن منذر شاہِ حیرہ کے دربار میں ہوا۔

" ابی عبیدہ سے روایت ہے کہ نعمان بن منذر کے ہاں بنی ربیعہ ، بنو مضر اور بنو تمیم کے وفد آئے ۔ ربیعہ کے وفد میں بسطام بن قیس اور حوفزان بن شریک البکریان تھے ۔ مضر کے وفد میں قیس بن عیلان ، عامر بن مالک اور

[۵۱] - بلوغ الارب فی احوال العرب صفحہ ۲۶۴
[۵۲] - بلوغ الارب ۔ حصّہ اوّل صفحہ ۲۶۵

عامر بن الطفیل اور تمیم کے وفد میں قیس بن عاصم اور اقرع بن حابس تھے۔ نعمان نے ان کی بہت تعظیم کی اور بہت تواضع سے پیش آیا۔ جب وہ لوگ رخصت ہونے لگے تو نعمان نے ان کے لیے اکل و شرب کی محفل آراستہ کی۔ شراب حاضر کی گئی تو پہلے نعمان نے پی اب ظاہر ہی کہ سب سے پہلے وہ جسے پیش کرے وہ سب میں افضل ہی، جب نعمان پی چکا تو خادم نے نعمان کی جانب دیکھا کہ وہ کسے پیش کرنے کا حکم دیتا ہی اور اُسے افضلیت دیتا ہی۔ ایک لمحے کے لیے اس نے سر جھکایا پھر یہ اشعار پڑھے ؎

سقی وفودك مما كنت ساقيتي ۔۔۔ وابدی بکاس ابن ذی الجدین بسطام

اغرّ ينميه من شيبان ذوانف ۔۔۔ حامی الذمار وعن اعراضها رام

قد كان قيس بن مسعود ووالده ۔۔۔ تبذ الملوك به ايام ايام

فارضوا بما فعل النعمان فی مضر ۔۔۔ وفی ربيعة من تعظيم اقوام

هم الجماجم والاذناب غيرهم ۔۔۔ فارضوا بذالك او بوؤا بارغام

پھر عامر بن الطفیل نے کہا ؎

كان التتابع فی دهر لهم سلف ۔۔۔ وابن المرار واملاك على الشام

حتى انتهى الملك من لخم الى الملك ۔۔۔ بارى السنان لمن يرمه رام

انحى علينا باظفار فطوقنا ۔۔۔ طوق الحمام باتعاس وارغام

ان يمكن الله فی يوم يشاء به ۔۔۔ نتركك وحدك تدعو رهط بسطام

فانظر الى الصيد لم يحموك من مضر ۔۔۔ هل فی ربيعه ان لم تدعنا حام

بسطام بن قیس نے اس کے جواب میں کہا ؎

لعمری لئن صحت تميم وعامر ۔۔۔ لقد كنت قدما فی حلوقهم شجا

اروني كمسعود وقيس وخالد ۔۔۔ وعمرو وعبدالله ذی الباع والندا

فكانوا على افناء بكر بن وائل ۔۔۔ ربيعا اذا ما سال سائلهم جدا

وسرت على آثارهم غير تارك ۔۔۔ وصيتهم حتى انتهيت الى المدا[1]

---

[1] بلوغ الادب حصہ اول ص۲۹۹

ان مفاخروں میں بعض شعرا کے قصائد ہم طرح بھی ملتے ہیں، لیکن یہ اتفاقی بات ہے ورنہ اس کا کوئی لزوم نہیں تھا۔ کئی مفاخروں میں ایسے اتفاق نہیں نظر آتے ہیں۔

ہم طرح قصائد اب ہم مشاعروں کے ارتقا کی دوسری منزل میں قدم رکھتے ہیں یہاں آپ کو مختلف شعرا کے ہاں ہم طرح قصائد نظر آئیں گے۔ اس قسم کے قصیدے بالعموم فارسی میں ملتے ہیں۔ ان میں ایسی مثالیں بھی ہیں کہ معاصرین ایک دوسرے کے قصائد پر طبع زاد قصائد لکھتے ہیں اور ایسی بھی کہ متاخرین متقدمین کا تتبع کر رہے ہیں۔ چناں چہ بعض قصائد کی زمینیں خاص وجوہاتِ پسندیدگی کی بنا پر بہت سے شعرا کی طبع آزمائی کی جولان گاہ بنیں۔ میں یہاں مثال کے طور پر چند ہم طرح قصیدوں کے مطلعے دیتا ہوں۔ رونی۔ وطواط۔ معزی اور مسعود سعد سلمان۔

رونی سے

قبول یافت ز ہر ہفت اختر آتش و آب	وجیہہ گشت بہ ہر ہفت کشور آتش و آب

وطواط سے

توئی کہ تیغ ترا شد مسخر آتش و آب	فگندہ ہیبتِ تو زلزلہ در آتش و آب

... سے

...اند دل و چشم من در آتش و آب	گشادہ در دل و در چشم من بر آتش و آب

...مسعود سعد سلمان سے

...م تا سر اندر آتش و آب	تواں نشستن ساکن چنیں در آتش و آب

...نی کا قصیدہ :-

... جہاں را	دیں حال کہ نوگشت زمیں را و زماں را
... جوانی را	ایام جوانی است زمیں را و زماں را۔

سنائی اور عرفی کا ایک ہم طرح قصیدہ - سنائی ؎

دلا تا کی دریں زنداں فریبِ ایں و آں بینی یکی زیں چاہِ ظلمانی بروں شو تا جہاں بینی

عرفی ؎

ز خود گر دیدہ بربندی چگویم کامِ جاں بینی ہماں کز اشتیاقِ دیدنش زادہ ہماں بینی

رونی اور عرفی :-

رونی ؎ سپہرِ دولت و دیں آفتاب ہفت اقلیم ابوالمظفر شاہِ مظفر ابراہیم
عرفی ؎ صباحِ عید کہ در تکیہ گاہ ناز و نعیم گدا کلاہِ نمد کج نہاد و شہ دیہیم

مسعود سعد سلمان - رونی اور قاآنی :-

سعد سلمان ؎ ز خاک و باد کہ ہستند یارِ آتش و آب قوی تر آمد بسیار آتش و آب
رونی ؎ گرفت مشرق و مغرب سوارِ آتش و آب ربود حرص امارت قرارِ آتش و آب
قاآنی ؎ چہ جوہر است کہ ہست اعتبارِ آتش و آب چہ گوہر است کہ زیبد نگارِ آتش و آب

عنصری - فرخی اور منوچہری :-

عنصری ؎ شہِ مشرق و شاہِ زابل ستانی خداوندِ اقران و صاحب قرانی
فرخی ؎ یکی گوہری چوں گلِ بوستانی نہ زرّ و بہ دیدار چوں زرِّ کانی
منوچہری ؎ جہانا چہ بدمہر و بدخو جہانی چو آشفتہ بازار بازارِ کانی

خاقانی اور قاآنی :-

خاقانی ؎ می و مشک است کہ با صبح برآمیختہ اند یا بہم زلف و لبِ یار در آمیختہ اند

قاآنی ؎

غم و شادی ست کہ بایک دگر آمیختہ اند یا مہ روزہ بہ نوروز در آمیختہ اند

اسی طرح میرزا غالب نے نظیری کے قصیدوں پر قصیدے لکھے ہیں۔

اس قسم کے ایک ہی زمین کے قصیدوں کی بعض اوقات اتنی کثرت ہوتی ہو کہ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ اِس زمین کا موجد کون تھا ہاں اس قدر بتا سکتے ہیں کہ سب سے قدیم قصیدہ اس طرح میں ہمیں فلاں شخص کا ملتا ہو۔

بعض قصائد میں زمین کے علاوہ موضوع بھی ایک ہی ہو۔ مثلاً ثنائی، جمال الدین اصفہانی اور خسرو کا ایک قصیدے میں شہر آشوب کا مضمون ہو۔

جمال الدین ؎ الحذار ای عاشقاں زیں وحشت آباد الحذار الفرار ای غافلاں زیں دیو مردم الفرار

ثنائی ؎ ای خداوندانِ مال الاعتبار الاعتبار ای خدا خوانانِ قال الاعتذار الاعتذار

غزلوں میں پیروی

فارسی میں جب سعدی اور خسرو کے زمانے میں غزل گوئی کا چرچا ہوا تو یہی زمینوں کی پیروی غزلوں میں بھی منتقل ہوگئی۔ متحد زمینوں کی غزلیں قصیدوں سے زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔ خواجہ عماد اور حافظ کے ہاں اکیس غزلیں متحد زمین کی ہیں۔ خواجہ حافظ اور عماد معاصر تھے عماد دونوں میں چھوٹے تھے، غالباً تتبع اُنھی نے کیا۔[۱]

اس قسم کی غزلوں کی ایک کثیر تعداد آپ کو تحفۃ الحبیب میں ملے گی "یہ کتاب ایسی فارسی غزلوں کا مجموعہ ہو جو بعض اساتذۂ ایران نے ایک ہی بحر و ردیف و قافیہ میں لکھی ہیں ..... اس مجموعے میں ایک سو اسّی (۱۸۰) شعرا کی غزلیں تخلص کے ساتھ جمع کی گئی ہیں لیکن ایسی غزلیں بھی کثرت سے ہیں جن کے مصنفین کے ناموں کے واسطے لا اعلم ولا ادری لکھا گیا ہو۔ مجموعے کا حجم ۹۱۲ صفحوں کا ہو۔ اس کا جامع فخری ابن محمد امیری ہو۔ جامع نے یہ کتاب ۹۲۹ھ میں حبیب اللہ آصف کے ایما سے مرتب کی تھی جس کی بابت وہ لکھتا ہو کہ " امین شہنشاہ ترک و عرب تھا جب اُسے یہ مجموعہ دکھایا گیا تو اس نے جامع سے کہا ؎

---

[۱] - اورینٹل کالج میگزین - مئی ۱۹۲۶ء و نومبر ۱۹۲۶ء

تو ہم درچنیں کارگاہِ سخن　　　ز کارِ سخن آں چہ دانی بکن
مبادا بہ بعضے شود اشتباہ　　　کہ در ملک نظمت نہ بود است راہ

مصنف نے اس میں التزام کیا ہے کہ جب تین سے زیادہ شاعروں کی غزلیں ایک ہی بحر و ردیف و قافیے میں نہ ملیں تو چوتھی غزل اپنی شامل کردی "۔

تحفۃ الحبیب اس مجموعے کا تاریخی نام ہے، ان غزلوں میں ہم کو توارد کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ مثلاً

(۱) سعدی ؎ یارب تو آشنا را مہلت دہ و سلامت　　　چنداں کہ باز بیند دیدار آشنا را
حافظ ؎ کشتی شکستگانیم ای بادِ شرطہ برخیز　　　باشد کہ باز بینم دیدار آشنا را
(۲) خاقانی ؎ داریم رو بجائے از بہرِ مدعائے　　　در حق ما دعائے شیخا بزرگوارا
مولانا نہائی حالی ؎
مستیم و بادہ در سر رسوائے شہر و کشور　　　با ما مشو برابر شیخا بزرگوارا
(۳) حافظ ؎ الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا　　　کہ عشق آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکل ہا
جامی ؎ شراب لعل باشد قوتِ جاں ہا قوتِ دل ہا　　　الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا
جامی ؎ ز اوّل عشق مشکل بود و آخر ہم چرا گویم　　　کہ عشق آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکل ہا
(۴) حافظ ؎ بہ بوی نافۂ کاخر صبا زاں طرہ بکشاید　　　ز تاب جعد مشکینش چہ خوں افتاد در دل ہا
ابن حسام ؎ بہ امیدے کہ بکشاید ز لعل یار مشکل ہا　　　خیال آں لب میگوں چہ خوں انگندہ در دل ہا
(۵) حافظ ؎ ساقی بہ نور بادہ بر افروز جامِ ما　　　مطرب بگو کہ کارِ جہاں شد بکام ما
جامی ؎ ساقی بیا کہ دور فلک شد بکام ما　　　خورشید را فروغ دہ از عکس جام ما

معاصرین کے انفرادی مشاعرے اب ہم معاصرین کے مشاعروں کو لیتے ہیں۔ اس سے پہلے کی منزل میں شعرا ہم طرح قصائد اور غزلیں کہتے تھے لیکن اس میں یہ ضروری نہیں تھا کہ شعرا ہم عصر ہوں۔ یہاں آکر ہمیں انفرادی مقابلے ملتے ہیں یعنی کوئی دو شاعر حریف بن کر یا دوستانہ طریقے سے ایک ہی زمین میں قصیدے اور غزلیں تصنیف کرتے ہیں۔ اس کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ ایک شاعر نئی زمین میں قصیدہ کہتا ہے اور دوسرا اس کا جواب لکھتا ہے۔

۲۔ دونوں کسی دوسرے شاعر کی ایجاد کردہ زمین طرح کے طور پر مقرر کر لیتے ہیں۔

ان معرکوں کا آغاز پانچویں صدی ہجری میں شروع ہوتا ہے۔ شاعروں کی باہمی رقابت عموماً شاہی انعام و اکرام پر ہوتی تھی اگر ایک شاعر کو کسی قصیدے پر بھاری صلہ دیا جاتا تو حریف اسی زمین میں بہتر قصیدہ لکھنے کی کوشش کرتا۔ عموماً یہ رقابت ایک ہی دربار کے شعرا کے مابین ہوتی تھی۔ چناں چہ ’’غضایری رازی کے دو شعروں پر سلطان محمود نے دو توڑے دلوا دیے۔ عنصری نے غضایری کے قصیدے کا رد لکھا۔ غضایری نے قصیدے ہی میں رد الرد لکھا۔ ان قصیدوں میں اس تفصیل سے اعتراض و جواب ہیں کہ گویا علمی رسالے ہیں ‘‘[1] اس سے ظاہر ہے کہ اس قسم کے مشاعرے مناظروں کا کام بھی دینے لگے تھے۔

دولت شاہ، غضایری کے بارے میں لکھتا ہے:[2] ’’از اکابر شعراست۔ در روزگار سلطان محمود بن سبکتگین بودہ از ولایت ری بہ عزم ملازمت متوجہ زین شدہ بر در دارالملک غزنین در مشاعرہ و معارضہ مشغول شدہ۔‘‘

پانچویں صدی کے آخر میں عہدِ ابراہیم غزنوی میں ہمیں راشدی اور مسعود سعد سلمان کے باہمی معرکوں کا پتا چلتا ہے یعنی دونوں شاعروں میں مشاعرے بھی ہوئے ہیں چناں چہ مسعود سعد سلمان لکھتا ہے ؎

ہر آں قصیدہ کہ گفتیش راشدی یک ماہ   جواب گفتم بہ زاں بدیہہ ہم بہ زماں[3]

پانچویں صدی کے بعد چھٹی، ساتویں، آٹھویں اور نویں صدی ہجری تک ہمیں ان انفرادی مشاعروں کے وجود کی شہادت حاصل ہے۔

چھٹی صدی میں (۱) خاقانی اور اثیرالدین کے مشاعرے۔ دولت شاہ لکھتا ہے[4] ’’فاضل زمانِ خود اثیرالدینؒ معاصر خاقانی بود و از دیار فرغانہ ترکستان بہ آرزوی مشاعرہ خاقانی آہنگ ملک شروان کرد۔‘‘

(۲) شمس طبسی اور قاضیٔ بخارا صدر الشریعہ۔ شمس طبسی کے ذکر میں دولت شاہ راقم ہے ’’شمس الدین معاصر سلطان الفضلا صدر الشریعت (قاضیٔ بخارا) از اکابر فضلاست و بایک دیگر صحبت داشتہ اند۔ گویند کہ قاضی شمس الدین

[1] ’’شعر العجم‘‘ جلد ۴، صفحہ ۱۳۱ شعرا کے باہمی معرکے۔ [2] دولت شاہ، صفحہ ۳۳۔ [3] ’’اردو‘‘ جنوری و اپریل ۱۹۳۳ء تبصرہ از علامہ شیرانی بر کتاب شمس العلما عبد الغنی صفحہ ۱۰۔ [4] دولت شاہ، صفحہ ۸۰، نیز دیکھو ’’آثار البلاد‘‘ صفحہ ۲۷۶

آوازۂ فضل کمال صدر الشریعۃ بشنود و عزیمت بخارا کرد۔ روزی کہ بہ دیدن صدر الشریعۃ رفت، درآں شب صدر الشریعۃ قصیدۂ گفتہ بود و بعد از آں کہ طلبہ را درس گفت ایں قصیدہ را می خواند و درغث و سمینِ آں فضلا سخن می گفتند و این است بعضی از آں قصیدہ سے

برخیز کہ صبح است و شراب ست و من و تو   آوازِ خروس سحرے خاست ز ہر سو
برخیز کہ برخاست پیالہ بہ یکی پای   بنشیں کہ نشست ست صراحی بہ دو زانو
می نوش از اں پیش کہ معشوقۂ شب را   با صبح بہ گیرند و ببرند دو گیسو
در شیشۂ مینا می رنگیں خور و پندار   سنگی کہ دریں شیشۂ گردندۂ مینو
ای آہوی رعنای ترا صید دل من   وی زلفِ پریشانِ تو چوں نافۂ آہو
از حسرتِ شفتالوی سرخِ لبِ لعلت   نیلی رُخ سرخم ز طپاں چہ است ز آلو

مولانا شمس الدین از مجلس برخاست و فی الحال بہ طریقۂ بدیہہ ایں قصیدہ را جواب گفت و بحضور مولانا صدر الشریعۃ آورد و بگزرائید و بعضی از آں قصیدہ ایں ست سے

از روی تو چوں کرد صبا طرّہ بہ یک سو   فریاد برآورد شب غالیہ گیسو
از زلف سیاہ تو نگر شد گرہی باز   کز مشک برآورد فلک تعبیہ ہر سو
از شرم خط غالیہ تاثیر تو ماند است   در وادیِ غم با جگرِ سوختہ آہو [۱]

(۳) خالد ابن الربیع المکی الطولانی ... "میانِ او و وحید الدین انوری مکاتبات و مشاعرات ست" [۲]

(۴) حمید الدین الجوہری المستوفی ... "میانِ او و استاد سوزنی مشاعرات ست" [۳]

(۵) شرف الدین احمد بن محمد ایزد یار الشہیر بفریدکانی "میانِ او و صدرِ اجل جمال الدین افضل العصر (افتخار الملک) مکاتبات و مشاعرات ست" [۴]

ساتویں صدی | اس صدی میں انفرادی مشاعروں کا سب سے زیادہ زور ہے۔ عوفی یزدی 'لباب الالباب' میں مختلف ہم عصر شعرا کے مشاعروں کا ذکر کرتا ہے مثلاً :-

---

[۱] دولت شاہ صفحہ ۵۔ [۲] لباب الالباب جلد دوم ص ۱۳۸۔ [۳] لباب جلد دوم ص ۲۰۵۔ [۴] لباب جلد اوّل ص ۱۱۲

(۱) ملک طغان شہ بن محمد المؤید ..... "میانِ او و میانِ ملک تاج الدین تمران مکاتبات و مشاعرات ست"[1]

(۲) فخر الدین محمد .... "مدتی در نیشاپور بہ مصاحبت یک دیگر بودیم و میانِ ایں ضعیف و او مشاعرات ست"[2]

(۳) ابوالفضل عثمان بن احمد الہروی .... "میانِ او و رفیع مشاعرات ست"[3]

(۴) الحکیم مجد الدین فہمی البخاری .... "میانِ او و سعد الدین کافی مشاعرات ست"[4]

دولت شاہ نے بھی اس صدی کے بعض مشاعروں کا ذکر کیا ہے:-

(۵) رکن الدین قبای ... "با بدر الدین جاجرمی در اصفہان مشاعرہ و معارضہ دارد"[5]

{ساتویں کا آخر یا آٹھویں کا آغاز} (۶) جامی ... "بہ تبریز رفت و با خواجہ ہمام الدین مشاعرہ کرد"[6]

آٹھویں صدی

(۱) سراج الدین قمری .... سراج الدین را با عبید زاکانی و خواجہ سلمان مشاعرہ و معارضہ است"[7]

(۲) امیر یمین الدین فریومدی .... "میانِ امیر یمین الدین و پسرش امیر محمود کہ مشہور است بہ ابن یمین مشاعرہ بود"[8]

نویں صدی

(۱) ملک الشعرا مولانا بدر شیروانی .... "مولانا محمد کاتبی از خراسان چوں بہ شیرواں افتاد میانِ او و مولانا بدر مشاعرہ و معارضہ دست داد"[9]

(۲) خواجہ علی شہاب ... "میانِ او و شیخ عارف آذری مشاعرہ و مناظرہ افتاد"[10]

شاعروں کی اس قسم کی باہمی چشمکیں بے شک شاعری کی ترقی کا موجب ہوتی تھیں۔ مولانا شبلی شعر العجم میں لکھتے ہیں "ایک شاعر کوئی نظم زور کی لکھتا تھا تو حریف شعرا قصیدے کا جواب لکھتے تھے اور زیادہ زورِ طبیعت صرف کرتے تھے۔ اکثر مشکل مشکل طرحوں میں اس غرض سے قصیدے لکھتے تھے کہ حریف سے جواب بن نہ آئے"[11]

نویں صدی کے اختتام پر اور دسویں صدی کے دوران میں طرحیں دینے کا رواج ہوا۔ اس سے پیشتر شعرا از خود

---

[1] لباب جلد اول ص۳۶۔ [2] لباب جلد اول ص۲۱۱۔ [3] لباب جلد دوم ص۳۴۶۔ [4] لباب جلد دوم ص۳۸۶
[5] دولت شاہ ص۱۶۲۔ [6] دولت شاہ ص۱۸۱۔ [7] دولت شاہ ص۲۳۵۔ [8] دولت شاہ ص۲۷۳۔
[9] دولت شاہ ص۳۷۷۔ [10] دولت شاہ ص۳۹۱۔ [11] شعر العجم جلد ۴۔ ص۱۳۷

اساتذہ کی غزلوں پر غزلیں کہتے تھے ۔ طرح اس سے قبل عموماً کسی شاعر کا امتحان کرنے کے لیے دی جاتی تھی ۔ چناں چہ میخانے میں خواجہ حافظ کا قصہ انھی کی زبانی یوں دیا گیا ہے :-

"من ایں غزل خواندن گرفتم ۔ چوں تمام شد ہمگی گفتند ایں شعر تو نیست بہ اعتقادِ ما معلوم نیست کہ دریں جزوِ زماں کسی بہ ایں خوبی شعر بگوید چوں از تو قبول کنیم ؟ گفتم غزل طرح کنید ۔ غزلی طرح کردند بہ توفیق فیاض علی الاطلاق خوب گفتم "۔[۱]

مآثر رحیمی ۔ ص ۲۴۴ ۔ بیان مولانا قمی ۔ "غزلی چند کہ مستعداں درآں زماں بہ جہت آزمایش و امتحان طبیعت آں دانش پژوہ طرح کردند دمِ مساوات بلکہ پیشی زد "

مولانا شبلی شعر العجم میں رقم کرتے ہیں :-

" اس زمانے میں شاعری کی ترقی کا ایک سب سے بڑا سبب یہ ہوا کہ مشاعرے کا رواج قائم ہوا ۔ اس سے پہلے شعرا بطورِ خود اساتذہ کی غزلوں پر غزلیں کہتے تھے اب یعنی فغانی کے زمانے سے یہ طریقہ ہوا کہ کسی امیر صاحبِ مذاق کے مکان پر شعرا جمع ہوتے تھے ۔ پہلے سے کوئی طرح دے دی جاتی تھی سب اس طرح میں غزلیں لکھ کر لاتے تھے اور پڑھتے تھے ۔ کبھی کبھی برسرِ محفل برابر کے دعوے داروں میں چوٹ چل جاتی تھی ۔ سوال و جواب ہوتے تھے اور اس طرح مسابقت اور حریف پیشگی شاعری کو ترقی دیتی جاتی تھی . . . "[۲]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں : " فغانی کی غزلیں عموماً طرح کے طور پر دی جاتی تھیں اور محتشم کاشی وحشی یزدی غیرتی وغیرہ ان میں غزلیں لکھتے تھے ۔ عرفی بھی انھی طرحوں پر غزلیں لکھتا تھا اور عام مشاعروں میں بے باکانہ پڑھتا تھا ۔ وحشی یزدی یزد میں سکونت رکھتا تھا اس لیے اس سے تحریری مناظرات رہتے تھے ۔ اوحدی نے لکھا ہے کہ جب میں شیراز گیا تو مشہور شعرا کے نام دریافت کیے ۔ لوگوں نے غیرتی کا پتا دیا ۔ شیراز میں ایک دکان تھی جو شعرا کا دنگل تھا یہاں عارف لاہجی ، حسین کاشی مورّخ ، میر ابوتراب شبستری مخاطب بہ مورخ خاں ، رضائی کاشی وغیرہ مشاعرے کرتے تھے ۔ مشاعرے میں غیرتی اور عرفی سے مباحثہ ہوا ۔ عرفی نے دعوے کے دونوں پہلو مخالف اور موافق لیے اور دونوں میں غیرتی پر غالب آیا . . . "[۳]

---

[۱] میخانہ ص ۹۳ ۔ [۲] شعر العجم جلد ۲ ص ۱۹ ۔ [۳] شعر العجم جلد ۳ ص ۵۳ بہ بعد بہ حوالہ بہارستان سخن صمصام الدولہ شاہنواز خاں

شیراز کے علاوہ مشاعروں کا بڑا مرکز کاشان تھا۔ عبدالباقی نہاوندی کاشان کے مشاعروں کا ذکر مآثرِ رحیمی میں کرتا ہے۔

خراسان میں مشاعرہ:۔ ص۳۳۲ مآثر رحیمی۔ ذکر مولانا مظہری کاشمیری . . . " وغزلی چند طرح نمودند و بہ امثال و اقران خود دم مساوات زدند"

یہ وہ زمانہ تھا کہ اکبر اور خان خاناں کی بخششیں دور دور سے اہلِ کمال کو ہندستان میں کھینچ کر لا رہی تھیں ایران میں صفویوں کی شعر و شاعری کے معاملے میں بد ذوقی انھیں وہاں سے نکلنے پر آمادہ کرتی تھی۔ ایران سے بہت سے شعرا ان دنوں ہندستان میں آئے اور انھی مشاعروں کو اپنے ساتھ لائے۔ یہیں بہت سی مجالس مشاعروں کی نظر آتی ہیں۔

کشمیر میں ظفر خاں کے ہاں مشاعرے ہوتے تھے جن میں کلیم۔ صائب اور غنی وغیرہم شریک رہتے۔ [۱] مآثر الامرا میں لکھا ہے:۔

" و در ہر ہفتہ یک بار مشاعرہ مقرر کردہ بود۔ جمیع شعرای کشمیر حاضری شدند در آخر مجلس شیلانے می کشید۔" [۲]

مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے بدایونی سے ایک واقعہ پیش کیا ہے جو مشاعرے کے وجود پر دلالت کرتا ہے:۔

بدایونی نے امیر سلطان کا ایک شعر نقل کیا ہے ؎

باریک چو موی ست میانی کہ تو داری   گویا سرِ آں موست دہانی کہ تو داری

" چوں ایں غزل درمیاں انداخت خیلی از شعرای آں صوبہ جواب گفتند از اں جملہ این ست ؎ گفتم کہ گمانیست دہانی کہ تو داری ۔ گفتا کہ یقیں است گمانی کہ تو داری ـــــــ و فقیر ایں چنیں گفتہ بودم ؎

سرچشمۂ خضر است دہانی کہ تو داری   ماہی است در آں چشمہ زبانی کہ تو داری [۳]

بدایونی نے ایک اور امیر محمد خاں کلاں غزنوی کے بارے میں نقل کیا ہے:۔

" زمانے کہ حکومت سنبل داشت ایں غزل حضرت شیخ سعدی قدس سرہٗ درمیاں انداخت کہ ؎

دلی کہ عاشق صابر بود مگر سنگ است   زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است

وخود ایں چنیں گفت کہ ؎

---

[۱] شعر العجم جلد ۳ ص۲۱۹ ۔ [۲] مآثر الامرا حصہ دوم ص۷۶۷ ۔ [۳] بدایونی ص۲۳۸

دمے کہ چہرۂ ساقی ز بادہ گل رنگ است — بہ نوش بادہ بر آوازِ نی کہ دل تنگ است

ومیر امانی و دیگر شاعران ہر کدام فراخور حوصلہ و حالت خویش موافق زباں آں زمان تتبع نمودہ جواب دادند ازاں میاں جمال خان مرحوم بداونی کہ نسبت مصاحبت و تقرب تمام بہ خان داشت و در لطافت طبع یگانہ بود غزلی گفت کہ مطلعش ایں ست سے

تُرا رخ از مئے عشرت مدام گل رنگ است — مرا بہ فکر دہانت چو غنچہ دل تنگ است[1]....."

اس زمانے میں مشاعروں کا سب سے بڑا مرکز برہان پور تھا۔ صاحب مآثرِ رحیمی جا بہ جا اس کا ذکر کرتا ہے، مثلاً مولانا تسلّی کے بیان میں درج ہے :-

" بہ برہان پور آمدہ بہ شرفِ بندگیٔ شان سرفراز شد، و در وقتے کہ مُوما الیہ (خان خاناں) در بُرہان پور بود و ہنوز ملازمت ایشاں نمودہ بود ایں غزل خواجہ حسین ثنائی را کہ ایں بیت از وست سے

ای اہلِ ہوش وقتِ گریباں دریدن است — دست مرا بہ سوے گریباں کہ می برد؟

طرح فرمودہ بودند کہ موزونانِ برہان پور و بندگانِ صاحب طبیعت ایشاں نیز بگویند مولانا مذکور آں غزل را و قصیدۂ بمدح ایں سپہ سالار بود "[2]

مولانا سیدی کے ذکر میں لکھتے ہیں :-

" بتاریخ سنہ یک ہزار و بست و دو از عراق بہ رفاقت و ہم راہیٔ ایں فقیر بہ ہندستان افتاد و غزلی چند کہ در دارالسلطنت برہان پور درمیانۂ بعضی موزونان طرح شدہ بود بہ غایت نیکو گفت "[3]

مؤلف اپنی سوانح میں لکھتا ہے :- " در سنہ ہزار و ہفت غزلی درمیانۂ مستعداں طرح شدہ بود ..."[4]

برہان پور میں مشاعروں کا یہ چرچا خان خاناں کی بدولت تھا جو خود طرحیں دے کر شاعروں سے غزلیں لکھواتا تھا اور خود بھی لکھتا تھا۔ ملّا صاحب اس کے متعلق رقم طراز ہیں :-

" خان خاناں در قابلیت و استعداد یکتائی روزگار بود و عربی و فارسی، ترکی و ہندی رواں داشت۔ شعر خوب می فہمید و رحیم تخلّص کرد۔"

" خان خاناں کو فراہمی کتب کا بے حد شوق تھا اور اس قدر کتابیں جمع کی تھیں کہ وہ دار الحکمت کا کام دیتا تھا۔ ایک عجیب خصوصیت اس کتب خانے کی یہ تھی کہ جس قدر ممتاز و معروف شعرا اس کے دربار میں تھے،

---

[1] بدایونی ص ۲۸۸ ۔ [2] مآثرِ رحیمی ص ۱۵۳۶ ۔ [3] مآثرِ رحیمی ص ۱۱۲۹ ۔ [4] مآثرِ رحیمی ص ۱۵۲۹

ان کے دیوان خود ان کے ہاتھ سے لکھے ہوئے کتب خانے میں محفوظ تھے اکثر شعرا اس کتب خانے کی خدمت پر مامور تھے کتب خانے میں غزلوں کی طرحیں دی جاتی تھیں ۔ شعرا جلسۂ مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے ۔ خانخاناں خود بھی شریکِ جلسہ ہوا کرتا تھا اور اس نے خود ان طرحوں میں غزلیں کہی ہیں اور زور آزمائیاں کی ہیں ۔"

عہدِ اکبری میں ہمیں انفرادی مشاعرے کی ایک ایسی مثال ملتی ہے جو بہت نادر ہے ۔ اس میں عرب کے مفاخروں کا رنگ بھی ہے اور اس کے علاوہ مطارحہ بھی موجود ہے لیکن بجائے غزل کے رباعی کو استعمال کیا گیا ۔

خان زمان اکبر کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہوا اُس نے اکبر کو لکھا :- ؎

ای سدِّ سکندرِ زمانہ درِ تو　　یاجوج بود سپاہی لشکرِ تو
در دورِ تو آثارِ قیامت پیداست　　دجّال توئی خواجہ امینا خرِ تو

اکبر نے اس کا جواب حسب ذیل رباعی میں دیا ؎

ای خانِ زماں کہ پُر بود لشکرِ تو　　شد دولتِ من باعثِ کرّ و فرِ تو
کم تر باشم ز خرِ دجّال امروز　　فردا من اگر جُدا نہ سازم سرِ تو

خان زمان نے پھر لکھا ؎

تا ہست اثرِ خالصہ در کشورِ تو　　مشکل کہ بمن جنگ کند لشکرِ تو
بگزر ز زر و سیم کہ تا نوکرِ تو　　از سر گزرد برای سیم و زرِ تو

اکبر :- ؎　با آں کہ بود خاکِ درم افسرِ تو　　امروز بمن فرد نیامد سرِ تو
از دولتِ من ہست ترا سیم و زری　　وز زورِ زراست قدرت لشکرِ تو

خان زمان :- ؎　ای شاہِ زماں منم کمیں نوکرِ تو　　وز ترس نمی توانم آمد برِ تو
از دوُر تو قصدِ کشتنِ من داری　　نزدیک چساں توانم آمد برِ تو

اکبر :- ؎　گفتی تو چو راستی خدا یاورِ تو　　صد رحمتِ حق بر پدر و مادرِ تو
تغییر بدہ تو سکّہ و خطبۂ من　　تا من نہ کنم آرزوی کشورِ تو

جہاں گیر کی اپنی شعر فہمی کا معیار نہایت بلند تھا اور معمولی شاعر اس کے رو بہ رو غزل یا قصیدہ پڑھنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ وہ خود طرحیں ڈالا کرتا تھا۔ دو ایک مشاعروں کا 'توزک' میں بھی ذکر ہے۔

ایک دفعہ دربار میں یہ شعر امیر الامرا کا پڑھا گیا ؎

بگزر مسیح از سر ما کشتگانِ عشق　　　یک زندہ کردنِ تو بہ صد خوں برابر است

جہاں گیر کے اشارے پر سب نے غزلیں کہیں۔ جہاں گیر نے ملا احمد مُہرکن کا شعر پسند کیا چناں چہ یہ تمام واقعہ 'تزک' میں لکھتا ہے جو حسبِ ذیل ہے:-

' بہ تقریبے ایں بیت امیر الامرا خواندہ شد . . . . چوں طبع من موزون است گاہے بہ اختیار و گاہے بے اختیار مصراع و رباعی یا بیتے در خاطرم سری زند ایں بیت بر زباں گزشت ؎

از من عتاب رُخ کہ نیم بے تو یک نفس　　　یک دل شکستنِ تو بہ صد خوں برابر است

چوں خواندہ شد ہر کس کہ طبع نظم داشت دریں زمین بیتے گفتہ گزرانید۔ علی احمد مُہرکن کہ احوال او پیش ازیں گزشت بد نہ گفتہ بود ؎

ای محتسب ز گریۂ پیرِ مغاں بترس　　　یک خم شکستنِ تو بہ صد خوں برابر است

جہاں گیر کے عہد میں دوسرے امرا بھی اپنے ہاں مشاعرے منعقد کراتے تھے مثلاً امان اللہ خاں فرزند زمانہ بیگ مہابت خاں کے مشاعرے کا 'مُوخاذنہ' میں ذکر ہے۔

جہاں گیر خود شعر و شاعری کا دل دادہ تھا۔ شاہ جہاں اور عالم گیر نے اگرچہ اس کی جانب توجہ نہیں کی لیکن ان کے عہد میں بھی مشاعرے کسی نہ کسی صورت میں جلوہ گر ہیں۔

شاہ جہاں کا عہد

قدسی کا ایک قصیدہ ہے:-

عالم از جلوۂ حُسن تو چناں تنگ فضا ست
کہ سپند از سرِ آتش نہ تواند برخاست

شیدا نے اس قصیدے کے ایک ایک شعر کا رد لکھا اور اسی بحر و قافیے میں لکھا۔ منیر لاہوری نے محاکمہ کیا اور وہ بھی انھی قافیوں میں ہے . . . [1]

[1] شعر العجم، جلد ۴ صفحہ ۱۳۷

بیداہی کے حالات میں عمل صالح میں ایک مشاعرے کا بیان درج ہی جو میں چھوڑ دیتا ہوں۔

عہد عالم گیر

کلمات الشعرا کا مصنف سرخوش اپنے عاصرین کے شاعروں کا ذکر کرتا ہی۔ وہ خود بھی ان میں شریک ہوتا تھا۔ میر محمد احسن ایجاد پر راست نی .... ہی ... غزل ہائے طرحی را بہ قدرت تمام می گوید ... [1] پھر ایک اور جگہ میر نظام الدین اسد تایع کے حالات میں لکھا ہی :- "روزی ایں بیت خواجہ حافظ شیراز ..... باہم طرح کردہ ایم۔ حافظ :-

مزرعِ سبز فلک دیدم و داس مہ نو | یادم از کشتۂ خویش آمد و ہنگام درو [2]

یہ واقعات کم وبیش انفرادی مشاعروں کی فہرست میں آسکتے ہیں یہاں میں صراحت سے کہنا چاہتا ہوں کہ اگرچہ اس دور میں آکر مشاعرے باضابطہ یعنی مروجہ صورت میں آچکے تھے لیکن اس کی پرانی صورتیں اب بھی قائم تھیں۔ جس طرح والدین اپنی اولاد کے پرورش پا چکنے کے بعد زندہ رہتے ہیں بعینہٖ یہی کیفیت مشاعروں کی ہی۔ انفرادی مشاعرے اب تک قائم تھے اور آیندہ بھی قائم رہے اور ہم دیکھیں گے کہ اردو میں منتقل ہوکر جب مشاعروں میں پابندیٔ اصول و قاعدہ شرط ہوئی اور مشاعروں نے مستقل رواج و رسم کی صورت اختیار کی، اس وقت بھی مشاعرے کی ابتدائی شکلیں قائم رہیں۔ چناں چہ میں پہلے بیان کرچکا ہوں کہ میرزا غالب نے نظیری کے قصائد کا اسی طرح تتبع کیا جس طرح اوائل میں شعرا کرتے تھے۔

اسی طور پر طرح کا استعمال شاعر کی اہلیت جانچنے میں تا ایں دم ہوتا ہی اور ہر عہد میں رہا۔ عالم گیر کے عہد میں ہمیں اس کی ایک مثال ملتی ہی، سرخوش کے "کلمات الشعرا" میں ہی :-

"و در اوائلِ روزی فقیر باوی گفت کہ مسودہ اشعار ملا نعیم بہ دست ناصر علی افتادہ و اشعار آں را بہ نام خود می خواند گفت امتحان شاعر طرح غزل است۔ باید باہم طرح غزل کنیم .. " [3]

اوپر کی مثالوں سے ظاہر ہی کہ فارسی کے مشاعرے کثرت سے ہندستان میں رائج ہوچکے تھے اور بعد کے زمانے میں ترقی پکڑتے گئے حتاکہ جب اردو زبان نے ادبی حلقوں میں طاقت حاصل کی اور مشاعرے اردو میں ہونے لگے، اس وقت بھی ان کے دوش بہ دوش فارسی مشاعروں کی محفلیں باقاعدہ جمتی رہیں بلکہ جہاں اردو

---

[1] کلمات الشعرا صـ۸ ۔ [2] کلمات الشعرا صـ۴۲ ۔ [3] کلمات الشعرا صـ۷۵ ۔

کی طرح دی جاتی وہاں اساتذۂ فارسی کے لیے فارسی کی ایک الگ طرح بھی رکھی جاتی تھی۔ فارسی زبان منظرِ عام سے کبھی نہیں ہٹی اس پر ہم آگے چل کر بحث کریں گے۔

مشاعروں کا رواج اُردو میں اُردو ادب کا شمالی ہند میں باضابطہ آغاز محمد شاہ کے اوائلِ حکومت میں ہوا ہو اور یہی وہ زمانہ ہو جب کہ مشاعرے فارسی سے منتقل ہو کر اُردو میں بھی جگہ پانے لگے۔ اگر انفرادی مشاعروں کو لیا جائے تو ان کا وجود ہمیں وؔلی دکنی کے عہد سے ملتا ہو۔ آزاؔد نے 'آبِ حیات' میں حسبِ ذیل لطیفہ نقل کیا ہو:۔

ولی نے اپنے جوش ریختہ میں ناصر علی سرہندی کو کہ علیؔ تخلص کرتے تھے، یہ شعر لکھا:۔

اُچھل کر جا پڑے جوں مصرعِ برق　　　اگر مطلع لکھوں ناصر علی کوں

ناصر علی نے اس کے جواب میں لکھا:۔

بہ اعجازِ سخن گر اُڑ چلے وہ　　　ولی ہرگز نہ پہنچے گا علی کوں[1]

محمد شاہی عہد میں فارسی مشاعرے اس واقعے پر مشاعرے کا صحیح اطلاق نہیں ہوسکتا لیکن مشاعروں کی باقاعدہ ابتدا سوداؔ کے اوائلِ عمر میں ہوتی ہو۔ فارسی گویوں کے لیے غزلوں کو منظرِ عام پر لانے کا ذریعہ مشاعرے تھے۔ اس زمانے میں کئی جگہ مشاعرے ہوتے تھے سب سے زیادہ مشہور مشاعرہ مرزا بےدؔل کے عرس کے موقع پر ہوتا تھا۔ اس زمانے کے شاعروں کے کلام اور دیگر تحریروں سے اس کا حال معلوم ہوتا ہو۔ مثلاً 'خزانۂ عامرہ' میں اس کا ذِکر ہو۔

نیز سوؔدا نے مولوی ندرؔت کی ہجو میں اس کا ذِکر کیا ہو، وہ خود انھی مشاعروں میں اپنا فارسی کلام سُناتا تھا۔ اس ہجو میں وہ دو جگہ لکھتا ہو:

(۱) عرس میں جا میرزا بےدؔل کے تئیں باشدّومد　　　شعر ناموزون و پوچ اس رات کو پڑھتا تھا جد

کہتے تھے سُن سُن کے تیرے حق میں سب یوں نیک و بد　　　جوں براے ع اشب کو مغز سا معان را ے خورد

ایں لعیں در بزم طرح شور و غوغا ریختہ

(۲) ایسی غزل اک عرس میں تم سے جب انصرام ہو ۔ بحر میں جس کی ہر طرح شبہ خاص و عام ہو
تقطیع اس کی جس کنے صبح سے تا بہ شام ہو ۔ اس کی طرف سے آخرش تم کو یہی پیام ہو
گھوڑے کو دو نہ دو لگام منہ کو تنک لگام دو[1]

پہلی مثال سے ظاہر ہی کہ فارسی کے یہ مشاعرے بھی رات کے وقت ہوتے تھے۔

فارسی گویوں کے توڑ پر دلّی کے ریختہ گویوں نے مجلسِ مراختہ کی بنا ڈالی یعنی صحبتِ ریختہ گویاں میاں کم ترین کے بیان میں نکات الشعرا میں میر تقی لکھتے ہیں :۔ "گاہ گاہ در مجلسِ مراختہ کہ ایں لفظ بوزنِ مشاعرہ تراشیدہ اند ملاقات می شود"[2] نیز دیکھو قیام الدین قائم مخزنِ نکات صفحہ ۷۴ ذکرِ فرحت "گاہ گاہ در مجلسِ مراختہ کہ ایں اختراع بروزنِ مشاعرہ است بہ لفظ می آید"

سب سے قدیم مراختہ خان آرزو کا ہی جو اس کے مکان پر منعقد ہوتا تھا اور ریختے کے تمام بڑے بڑے استاد یعنی سودا، میر، میر درد، جرأت وغیرہ اس میں شریک ہوتے تھے۔ شفیق اورنگ آبادی چمنستانِ شعرا میں اس کا ذکر میر درد کے بیان میں بہ ایں الفاظ کرتے ہیں :۔ "شاہ عبدالحکیم حاکم لاہوری می گوید کہ ایں عزیز بزرگِ عالی دودماں را فقیر مکرر بہ خانہٴ خان آرزو روز مراختہ یعنی صحبت ریختہ گویاں ہندی کہ در پانزدہم ہر ماہی مقرر بود دیدہ ام"[3] حاکم لاہوری نے 'مردم دیدہ' میں اس کا تذکرہ کیا ہی۔

'آبِ حیات' میں مولانا آزاد نے اسی مشاعرے کے ایک واقعے کی روایت کی ہی کہ سودا نے یہ مطلع پڑھا
؎ آلودہٴ قطراتِ عرق دیکھ جبیں کو ؛ اختر پڑے جھانکے ہیں فلک پر سے زمیں کو ۔ شعر قدسی کے ایک مطلع کا ترجمہ تھا۔ خان آرزو نے فوراً کہا ؎ شعرِ سودا حدیثِ قدسی ہی ؛ چاہیے لکھ رکھیں فلک پہ ملک۔
سودا اُٹھ کر خان سے لپٹ گیا اور لوگوں پر یہ ظاہر کیا کہ خان نے واقعی اس کے شعر کو حدیثِ قدسی کہا۔
قدسی کا اصل شعر یہ ہی :۔ ؎ آلودہٴ قطراتِ عرق دیدہ جبیں را ؛ اختر زفلک می نگرد روی زمیں را[4]

دوسرا مشہور مراختہ خواجہ میر درد کا ہی۔ میر تقی نکات الشعرا میں میر درد کے بیان میں لکھتے ہیں :۔
"مجلسِ ریختہ کہ بہ خانہٴ بندہ بہ تاریخ پانزدہم ہر ماہ مقرر است بہ ذاتِ ہمیں بزرگ است زیرا کہ پیش

---

[1] سودا از شیخ چاند صفحہ ۲۳ ۔ [2] نکات الشعرا صفحہ ۱۴۷ ۔ [3] چمنستان شعرا صفحہ ۷۶ نیز دیکھو تذکرہ میر حسن صفحہ ۲۰۶ ۔ [4] آبِ حیات صفحہ ۱۵۹

ازیں این مجلس بہ خانہ اش مقرر بود ،،[1]

میر صاحب اس کے انعقاد کی تاریخ ہر ماہ کی پندرھویں بتاتے ہیں لیکن 'دستور الفصاحت' میں یکتا نے اس کی تاریخ تئیسویں درج کی ہے :-

" میر دَرد . . . در بست و سویم ہر ماہ مجلسِ سرود و مشاعرہ در کاشانۂ فیض نشان اش مرتب می گشت و تمامیٔ شعرائے دار الخلافہ و نغمہ سنجان حاضر می آمدند " . .[2]

تاریخ جو بھی ہو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب خان آرزو کا مراختہ بند ہوا تو میر دَرد کے ہاں ہونے لگا[3] اور پھر خود میر تقی کے ہاں اس کا انعقاد ہوتا رہا اور اس کی تاریخ وہی پندرھویں رہی ۔

معلوم ہوتا ہے کہ مراختے کی مجالس بہت مقبول ہوئیں ۔ اسی ابتدائی زمانے میں ہمیں دلی کے بہت سے مراختوں کا حال ملتا ہے جو مختلف اہلِ ذوق اپنے گھروں پر منعقد کراتے تھے ۔ مثلاً :-

۱- مراختہ میر علی نقی[4]

۲- مراختہ بہادر بیگ خاں غالب . . . یک چند مجلسِ مراختہ بہ دولت خانہ خود منعقد می ساخت و بہ ضیافتِ مجلسیان خاص و شعرائی فصاحت بیان بہ انواع اطعمہ و اقسامِ اشربہ و صد گونہ رقص می پرداخت"[5]

ظاہر ہے کہ اُمرا شعرا اور حاضرینِ خاص کی ضیافت بھی کرتے تھے ۔

۳- مراختہ عظیم الدّین خاں آشفتہ . . .[6]

۴- مراختہ مرزا اسد بیگ رفیق[7]   مراختہ میر علی نقی ۔ صـ۱۴۸ نکات الشعرا

۵- مراختہ مرزا راجا شنکر ناتھ[8]

۶- مراختہ محمد تقی ترقی[9] در فیض آباد۔

۷- مراختہ مولوی قدرت اللہ قدرت ۔ رام پور میں[10]

۸- مراختہ میر سجّاد سجّاد[11]

---

[1] 'نکات الشعرا' صـ۱۲۸ ۔ [2] 'دستورِ فصاحت' صـ۳۸ متن ۔ [3] نیز دیکھو نکات الشعرا صـ۱۵۰ 'ذکر عشاق' صـ۹۹، ۱۲۸، صـ۱۳۶، ۲۰۰
[4] 'نکات الشعرا' صـ۱۲۸ ۔ [5] 'مجموعۂ نغز' جلد ۲ صـ۲۴ ۔ [6] 'مجموعہ نغز' جلد اوّل صـ۳۱ ۔ [7] 'مجموعۂ نغز' صـ۲۷۴
[8] مجموعہ صـ۳۶۱ ۔ [9] کریم الدّین صـ۳۶۱ ۔ مجموعہ صـ۱۳۹ ۔ [10] مجموعہ جلد ۲ صـ۱۲۵ ۔ [11] مجموعہ صـ۲۹۰

۹۔ مراختہ میر محمدی مرحوم شرف ... در ایام نواب معلّے القاب امیر الامرا نجیب الدولہ عفی عنہ طرح مراختہ بہ خانہٗ خود می انداخت قاسم ہیچمداں درآں اوان بتدی ایں فن بود بہ مجلس وی حاضر می شد [۱]

۱۰۔ مراختہ غلام ہمدانی مصحفی ..... در زمانے کہ وارد حضرت دہلی یک چند طرح مراختہ بہ خانہٗ خود انداختہ باقاسم ہیچمداں سراپا نقصان کہ اکثر بہ مشاعرہ اش می رفت بسیار بہ اہلیت و آدمیت پیش می آمد [۲] (مراختے کو مشاعرہ بھی کہنے لگے تھے)

یہ وہ مراختے ہیں جن کا ذکر بڑے بڑے اُستادوں کے بیان میں آتا ہے۔ ان کے علاوہ چھوٹے چھوٹے اور کئی مراختے ہوتے تھے۔ ان کی کثرت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ غم و شادی کی تقریبوں پر لوگ مشاعرے کرواتے تھے۔ چناں چہ مہدی علی خاں عاشق کے بیان میں قدرت اللہ قاسم لکھتے ہیں:۔

"قریب دوازدہ سال بلاناغہ روز جمعہ بہ انعقاد مشاعرہ بہ خانہٗ خود پرداخت و بہیچ مانع قوی بل اقوا موقوف نہ ساخت حتا کہ صبح فاتحہ سیوم فرزند ارجمند خود نمودہ و بعد ظہر مجلس مراختہ منعقد فرمود ..." [۳]

معلوم ہوتا ہے کہ ریختہ گویوں کے غیر معمولی جوش و خروش نے فارسی کے مشاعروں کی مقبولیت پر بہت اثر ڈالا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ فارسی کے معاملے میں ہندستانیوں اور ایرانیوں کے درمیان کش مکش جاری تھی۔ ایرانی اہلِ ایران کی زبان کو سند جانتے تھے اور ہندستان کے فارسی شعرا کو حقارت سے دیکھتے تھے، ہندستانی ادبا کا یہ دعوا تھا کہ اہلِ ہندستان نے فارسی کی ایسی خدمت کی ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اسی زمانے میں محمد علی حزیں ہندستان آئے اور انھوں نے اس تنازع کو تقویت دی۔ ان کی حقارت کا اندازہ حزیں کے اس فقرے سے ہوتا ہے جو انھوں نے سودا کے بارے میں کہا کہ "از پوچ گویان ہندی بد نیست" اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ فارسی سے ہندستانی اہلِ ذوق کسی حد تک منحرف ہو گئے۔ اس چیز نے ریختہ گوئی کو تقویت اور مراختوں کو مقبولیت دی چناں چہ مصحفی لکھتے ہیں "بہ مقتضائے رواج زمانہ آخرکار خود را مصروف بہ ریختہ گوئی داشتہ برائے ایں کہ رواجِ شعر فارسی در ہندستان بہ نسبت ریختہ کم است و ریختہ ہم فی زماننا بہ پایۂ اعلا فارسی رسیدہ (بلکہ از و بہتر گردیدہ)" [۴] شاید یہ مصحفی کا مبالغہ ہو لیکن اس میں شک

۱؎ مجموعہ صفحہ ۳۴۔ ۲؎ مجموعہ جلد ۲ صفحہ ۱۸۹۔ ۳؎ [illegible] ۴؎ تذکرہ ہندی گویاں صفحہ ۲۲۸

نہیں کہ ان مراختوں کی بہ دولت ریختے کو بہت ترقی ہوئی۔

اوپر کی اس عبارت سے یہ بھی ظاہر ہے کہ مراختوں کی مجالس کو مشاعرہ بھی کہنے لگے تھے اس کی شہادت ایک اور جگہ بھی ملتی ہے۔ "ریاض الفصحا" میں مصحفی جعفر کے بیان میں رقم کرتے ہیں :-

"پسر کلاں این بزرگ مجلسِ مشاعرہ ترتیب دادہ نظم ریختۂ خود را بسمع مبارک ایشاں می رسانید۔۔" [۱]

اب تک ہم نے جن اردو محفلوں کا ذکر کیا ہے وہ صرف وہ ہیں جنھیں تذکرہ نگاروں نے لفظ 'مراختہ' سے تعبیر کیا ہے لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ ریختہ یا اردو کی محفلیں مشاعرہ کہلانے لگی تھیں اور ایسی بزموں کا شمار کرنا نہایت مشکل ہے کیوں کہ وہ کثیر تعداد میں ہیں۔

جن مشاعروں کا ہمیں ذکر ملتا ہے وہ حسبِ ذیل ہیں :-

دلّی کے مشاعرے :-

۱- محمد تقی خاں ترقی کا مشاعرہ [۲]
۲- مشاعرہ محمد یار خاں امیر روہیلہ [۳]
۳- مشاعرہ نواب امین الدولہ معین الملک ناصر جنگ بہادر عرف مرزا میڈھو [۴]
۴- مشاعرہ حمید الرحمان انیس [۵]
۵- مشاعرہ مصحفی [۶]
۶- مشاعرہ نواب علی حسین خاں اندوہ [۷]
۷- مشاعرہ صدر الدین صدر [۸]
۸- مشاعرہ حکیم سید محمد [۹]
۹- مشاعرہ حاجی قمر الدین قمر عرف حاجی [۱۰]
۱۰- مشاعرہ میر محمدی شرف [۱۱]
۱۱- مشاعرہ مہر اللہ غیور [۱۲]
۱۲- مشاعرہ تقی ہوس [۱۳]
۱۳- مشاعرہ نصیر الدین نصیر
۱۴- مشاعرہ فراق [۱۴] ثناء اللہ خاں
۱۵- مشاعرہ لطف علی خاں ناطق [۱۵]
۱۶- مشاعرہ نجیب الدولہ [۱۶]
۱۷- مشاعرہ حافظ حلیم ص۱۷۰۔ نکات الشعرا۔

---

۱ ریاض الفصحا ص۶۹۔ ۲ مجموعۂ نغز ص۱۵۵، آب حیات ص۲۶۹۔ ۳ ص۲۳ مجموعۂ نغز۔ ۴ مجموعۂ نغز ص۱۷۰، ۸۱، ص۲۵۱۔ آب حیات ص۱۹۔ ۵ مجموعۂ نغز ص۴۸۔ ۶ ریاض الفصحا ص۲، ص۲۹۹، ص۲۲۲، ص۳۲۔ تذکرہ ہندی مصحفی ص۱۶، ص۲۲، ص۲۱۷، ص۲۲۸، ص۴۸۔ خم خانۂ جاوید جلد اول ص۴۶۵۔ ۷ ریاض الفصحا ص۲۵، ص۱۵۷، ص۱۷۰، ص۱۷۷۔ ۸ ریاض الفصحا ص۵۲۔ ۹ ریاض الفصحا ص۱۱۵، ص۶۹، ص۲۰۔ آب حیات ص۴۳۔ ۱۰ ریاض الفصحا ص۱۴۵۔ ۱۱ ریاض الفصحا ص۲۴۰۔ یکتا ص۱۰۸۔ ۱۲ ریاض الفصحا ص۲۴۶۔ ۱۳ ریاض الفصحا ص۲۳۷۔ ۱۴ ریاض الفصحا ص۱۵۷، ص۲۲۔ ۱۵ ریاض الفصحا ص۸۳۔ ۱۶ یکتا ص۱۰۸۔

۱۸۔ مشاعرہ علیم اللہ بے تاب۔ تذکرہ حسن ص ۶۵ ۱۹۔ مشاعرہ احمد علی، تذکرہ حسن ص ۵
۲۰۔ مشاعرہ میرحسن ص ۱۶۱ و ص ۲۰۲

دلی اور دیگر مقامات کے یہ مشاعرے ناپایدار ہوتے تھے اور سال دو سال سے زیادہ جاری نہیں رہتے تھے مصحفی لکھتے ہیں :۔ "اکثر بہ تجربہ درآمدہ کہ ایں مجلس از یک سال طول نمی کشد و تفرقہ و خللے برد بالضرور واقع می شود" ایک اور جگہ لکھتے ہیں :۔ "تفرقہ انداز خواہندۂ ایں چنیں مجالس از قدیم نیست" ریاض الفصحا
ظاہر ہے کہ ان کی ناپایداری کی وجہ شعرا کے باہمی تفرقے ہوتے تھے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہمیں ملتی ہیں۔ اکثر شاعر ایک دوسرے پر سر مشاعرہ اعتراض کرتے تھے جس کا انجام عموماً جھگڑے ہوتے تھے اور ہجو گوئی تک نوبت پہنچ جاتی تھی " سودا نے ندوی نام ایک شاعر کی جو نسل کا بقال تھا اور اس سے فنی رقابت رکھتا تھا، کئی ہجویں لکھی ہیں۔ یہ شخص برخود غلط اور عامیانہ وضع کا تھا مشاعروں میں اکثر کھڑے کھڑے غزل پڑھتا تھا اور چلا جاتا تھا۔ ٹانڈے سے فرخ آباد سودا سے مقابلے اور مجادلے کے لیے آیا لیکن سودا اور اس کے شاگردوں نے اس کی ایسی ہجویں لکھیں کہ ذلت اٹھا کر بھاگ نکلا"[۱]
اسی طرح نعیم اللہ نعیم دہلوی اور محمد حاتم کے درمیان طنز و ایما کی گفتگوئیں مشاعروں میں اکثر آئی ہیں اور مکرر غزلیں آپس میں لڑائی ہیں۔ ایک دن محمد حاتم نے مشاعرے میں یہ غزل پڑھی اور مطلع میں محمد نعیم پر طعن کی ؎

جس دن سے کوئے یار کا حاتم مقیم ہے — بدتر اسے خزاں سے بہارِ نعیم ہے

جب دورہ پڑھنے کا محمد نعیم تک پہنچا تو انھوں نے بھی مطلع غزل کا یہ پڑھا ؎

طلب نہ ہو تو سلیماں کی کچھ بھی خاتم ہے — لب سوال نہ ہووے تو ہیچ حاتم ہے[۲]

احمد علی یکتا نے بھی دو مشاعروں کا ذکر کیا ہے جن میں گالی گلوچ تک نوبت پہنچی تھی۔ ان میں ایک مشاعرہ مہراللہ غیور کا ہے اور دوسرا نجیب اللہ کا۔ اس کا حال انھی کے لفظوں میں دیکھیے۔ خوش فکر خاں نوا کے متعلق لکھتے ہیں :۔ "یک مرتبہ در مشاعرہ مولوی نجیب اللہ و یک بار در مشاعرہ سید مہراللہ غیور کہ مقابلۂ او

[۱] سودا از چاند ص ۲۵۹
[۲] گل زار ابراہیم ص ۲۴۳

ظاہرا با مجمل مرثیہ گو و مرزا علی لطف و مرزا مغل سبقت و بہ باطن با جرأت شدہ بود ، بر ہمہ ہا غالب آمدہ شکست فاش دادہ و ہجو ہاے رکیک بر روے ہر یک در مجمع کثیر خواندہ ، حتی ہمہ بزرگاں دشمن او شدہ خواستند کہ او را بہ جاں بہ کشند ۔ مشار الیہ نیز ازیں معنی خبر یافتہ ، باوجود تنہائی مطلق پروا نمی کرد و مستعد جنگ بہ زبان سنان و تیغ زبان ہر دو بود ۔ بالآخر محمد عاشق تصور واسطہ گردیدہ ، با مرزا مغل سبقت و او سبب ملاقات شد، و بہ ظاہر نزاع موقوف ماند ۔"[1]

" دلی میں میر تقی نے ایک مثنوی کہی اپنے تئیں اژدہا قرار دیا اور شعراے عصر میں سے کسی کو چوہا کسی کو سانپ کسی کو بچھو کسی کو کن کھجورا وغیرہ وغیرہ بنایا ساتھ اس کے ایک حکایت لکھی کہ دامن کوہ میں ایک خوں خوار اژدہا رہتا تھا جنگل کے حشرات الارض جمع ہو کر اس سے لڑنے گئے جب سامنا ہوا تو اژدہے نے ایک ایسا دم بھرا کہ سب فنا ہو گئے۔ اس قصیدے کا نام اجگر نامہ قرار دیا اور مشاعرے میں لا کر پڑھا محمد امان نثار شاہ حاتم کے شاگردوں میں ایک مشاق موزوں طبع تھے انھوں نے وہیں ایک گوشے میں بیٹھ کر چند شعر کا قطعہ لکھا اور اسی وقت سر مشاعرہ پڑھا چوں کہ میر صاحب کی یہ بات کسی کو پسند نہ آئی تھی اس لیے اس قطعے پر خوب قہقہے اُڑے اور بڑی واہ وا ہوئی اور میر صاحب پر جو گزرنی تھی سو گزری' چناں چہ مقطع مذکور کا یہ ہے ؎

حیدرِ کرار نے وہ زور بخشا ہے نثار ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلّے چیر کر"[2]

دلی کے ان معرکوں میں سب سے بڑھ کر خطرناک وہ معرکہ تھا جو سید انشا اور مرزا عظیم بیگ کے درمیان ہوا ۔ یہ " شعری رزم جس میں انشا کی طرف سے بعض ناجائز امور کی حد تک اقدام ہوا ہے مرزا میڈھو کے مشاعرے میں قطعات و غزلیات فخریہ سے گزر کر باقاعدہ میدانِ جنگ کی صورت اختیار کرنے والی تھی۔ جب حکیم قدرت اللہ قاسم کے سامنے شمع لائی گئی انھوں نے انشا سے خطاب کر کے کہا " عم زاد آپ کی سرکار سے ہمیں مسیلمۂ کذاب کا خطاب عنایت ہوا ہے' بہت اچھا اب ذرا ہمارے الفیل مالفیل پر بھی کان دھریے۔ صاحبِ مشاعرہ کو گمان گزرا کہ اب کوئی رکیک ہجو پڑھی جانے والی ہے

---

[1] یکتا، ص۱۰۹ متن [2] آب حیات ص۲۱۷

ادھر سے یہ اور اُدھر سے محب علی محبؔ اُٹھے اور کوشش کرکے فریقین میں صلح کرادی۔ دونوں طرف شرفا تھے، مان گئے، معاملہ بہ خیر و خوبی گزر گیا اور کشت و خون تک نوبت نہیں آنے پائی "[۱] مرزا عظیم نے اسی وقت فی البدیہہ کہا ؎

عظیم اب گو ہمیشہ سے ہے یہ شعر کہنا شعار اپنا — طرف ہر ایک سے ہے بحث کرنا نہیں ہے کچھ افتخار کرنا
کئی سکھن باز کھنڈ گویوں میں ہو نہ ہو اعتبار اپنا — جنھوں کی نظروں میں ہم سُبک تھے دیا انھی کو وقار اپنا
عجب طرح کی ہوئی فراغت گدھوں پہ ڈالے سے بار اپنا

جب یہ واقعہ خود بادشاہ جم جاہ تک پہنچا تو شیخ ولی اللہ محبؔ نے خوب موقع پر کہا :۔ ؎

مجلس میں چلے چاہیے جھگڑا شعرا کا — اس فن کے کسی صاحب توقیر کے آگے
یہ بھی کوئی دانش ہے کہ پہنچے یہ تضایا — اکبر ثانی یا شاہِ جہاں گیر کے آگے

اس شاعرانہ پرخاش کی یادگار سید انشا اور پھر اس کے جواب میں میرزا عظیم بیگ کا مخمس ہے۔

یہ پورا واقعہ بہت طویل ہے اس لیے یہاں بیان نہیں کیا۔

اس طرح کے اور بہت سے واقعات مشاعروں کے سلسلے میں آئیں گے جن کا ذکر ان کے موقع پر کیا جائے گا۔

مشاعروں کی کثرت نے شعرا کے دماغ بہت چڑھا دیے تھے اور اُمرا اور رؤسا کو ان کی بہت نازبرداریاں کرنا پڑتی تھیں۔ اس کی ایک مثال حسب ذیل ہے :۔

"نواب امین الدولہ مرزا مینڈھو بہ آں شوکت و مکنت بہ ہرکس چہ درد خورد بزرگانہ می فرمودند در ایّام عقد مجلسِ مشاعرہ بہ دولت خانۂ ایشاں مرزا عظیم بیگ مرحوم عظیم کہ مردے بود آزاد وضع بے باک از رفتن مشاعرہ ابا آوردہ گفت "من وارستہ راچہ ضرور کہ تعظیم عظیم امیرے بجا آوردہ زیرِ مسند نشینم و مثل ما بے سروپا راچہ احتیاج کہ بے ہیچ تکریم فخیم ایں وزیرے سرانجام دادہ پائیں نشینی گزینم گاہے کہ ایں سخن بہ آں نیکو کردار والا اتبار رسید گستردن مسند موقوف نمودہ فرمود کہ تشریف شریف ارزانی دارند کہ من ہم باشما بر فرشِ چاندنی خواہم نشست قاسم ہیچ مداں سراپا نقصان درحین حضور ایں محفلِ سرور مرزا

[۱] مقدمہ مجموعہ نغز لب، تفصیل کے لئے دیکھو مجموعہ جز اول ص۸۲ تا ص۸۷ نیز ص۲۶۲ و ص۲۶۳ بہ بعد آب حیات

مذکور را ہر چہ تمام تر پیش کشید تا مشار الیہ شرطِ خدمت بجا آوردہ خود چار بالش شوکت پیش کشید بہ مبالغۂ بسیار و قال و مقال بے شمار ہماں روز بر مسند اجلاس فرمودا زاں پس بالمرہ در مجلسِ مشاعرہ بہ مسندِ جلوس نہ فرمودند میر انشاء اللہ خاں انشا و برکت اللہ خاں برکت و مشتاق علی خاں شتاق بہ شاعرِ طبع قدیم مرزا عظیم بیگ عظیم و دوست دار سراپا وفاق حکیم ثناء اللہ خاں فراق و ایں خوشہ چین اربابِ سخن یعنی قاسم بے سرو بن بہ مقتضائے بشریت بہ خلاف عنوان بزرگی بزرگان بے ہیچ خوش نہ بودند و مانندِ میوہ بیش رس پیش رسیدہ مانند گلِ سرسبد درآں بزمِ رنگیں بہ صدرِ مجلس می نشستند ما ہا جائے کہ می یافتیم می نشستیم و ہر جا کہ نشستیم ہر چہ بودیم بودیم ..... [۱]

مجالسِ مشاعرہ میں اب تک کئی پابندیاں آگئی تھیں اور دستور مرتب ہو رہے تھے ۔ مثلاً شمع کا گھومنا[۲]، داد دینا وغیرہ ۔ کسی اُستاد کا میرِ مشاعرہ ہونا : میرِ مشاعرہ عموماً کہنہ مشق کو بنایا جاتا تھا ، ریاض الفصحا میں صدرالدین صدر کے مشاعرے کے حال میں مصحفی لکھتے ہیں :۔" فقیر را میر آں مجلس بہ سبب زیادتیٔ عمر قرار داد [۳]"

مشاعروں میں اعتراضات اس کثرت سے ہوتے تھے کہ کوئی مبتدی شعر سُنانے کی جرأت نہ کر سکتا تھا جب تک اس کا اُستاد کوئی مسلم الثبوت شخص نہ ہوتا تھا ۔ شاگرد پر اعتراض ہوتا تو عموماً اُستاد اس کا جواب دیتا ۔ قدرت اللہ قاسم محمد بخش شوق کے بارے میں لکھتے ہیں :۔" درایامِ انعقاد مجلسِ مشاعرہ در دولت خانۂ ایشاں (میرزا میڈھو) بنابر اصلاح برکت اللہ خاں برکت بہ گفتن غزل طرحی ہمت می گماشت "[۴] ان اعتراضوں کا حال ہم آگے چل کر بتائیں گے ۔

نکات الشعرا :۔ اکثر بر شعرا مرداں اعتراضات بے جا می کرد و جواب باصواب می یافت ۔"

شعرا اپنے شاگردوں کی ٹولیاں لے کر مجلسِ مشاعرہ میں پہنچتے تھے ۔

مصحفی لکھتے ہیں :۔ فقیر در ہر چار مشاعرہ اش (صدرالدین صدر) مع شاگرداں حاضر بود [۵]

مصحفی نے اپنے شاگردوں کی اصلاح اور مشق کے لیے ایک علاحدہ مشاعرہ نئی طرز کا قائم کیا تھا جس کا حال وہ شفق کے حال کے ضمن میں یوں لکھتے ہیں :۔" پیش از چند سال فقیر در روز ہائے کہ

[۱] مجموعہ نغز ص۱۷ ، [۲] مقدمہ مجموعہ لب ، [۳] ریاض الفصحا ص۱۶۱ ، [۴] مجموعہ نغز ص۳۵۲ ، [۵] ریاض الفصحا ص۱۶۱

بنائے مشاعرہ بہ تجدید بر روش انداختم بہ حلقۂ شاگردیٔ من در آمدہ و چند غزل را بہ اصلاح رسانیدہ"[۵۱] اسی کا مکمل حال لکھا ہے لیکن اسے چھوڑ دیتا ہوں:۔" روزی شیخ محمد عیسیٰ تنہا تخلص آمدہ عرض کرد کہ ای قبلہ اگر برائے مشق ما مردم صحبت جلسہ انعقاد دادہ شود اغلب کہ در رائے شریف ہم اولاٰ و انسب باشد التماس ایشاں را پزیرہ کردہ در ویرانۂ بیرونِ شہر کہ روشن آرا می گویند بہ ایں روش دلے خالی می کردیم و شریکِ جلسہ غیر شاگردان دیگرے کم شد چوں مرا در آں روز تعطیل محض بود ایں شغل را بہ پاسِ خاطرِ دوستاں درپیش گرفتم و میاں نورالاسلام منتظر تخلص کہ خدا ایشاں را بیامرزاد و میرزا حیدر علی گرم تخلص کہ از مدتے بہ طرفِ حیدرآباد دکن در رفتہ و ایں جا نام و نشانے پیدا کردہ شمع جلسہ بودند دوسہ سال رونقِ جلسہ روز بہ روز ترقی داشت و دریں اثنا میاں نورالاسلام بہ سبب بیماریٔ سِل سفر ناگزیر در پیش آمد، شکستِ عظیم بر دلِ من افتاد و صحبت، جلسۂ معینہ بگسیخت ...."[۵۲]

یہاں میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ان مجالسِ عزا اور مسالموں کا بھی ذکر کروں جن میں غزلوں اور مثنویوں کی بجائے مرثیے اور سلام پڑھے جاتے تھے۔ یہ مجالس ریختہ گوی کی مجلسوں سے بالکل مختلف تھیں لیکن فی الحقیقت انھیں مشاعروں ہی کی ایک شاخ کہنا چاہیے۔ ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ مرثیوں کی زبان اور محاوروں پر اعتراض یا تنقید نہیں کی جاتی تھی۔ سوداؔ اور پھر میرؔ و مصحفیؔ کے زمانے میں مجالسِ عزا کثرت سے ہوتی تھیں لیکن اسی تنقید کے نہ ہونے کی وجہ سے مرثیوں کی حالت ابتر تھی۔ شیخ چاند لکھتے ہیں:۔

"مرثیہ گوئی کی حالت بُری تھی، پہلے تو اکثر مرثیہ گو بلند پایہ شاعر نہ تھے دوسرے ان کا مطمعِ نظر سامعین وغیرہ سے صلہ حاصل کرنا بھی تھا ..... سوداؔ نے بھی ایک شعر میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

یہ روسیاہ تو ایسا نہیں جیسے ہووے ۔۔۔ تلاشِ مرثیہ گوئی سے دام و درہم کا

سامعین کے پاسِ ادب و عقیدت سے فائدہ اُٹھاکر مرثیہ گو جری ہوجاتے تھے اور بے جھجک فنی غلطیاں کرتے تھے۔ یہی وجوہ ہیں کہ بعض معقول اور رُتبے دار شاعروں نے مرثیہ گوئی ترک کردی تھی (جیسا کہ اوپر ندیم کے متعلق قائمؔ نے لکھا ہے) یہی شکایت سوداؔ کو بھی تھی اسی لئے لکھا ہے :۔

لازم ہے کہ مرتبہ در نظر رکھ کر مرثیہ کہے نہ برائے گریۂ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے۔ نادر مقالہ ہے کہ

---

[۵۱] ریاض الفصحا صہ ۱۵۲
[۵۲] ریاض الفصحا صہ ۲

عقلا جو نہ سمجھیں اور ضبطِ تضحیک و قصدِ بکا میں رہیں اس کا سیاق و سباق جہلا دریافت کریں اور پھوٹ بہیں۔"

قائم اور سودا کے بیانات سے ظاہر ہو کہ مرثیہ گوئی کی حالت ابتر تھی اور نااہل شاعری کی جولاں گاہ بنی ہوئی تھی عیوب پر مذہبی احترام اور عقیدت کا پردہ ڈالتے تھے۔ مرثیہ گو بے تکان طبع آزمائی کرتے تھے اور صلہ پاتے تھے اکثر شاعروں نے مرثیہ گوئی کو معاش کا ذریعہ بنا لیا تھا اس میں تنقید و تنقیص کی زد سے بھی بچاؤ ہو جاتا تھا۔ چناں چہ سودا جیسا بے باک ہجوگو بھی اعتراض کرنے سے ہچکچاتا تھا اس نے آخر صاف کہہ ہی دیا ؎

عرض رکھتا ہوں ای کرم گستر　　　اعتراضی سے پر مجھے ہو ڈر
کھول سکتا نہیں مَیں اپنے لب　　　اس سبب سے کہ ہو یہ جاے ادب

لیکن زمانے کے اربابِ فن اور اساتذۂ تنقید نے اسی خرابی کو محسوس کیا اور یہ حکم لگا دیا کہ "بگڑا شاعر مرثیہ گو" یہ کلیہ تاریخی حیثیت رکھتا ہو اور اس میں اس زمانے کی مرثیہ گوئی کی ابتری و خرابی کی داستان مضمر ہو۔ سودا نے بھی اس عام ابتری کو بہ شدت محسوس کیا اور خوف و خطر کے باوجود اس زمانے کے مشہور مرثیہ گو تقی کے سلام اور مرثیے پر منظوم اعتراضات کیے جو ایک رسالے "سبیلِ ہدایت" کی شکل میں اسی زمانے میں مرتب ہو چکے تھے۔ . . . سودا نے تعجب سے لکھا ہو کہ جگا اور بدھو جیسے عوام جن مرثیوں کو سُن کر پھوٹ بہیں ان کے معانی و مطالب اہلِ علم و فن کی فہم سے باہر ہوں ؎

آپ کے مرثیے کا ہوں قائل　　　خون جس سے عوام کا ہو دل
سُن کے جگا سے جس پہ بدھو تک　　　شام سے کوٹیں سینہ صبح تلک
لیکن افسوس صد ہزار افسوس　　　یہی آتا ہو بار بار افسوس
بدھو جگا سمجھ جسے رو دیں　　　معنی اس کے نہ مجھ سے حل ہو دیں
جب یہ صورت خیال کرتا ہوں　　　اسی غیرت کے مارے مرتا ہوں . . . [1]

مولانا آزاد بھی اس راے سے اتفاق رکھتے ہیں :۔

"اس زمانے کے انھی مرثیوں کو دیکھ کر اگلے وقتوں میں مثل مشہور ہوئی تھی کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو اور

---

[1] سودا از شیخ چاند ص۲۸۳ بہ بعد

بگڑا گویا مرثیہ خواں۔ حق یہ ہے کہ مرثیے کا شاعر گویا ایک مصیبت زدہ ہوتا ہے کہ اپنا دُکھڑا روتا ہے جب کسی کا کوئی مرجاتا ہے تو غم و اندوہ کے عالم میں جو بےچارے کی زبان سے نکلتا ہے سو کہتا ہے اس پر کون بے درد ہے جو اعتراض کرے وہاں صحت و غلطی اور صنائع بدائع کو کیا ڈھونڈنا لوگ فقط اعتقادِ مذہبی کو مدِ نظر رکھ کر مرثیے سلام کہتے تھے اس لیے قواعد شعری کی احتیاط کم کرتے تھے اور کوئی اس پر گرفت بھی نہ کرتا تھا۔[1]

اب تک دلی کے علاوہ اور بہت مقامات پر مشاعروں کا رواج ہو چکا تھا۔ ان کے مشہور مرکز فیض آباد[2]، بریلی[3] اور لکھنؤ تھے۔ ان میں لکھنؤ سب سے بڑا مرکز تھا۔ احمد نگر، فرخ آباد، رام پور، عظیم آباد، مرشد آباد، حیدر آباد۔ (دیکھو مقدمہ مجموعۂ نغز) الہ آباد۔ آب حیات ص۳۶۶

۱۱۹۸ھ میں میرزا جواں بخت جہاں دار شاہ ولی عہد شاہ عالم لکھنؤ پہنچے اور انھوں[4] نے وہاں جاکر مشاعرہ شروع کیا۔ صاحب گُل زارِ ابراہیم بھی ان مشاعروں میں حاضر ہوا ہے اور ان کا حال یوں بیان کرتا ہے:۔ "غرض اس شہزادۂ عالی تبار کی طبیعت شعرا کی طرف اس قدر آئی تھی کہ مہینے میں دو مرتبہ بنا مشاعرے کی اپنے دولت خانے میں ٹھیرائی تھی۔ شعرائے باوقار کو چوب دار بھیج بھیج کر مشاعرے کے دن بُلواتے۔ چناں چہ راقم حقیر کو جب یاد فرمایا تو اس ہیچ مداں نے یہ عذر کہ بھجوایا کہ کم ترین نے مشاعرے کا جانا مدت سے موقوف کیا ہے ازبس کہ ان صحبتوں میں مناظرے ہی کو یارانِ عالی حوصلہ نے رواج دیا ہے۔ .. پذیرا نہ ہوا پھر چوب دار آیا اور یہ ارشاد فرمایا کہ تیرا حاضر ہونا مشاعرے میں بہت ضرور ہے مناظرے کا مطلق ہمارے ہاں دستور نہیں۔ غرض ایما سے نواب آصف الدولہ مرحوم کے حاضر ہوا اور شرفِ سعادت ملازمت کا حاصل کیا مکرر غزلیں اس دن تفضلات کے پڑھوائیں اور ہر شعر پر کیا کہوں کہ کیا کیا عنایتیں فرمائیں۔ پھر اپنی طبع زاد سے بہت کچھ ارشاد فرمایا اور سامعین کو موردِ عنایت و امداد فرمایا۔"[5]

دلی تباہ ہو چکی تھی اور نواب آصف الدولہ کی سخاوتیں اہلِ کمال کو لکھنؤ کھینچ رہی تھیں۔ لکھنؤ میں بھی جگہ جگہ مستقل مشاعرے قائم تھے، چند ان میں سے حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ مرزا سلیمان شکوہ کا مشاعرہ[6]۔ جس میں جرأت، مصحفی، انشا، رنگین اور دوسرے اساتذہ شریک

---

[1] آب حیات ص۱۵۶ [2] مجموعۂ نغز ص۱۵۵، آب حیات ص۲۶۹، سودا از شیخ چاند ص۳۸۵۔ [3] ریاض الفصحا ص۳۲۷۔ [4] گل زارِ ابراہیم ص۵۹
[5] مجموعۂ نغز ص۳۰۱ [6] بعد، تذکرہ ہندی ص۱۲۱، ص۱۴۸۔ یکتا ص۹۹۔

ہوتے تھے۔

۲۔ مشاعرہ مرزا رضا علی بیگ آشفتہ[51]

۳۔ مشاعرہ مرزا حیدر علی[52]

۴۔ مشاعرہ حسین علی خاں اثر[53]

۵۔ مشاعرہ لالہ موتی لال (کشمیری پنڈت)[54]

۶۔ مشاعرہ قمر اللہ قمر[55]

۷۔ مشاعرہ مرزا جعفر[56]

۸۔ مشاعرہ نواب آغا میر[57]

۹۔ مشاعرہ نواب سید محمد خاں رند[58]

۱۰۔ مشاعرہ مرزا شناور

بعد کے زمانے میں لکھنؤ کیننگ کالج کا مشاعرہ بھی دلّی کالج اور غازی الدّین خاں کے مدرسے کے مشاعروں کی طرح مقبول ہُوا۔

مشاعروں کی دیکھا دیکھی لکھنؤ میں شیخ مغل فانی ایک صاحب نے ایک مجلسِ مناثرہ کی بنا ڈالی۔ مصحفی نے اس کا حال لکھا ہے:۔

«شیخ مغل فانی تخلص بانیٔ مجلسِ مناثرہ دریں شہر او شدہ اوّل جماعتے از ہنوداں وغیرہ بہ تقریبِ نثر نویسی چہ در زباں اُردوے ریختہ و چہ در زبانِ فارسی در آں مجلس حاضر می شدند چوں حسب اتفاق روزی گزرِ فقیر دراں مقام افتاد برائے شریک شدن نیشانِ انشا پردازان روز ہا نثرے کہ در وصف دکان تنبولی و تتبع ظہوری بر نثری گفتہ بودم بہ معرض بیان آوردم چوں چوں خار خار مشاعرہ از قدیم درویش جا داشت پیشِ فقیر ہم گاہ گاہ رفت و آمدی می کرد القصہ رفتہ رفتہ مجلسِ مناثرہ اش بہ مشاعرہ تبدیل یافت دورقِ مرقعِ تصویرِ نثر نویساں را بر طاق گذاشتہ زمانہ بازیٔ گنجیفہ دیگر درپیش آورد یعنی از رفتنِ عاصی در آں مجلس بہ کثرت مجمع کثیر شاگرداں شود۔ غزل خوانی از سامع سبحان ملا، اعلا درگزاشت دراں وقت نشیانِ سحر بیان زبانِ سکوت بہ کام کشیدہ جز سماعتِ اشعار کارے دراں انجمن نداشتند۔ ہر گاہ دریں نزدیکی روزگارِ شیخ موصوف بہ سرکارِ نواب کلب علی خاں بہادر رونقِ شرف گرفت آں رقعہ شوریدہ مضمون زبانِ اُردو خواندہ شد واجب رفتنِ مشاعرہ بر من فرض گردید برائے آں کہ فقیر ہم سرکارِ ایشاں بہ صیغۂ شاعری پیشتر از مغل عز امتیاز داشت چند سال گزشتہ باشد کہ حالا باوصف نہ رفتن فقیر بہ سبب روزگارِ نوابِ فلک جناب مہدی علی خاں بہادر شاگردانِ من آں مجلس بہ دستور قائم می دارند . . . .»[59]

---

[51] خم خانہ جلد اوّل ص۶۹ ۔ مجموعۂ نغز ص۳۴۱ ۔ [52] ریاض الفصحا ص۳ ۔ [53] ریاض الفصحا ص۳۲۳ ۔ [54] ریاض الفصحا ص۲۲۲ ۔ [55] خم خانہ ص۶۹
[56] یکتا ص۲۵ دیباچہ ۔ [57] یکتا ص۲۵ دیباچہ ۔ [58] آبِ حیات ص۳۶۴ و خم خانہ جلد اوّل ص۹ ۔ [59] آبِ حیات ص۳۶۴ بعد ۔ [60] ریاض الفصحا ص۳۵

یوں تو لکھنؤ میں مشاعرے سوداؔ کے وہاں پہنچتے ہی شروع ہو چکے تھے۔ سوداؔ جب فیض آباد سے لکھنؤ پہنچا تو محفلِ شعرا کو ہمراہ لایا اور وہی ان مشاعروں کا روح درواں تھا۔ لیکن مشاعرے اپنے اوجِ کمال پر نواب آصف الدولہ کے آخری ایام میں پہنچے۔ دلی کے مشاعروں کی طرح لکھنؤ میں بھی مشاعروں کی بنا پر باہمی عناد اور تفرقے پیدا ہوے اور عناد اور عداوت نے بہت طول کھینچا۔ خود سوداؔ اور مرزا فاخر مکین کے مابین ایک طویل مجادلہ رہا لیکن اس سے زیادہ بڑھ کر انشاؔ اور مصحفیؔ کا واقعہ ہے۔ جس کی تفصیل 'آبِ حیات' میں ہے اس لیے اس کے دُہرانے کی میں ضرورت نہیں سمجھتا۔

اس طویل قصّے میں جو بات دیکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ دونوں شاعروں نے ایک دوسرے پر کس قسم کے اعتراضات کیے۔ میں یہ کہوں گا کہ جس طرح کا کلام ہے اسی طرح کے فضول اعتراض ہیں۔ دونوں میں ذاتیات پر حملہ کرنے کا عنصر غالب ہے اور کلام کی تصحیح یا اصلاح کا کم۔ دونوں پایۂ ثقاہت سے گرے ہوے ہیں ان کی تنقید ہزلیات اور تضحیک پر مبنی ہے۔

ایک اور بات جو یہاں قابلِ توجہ ہے وہ شاعری پر ان مشاعروں کا اثر ہے۔ اور یہ اثر بالخصوص اہلِ لکھنؤ پر ہوا۔ طرح دے کر غزلیں لکھوانا بے شک شاعری کو ترقی دیتا تھا اور شعرا میں منافست پیدا کرکے انھیں آگے بڑھنے پر آمادہ کرتا تھا لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری کا مقصد محض قافیہ پیمائی رہ گیا۔ سنگلاخ زمینوں میں اشعار کا نبھانا شاعری کی عمدگی کا معیار ہوا۔ انشاؔ اور مصحفیؔ کے اسی واقعے میں ردیف گردن والی غزل طرحی تھی اور ظاہر ہے کہ یہ ایک مضحکہ خیز طرفہ زمین ہے۔ اچھے اچھے اساتذہ جب مشاعرے کے لیے طرحیں تجویز کرتے تھے تو چُن چُن کر عجیب وغریب زمینیں نکالتے تھے۔ اس قسم کی نئی نئی زمینوں میں شعرا جب غزلیں لکھنے بیٹھتے تھے تو دُور دُور سے قافیے کھینچ کر لاتے تھے اکثر لغت میں سے کُل قافیے چھانٹ کر قصیدہ یا غزل میں بنھانے بیٹھتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ ان بے محل قافیوں اور ردیفوں کے لیے دور از کار اور نئے نئے استعارے اور تشبیہیں لانی پڑتی تھیں، اس سے زبان کو تو خوب فروغ ہوتا تھا کیوں کہ مشکل سے مشکل خیال کو ادا کرنے کے طریقے ڈھونڈے جاتے تھے لیکن شاعری کا مطلب خبط ہوتا تھا اور لوگ نفسِ مضمون کی بجاے ترکیبوں اور صنعتوں کی ندرت پہ جان دیتے تھے۔ اس قسم کی زمینوں کا مفصّل حال ہم شاہ نصیر

کے بیان میں لکھیں گے ۔ یوں تو دلّی کے شعرا بھی مشاعروں کے اس اثر سے متاثر ہوئے جیسا کہ ذوق اور بہادر شاہ ظفر کے دیوانوں سے ظاہر ہے لیکن لکھنؤ والوں پر اس کا جو شدید اثر ہوا وہ دلّی والوں پر نہیں ہوا۔

لکھنؤ میں میر انشا اور مصحفی کے معرکوں کے بعد خواجہ آتش اور ناسخ کا مجادلہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ معتمدالدولہ نواب آغا میر صاحب کے ہاں مشاعرہ منعقد ہوتا تھا۔ یہ وہی مشاعرہ ہے جہاں نواب نے شیخ کو خلعت دینے کا ارادہ کیا تھا اور خواجہ آتش قرابین لے آئے تھے ۔ اس میں شیخ امام بخش نے پہلے غزل پڑھی ؎

مسّی مالیدہ لب پر رنگِ پاں ہے ۔۔۔ تماشا ہے تہِ آتش دھنواں ہے

آتش کے لفظ پر خواجہ صاحب آگ بگولا ہوئے جب ان کی باری پڑھنے کی آئی تو انھوں نے مطلع پڑھا

؎ یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے ۔۔۔ زمیں جس کی چہارم آسماں ہے

اتّفاق سے جس منزل پر مشاعرہ ہو رہا تھا وہ بھی چوتھی تھی نواب نے خوش ہو کر خواجہ صاحب کو بھی خلعت دی [۱]

شاہ نصیر ان دِنوں حیدرآباد میں تھے۔ وہاں دیوان چندو لال[۲] کے ذوق نے بہت سے شعرا کو گرد جمع کیا تھا اور مشاعرے کثرت سے ہوتے تھے ۔ لکھنؤ میں خواجہ آتش اور ناسخ کی دھوم تھی کہ شاہ نصیر لوٹے۔ آزاد 'آبِ حیات' میں لکھتے ہیں :۔ "جس دن وہاں پہنچا مشاعرے میں شاید دو تین دن باقی تھے ہر اُستاد نے ایک ایک دو دو مصرع طرح کے بھیجے۔ اِدھر انھیں دردِ گردہ عارض ہوا مگر وہ درد کے ٹھیرتے ہی اُٹھ بیٹھے اور آٹھ غزلیں تیار کر کے مشاعرے میں پہنچے پھر اور مشکل طرحیں مشاعرے کے شاعروں نے بھیجیں ۔ یہاں بھی ہمیں وہ بات نظر آتی ہے کہ دو غزلے سہ غزلے لکھنا موردِ تحسین ہوتا تھا۔ ادہر یہ بھی بے تکلف غزلیں لے کر پہنچے مگر وہاں کے صاحبِ کمال خود نہ گئے۔ جب دو تین جلسے اور گزرے تو ایک شخص نے سرِ مشاعرہ مصرع طرح دیا وہ مصرع شیخ صاحب کا تھا اس وقت شاہ صاحب سے ضبط نہ ہو سکا مصرع تو لے لیا مگر اتنا کہا کہ چکّس میں گل دم اُڑانے کی صحیح نہیں پالی میں آئیے کہ دیکھنے والوں کو بھی مزا آئے افسوس ہے کہ اس موقع پر بعض جہلا نے جن سے کوئی زمانہ

[۱] خمخانۂ جاوید جلد اوّل صفحہ ۔۔۔ [۲] آبِ حیات صفحہ ۔۔۔

اور جگہ خالی نہیں اپنی یادہ گوئی سے اہلِ لکھنؤ کی عالی ہمّتی اور مہماں نوازی کو داغ لگایا چناں چہ ایک معرکے کے مشاعرے میں شاہ صاحب نے آٹھ غزلیں فرمایش کی لکھ کر پڑھیں تھیں ایک غزل اپنی طرح کی ہوئی بھی پڑھی جس کی ردیف و قافیہ عسل کی مکھی اور محل کی مکھی تھا اس پر بعض اشخاص نے طنز کی۔ کسی شعر پر کہا کہ سبحان اللہ کیا خوب مکھی بیٹھی ہے کسی نے کہا حضور یہ مکھی تو نہ بیٹھی۔ ایک شخص نے یہ بھی کہا کہ قبلہ غزل تو خوب ہے مگر ردیف سے جی متلانے لگا۔ شاہ صاحب نے اسی وقت کہا کہ جنھیں چاشنیٔ سخن کا مذاق ہے وہ تو لطف اُٹھاتے ہی ہیں ہاں جنھیں صفرائے حسد کا زور ہے ان کا جی متلائے گا ہی[1]

ان مشاعروں میں جو اعتراضات ہوتے تھے وہ اہم ہیں لیکن میں نے سب 'آب حیات' سے اخذ کیے ہیں اس لیے سُنانے کی ضرورت نہیں۔

مشاعروں میں جس قدر مورچہ بندیاں ہوئیں ان میں آخری پُر لطف شاہ نصیر اور ذوق کی ہے۔ ذوق کو اوائلِ عمر میں بہادر شاہ ظفر کی اُستادی نصیب ہوئی تھی وہ اپنے اُستاد سے خاص حالات میں منحرف ہوئے۔ "جب شاہ نصیر دکن سے لوٹے تو ذوق مشاق ہو چکے تھے، شاہ صاحب نے دکن میں کسی کی فرمایش سے ۹ شعر کی ایک غزل کہی تھی جس کی ردیف تھی آتش و آب و خاک و باد وہ غزل مشاعرے میں سُنائی اور کہا کہ اس طرح میں جو غزل لکھے اسے میں اُستاد مانتا ہوں دُوسرے مشاعرے میں انھوں نے اس پر غزل پڑھی۔ شاہ صاحب کی طرف سے بجائے خود اس پر کچھ اعتراض ہوے جشن قریب تھا شیخ علیہ الرحمۃ نے بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ اسی طرح میں لکھا مگر پہلے مولوی شاہ عبدالعزیز کے پاس لے گئے کہ اس کے صحت و سقم سے آگاہ فرمائیں۔ انھوں نے سُن کر پڑھنے کی اجازت دی مگر ولی عہد بہادر نے اپنے شقے کے ساتھ اُسے پھر شاہ صاحب کے پاس بھیجا انھوں نے جو کچھ کہا تھا وہی جواب میں لکھ دیا اور یہ شعر بھی لکھا ؎

بود بہ گفتۂ من حرفِ اعتراض چناں — کسے بہ دیدۂ بینا فرو برد انگشت

---

[1] آب حیات صفحہ ۴۲۰

شیخ مرحوم قصیدۂ مذکور کو مشاعرے میں لے گئے کہ وہاں پڑھیں اور روبرو برسرِ معرکہ فیصلہ ہو جائے چناں چہ قصیدہ پڑھا گیا۔ شاہ نصیر مرحوم نے ایک مستعد طالب علم کو کہ کتبِ تحصیلی اُسے خوب رواں تھیں جلسے میں پیش کر کے فرمایا کہ انھوں نے اس پر کچھ اعتراض لکھے ہیں۔ شیخ علیہ الرحمۃ نے عرض کی کہ میں آپ کا شاگرد ہوں اور اپنے تئیں اس قابل نہیں سمجھتا کہ آپ کے اعتراضوں کے لیے قابلِ خطاب ہوں۔ انھوں نے کہا مجھے کچھ تعلق نہیں انھوں نے کچھ لکھا ہو۔ شیخ مرحوم نے کہا کہ خیر تحریر تو اسی وقت تک ہے کہ فاصلہ دوری درمیان ہو جب آمنے سامنے موجود ہیں تو تقریر فرمائیے قصیدے کا مطلع تھا ؎

کوہ اور آندھی میں ہوں گر آتش و آب و خاک و باد　　　آج نہ چل سکیں گے پر آتش و آب و خاک و باد

مشاعروں میں اعتراض معترض نے اعتراض کیا کہ سنگ میں آتش کے چلنے کا ثبوت ہونا چاہیے انھوں نے کہا کہ جب پہاڑ کو بڑھنے کے سبب سے حرکت ہو تو اس میں آگ کو بھی حرکت ہوگی۔ معترض نے کہا کہ سنگ میں آتش کا ثبوت چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ مشاہدہ! اس نے کہا کتابی سند دو انھوں نے کہا تاریخ سے ثابت ہے کہ ہوشنگ کے وقت میں آگ نکلی۔ اس نے کہا کہ شاعری میں شعر کی سند درکار ہے تاریخ شعر میں نہیں چلتی۔ حاضرینِ مشاعرہ اس سوال و جواب کے اُلٹ پھیر کے تماشے دیکھ رہے تھے اور اعتراض پر حیران تھے کہ دفعتہً شیخ علیہ الرحمہ نے یہ شعر محسن تاثیر کا پڑھا ؎

پیش از ظہورِ جلوۂ جانانہ سوختیم　　　آتش بہ سنگ بود کہ ما خانہ سوختیم

سُنتے ہی مشاعرے میں غُل سے ایک ولولہ پیدا ہوا اور ساتھ ہی سوداؔ کا یہ مصرع گزرانا ع

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا [1]

مشاعروں میں اعتراضات اور ان کے جواب اُردو مشاعروں میں اعتراضات کا سلسلہ بہت ابتدائی زمانے سے ہے یہ اعتراضات عموماً بے معنی ہوتے تھے تاہم مشاعروں کا یہ پہلو بہت اہمیت رکھتا تھا اور شاعری پر اور بالخصوص اُردو زبان پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا۔

مصحفیؔ تذکرۂ ہندی میں بال مکند حضورؔ کے بیان میں لکھتے ہیں کہ لطف علی خاں ناطقؔ کے ہاں دہلی

---

[1] آب حیات صفحہ ۴۵۳

میں مشاعرہ ہوتا تھا :- " غزل طرحی میر صاحب کہ ردیفش بعد قافیہ حرف " اور " بمعنی تقرّر داشت و ازیں جہت بعضی از فصحا اور را خلاف اردو شمردہ پیروش نہ کردند و اکثرے از اطاعت استادیش کردہ اشہب فکر را در میدان خیال دوانیدہ مشارٌ الیہ کارے کردہ کہ پیش ہر دو گروہ خفت عقلش عاید حال نگشتہ یعنی در آں غزلی طرحی شعرے طرفہ خوانده و آں ایں ست ؎

رکھتا ہوں میر صاحب و قبلہ سے ہیں سند　　　یہ جانتا نہیں کہ زباں ہو کہاں کی "اور" [1]

خواجہ آتش پر اعتراضات :- [2] ؎

دخترِ رز مری مونس ہو مری ہم دم ہو　　　میں جہاں گیر ہوں وہ نورجہاں بیگم ہو

اعتراض :- بیگم ترکی لفظ ہو اہلِ زبان گ پر پیش بولتے ہیں اور زبانِ فارسی کا قاعدہ بھی یہی ہو - یہ اس وقت بھنگیائے ہوے بیٹھے تھے کہا کہ ہوں ہم ترکی نہیں بولتے - ترکی بولیں گے تو بیگم کہیں گے۔

ایضاً :- ؎ اس خوان کی نمش کفِ مارِ سیاہ ہو

لوگوں نے کہا یہ لفظ فارسی اور اصل میں نشک ہو - انھوں نے کہا کہ جب ہم فارس جائیں گے تو ہم بھی نشک کہیں گے یہاں سب نمش کہتے ہیں تو نمش ہی شعر میں باندھا چاہیے۔

شیخ ناسخ پر اعتراض :- [3] ؎

کیا ہی حاسد ہو فلک جس نے کہ نوبت پائی　　　دم میں مانندِ حباب اس نے نقارہ توڑا

اعتراض :- نقّارہ مشدّد ہو تخفیف کے ساتھ نہیں آیا - جواب : نقارہ بھی بہ تشدید ہو لیکن فارسی اور ریختے میں آیا ہو۔

اعتراض :- غیر زبان کے لفظ میں قیاس نہیں چل سکتا اہلِ زبان کی سند دینی چاہیے - جواب :- (نظامی) ؎

بہ ذوقِ جشنِ نوروزی نقارہ　　　گلوے خویش کردہ پارہ پارہ

شاہ نصیر پر اعتراض :- [4] تظلّم کو بجائے ظلم باندھا ہو - جواب میں یہ سند پیش کی :- محتشم کاشی ؎

آلِ نبی چو دستِ تظلّم بر آورند　　　ارکانِ عرش را بہ تزلزل در آورند

---

[1] ریاض الفصحا صفحہ ۸۳ - [2] آبِ حیات صفحہ ۳۹۳ - [3] آبِ حیات صفحہ ۳۵۹ - [4] آبِ حیات صفحہ ۴۰۵

اردو اساتذہ کی ستم ظریفی دیکھیے کہ سند پر اس قدر توکل کرتے تھے کہ اگر استاد نے کچھ غلط بھی کہا ہو تو اس کو صحیح مان لیتے تھے" اور اس کی پیروی کرنے کو جائز سمجھتے تھے۔

ذوق پر اعتراض :- [۱]

جس ہاتھ میں خاتم لعل کی ہو گر اس میں زلفِ سرکش ہو　　پھر زلف بنے وہ دستِ موسیٰ جس میں انگرِ آتش ہو

اعتراض :- یہ بحر ناجائز ہے کسی استاد نے اس پر غزل نہیں کہی۔ شیخ مرحوم نے جواب دیا کہ ۱۹ بحریں آسمان سے نازل نہیں ہوئیں طبائع موزوں نے وقت بہ وقت گل کھلائے ہیں۔ یہ تقریر مقبول نہ ہوئی۔

اوپر کی آخری دو مثالوں سے ثابت ہے کہ اردو شعرا تمام تر فارسی کی کورانہ تقلید میں مصروف تھے، اگر فارسی کے شعرا محاورے کی غلطی کرتے ہیں تو اردو کے شاعر بھی اس کے مرتکب ہوں گے، اگر کوئی عمدہ بحریں فارسی میں موجود نہیں ہیں اردو والے بھی ان میں طبع آزمائی نہیں کریں گے" اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی شاعری کی تمام خصوصیات اردو میں بعینہٖ منتقل ہوگئیں۔

مشاعروں کی بدولت اردو زبان بہت جلد ترقی کرگئی لیکن شاعری کو بہت ضعف پہنچا۔ میں پہلے بھی عرض کرچکا ہوں کہ شاعری قافیہ پیمائی کا نام رہ گیا تھا۔ گل زارِ ابراہیم کے مقدمے میں مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں :- "کہتے ہیں کہ یہ اردو شاعری کے عروج کا زمانہ تھا بے شک لیکن یہ ایک ایسا عروج تھا جس کے ایک رُخ پر عروج اور دوسرے پر زوال کی تصویر نظر آتی تھی۔ عروج تو اس لیے کہ زبان روز بہ روز منجھتی جاتی تھی اور زوال اس لیے کہ فنِ شاعری میں صرف فارسی والوں کی تقلید کی جاتی تھی اور تقلید بھی ناقص اس کے بعد اور جو لوگ پیدا ہوئے وہ بھی اسی ڈگر پر ہو لیے۔ شاعری بس اسی کا نام رہ گیا تھا کہ بندش چست ہو قافیے کو اچھی طرح نباہ دیا ایک آدھ محاورہ آ گیا کسی نئی یا سنگلاخ زمین میں غزل کہہ دی کبھی کبھار ڈرتے ڈرتے سال دو سال میں کسی نئی تشبیہ یا استعارے کا استعمال ہوگیا۔ رہا مضمون، سو خدا کے فضل سے اس میں برکت ہی برکت تھی اور اب بھی وہی حال ہے مضمون تو مضمون تشبیہات تک مقررہ ہیں اور اب تک وہی استعمال ہوتی چلی آتی ہیں کسی نئی تشبیہ کا لکھنا بڑی بہادری اور جرات کا کام

---

[۱] آبِ حیات، ص۴۶۴

ہو کیوں کہ ہمارے نکتہ سنج شاعر اس کے لیے سند طلب کرتے ہیں جیسے کوئی قانون داں کسی فوج داری میں تعزیراتِ ہند کی دفعہ تلاش کرتا ہو اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ان شعرا کی محنت سے زبان صاف ہوگئی"۔[1]

مولوی صاحب کے یہ الفاظ اس زمانے کی بالخصوص لکھنؤ کی شاعری کا نہایت صحیح نقشہ ہیں۔ یہی حالات تھے جن کی وجہ سے میرزا غالب نے جب شاعری میں طرزِ ادا، تشبیہات میں جدت پیدا کرنی چاہی تو اربابِ علم ان کے پیچھے پڑگئے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اس شدید تنقید کا اثر میرزا پر نہایت خوش گوار ہوا اور ان کی شاعری سیدھے رستے پر آگئی، لیکن اس اصلاح کی وجہ یہ نہ تھی کہ مرزا نے اپنی جدت طرازی کو ترک کردیا بلکہ یہ کہ خاص و عوام کے معیارِ سہل پسندی نے ان کے کلام کو آسان اور رواں کردیا جس سے اس میں شگفتگی پیدا ہوگئی۔

قلعے کے مشاعرے

دلّی کے مشاعروں کی حالت بہادر شاہ ظفر کے عہد میں اگرچہ بادشاہت قلعے تک محدود تھی اور شاہی انعام و اکرام برائے نام رہ گئے تھے لیکن دلّی میں اب بھی مشاعروں کے چرچے پورے زور و شور سے ہو رہے تھے ان میں سب سے زیادہ مشہور و مقبول مشاعرہ خود قلعے ہی میں ہوتا تھا جس میں شہر کے تمام اُستاد مومن، غالب، ذوق، صہبائی وغیرہ حاضر رہتے تھے۔ یہ مشاعرے رات رات بھر رہتے تھے۔ علاوہ اُردو کے فارسی کی طرح بھی دی جاتی تھی۔ مرزا غالب نے اپنے خطوط میں قلعے کے پانچ ایسے مشاعروں کا ذکر کیا ہو جن میں وہ شریک ہوے۔ مَیں صرف ایک خط کو پڑھتا ہوں جو میر مہدی مجروح کو لکھا ہو۔ قاضی عبدالجمیل بریلوی نے قلعے کا مصرع طرح مانگا تھا جواب میں انھیں لکھتے ہیں: "یہ قلعے میں شاہ زادگانِ تیموریہ جمع ہوکر کچھ غزل خوانی کرلیتے ہیں وہاں کے مصرع طرحی کو کیا کیجے گا اس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھیے گا، مَیں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا اور یہ صحبتِ چند روزہ اس کو دوام کہاں؟ کیا معلوم ہو کہ اب کے نہ ہو اور اب کے ہو تو آیندہ نہ ہو"۔

فارسی کے مکاتیب میں سے جن میں مشاعروں کا ذکر آیا ہو چار نواب مصطفا خاں شیفتہ کے نام ہیں

[1] مقدمہ گل زارِ ابراہیم صہ

اور ایک میر مہدی مجروح کے نام۔

پہلا :۔" جمعہ کی شب کو (۲۳مارچ سنہ درج نہیں) بزمِ سخن آراستہ ہوئی مَیں نے طرحی زمین میں غزل نہیں کہی تھی اس لیے مشاعرے میں جانا نہیں چاہتا تھا لیکن نواب ضیاءالدین احمد خاں نے نواب زین العابدین خاں عارف اور غلام حسن خاں محو کو دو فرشتوں کی طرح مجھ پر مقرر کردیا وہ دونوں شام کو ہاتھی لےکر میرے مکان پر آئے اور مجھے سوار کراکر لے گئے وہاں پہنچ کر مولانا صدرالدین آزردہ کی زیارت سے رنجِ راہ کی تلافی ہوگئی۔ صہبائی نے طرحی زمین میں غزل پڑھی (فارسی) دوتین شعر دل نشین تھے۔ عارف اور جوہر نے دو غزلیں پڑھیں۔ مَیں نے اسی روز ایک غزل کہی تھی جس کا مطلع یہ ہے :۔؎

صبح شد خیز کہ روداد اثر بنمایم　　　چہرہ آغشتہ بہ خونِ نابِ جگر بنمایم

یہ غزل سُنائی آیندہ مشاعرے کے لیے گریبانم نمی آید، دامانم نمی آید طرح ہوئی ہے۔"

دوسرا مشاعرہ :۔ دوسرے مشاعرے میں بھی غالب شریک ہوے۔فرماتے ہیں کہ اُردو کے بہت سے شاعر جمع تھے اور انھوں نے لمبی لمبی غزلیں پڑھیں۔ مفتی صدرالدین آزردہ بیمار تھے اس لیے شریکِ مشاعرہ نہ ہوئے :۔" چوں نوبت بہ من رسید نخست "ملک نہ خواست" "فلک نہ خواست" سرودم آں گاہ غزل طرحی خواندم :۔؎ چہ عیش از وعدہ چوں باور زعنوانم نمی آید ؛ بہ نوعے گفتنی می آیم کہ مے دانم نمی آید مشاعرے میں آیندہ کے لیے عرفی کا یہ مصرع قرار پایا ؏ صد سال می تواں بہ تمنا گریستن۔"

تیسرا مشاعرہ :۔ تیسرے مشاعرے کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں کہ شام ہوئی تو وہی دو فرشتے یعنی عارف و محو مجھے آکر لے گئے۔ میر نظام الدین ممنون اور مولوی امام بخش صہبائی بسببِ علالت نہ آئے حضرت آزردہ کی خدمت میں آدمی بھیجا گیا وہ اگرچہ دیر سے آئے مگر تشریف لائے۔ مَیں نے طرحی زمین میں ایک قصیدہ لکھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ قصیدے کو برأتِ نامقبول کی طرح واپس لے جاؤں گا اور اُردو کے شعرا کو دردِ سر نہ دوں گا لیکن حضرتِ آزردہ کی تشریف آوری سے دل مطمئن ہوگیا اور مَیں نے قصیدہ پڑھنا ضروری سمجھا (نوٹ۔ یہ مشاعرہ غالب تتمہ سے تعلق ملازمت پیدا ہوجانے کے بعد ہوا جب کہ ذوق بہ قیدِ حیات موجود تھے گویا اسے ۱۸۵۰ اور ۱۸۵۴ کے درمیان کا کوئی مشاعرہ سمجھنا چاہیے)

چوتھے مشاعرے کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس میں میری خاک زمیں گیر ریختہ گویوں کی آنکھوں کا غبار نہ بنی۔ میں نے ایک ہفتہ پہلے غزل کہہ لی تھی اور حضرت آزردہ کی خدمت میں بھیج دی تھی۔

پانچواں مشاعرہ۔ میر مہدی مجروح کو لکھا ہے:۔ جمعے کی شب ۲۵ر فروری (سن درج نہیں) کو بادشاہ کا حکم پہنچا کہ سب شاعر جمع ہوں چناں چہ خاندانِ بابری کے شہزادے اور دوسرے لوگ اس قدر تعداد میں آئے کہ نشست گاہ میں بیٹھنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ سب سے پہلے سلطان الشعرا شیخ محمد ابراہیم ذوق نے بادشاہ کی غزل پڑھی پھر شہزادۂ خضر سلطان نے اپنی غزل سنائی اس کے بعد میرزا حیدر شکوہ میرزا نورالدین اور میرزا عالی بخت نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ عالی کے پاس ہی میں بیٹھا ہوا تھا میں نے اپنی غزل دس شعر کی پڑھی۔ صہبائی کے شاگردوں میں سے محوی نام ایک نوجوان نے "نشید مستانہ" لگائی۔ مرزا حاجی شہرت نے کم و بیش ستر شعر زمینِ طرح میں سنائے ہیں... بہلنے سے وہاں سے اٹھا اور اپنے گھر چلا آیا مکانوں کے دروازے کھلے تھے چراغ روشن تھے شراب پی اور سو رہا۔ صبح قلعے میں گیا تو وہی چاروں شہزادے جن کے نام اوپر مرقوم ہیں جمع تھے انھوں نے رات والی غزلیں پھر سنائیں میں نے بھی اپنی غزل دوبارہ پڑھی۔ وہیں سنا کہ ساری رات مشاعرہ جاری رہا۔ سب سے آخر میں سلطان الشعرا ذوق نے دو غیر طرحی غزلیں سنائی تھیں۔"[۱]

قلعے کے مشاعروں کی مقبولیت ان خطوط سے ظاہر ہے، یہ مشاعرے دیوانِ عام میں ہوتے رہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے کریم الدین کا جو مشاعرہ لکھا ہے وہ فی الحقیقت دیوانِ عام کے مشاعروں ہی کا مرقع ہے، اس پر ہم آگے چل کر بحث کریں گے۔

قلعے میں شہزادے اپنے دیوان خانوں میں علاحدہ مشاعرے منعقد کراتے تھے۔ صاحب "خم خانہ" وجیہ الدین اختر گورگانی کے بیان میں لکھتے ہیں:۔ "سلیمان شکوہ کے پوتے غدر سے پہلے قلعۂ معلاّ دہلی میں ان کے دیوان خانے میں اکثر محفلِ مشاعرہ منعقد ہوا کرتی تھی۔"[۲]

قلعے کے مشاعروں میں وہ مشاعرہ بھی مشہور ہے جو مفتی صدر الدین آزردہ نے قلعے میں منعقد کرایا اس کی مفصل روداد جنوری کے "ادبی دنیا" میں چھپی ہے میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔

---

[۱] غالب: از غلام رسول مہر صفحہ ۱۱۳ بہ بعد

[۲] خم خانہ، جلد اول صفحہ ۲۰۲

قلعے سے باہر شہر میں بہت سے مشاعروں کا حال ملتا ہے۔ ایک مشاعرہ غازی الدین خاں کے مدرسے میں ہوتا تھا۔[۵۱]

دلّی کالج میں بڑی دھوم دھام کے مشاعرے ہوتے تھے یہ بھی بےلطفی اور تکرار کے بڑھ جانے پر بند کردیے گئے اس کا حال مولانا آزاد کی 'آبِ حیات' میں ہے:۔

"جن دنوں شاہ نصیر کے معرکے ہورہے تھے منشی فیض پارسا دہلی کالج میں مدرّسِ حساب تھے اور ان دنوں جوانی کے عالم میں شاعری کے جوش و خروش میں تھے۔ انھوں نے مدرسے میں بڑی دھوم دھام سے مشاعرہ قائم کیا اور اسے انشائے اُردو کی ترقی کا جزو ٹھیرا کر صاحب پرنسپل سے مدد لی ان دنوں میں مدرسہ اجمیری دروازے کے باہر تھا شہر کے دروازے نو بجے بند ہوجاتے تھے گرہ کپتان سے اجازت لی کہ مشاعرے کے دن دو بجے تک اجمیری دروازہ کھلا رہا کرے غرض مشاعرہ مذکور اس شان و شکوہ سے جاری ہوا کہ پھر کوئی مشاعرہ دلّی میں نہیں ہوا۔"[۵۲]

ان مشاعروں میں شاہ نصیر اور ذوقؔ کے جھگڑے ہوئے اس کے علاوہ حکیم آغا جان عیشؔ ایک ظریف الطبع نے عبدالرحمان ایک شخص کو 'ہُدہُد' کا تخلص دے کر اُسے اساتذہ سے لڑایا اور اس سے لُطف اُٹھایا۔ اُدھر مومن نے ایک بازؔ صاحب تیار کیے اور خوب خوب چوٹیں ہوئیں اور بالآخر یہ مجالس بھی ہجو گوئی اور گالی گلوچ تک پہنچیں۔

ایک مشاعرہ دلّی میں نواب مصطفا خاں شیفتہ نے قائم کیا تھا جو ۱۸۴۲ء میں عروج پر تھا۔[۵۳] پھر کریم الدین صاحب اورنگ آبادی کے ہاں ایک مجلس منعقد ہوتی تھی۔ کریم الدین ص۴۰۰۔ ایک مشاعرہ حاجی بیگ شہرت۔ اس سے موقوف ہوکر میرے مکان پر آیا۔ کریم الدین ص۴۰۱

ان دنوں دلّی سے جو اخبار یا رسالے نکلتے تھے ان میں سے بعض کے ایڈیٹر اپنے رسالے کو فروغ دینے کے لیے اپنے مطبع میں مشاعرے کرتے تھے اور پھر ان کی چیدہ غزلیں اپنے رسالے میں شامل کرتے تھے۔ لالہ سری رام دو ایسے رسالوں کا ذکر کرتے ہیں ان میں ایک "زبان دہلی" نام تھا جس کے ایڈیٹر پیارے لال صاحب رونقؔ دہلوی تھے۔[۵۴] اور دوسرا رسالہ 'کمال' ہے۔ بعض ایسے مطبع تھے جو رسالہ

[۵۱] 'خم خانہ' ص۱۱۵۔ [۵۲] 'آبِ حیات' ص۴۸۹۔ [۵۳] 'خم خانہ' جلد سوم ص۱۰۶، ص۲۵۴۔ کریم الدین ص۳۷۰۔ [۵۴] 'خم خانہ' جلد سوم ص۵۵۶۔ [۵۵] 'خم خانہ' جلد سوم

ہی کی صورت میں مشاعرہ کرتے تھے، جنھیں گل دستے کہا جاتا ہو اس میں گزشتہ طرح کی غزلیں شائع ہوتی تھیں اور آیندہ نمبر کے لیے طرح دے دی جاتی تھی ایسے رسالے آج کل بھی نکلتے ہیں۔

ان مشاعروں میں سب سے زیادہ اہم مشاعرہ مولوی کریم الدین کا ہو انھوں نے بھی اسے اپنے مطبع کے اشتہار کا ذریعہ بنایا تھا۔ یہ مشاعرہ اگرچہ دلّی کے دوسرے مشاعروں کے مقابلے میں معمولی مشاعرہ تھا لیکن اس کو مرزا فرحت اللہ صاحب کے قلم دل پذیر نے ایک تاریخی حیثیت عطا کی ہو اور اس میں بھی شک نہیں کہ یہ دلّی کی شمع آخری کی حیثیت رکھتا ہو۔ فرحت اللہ صاحب نے اس مشاعرے میں بہت کچھ مواد اپنی طرف سے شامل کیا ہو مثلاً اس میں اساتذہ مثلاً مومن، غالب، ذوق وغیرہ کو شامل کیا ہو۔ بادشاہ کی غزل پڑھوائی ہو غرض مرزا صاحب کا مقصد اس مشاعرہ لکھنے سے کوئی اصلی یا تاریخی واقعہ بیان کرنا نہیں بلکہ اہلِ ادب کے لیے سامانِ ضیافت کا تیار کرنا ہو۔ جہاں تک آدابِ محفل، قاعدۂ نشست و برخاست، مشاعرے کے انتظام کا دخل ہو یہ مشاعرہ قلعے کے مشاعروں کا ایک صحیح مرقع ہو اور خود مرزا صاحب نے یہ لکھا بھی ہو کہ یہ مشاعرہ انھوں نے ان حالات کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا ہو جو قلعے یا دیوانِ عام کے مشاعروں کے متعلق انھوں نے اپنے بزرگوں سے سُنے ہیں۔

اس زمانے کے مشاعروں کے آداب مشاعرہ ہونے سے چند روز پہلے منادی کی جاتی تھی یا اشتہار دیا جاتا تھا جس میں مصرع طرح کا اعلان ہوتا تھا۔ خاص خاص اساتذہ کو طرح اہتمام کرنے والے خود بھیجتے تھے، بڑے بڑے شاعروں کو شرکت پر راضی کرنے کے لیے منّت سماجت کرنا پڑتی تھی۔ مشاعرے سب رات کے وقت ہوتے تھے۔ جہاں مشاعرہ ہونا ہوتا وہاں خوب آرایش کی جاتی اور مہمانوں کے آرام کا انتظام ہوتا، جگہ کو جھاڑ فانوس سے سجادیا جاتا۔ مہمانوں کی ضیافت کے لیے عموماً صرف حقہ پان ہوتا تھا، بڑے بڑے امرا کھانے پینے کی چیزیں بھی حسبِ توفیق حاضرینِ خاص اور شعرا کو پیش کرتے تھے۔ اس زمانے میں مشاعرہ ہی تھیٹر اور سنیما کا حکم رکھتا تھا اس لیے تمام کا تمام شہر ٹوٹ پڑتا۔ بڑے بڑے اُستاد اپنے شاگردوں کی ٹولیاں لے کر پہنچتے ان کو ایسے طریق سے بٹھایا جاتا کہ شعرخوانی کا دَور جتدیوں سے ابتدا ہوکر اساتذہ پر آکر ختم ہو۔ اس میں مصلحت یہ ہوتی تھی کہ چوں کہ مشاعرہ رات رات بھر

چلتا تھا اس لیے لوگوں پر نیند کا خمار رہتا لیکن اساتذہ کا انتظار رہتا جس سے سارے کا سارا مشاعرہ دلچسپی سے گزرتا۔

قلعے کے مشاعروں میں ابتدا خود بادشاہ کی غزل سے ہوتی تھی جو عموماً کوئی دوسرا پڑھتا تھا، اس کے بعد نوعمر شعرا شروع ہوتے تھے ان کی ہمت افزائی کی جاتی تھی، اعتراض اور تنقید بھی ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ رفتہ رفتہ اساتذہ کی باری آتی تھی۔ سب لوگ غزلیں تحت اللفظ پڑھتے تھے اور مضمون کو ادا کرکے پڑھنا خوبی سمجھا جاتا تھا۔ گاکر پڑھنے کو معیوب خیال کرتے تھے۔ صرف بادشاہ کی غزل گاکر سُنائی جاتی تھی۔ اس زمانے میں تحت اللفظ پڑھنے والے بھی بڑے بڑے باکمال تھے یہ بھی ایک خاص فن تھا۔ تذکروں میں خاص خاص شعرا کی اس فن میں خاص تعریف کی گئی ہے۔ ان میں جرأت، انشا، مومن، اوج، غالب اور بعد کے زمانے میں میرزا ارشد گورگانی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

جرأت کا طرزِ شعرخوانی مشاعرے میں غزل پڑھتے تھے تو جلسے کے جلسے لوٹ جاتے تھے۔ آبِ حیات صفحہ ۲۱۲

مومن مومن کے متعلق آزاد لکھتے ہیں:۔ "میں نے انھیں نواب اصغر علی خاں اور مرزا خدابخش قیصر کے مشاعروں میں غزل پڑھتے ہوئے سُنا تھا ایسی دردناک آواز سے دل پذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے کہ سارا مشاعرہ وجد کرتا تھا۔" آبِ حیات، صفحہ ۴۴۲

انشا کے متعلق لکھا ہے، اکثر اشخاص مشاعرے میں اپنی غزل ان سے پڑھوایا کرتے تھے۔ آبِ حیات صفحہ۔

عبداللہ خاں اوج :۔ پڑھتے اس زور و شور سے تھے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ مشاعروں میں غزل سُناتے تھے تو صفِ مجلس سے گز گز بھر آگے نکل جاتے تھے۔ آبِ حیات صفحہ ۵۱۵

میرزا غالب کا اندازِ شعرخوانی بھی اپنی آپ مثال تھا۔ حالی نے یادگارِ غالب میں لکھا ہے:۔

"شعر پڑھنے کا انداز بھی مشاعروں میں حد سے زیادہ دلکش اور مؤثر تھا۔ میں نے غدر سے چند سال پہلے جب کہ دیوانِ عام میں مشاعرہ ہوتا تھا صرف ایک دفعہ مرزا صاحب کو مشاعرے میں پڑھتے سُنا ہے چوں کہ ان کی پڑھنے کی باری سب کے بعد آئی تھی اس لیے صبح ہوگئی تھی مرزا نے کہا صاحبو اب میں بھی اپنی بھیرویں الاپتا ہوں یہ کہہ کر اول اُردو طرح کی غزل اور اس کے بعد فارسی کی غیر طرح نہایت پُردرد آواز میں پڑھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو اپنا قدردان نہیں پاتے اور اس لیے

غزل خوانی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے

جس زمانے میں میر نظام الدین ممنون شاہ صاحب کے پُرانے مدرسے میں مشاعرہ کرتے تھے ایک مشاعرے میں میرزا نے اپنا فارسی قصیدہ دریا گریستین اور تنہا گریستن جو جناب سید الشہدا کی منقبت میں انھوں نے لکھا تھا پڑھا۔ سُنا ہے کہ مجلسِ مشاعرہ بزمِ عزا بن گئی تھی جب تک قصیدہ پڑھا گیا لوگ برابر روتے رہے مفتی صدرالدین خاں مرحوم بھی موجود تھے اتفاق سے اسی حالت میں مینھ برسنے لگا مفتی صاحب نے کہا آسماں ہم گریست . ." [1]

داد دینے کے بھی اپنے طریقے تھے، عموماً واہ واہ سبحان اللہ، کیا خوب، ہوتی تھی۔ ایک مشاعرے ا میرزا غالب نے اوج سے کہا: ".. میاں تم تو شعر کے خدا ہو خدا۔ یہ سب کافر ہیں جو تمھیں اُستاد تے ہیں یہ[2] کبھی کہتے یہ خدا کے دین ہیں۔ جی خوش کردیا۔ بتدی ہوتا تو دعائیں دیتے۔

بڑے بڑے اُستادوں میں چوٹیں بھی چلتیں ہجوں اور گالیوں کا ذِکر پہلے آچکا ہے، میرِ مشاعرہ کسی یگ کہنہ مشاق کو بناتے۔

لسِ عزا

ادھر مجالسِ عزا کا لکھنؤ میں چرچا ہوا اور انھوں نے بھی باقاعدہ مشاعروں کی صورت اختیار کی۔ مرثیے بہت ترقی کرچکے تھے۔ انیس اور دبیر کے درمیان مقابلہ ہوا۔ طویل مرثیے م عزا میں پڑھے جاتے تھے۔ مرثیے عموماً مسدس میں تھے، یہاں بھی اعتراضات کا بازار گرم ہوا اور یہ گوئی کو بہت ترقی ہوئی۔ یہ مجالس ان دنوں الہ آباد، مرشد آباد، بنارس، حیدرآباد وغیرہ میں ق تھیں۔

مرثیہ پڑھنا بھی ایک خاص فن تھا۔ میر انیس اور ان کے خاندان کے دوسرے مرثیہ گو شعرا کے ق مشہور ہے کہ وہ آئینے کے سامنے بیٹھ کر مرثیہ پڑھنے کی مشق کیا کرتے تھے، "آب حیات، ص۵۴۷"

غدر کے بعد جب دلّی تباہ ہوئی تو اہلِ کمال تمام ہندستان میں بکھر گئے اور جہاں جہاں گئے وہاں

[1] "یادگار غالب"، مرزا کی طرزِ شعر خوانی۔ [2] آب حیات، ص۵۱۵

مشاعروں کی بنا ڈالی، خاص خاص مشاعروں کے مرکز حسب ذیل ہیں :-

۱۔ حیدرآباد۔ مشاعرے کثرت سے ہوتے تھے۔ حاجی ابراہیم مقرب نظام مشاعرے کراتے تھے نظام کی غزل وہی پڑھتے تھے۔ داغ ان میں شرکت کرتے تھے۔ 'خم خانہ' جلد سوم ص۱۶، ص۱۱۱، ص۱۳۰ و ص۱۸۲۔

۲۔ رامپور۔ مشاہیر کے علاوہ نواب صاحب کی طرف سے مشاعرہ ہوتا تھا جس کا انتظام داغ کے سپرد تھا۔ کلب علی خاں مشاعرے کرتے تھے۔ 'خم خانہ' جلد دوم ص۱۰۶ و ص۲۴۱

۳۔ پٹنہ۔ 'خم خانہ' جلد سوم ص۱۰۷، 'خم خانہ' ص۳۲۷، ص۳۷۳، ص۵۰۹۔

۴۔ بریلی۔ قاضی خلیل کے ہاں۔ 'خم خانہ' جلد سوم ص۲۱۹، ص۴۰۹، ص۲۲۳، ص۱۷۸۔

۵۔ کلکتہ۔ 'خم خانہ' جلد سوم ص۴۵۴، 'خم خانہ' جلد اول ص۱۳۹۔ 'خم خانہ' ص۵۰۹

واجد علی شاہ جب کلکتہ گئے تو وہاں ٹیا برج میں مشاعرہ کیا جس کا انتظام ان کے ایک مصاحب اصغر علی اصغر کے سپرد تھا۔ 'خم خانہ' جلد اول ص۳۲۵

۶۔ ٹونک۔ 'خم خانہ' جلد اول ص۲۹ ...

۷۔ شاہی۔ " " ص۳۵۷

۸۔ مالیرکوٹلہ۔ " جلد دوم ص۱۷۸

۹۔ بھوپال۔ " " ص۳۰۸ 'کریم الدین' ص۴۰۵۔ 'خم خانہ' جلد چہارم ص۳۱۳

۱۰۔ آگرہ۔ " جلد چہارم ص۱۷۔ ص۲۰۹۔ ص۲۱۵

۱۱۔ سندیلہ۔ " " ص۲۳۲

۱۲۔ بدایوں۔ " " ص۲۰۰

۱۳۔ منصوری۔ 'کریم الدین' ص۴۵۳

اس کے علاوہ سندھ، مدراس، کرناٹک میں بھی مشاعرے کثرت سے ہوتے تھے۔

انجمن پنجاب کے مشاعرے

مشاعروں کے ان مرکزوں کے علاوہ سب سے بڑا مرکز مشاعروں کا لاہور تھا۔ اتفاق سے اس زمانے میں چند انگریز عالم یہاں ایسے آگئے جنھوں نے مشر

علوم میں دِل چسپی ظاہر کی ۔ دلّی میں غدر ہوا تو بہت سے علما پنجاب اور لاہور میں آگئے جن میں مولوی محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالیؔ قابلِ ذکر ہیں، ان اصحاب نے ان انگریزوں کی مدد سے یہاں ۱۸۶۵ میں ایک انجمن کی بِنا ڈالی جس کا نام "انجمن اشاعتِ مطالبِ مفیدہ پنجاب مقام لاہور" تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ لاہور میں علوم والسنۂ شرقیہ کی ایک یونی ورسٹی قائم کی جائے ۔ اس انجمن کی روداد مختلف قسم کی کوششوں پر حاوی ہے جس میں ادبی علمی معاشی اصلاح شامل ہے ۔

یہ مشاعرے یا مناظمے اس قافیہ پیمائی کا ردِ عمل تھے جن کا میں ذِکر کر چکا ہوں ۔ اس انجمن نے ۱۸۷۴ میں نئے قسم کے مشاعرے کی بِنا ڈالی۔ مولانا حالیؔ لکھتے ہیں :۔

"۱۸۷۴ میں جب کہ راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق لاہور میں مقیم تھا مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہال رائڈ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا جو ہر مہینے میں ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا ۔ اس مشاعرے کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جوکہ دروبست عشق اور مبالغے کی جاگیر ہوگئی ہے اس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے .. چار مثنویاں یعنی برکھارُت ، نشاطِ امید ، حبِ الوطن اور مناظرۂ رحم و انصاف اسی مشاعرے کی نظمیں ہیں ۔" [1]

نئی شاعری کے اس پہلے مشاعرے کی جس جلسے میں بنیاد رکھی گئی اس پر منشورات میں کیفی صاحب نے ایک مفصل مضمون لکھا ہے :۔

"یہ عظیم الشان جلسہ جس کی تاریخی عظمت ادبی دُنیا میں کسی جلسے سے کم نہیں ۔ ۹؍ اپریل سنہ ۱۸۷۴ کو شام کے چھ بجے انجمن کے اہتمام سے سکشا سبھا کے مکان پر منعقد ہوا ۔ حاضرین میں ہندستانی اصحاب کے علاوہ کرنل ہال رائڈ ، مسٹر جسٹس بولنو چیف جج چیف کورٹ ، مسٹر تھارنٹن سکریٹری پنجاب گورنمنٹ ۔ کرنل میکلیگن ، مسٹر ینگ کمشنر اور مسٹر نسبٹ ڈپٹی کمشنر لاہور اور نواب عبدالمجید خاں فقیر سید قمرالدین وغیرہ اصحاب تشریف رکھتے تھے ۔ مسٹر جسٹس بولنو صدرِ جلسہ تھے ۔ اس جلسے میں آزاد مرحوم نے ایک زبردست تقریر کی اور اس کے بعد ایک نظم مسمّا بہ شبِ قدر سُنائی اس سے لوگوں کو یہ جتانا مقصود تھا کہ اُردو کی نظم مروّجہ مضامین کے سوا اور مطالب کے بیان کرنے کی بھی

[1] مجموعہ نظمِ حالی ، مقدمہ ۔

قابلیت رکھتی ہے اگر شاعر کو سلیقہ ہو۔ یہ نظم ان کے مجموعے میں بھی شامل ہے اور نئی شاعری کی سب سے پہلی نظم قرار دی جاتی ہے۔

کرنل ہال رائڈ نے اپنی تقریر کے سلسلے میں فرمایا: اس وقت مولوی محمد حسین صاحب نے جو مضمون پڑھا اور رات کی حالت پر اشعار سُنائے وہ بہت تعریف کے قابل ہیں اور ہم سب کو مولوی صاحب کا بہت شکر گزار ہونا چاہیے۔ یہ نظم ایک عمدہ نمونہ اس طرز کا ہے جس کا رواج مطلوب ہے۔ . . . "

مسٹر تھارنٹن، رائے مول سنگھ، پنڈت بسنت رام اور صاحب صدر کی مختصر اختتامی تقریروں کے آخر میں اس نئی شاعری کے اوّل مناظمے کے لیے ایک موضوع قرار پایا۔"

منشورات۔ ص۱۷۲ یہ بعد بحوالہ ضمیمہ اخبار 'کوہ نور' لاہور مطبوعہ ۱۶ ارمئی ۱۸۷۴

"اب میں آپ کو نظم کی اس خاص اور تاریخی صحبت میں لے جانا چاہتا ہوں جو ساٹھ برس گزرے لاہور میں منعقد ہوئی یہ مناظمہ ۳۰ رجون ۱۸۷۴ کو انجمنِ پنجاب کے مکان میں ہوا تھا آپ دیکھ چکے ہیں کہ پُرانی چال کے طرحی مشاعروں کی جگہ موضوعی مناظموں کی قرار داد آزاد مرحوم نے ۹ راپریل ۱۸۷۴ء کے عالی وقار جلسے میں منظور کرائی تھی جس کی کیفیت آپ کے گوشِ گزار ہو چکی ہے اور یہ مناظمہ اسی سال کی ۳۰ رجون کو ہوتا ہے اس لیے ظنِ غالب ہے کہ یہ نئی شاعری کا اوّلین مناظمہ ہے۔ اس میں تو شعرا نے اپنی نظمیں پڑھ کر سُنائیں۔ آیندہ مناظمے کے لیے اُمید موضوع قرار پایا۔ وہ شعرا حسب ذیل ہیں: (۱) شاہ انور حسین ہما (۲) مولوی میرزا اشرف بیگ خاں اشرف رئیسِ دہلی اسسٹنٹ مترجم محکمہ ڈائرکٹری پنجاب نظم کا عنوان تھا بردِ عجوز، (۳) منشی الٰہی بخش رفیق عنوان یخ بستہ (۴) حضرت آزاد، (۵) مولوی محمد مقرب علی رئیس جگراؤں، (۶) مولوی امتو جان ولی دہلوی شاگردِ غالب ہیڈ ماسٹر ورنیکلر مڈل سکول فیروز پور جھرکہ، (۷) مولوی قادر بخش مدرس انبالہ، (۸) مولوی عطاء اللہ اور (۹) مولوی علاء الدین محمد کاشمیری، (ظاہر ہے کہ باہر سے لوگ آتے تھے)

اس مناظمے کے لیے موضوع زمستان مقرر تھا جون کی جلتی بلتی گرمی اور مناظمے کا موضوع زمستان"

اس کے بعد کیفی صاحب نے ان نظموں کے شعر نقل کیے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انجمن کا یہ مشاعرہ کب تک قائم رہا؟ مولانا حالی نے جن چار نظموں کے متعلق لکھا ہے کہ یہ اس مشاعرے میں پڑھی گئیں۔ ان میں پہلی تین یعنی برکھا رُت، نشاطِ اُمید اور

حبّ الوطن یہ تینوں ۱۸۷۴ء کی نظمیں ہیں اور چوتھی ۱۸۷۶ء کی ہے یعنی مناظرۂ رحم و انصاف۔ اس سے ثابت ہوا کہ سنہ ۷۶ تک یہ مجلس قائم تھی لیکن پیشِ نظر اس وقت "گل دستۂ سخن" یعنی "رسالۂ انجمن مشاعرۂ بیت العلوم لاہور" مطبوعہ حسب الحکم ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر صاحب رجسٹرار یونی ورسٹی کالج و پریزیڈینٹ انجمنِ پنجاب کے چار نمبر ہیں۔ یہ رسالہ انجمن پنجاب ہی کے مطبع میں چھپا۔ یہ چار نمبر حسب ذیل ہیں :-

۱۔ فروری، ۱۸۸۰ء ۲۔ جون، ۱۸۸۰ء

۳۔ جنوری، ۱۸۸۱ء ۴۔ فروری، ۱۸۸۱ء

یہ انجمنِ پنجاب کے وہ ماہ وار رسالے تھے جن میں مشاعرے کا بیش تر کلام چھاپا جاتا تھا اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔

آخری نمبر جو ہمارے پاس موجود ہے ۱۸۸۱ء کا ہے جس سے ظاہر ہے کہ فروری ۱۸۸۱ء تک یہ مشاعرہ جاری تھا۔ آگے چل کر ہمیں اس مشاعرے کے وجود کا ۱۸۸۳ء تک ثبوت ملتا ہے۔ لالہ سری رام 'خم خانہ' میں منشی احمد حسین خاں بی اے کا حال یوں لکھتے ہیں :-

"۱۸۸۳ء میں شعرگوئی کا شوق ہوا مرزا ارشد دہلوی کو کلام دکھایا ان دنوں میں انجمنِ پنجاب کا مشاعرہ بہت زور شور سے ہوا کرتا تھا مولانا آزاد اور مولوی فیض الحسن جیسے بزرگ وار شریک ہوتے تھے احمد حسین خاں بھی اپنی غزلیں پڑھا کرتے تھے۔"

۱۸۸۳ء کے بعد ہمیں اس مشاعرے کا ذکر نہیں ملتا اور یہ راز تاریکی میں ہے کہ یہ مشاعرے اور خود انجمنِ پنجاب کا خاتمہ کیوں کر ہوا۔ اتنا جانتے ہیں کہ یہ مشاعرے انجمنِ پنجاب کے ٹوٹ چکنے کے بعد بھی جاری رہے کیوں کہ انجمن پنجاب ۱۸۸۳ء سے بہت پہلے ختم ہو چکی تھی، انجمن اس مشاعرے کی نظموں کو رسالے کی شکل میں شائع بھی کرتی تھی پیشِ نظر اس کے چار نمبر ہیں ہم ان پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

۱۔ فروری ۱۸۸۰ء۔ فروری ۸۰ء کے اس مشاعرے میں سب سے اوّل مولانا آزاد کی نظم ہے "نو طرزِ مرصّع مولوی محمد حسین آزاد" بہ عنوان "اولوالعزمی کے لیے کوئی سدِّ راہ نہیں"۔

اس ایک نظم کے بعد باقی تمام غزلیات جو طرحی ہیں۔ اس سے ثابت ہے کہ انجمنِ پنجاب کا ہر مشاعرہ غیر طرحی نہیں ہوتا تھا اور اغلب یہی ہے کہ ہر مشاعرے میں طرح دی جاتی تھی کیوں کہ باقی تین نمبر جو اس رسالے کے ہمارے پاس ہیں ہر ایک میں طرحی غزلیات درج ہیں۔

اس رسالے میں طرحی غزلیات اردو کی بھی ہیں اور فارسی کی بھی ہیں۔

اردو طرح :- کھا بیٹھے ، جا بیٹھے ، دعوا بیٹھے۔

جون ۱۸۸۰ء کے رسالے میں غلام قادر صاحب نے لانگ فیلو کی ایک نظم کا ترجمہ سنایا۔ محمد نثار علی شہرت : مثنوی حالت نمای علوم ہند ۔ محرم علی شاداں : مثنوی "کوّے کی کارگزاریاں"، قاضی فضل حسین: مثنوی ۔ شاہ دین ہمایوں۔ مثنوی ۔

طرح اردو :- ستاتی نہیں عبث ، ہنساتی نہیں عبث ۔ اس میں تارا چند تارا ، سنت رام حسرت ، محمد دین سلیم ، رام رائے تنہا ، محمد یاسین عاشق ، عطاء اللہ عطا ۔ فیض الحسن فیض ، الٰہی بخش منیر ، گنڈا رام ناداں، الف دین نفیس کی غزلیں ہیں۔

طرح فارسی (۱) :- نامِ تو بود ، کامِ تو بود : ۔ شعرا ۔ حبیب اللہ کشمیری ، فقیر ولی محمد (غزل دوم بہ تبدیلِ قافیہ) محمد دین ہمایوں ، عطاء اللہ عطا ، غلامی شاہ غلامی ، فیض الحسن فیض ، مقصود حسین محزوں ۔

طرح فارسی (۲) :- گل زار را تاتار را :- فقیر ولی محمد (غزل دوم بہ تبدیلِ قافیہ) فتح محمد راحت ، الف دین نفیس ۔

جنوری ۱۸۸۱ء ۔ منشی نثار علی شہرت :- تازیانۂ غفلت ۔ مسدس ،
ظہور الدین ظہور :- مخمس بر مصرعۂ طرح "تازیانۂ غفلت" } مضمون دیا گیا ہے

طرح اردو اول :- جاتی ہے صبح ، آتی ہے صبح :- نہال چند عزیز ، عطاء اللہ عطا

طرح اردو دوم :- شیطاں خالی ، رضواں خالی :- گنڈا رام ناداں ، شاہ دین ہمایوں ۔

طرح فارسی :- خو دارد ، سبو دارد :- عطاء اللہ عطا ، حبیب اللہ حبیب کشمیری ، قاضی فضل حسین قاضی ، محبوب سبحانی محبوب

فروری ۱۸۸۲ء :۔ مثنوی جلیل الرحمان صاحب در بیان موت۔

مثنوی صبح صادق از حبیب کشمیری

مثنوی ظہور نبی ظہور۔ ساقی نامہ گرامی فارسی۔

طرح اُردو :۔ انسان نکلے ارمان نکلے :۔ عطا ۔ قہر

غیر طرحی اُردو :۔ حبیب اللہ حبیب

[illegible] :۔ محمد الدین شمیم ۔ محبوب ربانی محبوب ۔ عالی ۔ حبیب ۔ عطاء اللہ عطا ۔

قہر ۔ قاضی فضل حسین قاضی ۔

معلوم ہوتا ہے کہ جس مقصد کے لیے یہ مشاعرے بنا کیے گئے تھے وہ پورا نہ ہوا اور مروجہ طریق نے طرح دینے پر مجبور کیا۔ انجمن پنجاب اپنے ہاں سے ایک رسالہ "مشاعرہ" نکالتی تھی جس میں منعقدہ مشاعرے کا کل شائع ہوتا تھا نیز اس کے چار نمبر ہیں ان میں طرحی غزلیں زیادہ ہیں۔

۱۸۸۲ء سے انجمن پنجاب نے مناظموں کے چلانے کی کوشش کی لیکن یہ ظاہر ہے کہ انجمن پنجاب میں عام قسم کے مشاعرے ۱۸۶۷ء سے جاری تھے۔ محترمی آغا باقر صاحب کی رائے میں انجمن پنجاب کے مشاعرے اور ۱۸۷۴ء کے بعد کے مناظمے مختلف ہیں۔ کرنل ہالرائڈ کے ان مناظموں کو انجمن پنجاب سے کچھ تعلق نہیں لیکن انہی مناظموں کی روداد اور کلام جس رسالے میں چھپتا تھا جس کا ذکر میں کرچکا ہوں یعنی رسالہ انجمن مشاعرہ، اس کے سرورق پر لکھا ہے "مطبوعہ حسب الحکم ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر، رجسٹرار یونی ورسٹی کالج و پریزیڈنٹ انجمن پنجاب"۔ محترمی آغا صاحب کا قول ہے کہ کرنل ہالرائڈ اور ڈاکٹر لائٹنر کے درمیان رنجش تھی، ممکن ہے یہ صحیح ہو لیکن یہ مسلم ہے کہ انجمن پنجاب کے رواجی مشاعروں ہی کو مناظموں کی صورت میں بدل دیا گیا اور انجمن پنجاب کے مشاعرے اور کرنل ہالرائڈ کے مناظمے ایک ہی لڑی کے موتی تھے۔ انجمن پنجاب ۱۸۶۵ء میں وضع ہوئی اور ۱۸۶۷ء میں اس نے مشاعرے شروع کیے جو طرحی تھے ان کے حالات ہمیں انجمن پنجاب کے ان رسالوں سے ملتے ہیں جو انجمن کی روداد کے حامل ہیں۔

بظاہر ان مشاعروں اور ۱۸۷۴ء کے بعد کے مشاعروں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا وہی فارسی اور

اُردو کی طرحیں ہمیں یہاں بھی نظر آتی ہیں[1] سوائے اس کے کہ گنتی کی چند نظمیں جو ۱۸۷۴ء کے بعد کے مشاعروں میں ملتی ہیں ان میں نہیں ہیں، اکثر شعرا بھی وہی ہیں۔

ان مشاعروں کا سب سے پہلا ذِکر ہمیں مارچ ۱۸۶۶ء میں ملتا ہے۔ ۲۷ر مارچ کے جلسے کی رویداد میں یہ الفاظ ہیں :۔

> "حسب تحریک سکریٹری تجویز منظور ہوئی کہ جلسہ لکچر و مشاعرے میں جس قدر غزلیں اور لکچر پڑھے جاتے ہیں بنظرِ ترغیب و تحریک ہفتہ وار چھاپی جاویں اور شاعروں اور لکچر دینے والوں کو مُفت دی جاویں اس کا خرچ بھی قلیل ہوگا صاحب پریزیڈنٹ نے بہ اتفاق اس رائے کو منظور کرلیا اور فرمایا کہ خرچ اس کا لکچر فنڈ سے دیا جائے۔" [2]

نومبر ۱۸۶۶ء میں یہ مشاعرہ کچھ عرصے کے لیے بند ہوگیا تھا چناں چہ ۵ر نومبر ۱۸۶۶ء کے جلسے میں "صاحب پریزیڈنٹ نے فرمایا کہ بہ دستورِ سابق مشاعرہ ہُوا کرے اور غزلیات چیدہ چیدہ ہر مشاعرے کی چھپ جایا کریں اور قیمت ان کی دو آنے مقرر کی جاوے اور مشاعرے میں حاضرین کو تقسیم کی جاوے اور مشاعرہ دوسرے میں تقسیم کیے جاویں اور اشعار اگر سوائے مضامینِ عشقیہ کے اور مضامینِ مفیدہ میں بھی تصنیف ہوا کریں تو مناسب ہے چناں چہ اس تجویز سے مرزا خاور صاحب کو اطلاع دی گئی۔" [3]

جہاں ۱۸۶۷ء کے بعد کے جلسے ماہ وار تھے یہ مشاعرے ہفتہ وار ہوتے تھے :۔ رویداد ۴ر اکتوبر رسالہ ۱۸۶۶ء ص۲ "صاحب پریزیڈنٹ بہادر نے فرمایا کہ مجلسِ مشاعرہ کی بھی بہ دستورِ سابق ہفتہ وار منعقد ہونی چاہیے تاکہ چرچا علمی روز افزوں رہے شائقانِ اس مجلس کی خدمت میں تحریص اس کی کرنی چاہیے۔"

جلسہ لکچر و مشاعرہ ایک ہی ہوتا تھا[4] لکچر ہر قسم کے ہوتے تھے جن میں سائنس کے لکچر بھی کثرت سے ہوتے تھے۔ اس لیے مشاعرہ ختم ہو جانے کے بعد لکچر شروع ہوتے تھے[5] تاکہ صرف وہی لوگ بیٹھے رہیں جو خاص فروغِ علم میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اکثر علم و ادب کی اصلاح پر بھی لکچر دیے جاتے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد نے نئی شاعری کی حمایت اور قدیم شاعری کے خلاف احتجاج ۱۸۶۷ء

---

[1] دیکھو رسالہ انجمن پنجاب جنوری، فروری، اکتوبر، دسمبر ۱۸۶۸ء اور دسمبر ۱۸۶۹ء۔ [2] رسالہ مارچ ۱۸۶۶ء۔ [3] رسالہ انجمن نومبر ۱۸۶۶ء۔ [4] رسالہ اپریل ۱۸۶۶ء ص۵، ص۲۲۔ [5] رسالہ اپریل ص۲۳۔

ہی میں شروع کر دیا تھا۔ چناں چہ ۵ اگست ۱۸۶۷ء کو انھوں نے مجلسِ مشاعرہ میں ایک لکچر دیا جس کا عنوان یہ تھا "نظم اور کلامِ موزوں کے باب میں خیالات"[1] اس کے بعد ۲۴ فروری سنہ ۶۸ کو ایک اور لکچر دیا[2] غرض رفتہ رفتہ ان کا ارادہ پختہ ہوتا گیا اور آخر انھوں نے ۱۸۷۴ء میں اس مناظمے کی بنا ڈالی (منثوراتِ کیفی۔ ص۲۷۴) "یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جدید شاعری کی اِن کوششوں کا آزاد کے اہلِ وطن نے کس انداز سے استقبال کیا اور اردو پریس نے کیا تبصرہ کیا؟ اس بارے میں تفصیل کے لیے تو ایک دفتر درکار ہے پھر بھی سرسری واقفیت کے لیے صرف ایک اخبار سے استفادہ کیا جائے گا۔ میرٹھ کے ہفتہ وار اردو اخبار 'لارنس گزٹ' کی ۷ اکتوبر ۱۸۷۴ء کی اشاعت میں مفصل افتتاحیہ اس موضوع پر درج ہے جس کے بعض حصے اس بارے میں کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ اردو شاعری کے ابتدائی عہدوں کے تذکرے کے بعد صاحبِ اخبار اس وقت کی اردو شاعری کی قابلِ رحم حالت کا خاکہ اتارتے ہوئے رقم طراز ہیں:- "..... اس واسطے اردو شاعری مُردوں میں سمجھی جاتی تھی مگر آفریں ہے مولوی محمد حسین صاحب آزاد تخلص پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور کی رائے صائب پر کہ انھوں نے اردو شاعری کی بے قدری کو نظر کرکے ایک انجمن قائم کی جس کے ممبر واقعی حالات کے شرح و بسط کے ساتھ پورا پورا نظم میں موزوں کرتے ہیں اگرچہ بعض شاعروں نے اس تجویز پر طعن آمیز مضمون اخباروں میں چھپوائے ہیں جیسا ابتدائی قاعدہ ہر ایک عمدہ سے عمدہ تجویز کا ہوتا ہے کہ اوّل لوگ اس پر ہنسا کرتے ہیں پر اس کے فائدے دیکھ کر خود بھی اُدھر ہی متوجہ ہوجاتے ہیں۔ اگر سچ پوچھو تو حضرتِ آزاد نے آزادانہ اور بے باکانہ شاعری کو دوسرے قالب میں ڈھال دیا ہے جس سے پُرانا مردہ زندہ ہوگیا...."

لاہور کی اِس جدت آفرینی کی صدائے عام نے کہاں کہاں گونج پیدا کی اس کا بھی کچھ اندازہ 'لارنس گزٹ' کے اسی افتتاحیے سے ہوسکتا ہے:- "..... افسوس کہ میرٹھ میں صرف دو ہی جلسے نظم سوسائٹی میں ہونے پائے تھے کہ وبائی بیماری تپ لرزہ نے لوگوں کو پراگندہ کر دیا ورنہ وہ اس انجمن کی شاخ ہوجاتی"۔ یہ پایا جاتا ہے کہ مناظمے کا جہاں تک تعلق ہے میرٹھ کی نظم سوسائٹی نے نظم وضبط کے ساتھ انجمنِ

---

[1] مجموعہ نظمِ آزاد ص۱

[2] رسالہ انجمن فروری ۱۸۶۸ء ص۲۹

پنجاب کے ضابطے کی تقلید کی۔ یہ یوں ہوا کہ لاہور کی انجمن کے موضوع لےکر انھوں نے اپنے ہاں مناظمہ قائم کیا۔ دلّی میں دہلی سوسائٹی نے بھی انجمنِ پنجاب کی تقلید میں مناظمے کیے۔ پنجاب میں انجمن کی بے شمار شاخیں قائم ہوئیں جن میں کانگڑہ اور قصور میں نئی قسم کی شعر و شاعری کا چرچا ہوا۔

یہ صحیح ہو کہ انجمنِ پنجاب کے مشاعروں نے اُردو شاعری کو اگرچہ پُرانی بدعتوں سے چھڑا کر شاعری کی نئی شاہ راہوں پر لگایا لیکن آیندہ آنے والے مشاعروں کو بالکل بےمزہ کر دیا آج کل بھی مشاعرے کثرت سے ہوتے ہیں۔ علمی درس گاہوں میں اور ریڈیو پر مشاعرے کیے جاتے ہیں لیکن ان میں ان مشاعروں کا مزہ ہمیں نظر نہیں آتا جن کا حال ابھی ہم نے دیکھا ہو۔ آج کل مشاعروں میں دو باتیں نمایاں خصوصیات ہیں :-

(۱) گاکر پڑھنا۔ اس کی مثالیں ہمیں پُرانے مشاعروں میں بھی ملتی ہیں لیکن وہاں یہ معیوب سمجھا جاتا تھا۔

(۲) مشاعروں میں بلینک ورس پڑھنا۔ اس کی ابتدا اوائلِ بیسویں صدی سے ہوئی۔ شمس العلما مولوی محمد یوسف عظیم آبادی اسی زمانے میں زمانے کے انقلابات پر ایک غزلِ مسلسل میں لکھتے ہیں :- ؎

پڑھتے ہیں سب بجائے غزل اب بلینک ورس
اب ہیں مشاعروں میں غزل خواں نئے نئے

مشاعروں کی گرم جوشی کا کُل دار و مدار منافست اور مقابلے پر ہوتا ہو اور یہ اسی صورت میں ممکن ہو اگر طرح دی جائے یا شعرا کو کوئی موضوع بتادیا جائے ، ان کو مکمل آزادی دینے سے مسابقت کا عنصر مشاعروں سے خارج اور مشاعروں کا وہ مقصد خبط ہوتا ہو جس سے شاعری ترقی پاتی ہو۔

(٭)

۲

توتا

(ترجمہ معہ اضافہ از جناب آغا سروش صاحب لکھنوی)

[یہ ٹیگور کی نظم Parrot کا ترجمہ ہی سروش صاحب لکھنوی لکچرار عثمانیہ کالج اورنگ آباد دکن نے کیا ہی اور اُردو، میں اشاعت کے لیے بھیجا ہی۔ اس میں کہانی کے پیرائے میں موجودہ تعلیم کا خاکا اُڑایا ہی۔ مدیر]

ایک پرندہ تھا جاہل اور ناداں
ہی یہ دِلچسپ اس کے غم کا بیاں
کام تھا اس کو صرف گانے سے
ڈالی ڈالی پہ چہچہانے سے
عِلم سے تھا نہ اک ذرا سا لگاؤ
تھا طبیعت کا وحشیانہ بہاؤ
اِس طرف سے اُدھر کو مُڑ جانا
اُس طرف سے اِدھر کو اُڑ آنا
تھی نہ تہذیب پانو کی زنجیر
بندِ شایستگی کا تھا نہ اسیر

ایک دِن اس کو شاہ نے دیکھا
بولا کس کام کا پرند ایسا
نہیں اچھے بُرے کی اس میں تمیز
کاٹ ڈالا اسے ملی جو بھی تیز
یہ جو اُڑتا رہا یونھی آزاد
باغِ شاہی کے پھل ہوے برباد
بولا پھر اے وزیر تو، ہی حکیم
اِس کو باقاعدہ ملے تعلیم

دو بھتیجے تھے شہ کے نیک نہاد
بن گئے وہ پرند کے اُستاد
دونوں نے مِل کے اک کمیٹی کی
تاکہ تعلیم پر ہو بحث قوی
ایک جلسے میں سب ہوے حاضر
فنِ تعلیم کے جو تھے ماہر
باندھے طومار خوب بحثوں کے
کہ پرندے کا رازِ جہل کھُلے
اور پھر اِس نتیجے پر پہنچے
کہ ہیں یہ عیب آشیانے کے
خشک تنکوں کا گھر بہت ہی تنگ
علم اور جہل میں نہ ہو کیوں جنگ
یہ ہی محدود علم بے پایاں
کوزے میں بحر کی سمائی کہاں

الغرض سب نے مِل کے طے یہ کیا
پہلے پنجرا بنے اِک اچھا سا

فرد تھا اپنے فن میں اک سُنار
اس نے زرّیں قفس کیا تیّار
ایسی کاری گری و صنّاعی
چشمِ خورشید نے نہ دیکھی تھی
دُور دُور اُڑ کے جب یہ پہنچی خبر
لوگ دوڑے کہ دیکھیں ایک نظر
وہ قفس تھا کہ جنّتِ شدّاد
قید ہونے پہ جان دیں آزاد
ایک بولا کہ سب یہ نقش و نگار
ہیں پرندے کے عِلم کے آثار
دُوسرا بولا کچھ نہ ہو تو بھی
کیا حصولِ قفس نہیں کافی
اِس پرندے کو یہ قفس جو مِلا
ہو تو جاہل مگر نصیب کُھلا

اِس طرف وہ سُنار نیک انجام
نام کے ساتھ لے گیا انعام

اب پروفسروں کی باری آئی
سب نے مِل کر شروع کردی پڑھائی
ایک ان میں سے بولا فرزانہ
چاہیے مجھ کو اک کتب خانہ

پھر بھتیجوں نے بھیج کر پیغام
کیے خطّاطِ مُلک جمع تمام
خوش نویسوں نے اپنے فن دِکھلائے
نقل کرکے کتابیں ڈھیر لگائے
دیکھ کر اُن کو بولی خلقت واہ
عِلم کے بحر کی نہیں اب تھاہ

کرکے پھر خوش نویس اپنا کام
گاڑیوں لاد لے گئے انعام
پہنچے اپنے گھروں کو سب مسرور
ہوا افلاس ان سے کوسوں دُور

ہوچکا انتظام جب یہ سب
جو بھتیجوں کے نام کا تھا سبب
مستعد اور ہوگئے فی الفور
نگرانی کے بڑھ گئے کچھ طور

تیلیوں کو قفس کی چمکایا
عیب ڈھانپا جہاں جہاں پایا
ہوا یہ شور اس نتیجے کا
ملک بھر جوش میں پکار اٹھا
ایک دن ہوگا یہ پرند فہیم
زور پر ہے ترقی تعلیم

خادموں کی پھر اک جماعت کو
متعین کیا حفاظت کو
اور ان پر مزید نگراں تھے
من چلے، خوش لباس، البیلے
ان کو تنخواہیں ملتی تھیں معقول
کہ رہے ان کا دل کبھی نہ ملول
ہر مہینے کی پہلی جب آئی
جیب پہلے انھی نے گرمائی

یوں تو ہر چیز ہے جہاں میں کم
جس سے دستِ طلب نہیں بے نم
زیادتی ہے اگر تو اک شے کی
نکتہ چینی کہو کہ بے تکی
ہوگئی ایک نکتہ چیں کو خبر
نکلے اس کی زباں میں بال و پر

بولا کیا انتظام ہے واللہ
اب پرندہ غریب ہوگا تباہ

بادشاہ کو ہوا جو علم اس کا
ان بھتیجوں کو پاس بلوایا
اور پوچھا کہ ماجرا کیا ہے
کوئی کہتا تھا یہ تماشا ہے
کی بھتیجوں نے عرض شہ کے حضور
نکتہ چیں کی نظر کا سب ہے قصور
خوش نویس و پروفسر کہ سنار
ہے ہر اک اپنے کام میں ہشیار
خادموں کی پھر اک جماعت ہے
رات دن جو بڑی حفاظت ہے
نگراں خادموں کے چند ہزار
تھے جو ان میں کوئی کوئی سردار
ان کو بلوا کے پوچھیں شاہنشاہ
ہوں حقیقت سے حال کی آگاہ
بیٹھے بیٹھے جو نام دھرتے ہیں
اسی باعث تو بھوکوں مرتے ہیں

سن کے احوال سب شہِ ذی جاہ
مطمئن ہوگیا جو خاطر خواہ

کام سے خوش ہو، بھتیجوں کے
خلعت بیش بہا تحفے میں دیے

بیٹھے بیٹھے خیال شہ کو ہوا
کہ نہ جانے پرندہ ہو کیسا
لاؤ میں بھی تو جا کے دیکھوں کبھی
کتنی تعلیم نے ترقّی کی
ایک دن کچھ وزیر اور ندیم
ساتھ شہ کے چلے بصد تعظیم
درس گہ کی طرف بڑھا ہاتھی
حسب رتبہ تھے جا بہ جا ساتھی
تھی سواری کی سارے شہر میں دھوم
ہوا خلقت کا راستوں پہ ہجوم
الغرض کر کے شہر کا دَورہ
صدر دروازے پہ جلوس آیا
ہوا شہ کو اترنے کا جو خیال
بڑھ گئے لوگ بہرِ استقبال
چوب نقارے پر لگائی گئی
وردی اعزاز میں بجائی گئی
سنکھ ناقوس جھانجھے کی جھنکار
بینوں کا شور نَے کی پکار

اِس قیامت کی نغمہ ریزی تھی
جوش میں بجلیوں کی تیزی تھی

باجے بجنا جو ہو چکے موقوف
بڑھے اُستاد صاحبانِ وقوف
گون پہنے ہوئے لیاقت کی
بولتی مورتیں صداقت کی
سب نے ہاتھوں پہ لے کے پاک کتاب
بہرِ تقدیس پڑھ دیا اک باب

زرگر و خوش نویس اور معمار
خادم اور ہوشیار نگراں کار
بعد اس کے ادب سے آگے بڑھے
اونچی آواز میں ترانے پڑھے

کی بھتیجوں نے عرض ظلّ اللہ
چشمِ انصاف سے ذرا ہو نگاہ

شہ نے فرمایا کچھ ٹھکانا ہے
کیا زبردست شور برپا ہے

دونوں بولے یہی نہیں خالی
شور میں راز ہیں بہت عالی

شاہ خوش خوش وہاں سے جب پلٹا
طے کیا اس نے صدر دروازا
چاہتا تھا کہ بیٹھے ہاتھی پر
نکتہ چیں کا وہیں کہیں تھا گزر
آگے بڑھ کر ادب سے عرض کیا
ہو اجازت تو کچھ کہے بندا
شہ نے فرمایا ہاں کہو ہے کیا
بولا وہ کیا پرند بھی دیکھا

چونک کر شہ نے اپنے جی میں کہا
ہا۔ پرندہ تو یاد ہی نہ رہا
خاص جس کے لیے میں آیا تھا
یہ نہ کہتا تو بھول ہی جاتا

سامنے تھے پروفسر حاضر
فنِ تعلیم کے بڑے ماہر
یہ ہوا ان سے شاہ کا ارشاد
آپ سب ہیں پرند کے اُستاد

قابل و لائق و عقیل و فہیم
میں بھی دیکھوں طریقۂ تعلیم

شہ تھا مشتاق اور یہ مشّاق
دے ہی ڈالے نمونے کے اسباق
عظمتِ کار وہ۔ وہ عرضِ ہنر
خود پرندہ بھی جس سے تھا ششدر
انتظامات کی وہ کثرت تھی
جس پہ چشمِ خرد کو حیرت تھی
اتنا سامان تھا پڑھائی کا
دانہ پانی قفس میں تھا عنقا

پہلے باریک کی قلم کی نوک
کارِ تدریس میں نہ ہوتا روک
پھر کتابوں سے لے کے خشک ورق
نئے انداز سے ٹھونسائے سبق
حلق میں جو نوالہ پھنس جاتا
وہ بھی نوکِ قلم سے دھنس جاتا
اب پرندہ کہاں، کہاں گانا
بند فریاد کا بھی تھا رستا

اس قدر خوف ناک نظّارہ
شاہ نے اپنی آنکھ سے دیکھا

خوش ہُوا کام سے بھتیجوں کے
چلتے چلتے انھیں صلے بھی دیے
صدرِ عمّال کو ہوا فرمان
نکتہ چیں کے اینٹھے جائیں کان

مختصر یہ کہ جتنے دِن گُزرے
اِتنے دِن پھرگئے پرندے کے
تھا پروفسروں کا اس کا یقین
ہوگیا وہ مہذّب اور متین
جان جتنی گھُلی ریاضت میں
اِتنے پر لگ گئے لیاقت میں
بے سبب کب یہ نیم جانی تھی
یہ تو امید کی نشانی تھی

اس طرف وہ پرند کیا معلوم
کیوں قفس میں رہا کیا مغموم
صبح دم پھوٹتے ہی پہلی کرن
جس کی رہتی تھی شام ہی سے لگن
تیلیوں پر قفس کی سر دھنتا
تال پر ہر نفس کی سر دھنتا
پھڑپھڑانے میں ٹوٹ جاتے پر
باز آتا نہ شرحِ غم سے مگر
تھا جو سعیِ محال کا مختار
کاٹتا چونچ سے طلائی تار
نگراں کہتے سر بہ سر گستاخ
کس قدر ہو یہ مشتِ پر گستاخ

پاس ہی رہتا تھا وہاں لوہار
اس کو لائے بُلا کے خدمت گار
ساتھ لایا ہتھوڑا اور نہائی
بھٹّی صحنِ قفس کے پاس لگائی
کی طلائی قفس کی بربادی
جڑ دیے اس پہ جال فولادی

پھر بھی ہمّت سے در اگر کاٹے
مبتلائے بلا کے پر کاٹے

سر ہلا کے وزیر شہزادے
باتیں سنجیدگی سے یوں کرتے

سلطنت کے پرند بے ایمان
یہی اتنا نہیں کہ ہیں نادان
علم کی شان کا نہیں احساس
ان کو احسان کا نہیں احساس

کام کچھ اس قدر نہ تھا دُشوار
لے کے اُجرت چلا گیا لوہار
ہر محافظ نے ہوشیاری پر
پائے انعام جھولیاں بھر کر

ہوگیا انتظام پھر معقول
فنِ تعلیم کا جو ہے معمول
پوری سچائی اور دیانت سے
پہلے سے کچھ زیادہ محنت سے
ان پروفسروں نے کام کیا
ساری دُنیا میں اپنا نام کیا

موت آئی پرند کو جس دن
کوئی یہ بھی نہ سمجھا کب کس دن
قفس تن کا توڑ کر ہر بند
اُڑ گیا وہ قفس رہا سربند

قید و بندِ قفس سے چھوٹ گیا
جو گھروندا بنا تھا ٹوٹ گیا

نکتہ چیں نے جہاں کو گرمایا
ہر طرف اِس خبر کو پھیلایا

بادشہ نے کہا بھتیجوں سے
حکم پاکر جو سامنے آئے
مجھ کو سمجھاؤ سُن رہا ہوں کیا
مرگیا یا پرند ہے زندہ

کی بھتیجوں نے عرض شاہنشاہ
نکتہ چیں نے اُڑائی ہے افواہ
بلکہ اس کے خلاف ہے یہ دلیل
کارِ تعلیم کی ہوئی تکمیل

پوچھا اُڑتا ہے باغ میں بے کار
عرض دونوں نے کی نہیں سرکار
بولا اب بھی پھدکتا ہے ہر بار
دونوں بولے نہیں نہیں سرکار
بھوک سے نہیں ہے اب بے زار

بولے بالکل نہیں ۔ نہیں سرکار
گایا کرتا ہے کیا میاں کے ملار
بولے امکان ہی نہیں سرکار

شہ نے فرمایا لاؤ میرے پاس
دیکھوں کتنے ہیں اس میں ہوش وحواس

شان و شوکت سے آئی اس کی لاش
ہوئی مردے میں زندگی کی تلاش

مشتِ پر کا دبایا ہر پہلو
نہ ملا زیست کا مگر پہلو
زندگی میں پڑھے تھے جتنے سبق
پیٹ میں سرسرائے اُتنے ورق

بچ کے آزاد سے نسیم چلی
منھ بنا کر ہنسی ہر ایک کلی
باغِ عالم میں مُسکرائی بہار
دِل کو برما گئی پُرانی بہار

مردم شماری سنہ ۳۱ء

رپورٹ مردم شماری سنہ ۱۹۳۱ء پر سیر حاصل تبصرہ جس میں ہندستان کی آبادی، تعلیم، روزگار، فرقوں اور زبانوں وغیرہ کے متعلق مفید اعداد و شمار اور جدولیں دی گئی ہیں ۔ ہر قومی کارکن اور معلوماتِ عامہ سے دِل چسپی رکھنے والے کے پاس اس کتاب کا ہونا ضروری ہے۔ قیمت مجلد عہ غیر مجلد عہ

مشاہیرِ یونان و روما

مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی نے پلوٹارک کی مشہور عالم کتاب "الیس" سے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کتاب میں یونان و روما کی مشہور ہستیوں کا حال نہایت ہی دِل چسپ انداز میں مورخانہ تحقیق کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ۔ ترجمے کی سلاست و لطافت قابلِ داد ہے ۔ قیمت جلد اوّل مجلد صہ غیر مجلد للعہ ، جلد دوم مجلد صہ غیر مجلد للعہ ۔

منیجر انجمنِ ترقّیٔ اُردو (ہند) دہلی

خیام مؤلفہ سید سلیمان ندوی پر ایک عروضی نظر

(جناب سید معشوق حسین اطہر ہاپوڑی وکیل جے پور)

حکیم عمر خیام پر مشرق و مغرب کے فضلا نے بہت کچھ لکھا ہے اور اب تک بھی قلم کی گردش آسودہ منزل نہیں علامۃ العصر مولانا سید سلیمان ندوی نے جن کی مستجمع کمالات ہستی بلحاظِ تبحر علمی و وسعتِ تحقیق ایک امتیازِ خاص رکھتی ہے خیام نامی ایک کتاب دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع فرمائی ہے جس میں خیام کے سوانح حیات و تصنیفات پر محققانہ تبصرہ اور فارسی رباعی کی تاریخ اور رباعیاتِ خیام پر مفصل مباحث ہیں اور آخر میں خیام کے چھ عربی و فارسی رسالوں کا ضمیمہ اور اس کی رباعیات کے ایک قلمی نسخے کی نقل شامل ہے خیام پر یہ بہت ہی مکمل و جامع اردو میں پہلی محققانہ کتاب ہے۔

اس مضمون میں صرف رباعی اور رباعی کے اوزان کا جہاں تک تعلق ہے مجھے عروضی نقطۂ نگاہ سے تبصرہ مقصود ہے۔

(۱) خیام ص۲۲۵۔ رباعی کی تاریخ، وجہِ تسمیہ اور عربی زبان میں رباعی کا رواج بیان کرنے کے بعد عمارۂ مروزی کی مندرجہ ذیل رباعی لباب الالباب عوفی جلد دوم ص۲۵ سے نقل کی ہے ؎

آں مہ بدست آں بتِ سیمین من نگر — گوئی کہ آفتاب بہ پیوست با قمر
واں ساغرے کہ سایہ بیفگند می بروں — برگِ گل سپید است گوئی بہ لالہ بر

مقصود یہ ہے کہ اس عہد تک فارسی رباعیات کے تیسرے مصرع کا ہم قافیہ ہونا ضروری نہ تھا۔

لیکن اس منظوم سے رباعی کے تیسرے مصرع کے ہم قافیہ ہونے یا نہ ہونے پر استدلال نہیں ہوسکتا کیوں کہ اس منظوم کا وزن رباعی کے اوزانِ مقررہ سے مختلف ہے۔ یہ منظوم بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف بروزنِ مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن ہے اور رباعی کے لیے بحر ہزج مخصوص ہے جس

کے چوبیس اوزان بارہ اخرب اور بارہ اخرم ہیں ۔

اس رباعی کے متعلق علامہ نے "معارف" اکتوبر ۳۴ء ص۲۶۶ میں ارشاد فرمایا ہو کہ

"عمارہ مروزی کا یہ قطعہ یا رباعی جو چاہے کہیے میں نے "لباب الالباب" عوفی جلد دوم ص۲۵ طبع برون سے نقل کی ہو اس میں عوفی جیسے ماہرِ ادب نے اس کو رباعی ہی کہہ کر نقل کیا ہو اس کی تصحیح و تحشی کا کام اس عہد کے نام ور ایرانی فاضل علامہ عبدالوہاب قزوینی نے کیا ہو انھوں نے بھی یوں ہی رہنے دیا ہو اور اس نظم کے چاروں مصرع بھی اسی طرح ہیں جس طرح میں نے اپنی کتاب میں نقل کیے ہیں۔ اتنا لکھنے سے صحتِ نقل کا بار تو میرے سر سے اُتر گیا۔ عوفی کا اس کو رباعی کہنا اور قزوینی وغیرہ مصححین کا اس پر کوئی اعتراض نہ کرنا یہ معنی رکھتا ہو کہ مروزی کے عہد تک اوزانِ رباعی کی یہ تخصیص نہیں ہوئی تھی جو بعد میں ہوئی۔ یا اس کے یہ معنی ہیں کہ لوگ ہر چہار مصرعوں کی نظم کو رباعی کہہ دیتے تھے۔ چناں چہ عوفی نے ایک اور چار مصراعی نظم کو جس کے پہلے مصرع میں قافیہ بھی نہیں ہو رباعی کہا ہو۔"

مروزی کا سالِ وفات ۳۶۰ھ ہو اور رباعی کی ایجاد یعقوب صفار المتوفی ۲۶۵ھ کے زمانے میں ہو چکی تھی اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مروزی کے عہد میں اوزانِ رباعی کی تخصیص نہ ہوئی تھی اور اگر دوسری روایت کو جو رودکی المتوفی ۳۲۹ھ اور زمانۂ حکومت سامانیہ سے متعلق ہو صحیح مانا جائے تو بھی مروزی کے سالِ وفات ۳۶۰ھ سے پہلے رباعی ایجاد ہو چکی تھی عوفی کی مہارتِ ادب اور قزوینی کی نکتہ سنجی پر ہم کوئی اعتراض کرنا نہیں چاہتے۔ جب کہ علامہ ان کو ایک ماہرِ ادب اور فاضل کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں لیکن ہم یہ ضرور عرض کریں گے کیا محترم علامہ کے پیشِ نظر عوفی کے دست و قلم کا لکھا ہوا کوئی نسخہ ہو اور اگر نہیں ہو اور یقیناً نہیں ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ناقلانِ نا عاقل کی تحریف و تصرف ہو اور یہ قابلِ استدلال نہیں ۔ بے مایہ ناقلوں اور کم سواد کاتبوں نے اساتذۂ مسلّم کی تصانیف میں تحریف و تصرف کرکے ایسی غلطیاں پیدا کر دی ہیں کہ اساتذہ کی طرف اِن کا انتساب بھی سوے ادب سے کم نہیں ۔

مولانا جامی علیہ الرحمۃ کے متعلق کسی کو یہ شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ اوزانِ رباعی سے ناواقف ہوں گے اور بحرِ ہزج کے سوا کسی اور بحر میں رباعی کہنا جائز رکھیں گے لیکن بہارستانِ جامی ص۸ مطبوعہ نول کشور میں مندرجۂ ذیل قطعہ رباعی کے نام سے درج ہو ؎

آں کہ ز نام بہ دست است مرا زو نہ نشاں — دست بگرفتہ مرا در عقب خویش کشاں
اوست دست من و پا نیز بہ ہر جا کہ رود — پاے کوباں ز پیش [illegible] روم دست فشاں

فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلات ۔ رمل مثمن مخبون مقصور

شیخ سعدی پیغمبر سخن ہیں ان کا فضل و کمال شریعت سخن میں محتاج تعارف نہیں۔ گلستاں مطبوعہ محبوب المطابع [illegible] باب اوّل میں مندرجۂ ذیل قطعہ رباعی کے نام سے درج ہے

تا مرد سخن نگفتہ باشد — عیب و ہنرش نہفتہ باشد
ہر بیشہ گماں مبر کہ خالیست — شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

مفعول مفاعلن فعولن ۔ ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف

گلستاں باب دوم میں قطعۂ زیریں رباعی کے نام سے تحریر ہے

تو نیکو روش باش تا بد سگال — بہ نقص تو گفتن نیابد مجال
چو آہنگ بربط بود مستقیم — کے از دست مطرب خورد گوشمال

فعولن فعولن فعولن فعول ۔ متقارب مثمن مقصور

کیا صحیح الرائے مرتبہ شناس مصنف اس قسم کے مطبوعات کی بنا پر سعدی و جامی کی شخصیت کو مجروح کر سکتا ہے یا ناقابل وثوق شواہد کو دستاویز تحقیق بنا سکتا ہے۔

اُردو زبان میں جو مرتبہ انیس و دبیر کا بہ اعتبار کمال فن ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ مگر جلد مرثیہ ہائے انیس مطبوعہ نول کشور پریس میں مندرجۂ ذیل قطعات رباعیات کے سلسلے میں طبع ہوئے ہیں ۱۹۳۲ء ہے

غافل تجھے کیوں خواہش دنیاے دنی ہے — [illegible]
جو قاقم و سنجاب پہنتے تھے ہمیشہ — [illegible]

مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن ۔ ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف

ایضاً ص۳۹ — موقوف یہ مقام زاری ہے — [illegible]
فاطمہ آچکی ہیں مجلس میں — اب کہو کس کی [illegible] ہے — خفیف

فاعلاتن مفاعلن فعلن ۔ خفیف مسدس مخبون محذوف ۔

جلد مرثیہ ہائے مرزا دبیر مطبوعہ نول کشور پریس میں حسب ذیل قطعات رباعیات کے نام سے لکھے ہوئے ہیں:

ص۳۲۲ ۔ عزیزو! آنسو بہاؤ محرم آ پہنچا ۔ فلک پہ نالۂ خیرالنسا بھی جا پہنچا
برائے بخششِ امت شہید ہونے کو ۔ حسین منتصلِ دشتِ کربلا پہنچا

مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن ۔ مجتث مثمن مخبون محذوف ۔

ایضاً ص۲۱۴ جس گھڑی مسلمِ بےکس کا خیال آتا ہے ۔ صاحبِ درد کو افسوس کمال آتا ہے
سر تو نیزے پہ چڑھا لاش پھری کوچوں میں ۔ ایلچی پر کہیں ایسا بھی زوال آتا ہے

فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن ۔ رمل مثمن مخبون محذوف مسکن ۔

دیوانِ ذوق دہلوی مرتبہ پروفیسر آزاد مطبوعہ لاہور میں بھی یہ قطعہ پروفیسر آزاد کی ترتیب میں رباعی کے نام سے درج ہوگیا ہے ص۲۸۹ ۔

جن کو اس وقت میں اسلام کا دعوا ہے کمال ۔ غور سے دیکھا تو اے ذوق ہے اُن کا یہ حال
جیسے محفل میں ہنسانے کو مسلمانوں پر ۔ نقل کرتا ہو مسلمانوں کی کافر نقال

فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلات ۔ رمل مثمن مخبون مقصور۔

ان تمام ترتیبی مساحت سے شعرائے کامل الفن پر یہ ایراد وارد کرنا کہ وہ عروض سے ناواقف تھے حد درجے کی ناحق شناسی ہے۔ بحثِ رباعی سے متعلق اس موقع پر علامہ ندوی کو ایسی رباعی پیش کرنی چاہیے تھی جو بلا اختلاف رباعی کہی جاسکے ۔ اب یہ فرمانا کہ قطعہ یا رباعی جو چاہے کہیے اصل موضوعِ کلام کے خلاف ہے ۔ بے شبہ متقدمین بیش تر چاروں مصرعوں میں قافیہ لاتے تھے لیکن لازمی نہ تھا ۔ متاخرین کم تر تیسرے مصرع میں قافیہ لاتے ہیں۔ صاحبانِ ذوقِ صحیح جانتے ہیں کہ تیسرے مصرع میں قافیہ لانے سے رباعی کے چوتھے مصرع کی قوتِ تاثیر کم ہوجاتی ہے ۔ وجدانِ سلیم اس کو قبول نہیں کرتا ۔ اس لیے زمانۂ حال میں بالارادہ تیسرا مصرع بے قافیہ کہا جاتا ہے۔

(نوٹ) 'معارف' اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ء میں پروفیسر تاثیر ایم اے اپنے نامۂ کیمبرج موسومہ علامہ ندوی میں عمر خیام پر ریویو کرتے ہوئے اس نظم کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"مجھے یہ چار مصرعے رباعی کے نہیں معلوم ہوتے اور چوتھا مصرع غلط نقل ہوا ہے، است کی جگہ بہ چاہیے یوں مصرع (برگ گل سفید بہ گوئی بہ لالہ بر) نہ کہ۔ (برگ گل سفید ست گوئی بہ لالہ بر)۔ اور مستفعلن مفاعلن ہے۔ ۶۔ بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل چلے۔"

علامہ نے اسی نمبر میں اس کا جواب یہ دیا ہے:۔

"آپ کا یہ کہنا صحیح ہے کہ اس کا وزن بحر ہزج کے عام اوزانِ رباعی میں سے نہیں ہے مگر اس کی جو تقطیع آپ نے کی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ بحر رمل مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن میرے علم میں نہیں آیا ہے اور نہ اس وزن کو اہلِ عروض نے اس بحر کے منشعبات میں شمار کیا ہے۔"

علامہ کو معلوم نہیں کہ پروفیسرانِ لاہور تاثیر وغیرہ نے قدیم عروض کی تمام قیود و قواعد کو حرفِ غلط کی طرح مٹاکر ایک نیا لندنی کیمبرجی عروض ایجاد کیا ہے اس نظم کا وزن مستفعلن مفاعلن اسی حدیث العہد عروض کے مطابق قائم کیا گیا ہے۔ پروفیسر تاثیر کی اس جسارت پر حیرت ہے کہ جو شخص کسی نظم کا صحیح وزن دریافت نہ کرسکے اور حقیقی تقطیع نہ بتا سکے وہ کیمبرج یونی ورسٹی میں رہ کر یہ دعوا کرے کہ

رباعی کے اوزان کے متعلق مجھے خود مروّجہ مسلّمات سے اختلاف ہے

یہ ہے زمانۂ حال کا رجحانِ عامہ کہ جو شخص جس فن کے مبادیات سے بھی واقف نہیں وہ اُس فن کے مسلّمات سے اتّفاق نہیں رکھتا۔

علامۂ محترم سے بھی مصرعِ ۔برگِ گل سفید است گوئی بہ لالہ بر۔کی تقطیع کرنے میں ایک سہو ہوگیا ہے۔آپ نے اس طرح تقطیع کی ہے برگ گ مفعول ل سپیدس فاعلاتن ت گوئی ب مفاعیل لالہ بر فاعلن۔ فاعلاتن مفاعیل معاً ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے فاعلات کے ساتھ مفاعیل اور فاعلاتن کے ساتھ مفعول آئے گا۔بحرِ مضارع دو رکن مفاعیلن اور فاع لاتن سے مرکّب ہے مفاعیلن اخرب ہوکر مفعول ہوگیا ہے اور فاع لاتن مفروقی مکفوف ہوکر فاعلات ہوگیا ہے اور تیسرا مفاعیل بھی مفاعیلن سے مکفوف ہوکر بنا ہے اور چوتھا رکن فاعلاتن سے محذوف فاعلن ہوگیا ہے اس طرح مفعول فاعلات مفعول فاعلن مضارع اخرب مکفوف ہے۔ ارکان اوسط میں فاع لاتن سالم نہیں ہے بلکہ تسکینِ اوسط کے ذریعے سے فاعلات کی (ت) مفاعیل کے میم کے ساتھ مل کر فاعلاتم ہوگیا ہے

جس کو فاعلاتن سے بدل دیا گیا ہے اور مفاعیل کا میم فاعلات میں شامل ہو کر فاعیل رہ گیا ہے جس کو مفعول سے بدل دیا ہے اس طرح مفعول فاعلاتن مفعول فاعلن وزن قائم ہوا ہے۔ صحیح تقطیع یوں ہوگی۔ برگے گ مفعول لے سپیدس فاعلاتن گوئی ب مفعول لال بر فاعلن۔ است کی ت، ساکنِ دوم ہونے کی وجہ سے گر جائے گی تقطیع میں محسوب نہ ہوگی علامہ نے (ت) تقطیع میں محسوب کر کے مفعول کو مفاعیل بنا لیا ہے یہ خیال نہ کیا کہ فاع لاتن اور مفاعیل کے باہم جمع ہونے سے مصرعِ ناموزوں ہوجاتا ہے اور وزن میں ایک حرف زیادہ ہوجاتا ہے۔

'خیام' صفحہ ۲۲۹ و ۲۳۰ لباب الالباب عوفی میں حنظلہ بادغیسی کی حسبِ ذیل دو بیتیں ملتی ہیں جو رباعی کے وزن پر ہیں ؎

یارم سپند اگرچہ بر آتش ہمی فگند   از بہرِ چشم تا نہ رسد مرورا گزند
اورا سپند و آتشِ ناید ہمی بکار   با روے ہمچو آتش یا خال چو سپند

یہ دو بیتیں علامہ کا نتیجۂ تفحص ہیں۔ لباب الالباب عوفی میں رباعی کے نام سے درج نہیں ہیں ورنہ یہ نہیں کہا جاتا کہ دو بیتیں ملتی ہیں جو رباعی کے وزن پر ہیں اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ خود علامہ نے اِن دو بیتوں کا وزن رباعی کا وزن قرار دیا ہے حالاں کہ یہ بیتیں بحرِ ہزج اوزانِ رباعی میں سے کسی وزن پر بھی نہیں ہیں

(۲) اور ان کا وزن مضارع مثمن اخرب مکفوف ہے مفعول فاعلاتُ مفاعیل فاعلات۔ ان بیتوں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رباعی کی تاریخ رودکی بلکہ ابودلف اور ابن الکعب سے پہلے شروع ہوتی ہے اور سامانی بلکہ صفاریہ کے بجائے طاہری دربار کو اس کی اوّلیت کا فخر حاصل ہے اس لیے کہ یہ بیتیں رباعی کے وزن میں نہیں ہیں مزید علیہ بجائے چو سپند چوں سپند ہونا چاہیے نظم فارسی میں چو جو چوں کا مخفف ہے بروزن خو، بو بطور سبب خفیف استعمال نہیں ہوتا یعنی چو میں واو ملفوظہ نہیں ہے جس طرح اسی مصرع میں ہمچو آتش نظم ہوا ہے۔ با روے مفعول ہمچ اات فاعلات ش با خال مفاعیل چوں سپند فاعلات۔

(۳) 'خیام' صفحہ ۲۳۳ ؎

چشمم زغمت بہ ہر عقیقے کہ بسفت   بر چہرہ ہزار گل ز برازم بشگفت
رازے کہ دلم ز جاں ہمی داشت نہفت   اشکم بہ زبانِ حال با خلق بگفت

اس رباعی کا دوسرا مصرعِ ناموزوں ہے برازم میں بائے موحدہ زائد از وزن ہے اور زائے منقوطہ کے ہوتے ہوئے اس

کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہو علامہ نے نقل مطابق اصل پر اکتفا کی نہ وزن کا لحاظ کیا نہ زبرازم کے پہلوے ذم کا ۔ موجودہ شکل میں براز کے معنی غایط و فُضلہ کے لیے جاسکتے ہیں اور یہ سخت ادبی مُسامحت ہو۔ صحیح مصرع اس طرح ہوسکتا ہو ؏ برچہر ہزار گُل ز رازم بہ شگفت ۔ برچہر مفعول ہزار گُل مفاعلن ر رازم بش مفاعیلن گفت فاع ۔

(۴) خیام ص۲۳۶

”رباعی کے بحر کے بعض قطعات بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہو کہ ہنوز رباعی فن کی زنجیروں میں جکڑی نہیں گئی تھی ۔“

علامہ وزنِ رباعی میں کسی قطعے کا موزوں ہونا فن کی جکڑبندی خیال فرماتے ہیں غالبًا علامہ کے نزدیک رباعی کے وزن میں صرف رباعی ہی کہ سکتے ہیں اور کچھ نہیں کہنا چاہیے یہ خیال قطعی غلط ہو رباعی کے وزن میں ہمیشہ مختلف اصناف کی نظمیں کہی گئی ہیں اور کہی جاتی ہیں اور بہ روے فن اس پر کوئی نکتہ چینی نہیں ہوسکتی ۔ ابوطاہر خاتونی کے یہ اشعار رباعی کے وزن میں ہیں ۔ ؎

استادگماں مبرکہ دل ریش نیم ازفعل تو نیک و زبداندیش نیم
درکیش تو آئین نکوکاری نیست ایزد داند کہ من بدیں کیش نیم
تاکہ برمن زنی ز بدفعلی لاف گر تو گرگی بہ طبع من میش نیم
در نیکی و در بدی نیم ہم سر تو بے خار نیم ولیک بانیش نیم
گفتی کہ چرا دوانی و بازپسی زاں باز پسم کہ چوں تو درپیش نیم

گلستاں باب اول بیت ؎ آں راکہ بجاے تست ہردم کرمے عذرش بنہ ار کند بہ عمرے ستمے
مفعول مفاعلن مفاعیل فعَل مفعول مفاعلن مفاعلن مفاعیل فعل

گلستاں باب دوم بیت ؎ ترسم نرسی بہ کعبہ اے اعرابی کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستانست
مفعول مفاعلن مفاعیلن فع مفعول مفاعلن مفاعیلن فاع

گلستاں باب دوم بیت ؎ شخصے ہمہ شب برسرِ بیمار گریست چوں روز شد او بمُرد بیمار بزیست
مفعول مفاعیل مفاعیل فعول مفعول مفاعلن مفاعیل فعول

ایضًا بیت ؎ عاجز باشد کہ دستِ قوت یابد برخیزد و دستِ عاجزاں برتابد
مفعولن فاعلن مفاعیلن فع مفعول مفاعلن مفاعیلن فع

بہارستانِ جامی ص۵ نول کشوری بیت ؎ ہر لحظہ خورد ہزار سوگند دروغ زاں گونہ کہ اعرابی در بادیہ دوغ

مفعول مفاعلن مفاعیل فعول مفعولن مفاعیلن مفعول فعول

حقیقت یہ ہو کہ وزنِ رباعی میں ہر صنف نظم جائز ہو۔ رباعی وزنِ رباعی ہی میں کہی جاسکتی ہو دیگر بحور اوزان میں نہیں کہنا چاہیے معیار الاشعار محقق طوسی میں ہو کہ

" درغیر ترانہ (رباعی) چوں مقبوض آرند در ہمہ قصیدہ ہم چناں بود اما در ترانہ خلط مقبوض و مکفوف (مفاعلن و مفاعیل) . . بہ یک دیگر روا بود " ..

یعنی رباعی میں مفاعیل اور مفاعلن کا اجتماع جائز ہو لیکن جب وزنِ رباعی میں قصیدہ وغیرہ کہا جائے تو مفاعلن اور مفاعیل کا اجتماع جائز نہیں ہو یہ محقق کا ارشاد ہو لیکن یہ لازمی نہیں ہو پڑھیے سعدی ؎ شخصے ہمہ شب الخ

اس میں مفاعلن اور مفاعیل کا اجتماع ہو۔ مقیاس الاشعار ص۲۲ مصنفہ مرزا اوج لکھنوی میں ہو۔ رباعی اِن اوزان سے مخصوص ہو لیکن یہ اوزانِ رباعی سے مخصوص نہیں بلکہ اِن اوزان میں قطعہ وغیرہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

(۵) خیام، ص۲۴۲ و ص۲۴۳

علامۂ محترم نے شیخ کے معاصر بابا طاہر ہمدانی کے مجموعۂ رباعیات (زبانِ دہقانی) میں سے حسبِ ذیل دو رباعیاں نقل فرمائی ہیں ؎

(۱) دلے دارم کہ بہبودش نہ می بو نصیحت مے کرم سودش نہ مے بو
بہ بادش مے دہم نش سپرہ باد بر آذر مے نہم دودش نہ مے بو

(۲) نسیمے کز بُنِ آں کاکل آید مرا خوش تر ز بوے سنبل آید
چو شوگیرم خیالت را در آغوش سحر از بسترم بوے گُل آید

یہ دونوں منظوم بھی رباعی کے وزن میں نہیں ہیں۔ ہزج مسدس محذوف یا مقصور۔ مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل یا فعولن کے وزن پر ہیں۔ حیرت ہو کہ علامہ نے مسدس اور مثمن کے فرق کو بھی نظر انداز کردیا۔ یہ ایسی بات ہو پیش پا افتادہ کہ اس سے ہر لکھے پڑھے شخص کو واقف ہونا چاہیے۔

(۶) خیام ص۲۴۴ —— علامہ نے باخرزی کی یہ رباعی عوفی سے نقل کی ہو۔ ؎

"خصم تو اگر باز ندارد ز تو جنگ صد گونہ برائے تو برآمیزم رنگ
بنشینم اگر کار بنام ست و بہ ننگ برآتش چو کباب و بر تیغ چو زنگ"

معنی و مفہوم سے قطع نظر کرکے اس رباعی کا چوتھا مصرع ناموزوں ہو اس کی تقطیع دو طرح ہوسکتی ہو۔ (۱) برآتش مفعولن چ کباب فعلات بر تیغ مفعول چ زنگ فعول (۲) برآتش مفعولن چ کبابو فعلاتن بر تیغ مفعول چ زنگ فعول یہ دونوں وزن عروضی نہیں ہیں۔علامہ نے صرف نقل مطابق اصل کو ہی اپنا فرض سمجھا۔ اور موزونیت و ناموزونیت کو فرائض ادبی نہیں سمجھا اگر علامہ غور و خوض کو کام فرماتے تو چوتھے مصرع کو صحیح طور پر اس طرح نقل کرسکتے تھے۔۶

برآتش چون کباب و بر تیغ چو زنگ

یعنی بجائے چو کباب چون کباب لکھنے سے مصرع موزوں ہوجاتا ہو جو ہمیشہ بسقوطِ واو ہی مستعمل ہوتا ہو جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہو اب وزن درست ہوکر اس طرح تقطیع ہوگی۔ برآتش مفعولن چوکبا فاعلن ب بر تیغ مفاعیل چ زنگ فعول۔ مفعولن فاعلن مفاعیل فعول۔ ہزج مثمن اخرم اشتر مکفوف ازل۔

اصل یہ ہو کہ مفعولن کے بعد ہمیشہ مفعولن، مفعول، فاعلن ہی آئے گا۔ کبھی مفاعیل مفاعلن مفاعیلن نہیں آئے گا۔ اور مفعول کے بعد ہمیشہ مفاعلن مفاعیل مفاعیلن آئے گا۔ مفعولن مفعول فاعلن نہیں آئے گا۔ اس کے خلاف ہوگا تو مصرع ناموزوں ہوجائے گا۔

(۷) "خیام" ص۲۵۶ حاشیہ

"اورینٹل لائبریری پٹنہ ۲۳۴ پر رشیدالدین وطواط (المتوفی ۵۷۳ھ) کی طرف منسوب عروض کا ایک منظوم فارسی رسالہ ہو جس کا نام اقسام البحور (اقسام البحور) لکھا ہو اس میں ایک ایک دو دو شعروں میں ہر بحر کو بیان کیا ہو اس میں بحر ہزج کی نسبت جو رباعی کا وزن ہو حسب ذیل دو شعر ہیں ؎

در بحر ہزج زحاف بسیار آید ایں وزن بہر بدیہہ بکار آید
مفعول مفاعلن فعولن فعلن تقطیع کنی ہمہ پدیدار آید

اس سے معلوم ہوتا ہو کہ رباعی کا اصل استعمال بدیہہ گوئی کے موقع پر تھا۔"

یہ امر تو ہمارے مطمح نظر سے خارج ہو کہ رباعی کا اصل استعمال بدیہہ گوئی کے موقع پر تھا یا نہیں۔ ہم کو تو صرف یہ کہنا ہو کہ وہ رسالہ جس میں بحرِ ہزج کی نسبت جو رباعی کا وزن ہو نہ وہ رشیدالدین وطواط کا ہوسکتا ہو نہ

رشید الدین وطواط رباعی کا وزن، مفعول مفاعلن فعولن فعلن قرار دے سکتا ہے۔

یہ دونوں شعر وزن رباعی میں جو کسی ناواقفِ فن مبتدی کے ہیں، ہرگز رشید الدین وطواط جیسے گراں پایہ مسلم الثبوت ماہرِ فن استاد کی تصنیف نہیں ہو سکتے جس کی نسبت آتش کدہ آذر اخگرِ دوم میں ہے:۔

"مرد فاضلے و از علم بہرہ داشتہ و در فنون شعر کامل مہارت داشتہ رسالہ در قواعد شعر نوشتہ۔ بسیار سخن آفریں و حریف حرف بودہ۔"

دولت شاہ سمرقندی لکھتا ہے (ذکر افضل الفضلا رشید وطواط)

"وہو رشید الدین محمد بن عبد الجلیل الکاتب العمری کتب او بہ امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ می رسد فاضل و ادیب ذو فنون بودہ و بزرگ واری و فضل ہم گناں معترفند در روزگار خود استاد فرقۂ شعرا و فضلا بودہ شعرائے اطراف او نزدیک و دور تصدِ ملازمت او می کردند و بہ استفادہ شعر و دیگر علوم مشغول بودہ اند اورا در شاعری جاہ و مراتب عظیٰ دست دادہ مردے تیز زبان و فصیح بودہ در سخن شعرائے اطراف تخطیہ گرفتے بیش تر شعرا با او خوش نہ بودند۔ اکثر اورا ہجوہائے رکیک گفتہ انداز غایتِ حسد۔ اما ساحت او ازیں افترایات مبراست در فضل او ہیچ سخن نیست۔ و اورا در علمِ بیان و معانی تصانیفِ مرغوب است۔ کتاب حدایق السحر از تصنیفات اوست کہ در صنائع علم شعر ازاں مفید تر نہ ساختند۔"

بہارستانِ جامی میں ہے:۔

"در وقت خود استاد شعرائے مقدم و پیشوائے آں طبقہ بود کتاب حدایق السحر تصنیفِ اوست۔"

مرآۃ الخیال شیر خاں لودی میں ہے:۔

"فاضل و ادیب ذو فنون تیز زبان و فصیح بودہ اورا در علمِ عروض و قوافی رسالہ الیست موسوم بہ حدایق السحر ہر کس کہ آں را مطالعہ نماید بر علم و فضل او گواہی تواند داد۔"

کیا ایسے جلیل المنزلت استاد سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ مفعول مفاعلن فعولن فعلن رباعی کا وزن قرار دے۔ فعولن اور فعلن دونوں بحرِ ہزج کے مشعبات میں سے نہیں ہیں۔ رباعی کے چوبیس وزن جن ارکانِ عشرہ سے مرکب ہوتے ہیں ان میں نہ فعولن ہے نہ فعلن۔ رباعی کے فروعِ عشرہ یہ ہیں:۔

مفاعیلن[1] سالم مفاعلن[2] مقبوض مفاعیل[3] مکفوف مفعولن[4] اخرم مفعول[5] اخرب مفاعلن[6] اشتر فعول[7] ازل فعول[8] مجبوب فاع[9] ازل مخنق فع[10] مجبوب مخنق۔ انھی ارکانِ عشرہ کی تاخیر و تقدیم سے چوبیس وزن رباعی کے بنتے ہیں۔

منشی مولانا سعداللہ مصنفِ "میزان الافکار شرح معیار الاشعار" اپنے رسالۂ رباعی میں لکھتے ہیں :-

"اما آنچہ سیفی در عروض خود از بعض عروضیاں نقل کردہ کہ اوزانِ رباعی تا بدہ ہزار می رسد مقصود قائلش نہ ایں وزن ہاست کہ از اختلاط اوزان بست و چہار گانہ آوردہ شد۔ بل ازاں دیگر خارج از بست و چہار گانہ و اختلاط آں ہا لہذا گفتہ ازاں جملہ ایں ست۔ مفعول مفاعلن فعولن فعلن۔ و ظاہر است کہ ایں وزن در اوزان مسطورہ داخل نیست اما چوں ایں قولش مخالف تصریحات اہلِ فن ست کہ اوزانِ بسیطۂ رباعی را منحصر در بست و چہار داشتہ اند اعتبار را نشاید وکیف لا کہ نزد شاں فعلن در عروض رباعی واقع نمی شود بل فعلن و فعولن ہر دو از ارکان رباعی مطلقاً نیستند۔"

"مقیاس الاشعار" میں مرزا اوجؔ لکھنوی نے تفصیل سے لکھ دیا ہے :-

"اہلِ فن نے رباعی کو چوبیس وزنوں میں منحصر رکھا ہے۔ لیکن بعض ناواقفوں نے اپنے عدمِ وقوف کی جہت سے چند اوزانِ رباعی اور بھی نکالے ہیں ان میں سے ایک وزن مفعول مفاعلن فعولن فعلن ہے۔ چناں چہ وہ اس مصرع کی (کیا کیا نہ فلک نے خاک چھانی میری) اسی وزن پر تقطیع کرتے ہیں حالاں کہ ان کی یہ صریح غلطی ہے اس مصرع کا وزن (مفعول مفاعلن مفاعیلن فع) ہے انھوں نے بہ وجہ ناواقفی ایک سبب کم کر کے مفاعیلن کو فعولن بنایا اور اس سبب کو فع سے ملا کر فعلن کر لیا اور یہ نہ خیال کیا کہ رباعی میں فعولن اور فعلن کہیں نہیں آیا۔ بلکہ فعولن فعلن پر کیا حصر ہے کوئی رکن سوا دس ارکان مذکورہ بالا کے نہیں آسکتا۔ الغرض کوئی رباعی ایسی نہیں جو چوبیس اوزانِ مذکورہ بالا سے خارج ہو اور اگر ہو تو اس کو رباعی نہ کہنا چاہیے۔ کیوں کہ رباعی ان اوزان سے مخصوص ہے لیکن یہ اوزان رباعی سے مخصوص نہیں ہیں۔ بلکہ ان اوزان میں قطعہ وغیرہ بھی کہہ سکتے ہیں" صلہ ۲۲

فنِ عروض و قافیہ پر جو کتابیں متاخرینِ عروض نے لکھی ہیں ان میں "وطواط" کی "حدایق السحر" کا اکثر حوالہ ہے "حدایق السحر" ایک قدیم و مستند ماخذِ عروض ہے۔ مولانا امام بخش صہبائی مرحوم نے اپنے مبسوط رسالہ قافیہ "کافی در علمِ قوافی" میں لکھا ہے :-

"مستعملات را صاحب مجمع الصنائع و رشید الدین وطواط صاحب حدایق السحر و صفی الدین حبلی و عزیز الدین موصلی و جمع غفیر از فحول علما در صنائع بدیعی آوردہ اند"

مولانا غیاث الدین صاحب غیاث اللغات نے اپنے رسالۂ "معراج العروض" میں لکھا ہے :-

"لہذا از منہاج العروض کہ مستخرج است از رسالہ ضیاء الدین خزرجی و حدایق السحر رشید وطواط و معیار الاشعار خواجہ

نصیرالدین طوسی و رسالہ سلمان ساوجی و ہم حدائق البلاغت و عروض سیفی و حدائق العجم محمد بن القیس و رسالہ شمس الدین فقیر و تشریح الحروف وغیرہ مقدمات ضروری انتخاب نمودہ شد ۔"

اس کے بعد بھی کیا کوئی دیدہ ور نکتہ شناس یقین کرسکتا ہو کہ فاضلِ اجل استاد رشیدالدین وطواط اوزانِ رباعی میں فعولن فعلن لاسکتا ہو ۔ ہماری رائے ہو کہ یہ رسالہ کسی نا اہل ناواقف شخص کی تالیف ہو اور کسی کاتب نے اس پر رشید وطواط کا نام لکھ دیا ہو اس نام کی کوئی کتاب رشید وطواط کی نہیں اگر ہوتی تو اس کی تصانیف کے سلسلے میں اس کا نام بھی کہیں آتا خود رباعی بھی مہمل ہو ۔ مفعولن مفاعلن کی تقطیع کرنے سے تمام اوزانِ بحرِ ہزج کیوں کر نکل سکتے ہیں ہزج کے تقریباً ۸۰ وزن ہیں ۔

ہم اس مضمون کو اسی جگہ ختم کرتے ہیں ہماری رائے ہو کہ علامۂ محترم سید سلیمان صاحب ندوی نے کتاب اقسام البحور کو رشید وطواط کی تالیف قرار دینے میں اور خیام کی تصنیف میں جہاں تک علمِ عروض کا تعلق ہو حزم و احتیاط سے کام نہیں لیا ۔ ایک فاضل ادیب سے ہم کو یہ توقع نہ تھی ۔ فاعتبروا یا اولی الابصار ۔

علاوہ ازیں رباعی کا دوسرا مصرع " (این وزن بہر بدیہہ درکار آید) ناموزوں بھی ہو تقطیع اس وزن مفعول بہر بدی مفتعلن ۰ درکار امفاعیلن یدفع بہر بدی کو خواہ مفتعلن کے وزن پہ لیجیے خواہ مستفعلن کے وزن پر مگر وہ وزن رباعی کا نہ ہوگا اور بہر کو بوزن بہ ہر بہ حرکت یا وہا و سکون را بہ معنی ہمہ پڑھا جائے تو وزنِ عروضی تو درست ہوگا لیکن مصرع مہمل ہوجائے گا اور اس سے یہ مفہوم ادا نہ ہوسکے گا کہ رباعی کا اصلی استعمال بدیہہ گوئی کے موقع پر تھا ۔

طربیۂ خداوندی

دانتے کی مشہورِ عالم کتاب " ڈیوائنا کامیڈیا " کا سلیس اور با محاورہ اردو ترجمہ اصل اطالوی زبان سے جس میں مصنف نے دوزخ و جنّت کا خیالی نقشہ کھینچا ہو ، اور ان کے مختلف طبقوں میں جس قسم کے لوگ ہیں ان کا ذکر کیا ہو ۔ بہت ہی دل چسپ کتاب ہو ۔ اور خاص بات یہ ہو کہ دانتے باوجودے کہ عیسائی تھا اس کا جنّت و دوزخ کا تخیل اسلامی تخیل سے زیادہ قریب ہو اور اعراف کا بیان بھی جو عیسائی تخیل میں موجود نہیں ہو ۔ حصّہ اوّل (دوزخ) قیمت مجلّد للعہ ، غیر مجلّد سے ،

ممالکِ متحدہ آگرہ و اودھ میں اُردو

داستان گو۔ داستان گوئی۔ اس کا مستقبل

(از جناب حیات اللہ صاحب انصاری)

آج کل، جب کہ سنیما اور ریڈیو نے رنگیں سین سینریوں، بھڑکیلے لباسوں اور جگمگاتے تاج و تخت والی تھیٹر کی کمپنیوں کو فنا کے گھاٹ اُتار دیا ہے، اگر میں کہوں کہ داستان گوئی اور داستان گو کا وجود باقی ہے تو پڑھنے والوں کو یقین نہ آئے گا۔ داستان گوئی کو تو ناقدری کا شکار ہوئے دس بیس نہیں، کم و بیش پچاس برس کا زمانہ گزر چکا۔ اس فن کے آخری نام لیوا میر باقر علی دہلوی تھے۔ انھوں نے کسی نہ کسی طرح زمانے کی ناقدری کا مقابلہ کر لیا لیکن ان کے بعد پھر ان کا جانشین کوئی نہیں ہوا۔ لکھنؤ میں یہ فن ان سے پہلے مٹ چکا تھا۔ ایک آدھ غیر مستند داستان گو جو زندہ تھے وہ قبر سے پہلے گمنامی میں دفن ہو چکے تھے۔ ایک طرف تھیٹر اس فن کو ماند کر رہا تھا، تو دوسری طرف چھاپے خانے 'طلسم ہوش ربا'، 'بوستانِ خیال' اور ناولوں پر ناولیں چھاپتے چلے جاتے تھے۔ شوقین ان کو خود بھی پڑھتے تھے اور دوسروں سے پڑھوا کر سنتے بھی تھے۔ پھر وہ اگلی صحبتیں بھی باقی نہ رہی تھیں کہ مسند پر رئیس اور اس کے دوست احباب نیم دراز ہیں۔ مصاحبین جمع ہیں، پیچوان لگے ہوئے ہیں، جھاڑ اور فانوس جگمگا رہے ہیں اور داستان گو اپنی زبان سے سلطنتوں کے عروج و زوال، طلسم ہوش ربا کی معرکہ آرائیوں اور شیخ چلی کی حماقتوں کی تصویریں بناتا چلا جا رہا ہے۔ کہیں کوئی فقرہ پسند آگیا تو رئیس نے دوشالہ نذر کر دیا۔ جاگیرداری دَور کی رونقیں ختم ہو چکی تھیں رئیسوں کے خزانے خالی تھے، اور وہ فرصت کے رات دن بھی نہ رہے تھے۔ بھلا داستان گوئی جیتی تو کس آب و ہوا میں جیتی۔

لیکن نہیں۔ آج ۱۹۴۵ء میں بھی داستان گوئی زندہ ہے۔ اور سنیما اور ریڈیو کے پہلو بہ پہلو وہ بھی اپنا کارخانہ چلاتی

یکن اسباب نے اس کا ساتھ دیا ہے، اور آیندہ اس کی زندگی کی کتنی امید ہے، اس پر بحث کرنے سے پہلے مناسب
ی کہ داستان گو سے پڑھنے والوں کا تعارف کرادیا جائے۔ کیوں کہ یہ اشتیاق کہ آخر وہ کیا جادو کرتا ہے جو بھری محفل
گھنٹوں اپنی طرف متوجہ رکھتا ہے اور کسی اور بات کے سُننے کی مہلت نہیں دیتا ہے۔

اہر اکتوبر ۱۹۴۴ء کی رات ہے۔ فیض آباد کے ایک کالج کے ہال میں، سامنے اسٹیج پر، داستان گو ایک کرسی پر
بیٹھا ہوا ہے۔ پچاس سے کچھ اوپر سن، ساڑھے پانچ فٹ کے لگ بھگ قد، چھریرا بدن، سانولا رنگ، پچکے گال، چند
دانت ٹوٹے ہوئے، چہرے پر زندگی کی سخت کش مکش کے بنائے ہوئے خطوط، نہ آنکھوں میں کوئی خاص رونق،
اور نہ آواز میں کوئی خاص جھنکار۔ نیکر، آدھی آستین کی قمیص اور واسکٹ پہنے ہوئے۔ تینوں کے تینوں سیاہ رنگ
کی۔ واسکٹ میں ہار کی طرح بہت سے رپہلے تمغے لٹکتے ہوئے۔ ہاتھ میں ایک ڈیڑھ فٹ کا ڈنڈا۔ یہ ہے داستان گو۔

اب سُنیے اس کا ساز و سامان۔ اس کی کرسی کے برابر تین معمولی گویّے ڈھولک لیے بیٹھے ہیں۔ داستان گو
نے خبر دے دی ہے کہ اس کی داستان کئی ٹکڑوں میں بیان ہوگی۔ ہر ٹکڑے کے بیچ میں پانچ چھ منٹ کا وقفہ ہوگا۔
اسی وقفے میں تماشائی گانا سُنیں گے۔

داستان گو کے تماشائی ڈھائی تین سو کے قریب ہیں۔ ان میں کالج کے پروفیسر اور اُردو ہندی اسکولوں کے
مدرسین ہیں جو اسی کالج میں تعلیم پاتے ہیں۔ یہ مدرسین بیس سال سے لے کر پچاس برس تک کے سن کے ہیں۔ سینما
اور نوٹنکی دیکھتے رہتے ہیں۔

داستان سے پہلے گانا شروع ہوتا ہے۔ دس منٹ تک گانا ہوتا ہے۔ پھر داستان گو سیٹی بجاتا ہے۔ گانا بند ہوجاتا
ہے۔ تماشائیوں کی آنکھیں گانے والوں سے اس کی طرف گھوم جاتی ہیں۔ داستان گو کھڑا ہوجاتا ہے۔ اور یوں شروع کرتا ہے

یہاں نہ پردا ہے اور نہ اسکرین۔ نہ تھیٹر ہے اور نہ سینما۔ ایک سیدھا سادھا قصّہ ہے جو میں آپ سے بیان کروں گا
یہ ریاست کشمیر کا ایک سچّا واقعہ ہے .... داستان کے چار حصّے ہیں، پہلا کچھ زیادہ دل چسپ نہیں ہے۔ دو
اس سے زیادہ دل چسپ ہے اور ختم کے قریب تو قصّہ اتنا مزے دار ہے کہ اگر آپ لوگ تالیاں نہ بجائیں تو میرا ذمّہ۔

ریاست کشمیر کا ایک راجا تھا جس کا نام چندر سین تھا۔ اس کو خدا نے سب کچھ دیا تھا سوائے اولاد کے یہاں
پہنچ کر داستان رُک جاتی ہے اور ایک چھوٹی سی تقریر ہوتی ہے کہ یہ بھی مالک کی عجیب دین ہے کہ جس کے پاس پیسہ ہے ...

گھر اولاد نہیں۔ اور جو بچارے پیسے پیسے کو محتاج ہیں ان کے گھر اولاد کا جو سلسلہ چلتا ہی تو ٹوٹنے کا نام نہیں لیتا۔ دور کیوں جائیے اپنے پڑوس کے راجا... کو دیکھ لیجیے۔ بچارے بے اولاد کے ہیں۔

داستان گو نے کثرتِ اولاد کی تصویر ایسی کھینچی کہ تماشائی کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ اس تقریر نے تکلف کا وہ حجاب جو داستان گو اور تماشائیوں کے بیچ میں دونوں کے ایک دوسرے سے اجنبی ہونے کی وجہ سے حائل تھا توڑ دیا۔ اس کے علاوہ روزمرہ کی زندگی اور پڑوس کے راجا کی مثالوں نے داستان کو واقعیت سے قریب کر دیا۔ اور تماشائیوں کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ داستان گو خیالی داستان نہیں، بلکہ واقعہ بیان کر رہا ہی۔

داستان شروع ہو گئی۔ عشق و محبت کی کشمکش شامل ہوئی۔ راجا کے لے پالک بیٹے نے عشق میں اندھے ہو کر اپنے منھ بولے باپ کے ساتھ غداری کی اس کو مع اس کی دونوں بیویوں کے قتل کرا دیا۔ لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ اس کے دونوں دودھ پیتے بچوں کو لے کر دائیاں بھاگ گئیں۔ ان بچوں نے الگ الگ پرورش پائی۔ ایک جنگل کے ایک سردار کا منھ بولا بیٹا تھا اور دوسرا ڈاکوؤں کے سردار کے گھر پل کر ڈاکو بنا۔ دونوں ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔ پھر اتفاقات اور حُسنِ اتفاقات نے ایسے پلٹے کھائے کہ بڑا راج کمار اپنے پتا کے قاتل اور اس کے غدار منھ بولے بیٹے کی فوج کا افسر بنا۔ پھر اپنے بھائی کو جو لاعلمی کی حالت میں ڈاکو بنا ڈاکا ڈالتا پھرتا تھا، گرفتار کر لایا۔ دربار میں ڈاکو کا مقدمہ پیش ہوا۔ غاصب راجا نے راج کمار کو ایک مصلحت سے تھوڑی دیر کے لیے تخت پر بٹھایا اور ڈاکو کے مقدمے کا فیصلہ کرنے کا حکم دیا۔ اسی دربار میں یہ بھید کھلا کہ یہ دونوں لڑکے مقتول راجا کے بیٹے ہیں۔ فوج اور رعایا میں راج کمار پہلے ہی سے بہت ہر دل عزیز تھا۔ یہ خبر سُن کر سب اسی کے ساتھ ہو گئے۔ غداروں کو سزا ملی اور حق داروں کو تخت۔

غدار لے پالک کا عشق کا جنون، راجا اور رانیوں کا قتل۔ کھلائیوں کی وفاداری۔ بڑے راج کمار کی بہادری حُسنِ اتفاقات کی کارستانیاں اور آخر میں داستان کا نقطۂ عروج یعنی دربار کا سین یہ سب چیزیں داستان کے کامیاب عناصر تھے۔ اور ایسا ہی جیسا کہ داستان گو نے کہا تھا۔ یعنی نقطۂ عروج پر، جہاں ایک راج کمار نے دوسرے کو پہچانا ہی۔ تماشائیوں نے داستان گو کی فرمائش بے اختیار پوری کی یعنی تالیاں بجا دیں۔

تماشائیوں کے جذبات ڈھائی گھنٹے تک داستان کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ حرکت کرتے رہے تھے۔ کہیں تو تماشائی کھل کھلا کر ہنس پڑتے تھے اور کہیں شدتِ اشتیاق سے بُت بن جاتے تھے۔ کہیں سکون بخش مسرت سے مُسکرانے لگتے

تو کہیں آب دیدہ ہو جاتے۔ داستان کے بیچ میں کامک کے طور پر دس منٹ کا ایک چٹکلا بھی آیا تھا۔ چٹکلا بھی اچھا تھا اور جس موقع و محل پر آیا تھا وہاں نگینے کی طرح جم گیا تھا۔ جب داستان ختم ہوئی ہو تو تماشائی سیر تھے۔ نہ تو انھیں یہ حسرت رہ گئی تھی کہ داستان ابھی اور چلتی اور نہ یہ کوفت کہ مزا نہ آیا۔

اب زرا داستان گوئی کی ٹکنیک پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ داستاں گو نے وقائع نگار کے انداز میں داستان شروع کی تھی۔ یہ کہہ کر کہ یہ ایک سچا واقعہ ہو۔ اور پھر اس انداز کو برقرار رکھنے کے لیے اسی قسم کے فقرے استعمال کرتا جاتا تھا۔

"لکھا ہو کہ پانچ قطرے آنسوؤں کے کھلائی کے چہرے پر گرے ...."

"لکھا ہو کہ ایسا رَن پڑا کہ ......"

داستان، داستان تھی۔ یعنی اس میں افسانے اور ناول کی طرح ایسی جزئی اور روزمرہ کی زندگی کی باتیں نہ تھیں جو قدم قدم پر یاد دلائی جاتیں یہ اس قصّے کی دُنیا بھی ہماری دُنیا ہو اور کردار بھی یہیں کے آدمی۔ جب تک داستان کے سُننے والے کے دل سے یہ بات دُور نہ ہو جائے کہ کہنے والا محض ہوائی قلعے بنا رہا ہو، داستان میں زور نہیں آسکتا ہو۔ یہ بات داستان گو نے مذکورہ بالا فقروں کی مدد سے پیدا کی تھی، یا پھر کئی جگہ یہ بتا کر کہ یہ اورنگ زیب کی حکومت کا زمانہ تھا۔ اور ایسے ایسے تاریخی حالات تھے۔

داستان گو کا جو وقائع نگاری کا انداز تھا وہ خشک رپورٹر کا انداز نہ تھا۔ بلکہ ایسے وقائع نگار کا تھا جس نے حالات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہو۔ اشخاصِ واقعہ سے ملا ہو۔ ان کے خیالات و جذبات تک کو محسوس کیا ہو۔

داستان گو محض وقائع نگار یا راوی ہی نہیں تھا۔ وہ ایکٹر بھی تھا۔ حسین راج کماری کی مصیبتیں بیان کرتے کرتے، اک دم سے واسکٹ کی جیب سے ایک جگ مگاتی ہوئی چھری نکال لیتا اور راج کماری کا پارٹ ادا کرنے لگتا کہ کس طرح وہ خودکشی کے لیے آمادہ ہوگئی اور پھر اس نے اپنی ایک سہیلی سے کیسے باتیں کیں۔ میدانِ جنگ کا حال بیان کرتے کرتے وہ تلوار کھینچ لیتا (داستان گو کے ہاتھ میں جو ڈنڈا تھا وہ دراصل گپتی تھی۔ اسی کو نکال کر وہ میان سے تلوار نکال لینے کا اثر پیدا کرتا تھا) کہیں کہیں کسی کردار کا پارٹ ادا کرنے میں رونے بھی لگتا تھا۔ تو کبھی غصّے میں آجاتا اور اس کے چہرے کا رنگ بدل جاتا۔

داستان گو کی ان دو حیثیتوں کے علاوہ ایک تیسری حیثیت بھی تھی۔ وہ تھی ایک معمولی سوجھ بوجھ والے تماشائی کی۔

وقائع نگار اور ایکٹر کی بلندی سے وہ اک دم سے تماشائی بن کر اپنے کرداروں یا واقعات پر کوئی ایسا جملہ کس دیتا تھا جو داستان میں شہاب ثاقب کی طرح چمک جاتا تھا۔ یہ بات مثال کے بغیر واضح نہیں ہوسکتی ہے۔ داستان میں ایک جگہ راج کمار کو خطرہ ہے کہ دشمن شب کو مجھے قتل کرنے آئے گا۔ داستان گو راوی کی طرح اس خطرے کو بیان کرتا ہے۔ پھر کہتا ہے کہ راج کمار نے اپنے گھوڑے کو بلایا اور اس سے کہا

"اے میرے یار وفادار . . . ."

گھوڑے سے خطاب کرتے وقت داستان گو ایکٹر بن کر راج کمار کا پارٹ ادا کرتا ہے۔ اور گھوڑے سے کہتا ہے کہ تو میرے خیمے کی حفاظت کر۔ اب گھوڑے نے کیا کیا۔ یہ پہلو داستان گو نہ وقائع نگار بن کر کہتا ہے اور نہ ایکٹر۔ بلکہ ایک سادہ مزاج دہاتی تماشائی بن کر، جو ساری زندگی گھوڑے کو بیل کی طرح کا بے وقوف جانور سمجھتا رہا ہے۔ جب وہ راج کمار کو گھوڑے سے بات چیت کرتے دیکھ رہا تھا تو اسے ذرا امید نہیں تھی کہ گھوڑا اُسے سمجھے گا۔ نہ کہ یہ کہ وہ اس پر عمل بھی کرے گا۔ لیکن جب وہ گھوڑے کو عمل کرتے دیکھتا ہے تو حیرت زدہ ہوجاتا ہے، اور خوش بھی ہوتا ہے کہ اس طرح راج کمار کی جان بچ گئی۔ داستان گو اس جگہ صرف ایک فقرہ دہاتی لہجے میں کہتا ہے اور اسی میں تماشائی کا کردار، مزاج اور خیال سب کچھ آجاتا ہے۔

"ارے۔ او گھوڑا تو خیمے کی ٹٹی بن گوا۔"

داستان سُننے والے اس فقرے پر کھل کھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔ اگر ایسی معمولی تماشائی ذہنیت سے اس واقعے کو نہ دیکھا جاتا تو گھوڑے کی سمجھ داری اور وفاداری میں اتنا اثر نہ پیدا ہوتا۔

لکھنؤ کے پُرانے داستان گو قصّے کے ڈرامائی پن کی طرف جتنی توجہ دیتے تھے اتنی ہی بلکہ اکثر اس سے زیادہ باغوں محلوں اور درباروں کے بیان کی طرف توجہ دیتے تھے۔ زبان کو شگفتہ بنانے کے لیے کہیں کہیں اسے مقفّیٰ اور مسجّع بھی بناتے رہتے تھے۔ ضلع جگت کا بھی خیال رکھتے تھے۔ داستان میں شعر و شاعری اور غزل خوانی بھی ہوتی رہتی تھی ان باتوں سے داستان گو کی قادرالکلامی تو ثابت ہوجاتی تھی مگر داستان کا اصل زور گھٹ جاتا تھا۔ لیکن لوگوں کو یہ کمی محسوس تک نہ ہوتی تھی۔ کیوں کہ تب نہ ناولیں تھیں نہ سینما اور تھیٹر اور نہ طلسم ہوش ربا کی چھپی ہوئی جلدیں۔ لوگوں کا ذوق بہت معمولی تھا۔ واقعے میں ذرا سی بھی تیزی ہو، سُننے والے متاثر ہوجاتے تھے۔ لیکن اب زمانہ بدل چکا ہے۔ اگر پُرانے داستان گو اب پھر زندہ ہوجائیں اور اسی ڈھنگ پر داستان کہیں تو لوگ سُنتے سنتے سوجائیں۔ لیکن داستان گو مذکورہ

نے اپنی ٹکنیک کو زمانے کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ اس کے بیان میں کہیں بے جا طول نہیں تھا۔ اور نہ بے جا اظہارِ قادر الکلامی۔ اس کی داستان کا زور اصل کرداروں پر رہتا ہے۔

داستان گو مذکور نے زمانے کے مطابق نئی داستانیں بھی تیار کی ہیں۔ مثلاً بہرام کی بیٹی۔ اور موجودہ زمانے کے چٹکلے بھی اس کو آتے تھے۔

اب ذرا فنی حیثیت سے داستان گو کی داستان اور ٹکنیک پر نظر ڈال لیجیے :۔

داستان کا قصہ جس طرز کا تھا اور جس رفتار سے چلا ہے وہ ایسی پامال چیزیں ہیں کہ اب سُننے والوں کے لیے ان میں کوئی خاص بات رہ نہیں گئی ہے۔ اب لوگوں کے مزاج میں زیادہ سنجیدگی پیدا ہوگئی ہے۔ اسی وجہ سے شیخ چلی کے لطیفوں اور نکاتِ بیربل کی کوئی قدر نہیں رہی۔ لوگ ایسی باتیں سُننا چاہتے ہیں جو زندگی کے اصل حالات سے ملتی جلتی نہ ہوں تو کم از کم قریب تو ہوں وہ چاہتے ہیں کہ قصے کے کردار بھی انھی مسئلوں میں اُلجھیں جن میں خود اُلجھے ہوئے ہیں، اور پھر مسئلوں کا اس طرح مقابلہ کریں جیسے مقابلے کی ان کے دل میں تمنا ہے۔ لوگوں کے مزاجوں میں رومان کی بھوک ہے ضرور، مگر ایسی نہیں جو حقیقت کو بالکل فراموش کر دے۔ مذکورہ داستان کے قصے میں محض رومان ہی رومان تھا اس لیے سُننے والے کہیں بھی پوری طرح سنجیدہ نہیں ہوئے۔ یعنی قصے کو اپنا بیتا ہوا واقعہ سمجھنے پر ان کا دل آمادہ نہیں ہوا۔ اس وجہ سے جیسا چاہیے ویسا متاثر بھی نہیں ہوئے۔

داستان گو نے سنجیدہ لوگوں کو خوش کرنے کے لیے جابجا چھوٹی موٹی نصیحتیں اور تقریریں بھی شامل کر دی تھیں اور اس کا فائدہ بھی ہوا تھا یعنی سنجیدہ لوگوں کی توجہ اُکھڑنے نہیں پائی۔ لیکن پھر بھی اصل داستان دماغ کی گہرائی میں نہیں اُتر سکی۔

داستان گو کو کردار نگاری میں کوئی دخل نہیں تھا۔ اس کے سب کردار ایک سے تھے، یعنی بے جان حرکات و سکنات کے پُتلے۔ فرق صرف یہ تھا کہ کسی سے اچھی حرکتیں سرزد ہوتی تھیں اور کسی سے بُری۔ اسی طرح داستان گو میں جزئیات نگاری بھی نہ تھی۔ وہ مردوں اور عورتوں کے حرکات و سکنات میں فرق نہیں پیدا کر سکا۔ رنج و خوشی، غصہ و جوش کسی جذبے کی تصویرکشی میں کسی ایسے جزیے کی طرف اشارہ نہ کر سکا جس سے ہم جذبے کو اپنے میں محسوس کر سکتے۔ اس نے جو تصویر بھی بنائی موٹے خطوں سے بنائی۔

ان عیوب کی وجہ یہ ہے کہ داستان گو زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا اس کے قصے گوئی کی بنیاد صرف دو باتوں پر تھی۔ ایک تو یہ کہ وہ قصے سے خود متاثر ہو جاتا تھا۔ جس سے ایسی فضا پیدا ہو جاتی تھی جو اس قصے کے لیے بہت موزوں ہوتی

تھی۔ اور دُوسری بات یہ کہ وہ سُننے والوں کا رُخ دیکھ لیتا تھا، اور اسی کے موافق قصّے کو سنبھالتا چلتا تھا۔

داستان گو کی زبان بھی قابلِ تعریف نہ تھی۔ زبان میں روانی تھی لیکن منجھی ہوئی نہ تھی۔ اسے مطلب کے ادا کرنے پر عبور تھا لیکن شاعرانہ پن یک سر ناپید تھا۔

داستان گو کی یہ جدّت قابلِ تعریف ہو کہ وہ اثرات پیدا کرنے کے لیے اپنے ساتھ چھُری اور گُپتی بھی لاتا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر ایسا سامان زیادہ ہوتا تو دیکھنے والوں کو تکمیل کے بجائے کمی کا احساس ہونے لگتا۔ کیوں کہ پھر داستان ڈرامے کی سرحد میں داخل ہوجاتی۔ اور وہاں پہنچتے ہی سب سے بڑی کمی یہ نظر آتی کہ اس میں ایکٹرس نہیں ہو۔ اور پھر تو ہر طرف کمی ہی کمی نظر آتی۔ لیکن اس پر بھی ایسا ممکن ہو کہ داستان داستان ہی رہے اور اس میں اور اثر پیدا کرنے والی چیزیں بڑھا دی جائیں۔ مثلاً چمک دار ٹوپی تاج کے لیے۔ ایک پھول دار گملا باغ کے لیے۔ یہ ایسے اشارے ہیں جو داستان کو ڈرامے میں داخل نہیں کریں گے۔

داستان گو کہیں کہیں گاتا بھی تھا۔ لیکن یہ گانا بہت معمولی تھا۔ اگر اس کے بجائے ایسا ہوتا کہ اس کے ساتھ کے گویے اچھے ہوتے۔ اور جب گانے کی ضرورت ہوتی تب وہ گانے لگتے تو داستان کا لُطف بڑھ جاتا۔

داستان گو کا لباس بھی ترمیم طلب ہو۔ بظاہر اس نے نیکر اور آدھی آستین کی قمیص اسی لیے پہنی تھی تاکہ وہ "اپ ٹوڈیٹ" نظر آئے۔ وہ "اپ ٹوڈیٹ" تو نظر آیا لیکن اس کی شخصیت سے وہ لوچ رخصت ہوگیا جو داستان گو میں ہونا چاہیے اب بازی گر معلوم ہوتا تھا۔ اگر داستان گو شیروانی یا صرف کُرتا پہنے ہوتا تو اس کی شخصیت داستان کا جُز بن جاتی۔

داستان ختم ہونے کے بعد مَیں سوچنے لگا کہ اگر داستان ان کمزوریوں سے خالی ہوتی، اگر اس کا ساز و سامان ذرا بہتر ہوتا۔ ساتھ کے گانے والے بھی اچھے ہوتے تب داستان کیسا اثر کرتی۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ وہ اب سے سوگنا زیادہ اثر کرتی۔ محفل کے بعد داستان دماغ میں گونجتی رہتی پھر زندگی بھر موقع موقع پر یاد آتی۔ اکثر صحبتوں میں اس کے ٹکڑے بیان ہوتے۔ اور جو اثر داستان سے مرتّب ہوا تھا وہ خیالات پر اور خیالات سے پھر عمل پر اثرانداز ہوتا رہتا۔ مختصر یہ کہ داستان وہی کام کرتی جو کوئی عمدہ ناول، نظم یا ڈراما کرسکتا ہو۔

داستان گوئی دراصل ایک ایسا فن ہو جس کی مستقل حیثیت ہو۔ سینما نے رنگین پردوں والے تھیٹر کو ختم

کردیا، لیکن اصل تھیٹر اب زندہ ہو رہا ہے اور زندہ ہو کر رہے گا۔ کیوں کہ تھیٹر کے آرٹ کے عناصر سنیما سے مختلف ہیں۔ اسی طرح سنیما اور تھیٹر کے ہوتے ہوئے ریڈیائی ڈرامے زندہ ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ داستان گوئی ختم ہو جائے اور آگے ترقی نہ کر سکے۔

اگر آج کوئی جرمنی یا جاپان کی جنگ کا چشم دید حال بیان کرنے لگتا ہے تو ہم کتابیں اخبار اور فلموں کے ہوتے ہوئے بھی اس کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ وہ شخص اپنے ذاتی تاثرات بیان کرتا ہے جو ہمیشہ قابلِ قدر ہوتے ہیں۔ یہی حیثیت داستان گو کی ہے۔ وہ ایک عمدہ ناول بیان کرتا ہے، یا کسی جنگ کے حالات بیان کرتا ہے، ان میں واقعیت بھی ہوتی ہے اور ساتھ ساتھ داستان گو کے ذاتی تاثرات بھی۔

اگر آج اچھے داستان گو کا وجود ہوتا تو وہ رپورٹروں کی رپوٹیں اور سیاحوں کے چشم دید حالات سُن کر اگر بیان کرتا تو ان لوگوں سے بہتر بیان کرتا کیوں کہ ان کی باتیں سُننے کے بعد وہ ان کی جذباتی اور تجرباتی گہرائی محسوس کر لیتا۔ اور چوں کہ اس کے مزاج میں ادبیت ان لوگوں سے زیادہ ہے، اس لیے اس کا بیان بہتر ہوتا۔

داستان گوئی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ داستان گو میں اور سُننے والوں میں ایک قریبی رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ اس رشتے میں نہ مشین کا واسطہ ہوتا ہے اور نہ رسمی تکلفات کا۔ یہ نعمت ریڈیو اور سنیما میں تو قطعی نہیں ہوتی تھیٹر میں ہوتی ہے، مگر وہاں رسمی تکلفات کا ایک قدرتی حجاب حائل ہوتا ہے۔ گویا ہم میں اور اسٹیج پر چلنے پھرنے والوں کے درمیان میں تکلفات کی وہ دوری ہوتی ہے گویا سمندر حائل ہیں۔ لیکن داستان گو تماشائیوں سے گھل مل کر بات چیت کرتا ہے۔ تماشائی اس سے بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ اس رشتے سے دونوں ایک دوسرے کو سمجھ لیتے ہیں۔ ایسی حالت میں داستان گو اپنی داستان کا رُخ تماشائیوں کے ذوق کو دیکھ کر گھماتا رہتا ہے۔

داستان سُن کر مجھے وہ دن دیکھنے کی آرزو پیدا ہو گئی ہے جب، جس طرح آج مشاعرے ہوتے ہیں اسی طرح داستان گوئی کی محفلیں منعقد ہوں۔ جہاں سنجیدہ، زندگی کے مسائل سے تعلق رکھنے والی داستانیں بیان ہوں۔ اگر کوئی بحث آجائے تو کچھ اس پر بھی روشنی پڑ جائے۔ جیسا کہ ناولوں میں ہوتا ہے۔ جب اس فن میں ایسے جمالیاتی عناصر موجود ہیں جو اسی حالت میں ناول، اسٹیج، اسکرین اور ریڈیو میں نہیں پائے جاتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ فن گم نامی میں پڑ کر مر جائے۔

داستان گوئی اور اُردوٗ

مذکورہ بالا داستان گو ضلع فیض آباد کا رہنے والا ہی۔ بیس سال سے یہ پیشہ کر رہا ہی۔ ہندُستان میں برابر گھومتا رہتا ہی۔ دُور دراز مقاموں پر جاتا ہی۔ اس کی صحبت میں ہندوٗ اور مسلمان سب شریک ہوتے ہیں۔ اس کی کوشش یہ ہوتی ہی کہ سب میری داستان سے لطف اندوز ہوں۔ خوش ہونے کی جگہ خوش ہوں۔ رنجیدہ ہونے کی جگہ رنجیدہ ہوں۔ اس لیے اس کو ایسی زبان بولنا پڑتی ہی جو ہر شخص سمجھ لے۔ ہندوٗ بھی اور مسلمان بھی۔ اور وہ بولتا بھی ایسی ہی زبان ہی۔ یعنی آسان اُردوٗ۔

جوامع الحکایات

محمّد عوفی کی مشہور فارسی کتاب کا اُردوٗ ترجمہ از مسٹر اختر شیرانی۔ ان حکایات سے قرونِ وسطا کی اسلامی حکومتوں اور دیگر مشرقی ملکوں کے تمدنی اور تاریخی حالات کا دِلچسپ مواد ملتا ہی۔ اصل کتاب تقریبًا ناپید تھی، اب اُردوٗ میں اس کا ترجمہ انجمن نے شائع کرکے ایک اہم ادبی کوشش کو زندہ کیا ہی۔ قیمت جلد اوّل مجلّد ہے غیر مجلّد عہ، حصّہ دوم مجلّد للعہ، غیر مجلّد سے،

الف لیلہ

مشہور عالم عربی داستان الف لیلہ و لیلہ کا ترجمہ دُنیا کی تقریبًا تمام زبانوں میں ہوچکا ہی مگر اُردوٗ کا ترجمہ براہِ راست عربی سے کوئی موجود نہ تھا۔ مروّجہ تراجم انگریزی تراجم کے توسط سے اُردوٗ میں آئے تھے۔ انجمن نے اصل عربی سے ترجمہ کراکے شائع کیا ہی۔ پروفیسر منصوٗر احمد مرحوم نے ترجمے میں بڑی کاوش کی ہی مگر افسوس ہی کہ وہ اس کی صرف پہلی دو جلدوں کی اشاعت دیکھ سکے۔ اب اس کی چوتھی جِلد شائع ہوئی ہی اور بقیّہ دو جِلدیں بھی عنقریب شائع ہوں گی۔ قیمت جلد اوّل مجلّد ہے غیر مجلّد سے، جلد دوم مجلّد ہے غیر مجلّد سے، جلد سوم مجلّد صہ، غیر مجلّد للعہ، جلد چہارم مجلّد صہ، غیر مجلّد للعہ۔

منیجر انجمنِ ترقّیِ اُردوٗ (ہند) دہلی

تبصرے

ادبیات

عالمِ آشوب | جناب سیماب اکبرآبادی کی رباعیات کا تازہ مجموعہ جس میں "نفسیات جنگ عالم گیر اور واقعاتِ دورِ حاضرہ پر، تین سو سے زیادہ اشاراتی اور تاریخی رباعیاں" چھوٹی تقطیع کے ۴۲۸ صفحات پر، منقش گرد پوش میں مجلد شائع کی گئی ہیں۔ ہر صفحے میں سُرخ جدول اور بیل کے اندر ایک ایک رباعی بہت صاف وخوش خط چھپی ہے۔ کاغذ بھی عام نایابی کے باوجود اچھا لگایا گیا ہے۔ شروع میں سیماب صاحب کی عکسی تصویر زیبِ کتاب ہے اس تمام اہتمام کے باوصف قیمت سوا تین رُپے بہت ارزاں، بلکہ نفع خور ناشرین کے واسطے تنبیہ آمیز مثال کہی جاسکتی ہے۔

رباعیوں کے چند نمونے ذیل میں درج ہیں :- ؎

(۱) معمورِ غرض دین بھی ہے دُنیا بھی — معمول ریا و مکر ہے، دھوکا بھی
انسان ہی خطرے میں نہیں ہے اس وقت — خطرے میں ہے انسانیتِ کُبرا بھی

---

(۲) دُنیا کا یہ دَور انقلاباتی ہے — ہر چیز فنا ہوئی چلی جاتی ہے
آتے ہیں جو مغرب سے ہوا کے جھونکے — جلتے ہوے خوں کی چراند آتی ہے

ص ۳۶۷ ہاں جرمنی زور باندھ سکتا ہے ضرور — ہر ذرّہ جو مٹتا ہے چمکتا ہے ضرور
ہٹلر کا ہر اشتعال بامعنی ہے — بُجھتا ہے چراغ تو بھڑکتا ہے ضرور

اسی طرح برطانیہ اور اتحادیوں کی فتح اور جاپان کی بھی آخر میں شکست کی پیش گوئیاں کی گئی ہیں۔ آخری رباعی یہ ہے ؎

انسان بنا تھا عیش و عشرت کے لیے　　اور اب محتاج ہو مسرّت کے لیے
یہ چاند یہ سورج یہ زماں اور مکاں　　سب اس کے لیے ہیں جنگ و غارت کے لیے

ہندستان کے اہم واقعات اور نئی تحریکات پر بھی اپنے خاص طرز میں سیماب صاحب نے رائے زنی کی ہو اور مجموعی طور پر یہ رباعیاں خاصی تاریخی دل چسپی کا سامان رکھتی ہیں۔ اگر ذیلی حواشی میں فوائد یا تصریحات کا بھی اضافہ کردیا جائے تو غالبًا اور مفید ہوگا۔

سیماب صاحب کی شاعری میں کوئی خاص جدّت اور زور نہ سہی، ان کے اعتدال میں ضرور متانت و پختگی آگئی ہو۔ اور زبان کی خدمت وہ جیسے استقلال و انہماک سے انجام دیتے رہے ہیں، اس نے اب احسان کا مرتبہ اختیار کرلیا ہو۔　　(س - ۰)

لہو ترنگ

یہ اصطلاح حضرت اقبالؒ کی رنگین ایجادوں سے ہو: ؎

خونِ دل و جگر سے ہو سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہو غافل، نہ جل ترنگ!

دکن کے ایک نوجوان شاعر، سکندر علی صاحب وجدؔ نے اسی کو اپنے ہزار شعر کے مجموعے کی سرخی بنایا۔ دیباچے میں لکھتے ہیں ؎

کلام، تختۂ گُل ہائے رنگ رنگ بنا
ہزار شعر سے سازِ لہو ترنگ بنا

اسی نام کی مناسبت سے جلد اور گرد پوش کو ارغوانی رنگ دیا اور ایک جست کرتے ہوئے، مست ہرن کی (سفید) تصویر بنوائی ہو جس میں خونِ گرم کی جست و خیز کا اشارہ ہو۔

مجموعے میں اقبالؔ کی حکیمانہ شاعری کے اثرات جا بہ جا نظر آتے ہیں۔ سب سے اچھی نظموں میں ایک وہ ہو جس میں شاعرِ اسلام کو عقیدت کا خراج ادا کیا گیا ہو (ص ۳۹)۔ خودی، خدامست وغیرہ بعض الفاظ جن کو اقبالؔ نے اپنی ٹکسال میں ڈھالا اور نئی قدر و قیمت دے کر چلایا، وجدؔ صاحب کے ہاں سکۂ رائج کی طرح استعمال ہوئے ہیں۔ "بانگِ درا" کی تقلید میں ان کی کتاب کا آغاز بھی دُعا سے ہوتا ہو۔ اس کے پہلے دو شعر یہ ہیں ؎

اوجِ قبول ای مرے بندہ نواز دے
میری نوا میں گرمیٔ آہن گداز دے
طرزِ کہن سے سرد ہوئی محفلِ ادب
سازِ سخن کو نغمۂ جدّت طراز دے

اقبال کے ترانۂ وطن کی لَے میں ہی وجد صاحب نے ترانۂ دکن گایا ہی جس کی ٹیپ ہی : ۶

یہ ہی دکن ہمارا، پیارا وطن ہمارا

لیکن ان کی اقبال پسندی کی سب سے صالح دلیل اُن کی رجائیت، غیرت مندی اور جدّ و جہد کی تعلیم ہی۔ دو ایک نمونے ملاحظہ ہوں : ۷

وقت کی آواز

ای مردِ خدا اُٹھ، ہی یہ ہنگامِ تگ و تاز　　　جنگاہ کی بُنیاد ہلادے تری آواز
اس معرکۂ سخت میں تقلیدِ جنوں کر　　　بھٹکائے نہ تجھ کو خردِ تفرقہ پرداز
بےکار نہ جائے گی تری شعلہ نوائی　　　تدبیر سے ہوجائیں گے تقدیر کے در باز

. . . .　　　. . . . .

یہ کام نہیں لشکر و شمشیر و سناں کا　　　ہمت ہی جہاں گیر، جہاں سوز، جہاں ساز
مٹ جائے گی وہ قوم جو بیدار نہ ہوگی
کٹ جائے گا، جس ہاتھ میں تلوار نہ ہوگی

نہ کر

بلا سے جان چلی جائے عرضِ حال نہ کر　　　بجز خدا کے درِ غیر پر سوال نہ کر
تری حیات کا حسنِ عمل ہی پیمانہ　　　فقط شمارِ شب و روز و ماہ و سال نہ کر

. . . .　　　. . . . .

دلیلِ بے ہنری ہی شکایتِ دُنیا　　　کسی سے شکوۂ ناقدریٔ کمال نہ کر

وَجد صاحب کی شاعری میں جدید اشتراکی یا انقلابی خیالات کی جھلک بھی نظر آتی ہو - لیکن اس افراط و شدّت کے ساتھ نہیں، جس نے اہلِ ذوق کو "ترقی پسند" اور" ادب لطیف" کے ناموں تک سے بے مزا کردیا ہو - ذہانت و طبّاعی ہیں کم نہ ہونے کے باوصف، زبان اور خیال کے اعتدال میں وہ اکثر ہم چشموں سے بڑھے ہوئے ہیں اور یہ ان کی آیندہ ترقی کے حق میں سب سے اچھی فال ہو - مجموعے میں کہیں کہیں نومشقی کی لغزشیں پائی جاتی ہیں، جیسے:۶

سمندر جیسے ہنستا ہو حقارت سے جبالوں پر (ص۵۹)

جبل کی جمع الجمع بہ قاعدۂ ہندی بنائی ہو-

ایک ہی انجام ہو کم زور اور شہ زور کا
پیس کر دونو کو رکھ دیتا ہو کونا گور کا (ص۷۲)

س شعر میں گور کے کونے سے پیسنے کا کام لیا ہو-

اجنتا کی تعریف میں لکھتے ہیں: ۶

یہاں صدیوں سے رائج پُرسکوں شیریں مقالی ہو (ص۷۷)

شیریں مقالی کا رائج و پُرسکوں ہونا، جمع ضدین نہ سہی بے لطف تصنع ضرور ہو -

لیکن ایسے خفیف اسقام خال خال اور نظرانداز کرنے کے قابل ہیں - لائق مصنّف نظرثانی کے وقت آسانی سے انھیں دور کرسکتے ہیں - کتاب کے آخر میں ۴۰، ۵۰ غزلیں ہیں - یہ بھی حالی و اقبال کے جدید رنگ میں شاعر کے پاکیزہ مذاق کی گواہ ہیں - سرسری نظر میں چند اچھے شعر سامنے آئے، وہ ہدیۂ ناظرین ہیں: ۵

حریمِ شوق میں کچھ دل پہ انحصار نہیں — یہ وہ مقام ہو خود حُسن کو قرار نہیں
کھلائے غنچۂ گُل، غنچہ ہاے دل نہ کھلے — نسیم واقفِ طرزِ خرامِ یار نہیں
کمالِ حُسن ہو اس کا شباب کیا کہنا — جسے خود اپنی اداؤں پہ اختیار نہیں

تھوڑی سی خودی سے گرلے کام یہ دیوانہ — خود شمع پھرے آکر گردِ پرِ پروانہ

کس بِند کی حسرت نے مَے جام سے چھلکادی		کیوں دستِ حنائی میں تڑپا خطِ پیمانہ
بیمار نے رازِ دل سب نزع میں کہ ڈالا		تھی موت کی ایک ہچکی کُل عمر کا افسانہ

کتاب ایسی خوش خط اور صاف چھپی ہی کہ حیدرآباد کے مطابع شمالی ہند کے نامی چھاپے خانوں کی مطبوعات سے اس کا مقابلہ کرسکتے ہیں ۔ جنگ میں اچھا کاغذ اُڑ گیا ، پھر بھی یہ اتنا دبیز اور چکنا ہی کہ اہلِ تصنیف کو رشک پیدا ہوگا ۔ شاید اسی اہتمام کے عوض دس جُز کے مختصر مجموعے کی قیمت ، قسمِ اول ۶ر اور قسمِ دوم ۳ر رکھی گئی ہی ۔ کتاب خانہ انجمنِ ترقیٔ اُردو ، عابد روڈ ، حیدرآباد دکن سے طلب کی جائے ۔ (س ۔ ہ)

روسی ظرافت | از مسلم ضیائی صاحب ، اُردو محل ، معظم جاہی حیدرآباد دکن ۔ صفحات ۲۰۵ ، قیمت عہ ۔

مسلم ضیائی صاحب نے اس مجموعے میں بعض مشہور روسی مزاحیہ نگاروں کے عمدہ نمونے ترجمہ کرکے درج کردیے ہیں جس سے روسی مزاح نگاری کے معیار اور اسلوب کا اندازہ ہوسکتا ہی اور اس سلسلے میں دل چسپ بات یہ ہی کہ اَن مِل بےجوڑ باتوں کو ملانے سے جس طرح اور ملکوں میں لوگ ہنستے ہیں اُسی طرح روس میں بھی ، لیکن روس نے اس میں ایک قدم اور آگے بڑھاکر بالکل مجنونانہ اور مخبوط الحواسی کی گفتگو کو ذریعۂ تفریح بنایا ، اور اس طرزِ تحریر کے بعض بہت ہی مقبول و معروف مصنّف پیدا کیے ۔ ایسا اندازِ گفتگو جس میں جنون کا شائبہ پایا جاتا ہو ہنسنے کی جگہ ہم دردی کرنے اور اظہارِ تاسف کرنے کا موقع بہم پہنچاتا ہی لیکن روس میں گوگول ، نکولائی اس پنسکی ، گوربولوف جیسے مصنّفین نے اسی اندازِ تحریر سے روس میں شہرت و مقبولیتِ عام حاصل کی جس کی وجہ بہ ظاہر یہ معلوم ہوتی ہی کہ زار کے دورِ استبداد میں کسی شعبۂ حکومت پر سنجیدہ اعتراض دار و رسن کا مستحق بناتا تھا اس لیے جلے دِل کے پھپھولے جنون کا جامہ پہن کر پھوڑے جاتے تھے ، اور متذکرہ مصنّفین کی تحریروں میں ایسے اشارات کافی نظر آتے ہیں ۔ خصوصًا گوگول کی تحریروں میں جو مجنوں بن کر استبداد کی زنجیروں کو توڑنا چاہتا تھا ۔ روسی مزاح نگاری کے کئی نمونے اس کتاب میں اور پہلوؤں سے بھی دِل چسپ ہیں اور سیچ درن کا " عقاب " ، گوربونوف کا " تھانے میں " اور اسٹپ نیاک کا " پیسہ اور کسان " مزاح کے پردے میں اصلاح کی تحریک کے علم بردار ہیں اور موجودہ قدر

سے لفرت دلانے والے ہیں۔ طباعت وغیرہ اچھی ہی۔ (ر۔ع۔ہ)

زرد چہرے از ابراہیم جلیس، اُردو محل، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد دکن، صفحات ۱۹۵۔ قیمت عہ
ابراہیم جلیس کے پندرہ مختصر افسانوں کا یہ مجموعہ جس کا مقدمہ قاضی عبدالغفار صاحب نے لکھا ہی، تین عنوانوں کے ماتحت تقسیم ہی یعنی دعوا، تضاد، اور ترکیب۔ ان افسانوں میں سفید پوش غریب طبقے کے جذبات، احساسات اور تفکرات تحلیل تجربہ اور ترکیب کے نفسیاتی اعتبار سے نمایاں کیا گیا ہی۔ جو موجودہ معاشی حالات پر تیر و نشتر کے طنز بن کر حملہ کرتے ہیں، اور پڑھے لکھے طبقۂ اوسط کے لوگوں کی اقتصادی آشفتہ حالی کا مرثیہ دردناک اشارات میں سناتے ہیں۔ ہر افسانے میں زندگی کے ایک نئے کردار کو پیش کیا گیا ہی اور چوں کہ کرداروں کی تعداد بے شمار ہی اس لیے ایسی افسانہ نویسی کا میدان بھی بہت ہی وسیع ہی، بہ شرطے کہ کسی شخص میں کردار کا خاکہ مناسب الفاظ میں پیش کرنے کا سلیقہ ہو۔ زیرِ نظر افسانوں میں اس سلیقے کا بڑی حد تک اظہار ہوتا ہی اور امید ہی کہ یہ شوق سے پڑھے جائیں گے۔ (ر۔ع۔ہ)

تاریخ و سیاسیات

دکن کی سیاسی تاریخ "مصنفہ" مولانا سید ابوالاعلا صاحب مودودی۔ شائع کردہ دارالاشاعت سیاسیہ۔ اُردو گلی۔ حیدرآباد دکن۔

اصل میں یہ کتاب نواب نظام الملک آصف جاہِ اوّل بانیٔ خاندانِ آصفیہ کے حالات میں لکھی گئی ہی۔ پہلے باب میں جو بہت مختصر ہی، ان کے خاندان کا تذکرہ ہی۔ دوسرے کا عنوان ہی "عالم گیر کی وفات کے بعد" جس میں سلطنتِ مغلیہ کے اس دور کی تاریخ، محمد شاہ بادشاہ کے زمانے تک، دُہرائی گئی ہی۔ یہی کتاب کا سب سے طولانی حصہ ہی۔ آخری باب میں نواب نظام الملک کے دکن پر تسلط، اور دہلی کی وزارت کے حالات ہیں اور نادر شاہ کے دہلی پر حملے کے ساتھ یہ "دکن کی تاریخ" ختم ہوجاتی ہی۔ اگرچہ بہ طورِ ضمیمہ آصف جاہی مملکت کا ایک نقشہ اور اس کی جغرافی نیز مال گزاری وغیرہ کی کیفیت شامل کردی گئی ہی۔

اس چھوٹی تقطیع کی کل تین سو صفحات کی کتاب کی نسبت ناشر صاحب لکھتے ہیں کہ "اب تک

دکن کی سیاسی تاریخ پر کوئی ایسی وسیع کتاب لکھی نہیں گئی ہے جس میں حوادث و واقعات کا اس طرح استقصا کیا گیا ہو۔" یہ نہایت بے مزہ مبالغہ ہے جسے پڑھ کر پنجاب کے بعض دوافروشوں کے اشتہار یاد آجاتے ہیں۔ لائق ناشر سے ہماری درخواست ہے کہ علمی کتابوں کے باب میں اشتہار دیتے وقت بھی اپنی ذمے داری کا احساس فرمایا کریں۔ اوّل تو کتاب کا نام ہی سخت غلط فہمی پیدا کرتا ہے۔ پھر یہ "عرضِ ناشر" ناظرین کی مزید مایوسی کا موجب ہوگی۔ گزشتہ تاریخ کے لیے تصنیف کا لفظ لکھنا، خواہ جنابِ "مصنف" نے اسے پسند کیا ہو یا وہ حضرتِ ناشر کی تصنیف ہو، درست نہیں۔ کتاب اپنے محدود موضوع کی حد تک مستوخامی [illegible] ہے اور اس کی تالیف میں متداول تاریخوں کے علاوہ چار پانچ مخطوطات سے بھی مدد لی گئی ہے جو حیدرآباد کے سرکاری کتاب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اگرچہ اس میں ابوالفیض کی مثنوی فتوحاتِ آصفی کے بعض اشعار [illegible] اور کوئی تاریخی تفصیل یا نئی بات ایسی نہیں نظر آئی جو عام درسی یا دکن کی مروجہ تاریخوں میں موجود نہ ہو۔ تین سو صفحے۔ چھوٹی تقطیع۔ لکھائی چھپائی معمولی۔ مجلد شائع ہوئی ہے۔ قیمت قسمِ اوّل ہے، قسم دوم [illegible] ہے۔ (س۔ م)

سوشلزم ہی کیوں؟

راہل سانکرتیاین کی ہندی کتاب کا ترجمہ از طفیل احمد خاں صاحب بی اے، کتاب محل، زیرو روڈ، الہ آباد، صفحات ۱۰۴۔ قیمت درج نہیں۔

یہ کتاب راہل سانکرتیاین کی ایک ہندی کتاب کا ترجمہ ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دُنیا کے مصائب اور عوام کی اقتصادی زبوں حالی کا علاج اگر کوئی ہوسکتا ہے تو وہ صرف کمیونزم کے [illegible] سے ہوسکتا ہے۔ عنوانِ کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں دُنیا کے تمام اقتصادی نظاموں اور معاشی نظریات کا مقابلہ کرکے کمیونزم کے نظریے کی فوقیت ثابت کی گئی ہے لیکن دراصل مقابلہ صرف سرمایہ داری ہی کے نظام سے کیا گیا ہے اور دیگر نظریات کا محض ضمناً ذکر آگیا ہے۔ مثال کے طور پر فاضل مصنف نے اگر دُنیا کی اقتصادی بدحالی اور دولت کی غیر مساوی تقسیم کے مسئلے پر ذرا زیادہ وسعتِ نظر سے غور کیا ہوتا تو انھیں معلوم ہوتا کہ سرمایہ داری اور کمیونزم کے درمیان ایک اسلامی اقتصادی نظام بھی ہے جو کمیونزم کی تمام خوبیوں کو رکھتے ہوئے بھی اُن نقائص سے پاک ہے جن کی وجہ سے کمیونزم کا نظریہ قبولِ عام نہیں حاصل کر پاتا۔ [illegible]

ملکیت کے اصول کو قائم رکھتے ہوئے اس ملکیت کا مصرف ایسا بتایا گیا ہو جو دولت کی مساوی نہیں بلکہ متناسب تقسیم ہوجاتی ہو۔ اور یہ نظام افلاطون کے نظریۂ سیاست کی طرح محض خیالی نہیں ہو بلکہ چالیس سال کے عمل میں اپنی معقولیت اور افادیت ثابت بھی کرچکا ہو۔ اس بنیادی نقص کے ماسوا کتاب میں کمیونزم کے نظریے کی تشریح دِل چسپ ہو اور اس مسئلے سے دِل چسپی رکھنے والوں کو اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔ (ر۔ع۔ ۵)

زندہ روس | کتاب خانہ دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ، ۱۶۰ صفحات قیمت درج نہیں۔

روس کے موجودہ جنگ میں اتحادیوں کے ساتھ ہوجانے کی وجہ سے اتحادی ممالک اور اتحادی مقبوضات میں کیمونسٹ اور سوشلسٹ لٹریچر کی اشاعت کا جو دروازہ کھل گیا ہو، اُس کی وجہ سے روس کے متعلق بہ کثرت کتابیں، رسالے اور اخبارات میں مضامین شائع ہورہے ہیں چناں چہ اُردو میں بھی کافی ذخیرہ ایسے لٹریچر کا جمع ہورہا ہو، جس میں کافی حصّہ پروپگنڈے کا بھی ہو لیکن کتاب زیرِ نظر محض پروپگنڈا نہیں ہو بلکہ بعض مفید معلومات بھی اس میں ہیں۔ کتاب دراصل مختلف مضامین اور نظموں کا مجموعہ ہو جن میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہو کہ باوجود جنگ کی ہول ناکیوں کے سوویٹ روس کی علمی، اور دیگر تمدّنی سرگرمیاں جاری ہیں اور خاص کر علمی تحقیق وتالیف وتصنیف کا سلسلہ برابر جاری ہو اور قدیم مسوّدات کی نظرِ ثانی اور اشاعت کا کام بھی ہورہا ہو۔ خاص کر مشرقی علوم وفنون کے متعلق روسی علما برابر اپنی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ سید سجاد ظہیر کا مضمون "دورانِ جنگ میں روسی ادب" جو اس کتاب کا پہلا باب ہو یہ ظاہر کرتا ہو کہ گو اس دور کے جدید ادب پر جنگ کے اثرات وتاثرات غالب ہیں، تاہم آثارِ قدیمہ کی دیکھ بھال اور قدیم علمی نسخوں کی چھان بین اور اشاعت میں جنگ کی وجہ سے کوئی کمی نہیں ہوئی ہو۔ اسی طرح دیگر مضامین میں فنونِ لطیفہ اور خاص کر فنِ مصوّری ونقاشی میں ماہرینِ فن نے جو کارنامے کیے ہیں وہ دکھائے گئے ہیں۔ اور بعض مضامین اشتراکی مقاصد ونقطۂ نظر کی تشریح پر ہیں اور روسی ادب کے بعض حالیہ شاہ کاروں کے اُردو ترجمے نظم ونثر میں دیے گئے ہیں۔ اس طرح کتاب کو دِل چسپ اور مفید بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہو۔

(ر۔ع۔ ۵)

اہلیا بائی | از محمد الدین فوق، بیرون شیراں والہ دروازہ لاہور، ۵۲ صفحات قیمت ۴ر

یہ کتاب جو اندور کی شہرہ آفاق مہارانی اہلیا بائی کے حالات پر مشتمل ہی اور جو لوگ اپنے بچوں کو نام وران ہند کے مختصر حالات پڑھانا چاہتے ہوں ان کے لیے مفید ہی۔ اہلیا بائی ہندستانی تاریخ کی اُن ممتاز خواتین میں شمار ہوتی ہی جن کے تدبر اور نیک دلی کا آج تک چرچا ہی۔ جس زمانے میں مغلیہ حکومت کا اقتدار زوال پذیر ہورہا ہی اور مرہٹوں کی قوم احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے مجروح ہوچکی ہی اُس وقت اہلیہ بائی سندھیا خاندان کی راج کماری تھی اور ہولکر خاندان میں بیاہی گئی تھی' اپنے شوہر اور لڑکے کی وفات پر ہولکر راج کی گدی پر زینت افروز ہوئی اور ۳۰ سال تک حکومت کرتی رہی۔ اس کے تعمیر کرائے ہوئے مندر ہندستان بھر کی مختلف تیرتھ گاہوں میں بکثرت ملتے ہیں جس سے اس کی مذہبیت کا پتا چلتا ہی لیکن اسی کے ساتھ اپنی غیر ہندو رعایا کے ساتھ بھی داد و دہش اور حُسنِ سلوک میں کمی نہیں کرتی تھی چناں چہ عید کا دربار، شب برات کی نیاز اور محرم کے تعزیے اور مجلسیں اس کے زمانے میں سرکاری اہتمام سے ہوتی تھیں اور ان مذہبی رسوم میں وہ ذاتی طور پر دل چسپی لیتی تھی۔ بہرحال اس نام ور مرہٹہ مہارانی کے حالاتِ زندگی پڑھنے کے قابل ہیں۔ (ر۔ع۔ ہ)

اسلام کے چند معاشی نظریے

از مولوی محمد یوسف الدین صاحب ایم اے (عثمانیہ) سلسلہ مطبوعات انجمن طیلسانین عثمانیہ، حیدرآباد دکن ۱۰۰ صفحے قیمت ۱۲/

مولوی محمد یوسف الدین صاحب نے اس مختصر سی کتاب میں علمی تحقیق کے ایک نئے باب کا افتتاح کیا ہی جس کی حالاتِ زمانہ کے لحاظ سے سخت ضرورت تھی۔ اسلام کا معاشی قانون اعلاترین مانا جاتا ہی مگر یہ قانون ہی کیا اور اس کی سند کلامِ الٰہی اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم میں کس حد تک ملتی ہی؟ یہ اس کتاب کا اصل مبحث ہی اور اس میں فاضل مصنف نے نہایت ہی محنت و کاوش سے وہ واضح اشارات جمع کیے ہیں جن سے ایک منظم معاشی قانون کی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تدوین ہوسکتی ہی انسان کا محنت و مشقت میں پیدا ہونا اور آرزوؤں کے ایک بے پناہ سیلاب کے ساتھ دُنیا میں آنا۔ پھر کائنات کی تمام مخلوقات کو اس کا تابع بنانا۔ محض زمین اور آسمان ہی نہیں بلکہ ان کے مابین جو کچھ ہی' خلا، فضا، برقی قوت وغیرہ سب پر اسے تسلط دینا فطرت کے اس منشا کو ظاہر کرتا ہی کہ انسان ان قوتوں سے کام لینے کے طریقے دریافت کرے اور ان کا مناسب استعمال کرے۔ اور پھر اصلی عامل قوت

خلاق عالم کی ذاتِ واحد کو قرار دے کر ان قوتوں کے بے جا استعمال پر ایک روک لگادی گئی ہو یہی اسلام کے معاشی نظام کی بنیادیں ہیں اور پھر ان پر مختلف زندگی کے شعبوں کے لیے معاشی قوانین کی بنیاد رکھی گئی ہو جس کے واضح اشارات بھی قرآنِ کریم اور احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہیں جنھیں اس قابلِ قدر کتاب میں مجمع کردیا گیا ہو۔ چناں چہ اکتسابِ دولت کے مختلف طریقے زراعت، تجارت، مواصلات، حمل ونقل، صنعت وحرفت، کان کنی، شکار وغیرہ کی تحریکات صاف صاف قرآنِ پاک میں پائی جاتی ہیں بلاو محنت وتنظیم کے متعلق واضح ہدایات موجود ہیں۔ ضرورت صرف اس کی ہو کہ ان آیات کی معنویت پر غور کرکے ان کے منشاے اصلی کو سمجھا جائے اور اس پر عمل کیا جائے۔

اس وقت دنیا میں کئی معاشی نظریات زیرِ تجربہ ہیں جس میں سویٹ روس کا اشتراکی نظام خاص اہمیت رکھتا ہو اور اس وقت دنیا کی سیاسیات میں پیش پیش ہو۔ لیکن یہ نظریہ ابھی تجربے کی منزل میں ہو اور آخری نتائج معلوم نہیں ہیں۔ برعکس اس کے اسلام کا معاشی نظریہ تاریخ کے امتحانات اور آزمایشوں سے کام یابی کے ساتھ گزر چکا ہو اور اگر ہم خلافتِ راشدہ کے دور پر سرسری نظر ڈالیں جب کہ حکومت اور معاشرت کے نظام میں وہی روح جلوہ گر تھی جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی تھی، تو ہمیں صاف نظر آئے گا کہ اسلامی معاشی نظریے نے واقعی وہ مقصد حاصل کیا جو کسی معاشی نظام کا اعلاترین نصب العین ہوسکتا ہو یعنی ایک جماعت کے افراد میں دولت کی ایسی منصفانہ تقسیم کہ کسی کو دوسرے کے سامنے دستِ حاجت دراز کرنے کی ضرورت نہ رہے۔ اس نظام کی کام یابی کا اصل راز یہ تھا کہ اس میں دولت کے بہاؤ کا رُخ اُمرا سے غربا کی جانب رکھا گیا تھا برعکس اس کے ملوکی نظامِ معاشی میں دولت کے بہاؤ کا رُخ غربا سے امرا کی طرف ہو جس سے عام لوگوں کی معاشی حالت دن بہ دن ابتر ہوتی جاتی ہو اور گو متموّل لوگوں کا تموّلِ غیر معمولی تیزی سے بڑھ رہا ہو، غربا کی روٹی کا سوال اُسی جگہ رہتا ہو یا اُس سے بھی ابتر جتنا کہ پہلے تھا۔

مولوی یوسف الدین کی اس مختصر تصنیف سے امید ہو کہ لوگوں میں یہ رجحان پیدا ہوگا کہ وہ اسلام کے معاشی نظام کے اصول سمجھیں اور ان کی بنیاد پر اس زمانے کے حالات کے مناسب ایک نظام مرتب کریں

یہ کام تمام سیاسی مقاصد سے زیادہ اہم ہے اور ہمیں امید ہے کہ مصنّف کی اس کوشش سے اس کی تحریک ہوگی۔

(ر۔ع۔ م)

مقالاتِ جمال الدّین افغانی | مترجمہ سیّد مبارز الدّین رفعت صاحب ایم اے (عثمانیہ) دارالاشاعت سیاسیہ، حیدرآباد دکن۔ قیمت قسم اوّل ۱۲؍، قسم دوم ۸؍۔

سیّد جمال الدّین افغانی انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں اسلامی دُنیا کی ایک عظیم المرتبت ہستی تھے جن کے مقالات و خطبات نے سوتے ہوئے مسلمانوں کو بیدار کیا اور بھولی ہوئی مسلم اقوام کو راہِ فلاح کا نشان دیا۔ ان کی وحدتِ اسلامی کی تحریک کو پان اسلام ازم کہا جاتا ہے اور دُنیا کی غیر مسلم اقوام کو اس سے ڈرایا جاتا ہے۔ لیکن جمال الدّین افغانی کوئی نئی بات نہیں کہہ رہے تھے بلکہ مسلمانوں کو ایک بھولا ہوا سبق یاد دلا رہے تھے اور اپنی پوری قوّت انھیں ہوشیار کرنے اور ماضی و حال کا جائزہ لے کر مستقبل کا خاکہ بنانے پر آمادہ کرنے میں صرف کر رہے تھے۔ چناں چہ انھی کی مجاہدانہ کوششوں سے ملّتِ اسلامی کی نشاتِ ثانیہ کا آغاز ہوا، اور جہاں جہاں دُنیا میں مسلمان بستے تھے وہاں بیداری اور زندگی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ اس مجاہدِ اعظم کے حالات و اقوال سے اُردو داں پبلک کو روشناس کرانے کی ضرورت تھی چناں چہ قاضی عبدالغفّار صاحب نے "آثارِ جمال الدّین" لکھ کر اس کی ابتدا کی اور اب مولوی مبارز الدّین رفعت صاحب نے ان کے مقالات کا فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا جو اس وقت ہمارے زیرِ نظر ہے۔ ان مقالات میں مسلمانوں کے تمام دینی و دُنیوی معاملات پر نظر ڈالی گئی ہے، اور انھیں وحدتِ اسلامی کے عالم گیر پیام سے روشناس کر کے اُن جذبات و افکار کو اُبھارنے کی کوشش کی گئی ہے جو اسلامی تعلیم کا اصل منشا ہیں۔ قاضی عبدالغفّار صاحب کا ایک مقدّمہ بھی زیبِ کتاب ہے اور آخر میں افغانی کا ایک منظوم فارسی خط بھی درج ہے جو انھوں نے شہنشاہِ ایران کو لکھا تھا اور جس میں ان کے وحدتِ اسلامی کے خیال کی مخالفت پر اظہارِ ناراضی کیا گیا ہے۔ اس منظوم مکتوب سے ان کی وطنیت ایران کی معلوم ہوتی ہے۔ اور اگر یہ نظم واقعی انھی کی ہے تو یہ امر تحقیق طلب ہو جاتا ہے کہ انھوں نے ایرانی نژاد ہونے کے باوجود "افغانی" عرف کیوں اختیار کیا۔ بہرحال یہ خطبات بہت ہی پُرجوش اور سبق آموز ہیں اور خاص کر اُردو داں مسلمانوں کو اُن کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

(ر۔ع۔ م)

متفرقات

عثمانیین کے تراجم و تالیفات خوش نما سرورق اور چند تمہیدی مضامین کے ساتھ یہ ان کتابوں کی مختصر سی فہرست ہو جنھیں جامعۂ عثمانیہ کے لائق فرزندوں نے اب تک تصنیف یا ترجمہ کیا اور وہ انجمن طیلسانیین عثمانیہ، کے کتب خانے میں جمع کی گئیں۔ ان میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دونوں قسم کی کتابیں شامل ہیں لیکن بہ ظاہر وہ جو انجمن کے کتب خانے میں کسی وجہ سے داخل نہ ہوسکیں، اس فہرست میں درج نہیں ہیں۔ مثلاً اُستوا پر شیخ چاند مرحوم کا فاضلانہ مقالہ جو ضخیم کتاب کی صورت میں انجمنِ ترقیِ اُردو نے شائع کیا ہو، فہرست میں نہیں پایا گیا۔ مرتبینِ فہرست اس کمی سے بے خبر نہیں ہیں اور ہمیں یقین ہو کہ آیندہ اشاعتوں میں وہ حتی الامکان اسے رفع کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

فہرست، مصنفین کے ابجدوار ناموں کے لحاظ سے مرتب کی گئی ہو اور اس میں ان کی کُل تعداد ۲۶۹، اور ان کے قلم کی ۵۶۳ کتابیں یا مسودات کا نام درج ہو۔ ایک قلیل مدت میں جامعۂ عثمانیہ کے فاضلوں کا یہ کارنامہ کچھ کم قابلِ تحسین نہیں ہو۔ ہندستان کی کسی دوسری جامعہ کے تعلیم یافتہ حضرات نے شاید پچاس برس میں بھی اپنی زبان کی ایسی علمی خدمت انجام نہ دی ہوگی۔ اور یہی امر بجاے خود جامعہ عثمانیہ کے اصولِ تعلیم کی فضیلت کا عمدہ ثبوت فراہم کرسکتا ہو۔ لکھنے والوں میں ہر مذہب و ملت کے عثمانی طیلسانی موجود ہیں۔ مثلاً سدرشن راج، این پٹواری، کرشنابائی وغیرہم نے خالص علمی مضامین پر کتابیں تحریر کی ہیں۔ فہرست انجمنِ طیلسانین کے دفتر واقع باغِ عامّہ، حیدرآباد دکن، سے شائع ہوئی اور غالباً اسی پتے سے دست یاب ہوسکتی ہو۔

نئے رسالے

اُردو ضمیمہ (مدراس کرسچین کالج میگزین) یہ مختصر ڈیڑھ جزٗ کا رسالہ بہ قامت کہتر و بہ قیمت بہتر کی مثال ہو۔ کاغذ تو آج کل اچھی قسم کا ملتا نہیں۔ لتھو کی چھپائی بھی مدراس میں بہت معمولی ہوتی ہو۔ مگر چند مضمون جو اس اشاعت میں چھپے ہیں، قابلِ قدر ہیں۔ یہ زیادہ تر کرسچین کالج کے طلبہ کی تحریریں ہیں۔ مدراس جیسے دور دست علاقے میں انشاپردازی کے ایسے نمونے دیکھ کر، زبانِ اُردو کے بہی خواہ مسرور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کاش کہ رسالے کا حجم کچھ زیادہ اور وہ سالانہ کی بجاے دوماہہ یا سہ ماہہ ہوتا۔ قیمت درج نہیں۔ مذکورہ بالا کالج کے پتے سے مل سکےگا۔

اُردو

فہرستِ مضامین

جلد ۲۴ ——— سنہ ۱۹۴۴ء

ادب

تذکرہ و سوانح

تنقید

بہرۂ نظم

متفرقات

تبصرے

(اسامی کتب و رسائل جن پر تبصرہ کیا گیا)

ادب

تاریخ وسیر

سیاسیات ومعاشیات

متفرقات

نئے رسالے، سال نامے اور خاص نمبر

جلد ۲۵ جولائی سنہ ۱۹۴۵ء نمبر ۳

اُردُو

انجمنِ ترقّیِ اُردُو (ہند) کا سہ ماہی رِسالہ

ایڈیٹر:- عبدُالحق

شائع کردہ

انجمنِ ترقّیِ اُردُو (ہند) دہلی

اُردو

جلد ۲۵ — جولائی سنہ ۴۵ء — نمبر ۳

فہرست مضامین

سید صلاح الدین جمالی منیجر انجمن نے جید پریس بلی ماراں دہلی میں چھپوا کر
دفتر انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی سے شائع کیا

خطبۂ صدارت

یادِ حالی

(جو انجمن ترقی پسند حیدرآباد دکن کے اہتمام سے بلدۂ حیدرآباد میں ۲ر مارچ سنہ ۱۹۴۵ء کو منایا)

(از ڈاکٹر عبدالحق آنریری سکریٹری انجمنِ ترقیٔ اُردو)

کنفوشس کا قول ہو "ایسا کون ہو جو کھاتا اور پیتا نہیں لیکن کتنے ایسے ہیں جن کے کام و دہن حقیقی ذائقے سے آشنا ہیں" یہی حال ادَب کا ہو۔ لکھنے پڑھنے، تالیف و تصنیف کرنے والوں کی تعداد بہت کافی ہو لیکن ان میں کتنے ایسے ہیں جو ذوقِ سلیم رکھتے ہیں۔ صحیح ذوق ادَب کی جان ہو۔ جہاں یہ نہیں وہاں ادَب بھی نہیں۔ حالی کا بڑا کارنامہ یہ ہو کہ اُس نے اپنے کلام اور سیرت سے عمر بھر صحیح ذوق کی تعلیم دی۔

جس وقت حالی نے ادَب کے کوچے میں قدم رکھا، اُردو شاعری لفظوں کا کھیل ہو کے رہ گئی تھی۔ بڑی چیز شعر میں یہ دیکھی جاتی تھی کہ متروک الفاظ نہ آنے پائیں، بندش چُست اور محاورہ درست ہو، کلام تعقید و تنافرِ حروف، ضعفِ تالیف سے بری ہو۔ اس کے ساتھ لفظی رعایت اور صنائع بدائع کی لَے یہاں تک بڑھی کہ شاعری زیادہ تر لفظ پرستی اور ضلع جگت ہوگئی تھی۔ مضمون اور خیال آفرینی کے معنے ہی بدل گئے تھے۔ حالی نے اِس شاعری میں جان ڈال دی اور ایک انقلاب پیدا کردیا۔ یہ سب اُس صحیح ادَبی ذوق کی بدولت ہوا جو قدرت نے اُسے عطا کیا تھا اور اہلِ کمال کی صحبت و تربیت، مطالعے اور شوق نے اُسے جِلا دی تھی۔

حالی کی ابتدائی شاعری جو اُس وقت کے عام دستور کے مطابق تھی وہ بھی کم قابلِ قدر نہیں۔ لیکن جدید اثر اور خاص کر زمانے کے اقتضا اور سرسید احمد خاں کی تحریک نے اُسے حقیقت نگاری اور صداقت کے رستے پر لا ڈالا۔ حالی قدیم اور جدید ہر دو ادَب کے درمیان بہ طور ایک کڑی کے ہو۔ ایک اعتبار سے وہ دونوں کا ترجمان ہو۔ اس نے قدیم ادَب اور قدیم صحبتوں میں تربیت پاکر اپنے ادَب کو نقادانہ نظر سے دیکھا، اُس کے عیوب سے کنارہ کیا اور اُس کی خوبیوں کو نئے رنگ میں ڈھالا اور اُن سے زمانے کے اقتضا کے مطابق کام لیا۔ بہ قول

ایک ادیب کے "ادب چاند کی طرح مردہ شے نہیں ہو جو سورج کی کرنیں اُدھار لے کر روشن ہوتا ہو۔ ادب زندگی کی بدلتی ہوئی شکلوں کے پہچاننے کی سعی ہو"۔ حالی نے اس رمز کو پہچانا۔ پہچانا ہی نہیں عمل بھی کیا۔

اس کسوٹی پر حالی کے کلام اور اس کی تصانیف کو پرکھیے تو اس کی تصدیق ہوگی۔ اُس نے جو کچھ لکھا ہو اس رنگ میں ڈوب کر لکھا ہو اور کہیں حقیقت اور صداقت کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ اُس کی سب سے مقبول نظم مسدّس (مدّ و جزرِ اسلام) ہو۔ اُس نے قصرِ سلطنت ہی کو ڈھیتے نہیں دیکھا تھا، اپنے تمدّن اور تہذیب کو بھی جو سلطنت سے زیادہ عزیز تھے پارہ پارہ ہوتے دیکھا تھا۔ اس نظم میں اُس نے کھوئے ہوے عظمت و جلال کو ایسے جوش اور خلوص سے بیان کیا ہو کہ بجھے ہوے دل میں ولولہ پیدا ہوجاتا ہو۔ اس کے بعد قوم کے زوال اور نکبت کا بھیانک منظر دکھایا ہو اور ہر طبقے کی بداعمالیاں اور بے اعتدالیاں، ان کے اخلاق و عادات، ان کی معاشرت اور اطوار و اشغال کا نقشہ اس سوز و گداز اور درد بھرے دل سے کھینچا ہو کہ ایک غیرت مند مسلمان پڑھ کر بے تاب ہوجاتا ہو۔ اس میں تلخی ضرور ہو اور نشتر بھی چھپے ہوے ہیں لیکن اس سے دل آزاری مقصود نہیں ہو بلکہ اُن کو اپنی حالتِ زار پر آگاہ کرنا اور عبرت دلانا ہو۔ وہ بار بار گزشتہ تاریخی واقعات یاد دلاکر اور دوسری اقوام کی ہم دردی اور ایثار کی مثالیں پیش کرکے ان کا حوصلہ بڑھاتا ہو۔ وہ اُجڑے گھر کو پھر بنانا اور اس خرابے کو ازسرِ نو تعمیر کرنا چاہتا ہو۔ بیان کی سادگی، زبان کی فصاحت اور شاعر کے خلوص و صداقت نے اس نظم کو وہ مقبولیت بخشی جو شاید ہی کسی کتاب کو نصیب ہوئی ہو۔ بیسیوں بار چھپی اور برابر چھپ رہی ہو۔ اس نے مسلمانوں کے افسردہ دلوں کو جس طرح گرمایا اور اُن کی غیرت کو جس طرح اُبھارا اس کے بہت سے واقعات ہیں لیکن ایک تازہ واقعہ سُننے اور یاد رکھنے کے قابل ہو۔

میرے عزیز دوست مولوی سیّد ہاشمی ۱۳۵۴ھ (۳۵-۶۱۹۳۶) میں اداے حج کے لیے مکّۂ معظّمہ حاضر ہوے۔ مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم اُس وقت وہیں مقیم تھے۔ ہندستان واپس آنے کی اجازت نہ تھی۔ کوئی بیس سال سے جلا وطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ پہلے کابل میں تھے پھر کئی سال روس میں رہے۔ کچھ زمانہ ترکی میں گزارا۔ آخر کار خانۂ کعبہ میں پناہ لی۔ سیّد ہاشمی صاحب کہتے ہیں کہ دورِ قیام مکّہ کے زمانے میں مجھے قریب قریب ہر روز اُن سے ملاقات اور استفادہ کا موقع ملتا تھا۔ مولانا مرحوم کا دل و دماغ جس طرح دینِ اسلام

کے معارف سے لبریز تھا، اسی طرح وہ سیاسی دُنیا اور خصوصًا انقلابی رُوس کے حالات سے بہت وسیع واقفیت رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ بیان کیا کہ (غالبًا ماسکو میں) انقلابِ رُوس کی کوئی بڑی تقریب یا سال گرہ منائی جارہی تھی آرائش وزیبایش کے بہت سے دوسرے ساز وسامان کے ساتھ ایک عظیم الشان ایوان میں دیواروں اور جھنڈوں پر انقلاب کے نعرے، مزدوری کے فضائل اور مزدوروں کا حقِ بادشاہی، بڑے جوش انگیز اور پُراثر الفاظ میں جگہ جگہ مکتوب اور آویزاں تھے۔ مولانا فرماتے تھے کہ مجھے اُن کلمات اور اشعار (کے معنے) سُن کر بے اختیار مسدسِ حالی کے وہ بند یاد آگئے جن میں محنت مزدوری کی فضیلت کو اُن رُوسی مقولوں سے بھی زیادہ جوش وقوت کے ساتھ بیان کیا گیا ہو۔ مَیں نے اپنے رفیقوں سے یہ حقیقت کہی۔ پھر وہ اشعار ترجمہ کرا کے رُوسی حکام کے سامنے پیش کیے گئے تو انھیں سخت حیرت ہوئی۔ وہ کسی طرح باور نہ کرتے تھے کہ مُردہ ایشیا کے سب سے زیادہ گلے سڑے حصے میں، جہاں مزدوری انتہائی رذالت و غلامی کے مرادف مانی جاتی ہو، کسی کے وہم وخیال میں بھی یہ بات کبھی آسکتی ہو کہ ذلیل کمیروں کو انسانی تہذیب کا بانی مبانی، لائقِ عزت وشرف اور خُدا کی رحمت کا سب سے بڑھ کر اہل ومستحق ثابت کرے۔ طرفہ تر یہ کہ محنت کی یہ توصیف وتلقین ساٹھ برس پہلے ایسا شخص کر رہا ہو جس نے کوئی یورپی تعلیم حاصل نہیں کی اور محنت کش مزدوروں کے حقوق کی حمایت و وکالت کی بھنک بھی اس کے کان تک نہ پہنچی ہوگی۔ غرض کافی تلاش وتحقیق کے بعد 'مسدسِ حالی' اور اس حکیم شاعر کے حالات جمع کیے گئے اور حکام نے فیصلہ کیا کہ اُس کے اشعار بھی جلی قلم سے لکھ کر سب سے نمایاں جگہ آراستہ کیے جائیں۔

مولانا سندھی نے یہ واقعہ سُنا کر ازراہِ خوش طبعی فرمایا کہ "دیکھیے ہم نے انقلابی رُوس میں بھی آپ کی اُردو کا جھنڈا بلند کیا اور ثابت کرکے چھوڑا کہ اُردو شاعری دُنیا کے جدید ترین سیاسی اور اصلاحی افکار کی تبلیغ میں کسی زبان سے ہیٹی نہیں ہو۔"

مولوی سیّد ہاشمی صاحب کہتے ہیں کہ "مولانا نے ایک دو مصرع بھی مجھے سُنائے جو اس وقت یاد نہیں۔ لیکن (ضمیمہ) مسدس کے وہ مقام جہاں محنت مزدوری کے فضائل بیان کیے گئے ہیں میرے ذہن میں تھے۔ ذیل میں وہ چند بند نقل کیے جاتے ہیں۔ یقین ہو کہ انھی کے اشعار یا مصرع روسیوں نے انتخاب کیے ہوں گے ۔۔

۱۔ یہ برکت ہے دُنیا میں محنت کی ساری جہاں دیکھیے فیض اسی کا ہے جاری
یہی ہے کلید درِ فیضِ باری اسی پر ہے موقوف عزت تمھاری
اسی سے ہے قوموں کی یاں آبرو سب
اسی پر ہیں مغرور ہیں اور تو سب

گلستاں میں جوبن گُل و یاسمن کا سماں زلفِ سنبل کی تاب و شکن کا
قدِ دل رُبا سرو اور ناروَن کا رُخِ جاں فزا لالہ و نسترن کا
غریبوں کی محنت کی ہے رنگ و بو سب
کمیں کے خوں سے ہیں یہ تازہ رو سب

۲۔ مگر ایک فریق اور ان کے سوا ہے شرف جس سے نوعِ بشر کو ملا ہے
سب اس بزم میں جس کا نورِ ضیا ہے سب اس باغ کی جن سے نشو و نما ہے
ہوئے جو کہ پیدا ہیں محنت کی خاطر
بنے ہیں زمانے کی خدمت کی خاطر

- - - - - - - - - - - - - - - - -

چُنیں گر نہ وہ، ہوں کھنڈر کاخ و ایواں بُنیں گر نہ وہ، شاہ و کشور ہوں عُریاں
جو بوئیں نہ وہ، تو ہوں جاں دار بے جاں جو چھانٹیں نہ وہ، تو ہوں جنگل بیاباں
یہ چلتی ہے گاڑی انھی کے سہارے
جو وہ کل سے بیٹھیں تو بے کل ہوں سارے
کھپاتے ہیں کوشش میں تاب و تواں کو گھلاتے ہیں محنت میں جسم و رواں کو
سمجھتے نہیں اس میں جان اپنی جاں کو وہ مر مر کے رکھتے ہیں زندہ جہاں کو
بس اس طرح جینا عبادت ہے ان کی
اور اس دُھن میں مرنا شہادت ہے ان کی ۔ "

اگر میں اس موقع پر روس میں مولانا کے ساتھ ہوتا تو حالی کا یہ شعر پڑھ کر سناتا جو یقیناً وہاں بے حد پسند کیا جاتا ؎

کمالِ کفش دوزی علمِ افلاطوں سے بہتر ہے
یہ وہ نکتہ ہے سمجھے جس کو مشائی نہ اشراقی

یہ شعر اُس وقت کہا گیا تھا جب کہ ہمارے مُلک کو مارکسی اصول اور نظریوں کی ہوا تک نہ لگی تھی۔

ایک بار میں نے مولوی صاحب کی یہ غزل اُن کے سامنے پڑھی جس کا مطلع ہے ؎

درِ فیضِ حق بند تھا جب نہ اب کچھ
فقیروں کی جھولی میں اب بھی ہے سب کچھ

جب میں نے یہ شعر پڑھا ؎

کچھ اور آؤ بن کر تم اے میر و مرزا
نہیں پوچھتے یاں حسب اور نسب کچھ

تو مولانا نے فرمایا "مزدور بن کر آؤ" بلاشبہ "کچھ اور آؤ بن کر" کے یہی معنے ہیں۔

دُکھ درد والوں کی ہم دردی اور بےکسوں کی حمایت مولانا نے ہمیشہ کی۔ ان کا کلام اس کا شاہد ہے۔ اس کی سب سے بڑی شہادت اُن کی 'مناجاتِ بیوہ' ہے۔ یہ اُردو ادب کے جواہر خانے میں ان مول موتی ہے۔ یہ بیوہ کی دُکھ بھری کہانی ہے اور وہ بھی اُسی کی زبانی اور کس کے آگے؟ بارگاہِ باری تعالیٰ کے سامنے۔ انسان اس کا اہل نہیں کیوں کہ وہ اُس سے مایوس ہو چکی ہے۔ یہاں مولانا نہ مصلح کے رنگ میں نظر آتے ہیں اور نہ ناصح کے روپ میں۔ حالاں کہ اصلاح و پند دونوں کا موقع تھا۔ انھوں نے بیوہ کے دُکھ درد کو اُسی کی زبانی ایسے سوز و گداز سے بیان کیا ہے کہ اس کے سامنے وعظ و نصیحت کی کوئی حقیقت نہیں رہی۔ اس کی زبان ایسی سادہ ہے کہ اس سے زیادہ سادگی خیال میں نہیں آسکتی۔ اور پھر ایسی پاک صاف اور دل گداز کہ پتھر کا دل بھی ہو تو پگھل جائے۔ اس نظم کا طرزِ بیان شاعر نے خود پیدا کیا ہے جو موضوع کے عین مناسب ہے۔ ان جذبات کے ادا کرنے کے لیے ایسی ہی زبان کی ضرورت تھی۔ وہ کسی دوسری زبان میں ادا ہی نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ الفاظ گھڑتا بناتا اور ڈھالتا

ہی اور ان کے ذریعے سے اُس عالم میں پہنچادیتا ہی جہاں دوسرے شاعر کی رسائی نہیں۔ مثلاً دُنیا کی بے ثباتی کے متعلق کہتا ہی: ؎

ریت کی سی دیوار ہی دُنیا — اوچھے کا سا پیار ہی دُنیا
بجلی کی سی چمک ہی اُس کی — پل دوپل جھمک ہی اس کی
پانی کا سا ہی یہ پُچارا — جگنو کا سا ہی چمکارا
ساتھ سہاگ اور سوگ ہی یاں کا — ناؤ کا سا سنجوگ ہی یاں کا
ہار کبھی اور جیت کبھی ہی — اس نگری کی ریت یہی ہی

چند شعر اور سُنیے ؎

آئیں بہت دُنیا میں بہاریں — عیش کی گھر گھر پڑیں پُکاریں
پڑے ہیں بہت باغوں میں جھولے — ڈھاک بہت جنگل میں پھولے
گئیں اور آئیں چاندنی راتیں — برسیں کُھلیں بہت برساتیں
پر نہ کھلی ہرگز نہ کھلے گی — وہ جو کلی مرجھائی تھی دل کی
آس ہی کا یاں نام ہی دُنیا — جب نہ رہی یہ بھی تو رہا کیا
ایسے بدیسی کا نہیں غم کچھ — جس کو نہ ہو ملنے کی قسم کچھ
رونا ان بن باسیوں کا ہی — دیس نکالا جن کو ملا ہی
حُکم سے تیرے پر نہیں چارا — کڑوی میٹھی سب ہی گوارا
زور ہی کیا پتّے کا ہوا پر — چاہے جدھر لے جائے بہاکر
تنکا ایک اور سات سمندر — جائے کہاں موجوں سے نکل کر

شرط سے پہلے بازی ہاری — بیاہ ہوا اور رہی کنواری
سیلانی جب باغ میں آئے — پھول ابھی تھے کھلنے نہ پائے

پھول کھلے جس وقت چمن میں　　　جا سوئے سیلانی بن میں
پیت نہ تھی جب، پایا پیتم　　　جب ہوئی پیت گنوایا پیتم
خیر سے بچپن کا ہو رنڈاپا　　　دُور پڑا ہو ابھی بڑھاپا
عُمر ہو منزل تک پہنچانی　　　کاٹنی ہو بھرپور جوانی
شام کے مُردے کا ہو یہ رونا　　　ساری رات نہیں ہو سونا

تھی نہ کمی کچھ تیرے گھر میں　　　نون کو ترسی میں سانبھر میں
راجا کے گھر پلی ہوں بھوکی　　　سدا برت سے چلی ہوں بھوکی
رہی اکیلی بھری سبھا میں　　　پیاسی رہی بھری گنگا میں

آخر میں خدا سے دُعا کرتی ہو اور دیکھیے اس میں کیا شان اور مایوسانہ جرأت ہو: ؎

دِل میں لگن بس اپنی لگا دے　　　سارے غم اپنے غم میں کھپا دے
غیر کے رشتے توڑ دے سارے　　　دِل کے پھپھولے پھوڑ دے سارے
جب مجھے تنہا کیا ہو پیدا　　　تو مجھے بندھوا کر نہ کسی کا
واں سے اکیلی آئی ہوں جیسی　　　ویسی ہی یہاں سے جاؤں اکیلی
ساتھ کوئی غم لے کے نہ جاؤں　　　تیرے سوا کھووں جسے پاؤں
دِل نہ پھرے دُنیا میں بھٹکتا　　　کوئی رہے کانٹا نہ کھٹکتا
جی سے نشان پیاروں کا مٹا دوں　　　پیار کے موٗنھ کو آگ لگا دوں
تو ہی ہو دِل میں تو ہی زباں پر　　　مار کے جاؤں لات جہاں پر
پاؤں تجھے اک اک کو گنوا کر　　　خاک میں جاؤں سب کو ملا کر

ایک دوسری نظم "چُپ کی داد" ہو - یہ عنوان خود بول رہا ہو کہ اس میں کیا ہوگا۔ دیکھنے میں یہ دو

سادہ لفظ ہیں لیکن ان میں صدہا سال کی ناانصافیوں، خود غرضیوں اور غفلتوں کی روداد چھپی ہوئی ہے۔ اس عنوان کا انتخاب ہی شاعر کی جدّت اور گہری نظر کا پتا دیتا ہے۔ ہمارا ادب عورتوں کے چرتر اور عیاریوں کی داستانوں سے بھرا پڑا ہے۔ لیکن حالی نے اُن کی مہر و وفا، عصمت و عفت، صبر و استقلال، جفاکشی اور ایثار کے گن گائے ہیں اور اُن کی قدر و عزت کرنی سکھائی ہے۔

'شکوۂ ہند' میں ایک خاص عظمت و شان اور زور ہے اور اپنے ہم قوموں کو غیرت دلانے کے لیے ایک نیا اسلوب اختیار کیا ہے۔

ایک بات جو خاص طور سے دیکھنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ حالی نے اپنی ہر نظم کو ایک نرالے ڈھنگ اور نئے پیرائے میں پیش کیا ہے۔ اور یہ پیرایۂ بیان موضوع کی مناسبت سے نہایت دل آویز اور پُراثر ہوتا ہے۔ یہ وہ مجدّدانہ شان ہے جو بہت کم لوگوں کے حصّے میں آتی ہے۔

شاعری حالی کے لیے صداقت کا جذبہ ہے۔ اس کی ہر نظم میں صداقت اور خلوص پایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اُن خیالات کا اظہار کرتا ہے جن پر اس نے خود غور کیا ہے یا خود سوچ کر پیدا کیے ہیں۔ وہ اُن وارداتوں کو بیان کرتا ہے جو اُس پر یا دوسروں پر حقیقت میں گزری ہیں۔ وہ اُن جذبات کو ادا کرتا ہے جو اس نے ذاتی طور پر خود محسوس کیے ہیں۔ اچھے لکھنے کے معنے اچھی طرح غور کرنے اور محسوس کرنے کے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی ہر نظم کامل ہے۔ وہ ادب جس کی بنیاد نقالی ہے یا صرف دوسروں کے خیالات کے دُہرانے پر ہمیشہ ناقص، ادھورا اور بھونڈا ہوتا ہے۔ ایسے لکھنے سے بہتر ہے کہ کچھ نہ لکھا جائے۔

عام ڈگر سے ہٹ کر جب پہلے پہل اس نے دو چار نظمیں مثلاً حُبِّ وطن، برکھا رُت، نشاطِ امید، تعصب و انصاف لکھیں، تو ان میں بھی علاوہ حُسنِ بیان کے وہی سادگی اور حقیقت نگاری پائی جاتی ہے جو بعد میں اس کے کلام کا خاص امتیاز ہوگیا، یہاں تک کہ مدح اور مرثیے میں بھی اُس نے اِس روش کو ہاتھ سے نہیں دیا اور اِن دونوں صنفوں کی بنیاد بھی اُس نے حقائق اور واقعات ہی پر قائم کی۔ اعلاحضرت حضورِ نظام مرحوم کی جوبلی کے موقع پر جو قصیدۂ مدحیہ لکھا، حکیم محمود خاں کا مرثیہ مرزا غالب یا اپنے بھائی کا پُردرد مرثیہ یا آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں جو نظمیں وقتاً فوقتاً پڑھیں وہ سب حقائق و واقعات پر مبنی ہیں۔ اعلاحضرت میر عثمان علی خاں

خسروِ دکن خلداللہ ملکہٗ کی تخت نشینی کی تہنیت میں جو نظم لکھی وہ ہمارے ادب میں خاص چیز ہی۔ اس میں عام دستور کے خلاف بجائے مدح وثنا کے اُن کٹھن ذمے داریوں اور دُشواریوں سے آگاہ کیا جن سے ایک فرماں روا کو اِس کڑی منزل میں دوچار ہونا پڑتا ہی۔ نعت ایک نہایت مقبول مضمون ہی اور اُردو فارسی میں اس موضوع پر بے شمار نظمیں لکھی گئی ہیں اور خوب خوب لکھی گئی ہیں لیکن مسدس کے چند بند جو بعثتِ خاتم النبیین پر ہیں ان میں جو سادگی، خلوص، جوش، صداقت اور اثر ہی اُس کا کہیں جواب نہیں۔

ایک دوُسری خصوُصیت حالی کی شاعری کی اور ہی، اور وہ بھی صداقت اور حقیقت نگاری کا ایک پہلو ہی۔ یعنی اُس نے نفسِ انسانی کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہی اور انسان کی نفسانی کیفیتوں کی گہرائی تک پہنچ کر دِلوں کے کھوٹ اور نفس کی چُھپی ہوئی چوریوں کو پکڑا ہی اور بڑے دل آویز پیرائے میں بیان کیا ہی۔ کہیں ظرافت کے رنگ میں، کہیں اپنے نفس پر یا زاہد و شیخ پر ڈھال کر، کہیں حکیمانہ پیرائے میں اور کہیں صاف صاف۔ مثلاً ایک شخص اپنے ایک بے تکلف دوست سے پوُچھتا ہی کہ آپ سید احمد خاں کے مخالف کیوں ہیں۔ آپ جو اُسے ملحد و کافر کہتے ہیں تو آپ بھی تو کچھ ایسے پابندِ شرعِ اسلام نہیں۔ اس کے جواب میں وہ کہتا ہی ؎

رنج کچھ اِس کا نہیں مجھ کو کہ وہ ایسا ہی کیوں
بلکہ ساری کوفت اِس کی ہی کہ مَیں ویسا نہیں

کیا چوری پکڑی ہی۔

عادت جو انسان کے دِل و دماغ و شعور اور عمل پر بے طرح چھائی ہوئی ہی اس کے تسلط کو کس خوُبی سے ادا کیا ہی ؎

دیکھ عادت کا تسلط مَیں نے عادت سے کہا — گھیر لی عقلِ صواب اندیش کی سب تو نے جاے
ہنس کے عادت نے کہا، کیا عقل ہی مجھ سے الگ — مَیں ہی بن جاتی ہوں ناداں رفتہ رفتہ عقل ورائے

ایک دو مثالیں اور سُنیے ؎

تھا نہ استحقاقِ تحسیں پر سُنی تحسیں سدا — حق ہی جو دوں ہمتی کا وہ ادا کرتا رہا
موُنھ نہ دیکھیں دوست پھر میرا اگر جانیں کہ مَیں — اُن سے کیا کہتا رہا اور آپ کیا کرتا رہا

طاعتوں کی زد سے بچ بچ کر چلا راہِ خطا
وار اُن کا اس لیے اکثر خطا کرتا رہا
نفس میں جو ناروا خواہش ہوئی پیدا کبھی
اس کو، جیسے دل سے گھڑ گھڑ کر روا کرتا رہا

کرتے ہیں طاعت تو کچھ خواہاں نمایش کے نہیں
پر گنہ چھُپ چھُپ کے کرنے میں مزا پاتے ہیں ہم
ہیں فدا اُن دوستوں پر جن میں ہو صدق وصفا
پر بہت کم آپ میں صدق وصفا پاتے ہیں ہم
گو بھلائی کرکے ہم جنسوں سے خوش ہوتا ہو جی
تہ نشیں اس میں مگر ردِ ریا پاتے ہیں ہم
ہو ردائے نیک نامی دوش پر اپنے مگر
داغ رسوائی کے کچھ زیرِ ردا پاتے ہیں ہم

دیکھنے ہوں تمھیں گر جھوٹ کے انبار لگے
دیکھ لو جاکے خزانوں میں کتب خانوں کے
سچ نہ تحریروں میں پاؤگے نہ تقریروں میں
سچ کہیں ہو تو وہ سینوں میں ہو انسانوں کے

آنکھ سب ایک منڈی رکھتے ہیں اور ایک کھُلی
اس میں مسلم بھی ہیں ہندو بھی ہیں عیسائی بھی
جو چھپاتے ہیں حق اندیشۂ رسوائی سے
گھات میں اُن کے لگی بیٹھی ہو رسوائی بھی

ایسے نکات اور جواہر پارے حالی کے کلام میں آپ بکثرت پائیں گے۔

طنز سے بھی حالی کا کلام خالی نہیں۔ وہ ایک زرا سے لفظ سے یا چُبھتے ہوے اشارے سے وہ کام لیتا اور اثر پیدا کرتا ہو جو مزاحیہ نگار کے مضمون، شاعر کی ہجو یا واعظ کے وعظ سے نہیں ہوتا مثلاً ؎

نہیں چھپتے عیب اتنی ثروت سے تیرے
خدا دے تجھے خواجہ ثروت زیادہ
بڑا آپ کو وہ سمجھتا ہو ہم سے
سوا اس کے منعم میں کیا ہو بڑائی
ہو ادب مسند پہ جو کچھ ہو رئیسِ شہر کا
ہٹ کے مسند سے جو خود دیکھیں تو ہیں سرکار ہیچ
عقل کی بات کوئی ہم نے کہی ہو شاید
جتنی جتنے ہیں سب ہم سے حذر کرتے ہیں
دیں غیر دشمنی کا ہماری خیال چھوڑ
یہاں دشمنی کے واسطے کافی ہیں یار بس

ہمارے شاعروں نے زاہدوں اور واعظوں پر طرح طرح کی پھبتیاں کسی ہیں، کہیں اس کی ریش مبارک کی ہنسی اُڑائی ہے، کہیں اس کی پگڑی اُچھالی ہے، کہیں مغبچوں کے ہاتھوں رُسوا کیا ہے۔ حالی کے ہاں بھی ان بزرگوں کا ذکرِ خیر آتا ہے مگر بڑی تہذیب کے ساتھ۔ وہ صرف ان نفسیاتی چوریوں کی طرف طنز کرتا ہے جنھیں وہ اکثر چھپاتے رہتے ہیں۔ مثلاً ؂

ترک دُنیا کے علائق تو کیے سب زاہد　　　گر مناسب ہو تو اک ترک ریا اور سہی

("گر مناسب ہو" کے فقرے میں کس قدر تہذیب، ادب اور انکسار ہے مگر اس میں کیسا تیز نشتر چھپا ہوا ہے)

نکل آئے گی مے کشی کی بھی حلّت　　　کوئی بل گیا گر ہمیں یار واعظ

لوگ کیوں شیخ کو کہتے ہیں کہ عیّار ہے وہ　　　اُس کی صورت سے تو ایسا نہیں پایا جاتا

کہے اگر تم کو کوئی واعظ، کہ کہتے کچھ اور کرتے کچھ ہو　　　زمانے کی خو ہے نکتہ چینی کچھ اس کی پروا نہ کیجیے گا

گھر میں برکت ہے، مگر فیض ہے جاری شب و روز　　　کچھ سہی شیخ، مگر ہے بہ خدا ایک ہی شخص

ریا کو صدق سے ہے جامِ مے بدل دیتا　　　تمھیں بھی ہے کوئی یاد ایسی کیمیا ای شیخ

غرورِ فقر و غرورِ غنا میں فرق ہے کیا　　　تجھی پہ رکھتے ہیں ہم منحصر بتا ای شیخ

خبر بھی ہے تمھیں کیا بن رہی ہے بیڑے پر　　　ہیں آپ جو بسے بیڑے کے ناخدا ای شیخ

وہ ڈوبتوں سے الگ رہتے ہیں جو ہیں تیراک　　　شناوری کا یہی گُر ہے، مرحبا ای شیخ

میں تو سو بار ملوں، دِل نہیں ملتا تم سے　　　تو ہی کہ اس میں ہے کیا میری خطا ای زاہد

جال جب تک ہے یہ پھیلا ہوا دیں داری کا　　　فکر دنیا کا کرے تیری بلا ای زاہد

بُرائی ہے رندوں میں بھی شیخ لیکن　　　کہاں یہ بُرائی کہاں وہ بُرائی

جو دِل پہ گزرتی ہے کیا تجھ کو خبر ناصح　　　کچھ ہم سے سُنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا

اگرچہ حالی کی شاعری زندگی کے حقائق پر مبنی ہے مگر اس نے اپنی شاعری کو سیاست سے بچایا ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ سیاست کے مردِ میدان نہ تھے۔ آخر حقیقت شناس نظر اور حسّاس دِل رکھتے تھے ہندستان پر جو گزر رہی تھی اس سے کیوں کر گریز کر سکتے تھے۔ نہ رہا گیا اور کہا اور ایسے لطیف اور پُر اثر پیرائے میں

کہ ایک ایک لفظ دِل میں اُتر جاتا ہی ؎

صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چرانا پھرتا تھا
دیکھ کے اس کو سارے تھارے آگئے یاد احسان ہمیں

داد طلب سب غیر ہوں جب تو ان میں کسی کا پاس نہ ہو
بتلائی ہی زمانے نے انصاف کی یہ پہچان ہمیں

پاس انھیں گر اپنا ذرا ہو، جان بھی اپنی اُن پہ فدا ہو
کرتے ہیں خود نامنصفیاں اور کہتے ہیں نافرمان ہمیں

روسی ہوں یا تتاری ہم کو ستائیں۔گے کیا | دیکھا ہی ہم نے برسوں لطف و کرم تمھارا

"لطف و کرم" کو ملاحظہ فرمایے اس میں کیسی کچھ تلخی بھری ہوئی ہی

"کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان" تو کھُلی نکتہ چینی ہی۔

؎ نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی لیکن
حذر اُس لوٹ سے جو لوٹ ہی علمی و اخلاقی
نہ گُل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں
یہ گُل چینی ہی یا لٹس ہی گل چیں! یا ہی قزاقی

ہندستان کی غلامی ملاحظہ ہو ؎

کہتے ہیں آزاد ہوجاتا ہی جب لیتا ہی سانس
یہاں غلام آکر، کرامت ہی یہ انگلستان کی
اس کی سرحد میں غلاموں نے جو ہیں رکھا قدم
اور کٹ کر پانو سے ایک ایک کے بیڑی گر پڑی
قلبِ ماہیت میں انگلستان ہی گر کیمیا
کم نہیں کچھ قلبِ ماہیت میں ہندستان بھی
آن کر آزاد یہاں آزاد رہ سکتا نہیں
وہ رہے ہوکر غلام، اس کی ہوا جس کو لگی

آج کل دُنیا کی سیاسی حالت ؎

صلح ہی اک مہلتِ سامانِ جنگ
کرتے ہیں بھرنے کو یہاں خالی تفنگ
علم کیا اخلاق کیا ہتھیار کیا
سب بشر کے مار رکھنے کے ہیں ڈھنگ

بڑھ گیا ہے رحم انسانی بہت		ہو گئی ایجاد اب نئی توپ و تفنگ

جھپٹتے ہیں مردار کی پاکے بُو		یہ ہیں شیر مردوں کی جولانیاں
بنی نوع کے دوست کرتے ہیں آہ		بنی نوع پر آتش افشانیاں
کلیجے کے ٹکڑوں سے ہوتی ہیں یہاں		سدا چیل کووں کی مہمانیاں
جہاں سوزیوں کا ہے گویا کہ نام		جہاں داریاں اور جہاں بانیاں
ڈبوتی ہیں آخر کو منجدھار میں		یہ فرعونیاں اور ہامانیاں

سیاسی شاعری جو بعد میں پھولی پھلی اس کا بیج بھی سب سے پہلے حالی نے بویا۔

حالی سے پہلے ہماری شاعری ایک خاص طبقے میں محدود ہو گئی تھی، گویا اس کی بھی ایک ذات بن گئی تھی۔ سارا زور صناعی پر تھا۔ اور وہ تصنع، تکلفات، لفظی نزاکتوں اور رعایتوں میں اُلجھی ہوئی تھی۔ اس کی ایک خاص زبان ہو گئی تھی اور اس کے قدردان اور سمجھنے والے بھی خاص طبقے کے لوگ تھے جو اس سے لطف اندوز ہوتے اور ایک دوسرے کو داد دیتے تھے۔ حالی نے اُردو شاعری کو عوام تک پہنچایا کیوں کہ اس کی شاعری انسان اور انسانی اور قومی حیات سے تعلق رکھتی ہے۔ اور اس نے اسے ایسی سادہ اور عام فہم زبان میں ایسے انداز سے پیش کیا کہ سب کے دل اس کی طرف جھک گئے۔ باوجودے کہ تکلفات کی بلندیوں سے نکال کر حالی شاعری کو عوام سے قریب لایا لیکن اس میں ابتذال نہیں آنے دیا، ادبی شان کو قائم رکھا اور جوش اور تاثیر تو اس کا خاص حصہ ہے کیوں کہ وہ قدرت سے ایک دردمند دل لے کر آیا تھا۔

آج کل ہر طرف سے یہی آواز آ رہی ہے کہ آسان لکھو۔ مَیں ابھی وردھا سے آ رہا ہوں وہاں کانفرنس میں ہر شخص کی زبان پر یہی لفظ تھے آسان لکھو، آسان لکھو۔ گویا آسان لکھنا بہت آسان ہے۔ ایسا آسان لکھنا کہ سپاٹ ہو بے جان ہو تو اس سے تو نہ لکھنا بہتر لیکن ایسا آسان لکھنا کہ اس میں جان ہو جوش ہو دل آویزی ہو، ایسے ادیب کا کام ہے جو کوئی خیال رکھتا ہو، دل میں جذبہ اور اس کے اظہار کی قوت۔

ادب میں بیان کا اسلوب بھی بڑی چیز ہے۔ ایک محتاط اور اچھے ادیب کو اکثر اوقات بڑی اُلجھن ہوتی ہے جب وہ

اپنے خیال کو جیسا وہ چاہتا ہے ٹھیک ٹھیک ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کوئی ایسا اسلوب اُسے نہیں ملتا۔ آخر جب وہ پا جاتا ہے تو وہ نہایت سادہ اور بے ساختہ اسلوب ہوتا ہے۔ اعلا اور نازک جذبات صرف سادہ زبان میں ادا ہوسکتے ہیں۔ اور یہ گُر کوئی حالی سے سیکھے۔

یہ گُر اُسے کہاں سے مِلا؟ عام حیات کے مطالعے سے۔ اس کی تمثیلیں اس کی تشبیہیں اور استعارے حیات کی ایسی عام چیزوں سے لیے گئے ہیں جو ہر جگہ موجود ہیں مگر ہر ادیب کی نظر اُن پر نہیں پڑتی۔ اس کے لفظ روزمرّہ کے لفظ ہیں جن کا برمحل استعمال ہر ادیب نہیں جانتا۔ شاعر کا یہ کمال ہے کہ وہ معمولی جذبے کو غیرمعمولی اور چھوٹی سی بات میں نئی شان پیدا کردیتا ہے۔ مثلاً اس کی ایک نظم ہے جو اس نے اُس وقت لکھی جب مدرسۃ العلوم مسلمانانِ علی گڑھ کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اُسے ایک نہایت عام اور معمولی بلکہ ایک ادنا اور حقیر مثال سے شروع کیا ہے اور کہاں سے کہاں پہنچادیا ہے۔ وہ بند ملاحظہ ہو ؎

جُھٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹّی کا دِیا ایک بڑھیا نے سرِ راہ لاکے روشن کردیا
تاکہ رہ گیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں راہ سے آساں گزر جائے ہر ایک چھوٹا بڑا
یہ دِیا بہتر ہے اُن جھاڑوں سے اور اُس لیمپ سے روشنی محلوں کے اندر جن کی رہتی ہے سدا
گر نکل کر ایک ذرا محلوں سے باہر دیکھیے ہے اندھیرا گھُپ در و دیوار پر چھایا ہُوا

سُرخ رُو آفاق میں وہ رہ نما مینار ہیں
روشنی سے جن کی ملاحوں کے بیڑے پار ہیں

حالی نے شاعری سے جو کام لیا وہ اس سے پہلے کسی نے نہیں لیا تھا۔ وہ جگانے کے لیے آیا تھا۔ اس نے سوتوں کو جگایا اور غافلوں کو ہوشیار کیا۔ بھٹکے ہوؤں کی رہ نمائی کی اور افسردہ دلوں میں جوش اور حرکت پیدا کی۔

اُردو شاعری ہی حالی کی رہینِ منت نہیں، اُردو نثر پر بھی اس کا بڑا احسان ہے۔ اعلاحضرت مرحوم کی جوبلی کی تقریب میں جب مولانا حالی کا [illegible] ہوا تو علی گڑھ کالج کے چند قدیم طالب علموں نے نظام کلب میں مولانا کے اعزاز میں ایک دعوت دی۔ یہ بہت ہی مختصر مجمع تھا۔ مولانا کے جامِ صحت کے ضمن میں نواب عماد الملک بہادر

نے ایک تقریر کی جس میں انھوں نے ایک نئی اور عجیب بات کہی آپ نے فرمایا کہ ہماری زبانوں میں (یعنے اُردو فارسی عربی میں) نثر تھی ہی نہیں۔ مولانا حالی نے سب سے پہلے متین اور سنجیدہ نثر کی بنیاد ڈالی۔ یہ مبالغہ نہیں' حقیقت ہے۔ نواب عماد الملک معمولی شخص نہ تھے ان کا ادبی ذوق نہایت پاکیزہ اور اعلا تھا۔ انھوں نے جو بات کہی وہ قابلِ غور ہے۔ متین کا لفظ انھوں نے اصلی معنوں میں استعمال کیا تھا، یعنی قوی یا جان دار۔ ہماری زبانوں کی نثر ایک قسم کی شاعری یا نیم شاعری تھی۔ رنگین، مسجّع مقفّیٰ عبارتیں، دُور از کار تشبیہوں استعاروں اور مبالغوں سے لدی ہوئی۔ خیال کم اور لفظوں کی بھرمار۔ بات ایک اور اُسے طرح طرح سے کئی کئی جملوں میں ادا کیا جارہا ہے۔ ایک معنی کے لیے کئی کئی لفظ مترادف مسلسل استعمال کیے جارہے ہیں۔ اس سے بجائے وضاحت کے ابہام اور بجائے تاثیر کے بےکیفی پیدا ہوتی۔ البتہ صنّاعی کا کمال تھا جو لفظوں کا کھیل اور ذہانت اور طبّاعی کا مظاہرہ تھا۔

اس میں شک نہیں کہ سرسیّد احمد خاں نے سب سے اوّل خیال کو سادہ نثر میں ادا کرنے کی ابتدا کی۔ لیکن وہ ادیب یا شاعر نہ تھے۔ انھوں نے اس سادگی سے بہت کام لیا اور دوسروں کی رہ نمائی کی۔ لیکن جو متانت اور جانِ حالی کی نثر میں پائی جاتی ہے وہ کسی دوسرے ادیب کی نثر میں نہیں۔ حالی کے زمانے میں کئی مستند اور اعلا درجے کے نثّار ہوئے ہیں۔ لیکن وہ صرف اپنے کوچے کے مالک تھے جہاں انھوں نے دوسرے کوچے میں قدم رکھا تو ان کے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ بعض ان میں ایسے بھی تھے کہ جو ہر قسم کے مضامین لکھنے پر قدرت رکھتے تھے۔ ان میں فصاحت تھی شیرینی بھی تھی، بعض میں زبان کا چٹخارہ تھا لیکن جان نہ تھی۔ فصاحت ہو، شیریں بیانی ہو، زبان پر قدرت بھی ہو اور ایسی ہی بہت سی خوبیاں ہوں لیکن جان نہ ہو، تو وہ ادب ادب نہیں رہتا لفظوں کا خوب صورت مجموعہ ہوجاتا ہے۔ بعض ادیب تاثیر پیدا کرنے کے لیے تشبیہوں، استعاروں اور مبالغے سے کام لیتے ہیں یا کسی خیال کی قوّت کے اظہار کے لیے جملوں اور فقروں کے ردّے چڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ جب اس سے بھی کام نہیں چلتا تو چیخنا اور چلّانا شروع کردیتے ہیں یعنے بڑے بڑے لفظوں اور ثقیل جملوں کے پتھر لڑھکانے لگتے ہیں۔ عام قاعدہ ہے کہ کم زور شخص یا ایسا شخص جس کا دعوا کم زور ہے اور کوئی قوی دلیل نہیں رکھتا تو وہ شور غل مچاکر اور چیخ چیخ کر حریف کو مرعوب

کرنا چاہتا ہو۔ یہی حال اُن ادیبوں کا ہوتا ہو جن کے پاس کوئی اعلا خیال نہیں ہوتا یا جو بیان کے صحیح اسلوب کو نہیں جانتے۔ حالی زیادہ تر لفظوں سے کام لیتا ہو۔ وہ جملے میں ایسا برمحل لفظ بٹھا دیتا ہو جس سے سارا خیال چمک اُٹھتا ہو۔ اس کی نثر میں خیال و زبان کی صحت، لفظوں کا صحیح اور برمحل استعمال، ایجاز اور بیان کی سادگی پائی جاتی ہو۔

اس موقع پر مَیں خاص طور پر یہ بتانا چاہتا ہوں کہ حالی لفظوں کے استعمال میں بڑا کمال رکھتا ہو۔ یُوں تو ہزاروں لفظ لغت کی کتابوں میں بھرے پڑے ہیں لیکن وہ بے جان اور مُردہ ہیں۔ ایک کامل ادیب صحیح اور برمحل استعمال سے اُن میں جان ڈال دیتا ہو۔ اور یہ قدرت بہت کم لوگوں میں ہوتی ہو۔ حالی نے یہی نہیں کیا کہ جو الفاظ ہمارے ادب میں رائج تھے انھیں خوبی سے استعمال کیا بلکہ بہت سے سبک شیریں اور پُرمعنی الفاظ جو گمنامی میں پڑے ہوے تھے اور جنھیں اب تک دربارِ ادب میں بار نہیں ملا تھا، ہمارے ادب میں داخل کیے اور اس حُسن و خوبی کے ساتھ انھیں موقع موقع سے استعمال کیا ہو کہ حیرت ہوتی ہو اور افسوس ہوتا ہو کہ ایسے جان دار اور پُرمعنی لفظوں سے ہمارا ادب اب تک کیوں محروم رہا۔ فرسودہ اور پامال لفظوں اور تشبیہوں اور استعاروں میں جان نہیں رہتی، اُن میں پھسپھسا پن آجاتا ہو اور یہی وجہ ہو کہ لوگ زور پیدا کرنے کے لیے کئی مترادف الفاظ اور دُہرے تہرے جملے استعمال کرتے ہیں۔ نئے لفظوں، نئی تشبیہوں اور استعاروں سے زبان میں نیا خون داخل ہوتا اور نئی قوت اور شگفتگی پیدا ہوجاتی ہو۔ حالی کا یہ کچھ کم احسان نہیں۔

نثر میں حالی کی تین کتابوں یعنی 'یادگارِ غالب'، 'مقدمۂ شعر و شاعری' اور 'حیاتِ جاوید' کو درجۂ کمال حاصل ہوچکا ہو۔ یعنے یہ وہ کتابیں ہیں جو اُردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گی اور اسی شوق و ذوق سے پڑھی جائیں گی جیسے اس وقت پڑھی جاتی ہیں۔ حالی نے جس طرح شاعری میں ایک جدید رنگ پیدا کیا اسی طرح اس نے اُردو ادب میں تنقید اور سوانح نگاری کی بنیاد ڈالی۔ 'مقدمۂ شعر و شاعری' میں شاعری کی ماہیت، حیات اور سماج سے اس کا تعلق، اس کے لوازم، زبان کے بعض مسائل، اُردو شاعری کے اصنافِ سخن، ان کے عیوب و محاسن اور اصلاح پر بہت معقول اور مفکرانہ بحث کی ہو۔ اُردو زبان میں تنقید پر یہ پہلی کتاب ہو۔

اور اس موضوع پر اب تک اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ شعر کی خوبی کے لیے جن شرطوں کو حالی نے لازم قرار دیا ہو اس پر انھوں نے خود بھی عمل کیا ہو اور عمل کر کے دکھا دیا ہو کہ شعر اسے کہتے ہیں۔ مقدمے کے بعد سے ہماری زبان میں تنقید کا رنگ بدل گیا۔ پہلے تنقید کا مدار شعر کے ظاہر پر تھا مثلاً محاورہ درست ہو یا نہیں، زبان کی تو کوئی غلطی نہیں، بندش کیسی ہو، قافیہ ٹھیک بیٹھا ہو یا نہیں، تعقید تو نہیں وغیرہ وغیرہ۔ اب ظاہر سے زیادہ شعر کے باطن پر نظر پڑنے لگی ہو۔ گویا اب ہم تنقید کے صحیح اصول کو سمجھے ہیں۔ تنقید کے اس قسم کے اشارے آپ حالی کی دوسری کتابوں یعنی 'حیاتِ سعدی' اور 'یادگارِ غالب' میں بھی پائیں گے۔

سوانح میں پہلی کتاب جو حالی کے قلم سے نکلی 'حیاتِ سعدی' ہو۔ سعدی کی حیات کے متعلق فارسی ادب میں کوئی سامان نہ تھا۔ صرف ان کے کلام کے مطالعے سے شہد کی مکھی کی طرح ذرّہ ذرّہ چن کر سعدی کی سیرت اور اخلاق اور حالات کو مرتب کیا ہو۔ کلام پر مفصّل تبصرہ ہو اور اس کے محاسن اور ادبی نکات کو بڑے سلیقے اور خوبی سے بیان کیا ہو۔

'یادگارِ غالب' ہندستان کے عالی مرتبہ شاعر پر پہلی کتاب ہو۔ اگرچہ اس کے بعد غالب پر کئی کتابیں لکھی گئیں لیکن 'یادگارِ غالب' کو پڑھ کر غالب کے عادات و اخلاق، اس کی سیرت اور شخصیت کا جو نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہو اس سے دوسری کتابیں قاصر ہیں۔ 'یادگار' نے پہلی مرتبہ غالب کی قدر و منزلت اور عظمت لوگوں کے دل میں بٹھائی۔ اُس کی سیرت اور کلام کے مختلف پہلوؤں اور اس کے اشعار کی ظاہری اور باطنی خوبیوں اور نکات کو اِس انداز سے بیان کیا ہو کہ غالب کی شخصیت انسان اور شاعر کی حیثیت سے اس رُتبے کو پہنچ گئی ہو جس کا وہ مستحق تھا۔ یہ حالی کا طفیل ہو کہ ہم غالب کی شاعری کی سچی قدر کرتے، اُس کی یاد میں جلسے ترتیب دیتے، اس کے کلام پر مضامین لکھتے، اس کے دیوان کی شرحیں چھاپتے ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہو اور جاری رہے گا۔ 'یادگار' نے غالب کو زندۂ جاوید کر دیا اور خود یہ کتاب بھی اپنی ادبی خوبیوں اور حُسنِ بیان سے زندۂ جاوید ہوگی۔

تیسری کتاب 'حیاتِ جاوید' حالی کی سب سے بڑی اور اس کا سب سے بڑا کارنامہ ہو۔ اس میں صرف سیّد احمد خاں کی سیرت، اس کے حالات اور کارناموں ہی کا بیان نہیں بلکہ ایک اعتبار سے

مسلمانوں کے ایک صدی کے تمدن کی تاریخ ہے۔ اس میں اُس زمانے کی معاشرت، تعلیم، مذہب، سیاست، زبان، نئی تحریکیں اور اُن کے اثرات اور نتائج وغیرہ سب ہی کچھ آگیا ہے۔ یہ زمانہ بہت ہی انقلاب انگیز تھا۔ مسلمانوں کی حالت نہایت پست اور درماندہ ہوگئی تھی اس کی اصلاح کے لیے سرسید کی مساعی اور جدّوجہد، مخالفوں کی یورش، حکومت کی بے التفاتی اور سرد مہری، آپس کے تنازع یہ سب حالات بہت ہی دل چسپ اور عبرت انگیز ہیں۔ ایک ایسے شخص کے حالات کا لکھنا جو ہر طرف سے نرغے میں گھرا ہوا تھا، جو اپنی قوم کے لیے اپنوں اور غیروں سے مجاہدانہ لڑ رہا تھا اور جس کا موضوع کوئی ایک نہ تھا، بلکہ تعلیم، معاشرت، زبان، مذہب، سیاست سب ہی میں اسے کام کرنا اور دخل دینا پڑتا تھا، حالی ہی کے دل و دماغ کا کام تھا۔ حالی نے اِن تمام تحریکوں اور موضوعات پر بحث کی ہے۔ اُس سارے سامان کو جو منتشر تھا بڑی خوبی سے سمیٹا اور مرتب کیا ہے۔ ہماری زبان میں یہ اعلا اور مکمل نمونہ سوانح نگاری کا ہے۔ اَدبی لحاظ سے اس کتاب کا پایہ نہایت بلند ہے۔ اُردو نثر میں اس کا درجہ انتہاے کمال کو پہنچ گیا ہے۔ اس کے بعد اب تک کوئی کتاب اس پائے کی نہیں لکھی گئی۔ اس زمانے میں جو نثر لکھی جاتی ہے وہ حالی کا طفیل اور اسی کا عطیہ ہے۔ ایک شخص جس نے مغربی تعلیم نہیں پائی اور نہ جسے کوئی مغربی زبان آتی تھی اور نہ جس کے سامنے کوئی نمونہ تھا، ایسی معرکہ آرا کتاب لکھ ڈالے حیرت انگیز ہے۔ مولوی سید علی بلگرامی جس زمانے میں 'تمدنِ اسلام' کا ترجمہ کررہے تھے مجھے کہتے تھے کہ جب وہ ترجمہ کرنے بیٹھتے تو پہلے 'حیاتِ جاوید' کے چند صفحے پڑھ لیتے۔ نواب عماد الملک حالی کی شاعری سے زیادہ اس کی نثر کے قائل اور مدّاح تھے۔

حالی کے مزاج میں ضبط، اعتدال، رواداری اور بلند نظری تھی اور یہی خوبیاں اس کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ وہ کبھی کسی پر بے جا نکتہ چینی نہ کرتا اور نہ کسی کی دِل آزاری کرتا، کسی مسئلے کی بحث میں کبھی آپے سے باہر نہ ہوتا مگر سچ کے اظہار میں کبھی نہ ہچکچاتا۔ اس کی زندگی نمونہ تھی بہ حیثیت ادیب کے کیوں کہ اس کی ساری عمر اَدب کے لیے اور اَدب کی اصلاح کے لیے وقف تھی اور بہ حیثیت انسان کے کہ اس نے اپنی سیرت سے سچی تہذیب اور اخلاق کی مثال پیش کی۔

حالی کا کلام اس کی اصلی زندگی اور سوانح حیات ہے۔ اُسے کسی سوانح عمری کی ضرورت نہیں۔ اس کے

کلام میں اس کی سیرت، اس کی شخصیت، اس کے اخلاق، اس کے خیالات و جذبات صاف جھلک رہے ہیں۔ کون ہے جو اس کی مسدس، مناجاتِ بیوہ، شکوۂ ہند، چُپ کی داد، کلمۃ الحق، ننگِ صداقت، حبِ وطن اور دوسری نظموں کو پڑھکر اس کی دردمندی، سوز و گداز، عام ہمدردی، شرافتِ نفس، صداقت، پاکیزہ خیالات کا اثر اپنے دِل میں محسوس نہ کرے گا؟ کون ہے جو 'حیاتِ سعدی'، 'یادگارِ غالب'، 'حیاتِ جاوید'، 'مقدمۂ شعر و شاعری' اور اس کے دوسرے مضامین کے مطالعے کے بعد اس کی بلند خیالی، قوتِ تنقید، ذوقِ سلیم اور پُراثر اسلوب سے متاثر نہ ہوگا؟ اس طرح اس کے دِل و دماغ یعنے جذبات و خیالات سے متاثر ہوکر حالی کی جو تصویر ہمارے سامنے آئے گی وہ اُس تصویر سے کہیں زیادہ سچی اور پائے دار ہوگی جو عام سوانح عمریوں میں نظر آتی ہے جن میں خاندان، پیدایش، وطن، تعلیم، ملازمت یا پیشہ، روزمرہ کے کام کاج، کھانے پینے، اُٹھنے بیٹھنے، ملنے جلنے کا تذکرہ ہوتا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ یہ سب کام چند روزہ اور عارضی ہیں لیکن اس کا کلام جس میں انسانی فطرت اور انسانی زندگی کا گہرا مطالعہ ہے، غیر فانی ہے۔ وہ ہندستان کا سچّا شاعر تھا اور ایسا شاعر ہندستان ہی پیدا کرسکتا ہے۔ ہم بجا طور پر اُسے جدید ادب کا امام برحق کہہ سکتے ہیں۔

شہر آشوب کی تاریخ

(از جناب ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب ایم۔ اے ڈی لٹ لیکچرر یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور)

شہر آشوب کی ترکیب دو لفظوں سے مل کر بنی ہے۔ اہلِ لغت نے آشوب کے کئی معنے لکھے ہیں۔ مثلاً بہم برآمدن، شور و فتنہ و غوغا، ہجوم و اجتماع، ولولہ، بہ طور فاعل کے بھی استعمال ہوتا ہے یعنی آشوبندہ اور امر کے معنوں میں بھی آتا ہے۔

اصطلاحی معنوں میں اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی شہر یا ملک کی اقتصادی اور سیاسی بے چینی کا تذکرہ ہو یا شہر کے مختلف لوگوں (یعنی عوام) کی مجلسی زندگی کے کسی پہلو کا نقشہ ہزلیہ، طنزیہ یا ہجویہ انداز میں کھینچا گیا ہو۔

شہر آشوب کے یہ اصطلاحی معنے فارسی کی قدیم لغات میں نہیں ملتے۔ آخری زمانے کی فارسی لغتوں (اور پھر اُردو لغتوں) میں اس اصطلاح کی جو تشریح کی گئی ہے وہ جامع اور مانع نہیں۔ 'آنند راج' میں لکھا ہے:-

"شہر آشوب آں کہ در حسن و جمال آشوبندۂ شہر و فتنۂ دہر باشد و مدح و ذمے کہ شعرا اہلِ شہر را کنند۔"

'آصف اللغات' میں لکھا ہے: "فارسیاں ... ایں را برائے ہجوِ عام استعمال کردہ اند ......"

'فرہنگِ آصفیہ' میں اس کی تشریح یوں کی گئی ہے:-

(۱) وہ مدح یا ذم جو شعرا کسی شہر کی نسبت لکھیں۔

(۲) کسی شہر کے اُجڑنے یا برباد ہونے کا نظمیہ ذکر یا ماتم۔

(۳) وہ شخص جو اپنے حُسن و جمال کے باعث آشوبندۂ شہر ہو۔

'نور اللغات': "وہ نظم جس میں کسی شہر کی پریشانی، گردشِ آسمانی اور زمانے کی ناقدردانی وغیرہ کا ذکر ہو۔"

ہمارے اہلِ لغت نے شہر آشوب کے جو معانی بیان کیے ہیں، وہ بنیادی طور پر تو درست ہیں مگر شہر آشوبوں کے ان نمونوں کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس صنفِ نظم میں بعض ایسی باتیں داخل

ہیں۔ جن کا ذکر لغت نگاروں نے نہیں کیا۔ اس کے برعکس اس کے مفہوم میں بعض ایسے اُمور انھوں نے شامل کردیے ہیں۔ جو دراصل اس کی ماہیت سے خارج ہیں۔ مثلاً اگر آصفیہ' کی تشریح کے مطابق کسی شہر کی مطلق مدح یا ذم پر شہر آشوب کا اطلاق کردیا جائے تو وہ ہزاروں لاکھوں نظمیں جو شہروں کی مدح یا ذم میں فارسی' اُردو' عربی اور تُرکی میں لکھی گئی ہیں' ان سب کو شہر آشوب کہہ دیا جاتا حالاں کہ یہ نظمیں اس صنف میں شامل نہیں اسی طرح محض گردشِ آسمانی یا زمانے کی ناقدردانی کا ذکر کسی نظم کو شہر آشوب میں تبدیل کرنے کے لیے کافی نہیں۔

دراصل کسی نظم کا شہر آشوب کی صف میں شامل ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ اس میں چند بنیادی اوصاف اور شرائط موجود ہوں۔ اوّلین شرط اس نظم کی یہ ہے کہ اس میں کسی شہر (یا مُلک) کے مختلف طبقوں کا تذکرہ ہو علی الخصوص کاری گروں اور پیشہ وروں کا ذکر۔ دوسری صفت اِس نظم کی یہ ہے کہ اس میں اقتصادی اختلال یا کسی حادثے کی وجہ سے سیاسی اور مجلسی پریشانی کا ذکر ہو۔ ابتدائی زمانے کے شہر آشوبوں پر پہلی صفت غالب تھی مگر بعد میں دوسری صفت بھی شہر آشوب کے ساتھ لازم ہوگئی۔

ان شرائط کی روشنی میں اگر فارسی اور اُردو شاعری پر نظر ڈالی جائے۔ تو ہمیں بہت سی ایسی نظمیں مل جائیں گی۔ جو بہ آسانی ''شہر آشوب'' کے دائرے میں آجائیں گی — مگر مَیں موجودہ مقالے میں ان کا تذکرہ کرنے سے اجتناب کرتا ہوں۔ اگر وقت نے اجازت دی تو مَیں ''ہماری شاعری میں اقتصادی اور سیاسی عنصر'' کے عنوان سے ان نظموں پر الگ بحث کروں گا۔

شہر آشوب کی تاریخ

جہاں تک مجھے معلوم ہوسکا شہر آشوب کی ابتدا دسویں صدی ہجری میں ایڈریانوپل کے حماموں اور قہوہ خانوں میں ہوئی۔ اس وقت عثمانی ترکوں کے جاہ و جلال کا دورِ شباب تھا۔ اور ترکی ادب ترقی کی بہت سی منزلیں طے کرچکا تھا۔ اُس زمانے میں ترکی زبان کے ایک البانوی شاعر مسیحی (تخلص) نے ایڈریانوپل کے نوخیزوں کی تعریف میں ایک مثنوی لکھی جس کا نام ''شہر انگیز'' اور رکھا۔ اس ترکی نظم کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی چناں چہ ترکی میں اس کا تتبع بڑی کثرت کے ساتھ ہوا۔ اس نظم کا رنگ ہزلیہ تھا۔

ٹھیک اسی زمانے میں ایران میں بہت سے شہر آشوب یا شہر انگیز لکھے جاتے ہیں۔ ان نظموں میں

علاوہ ہزلیہ عنصر کے شدید ہجو کا جُز بھی شامل ہوجاتا ہے۔ یہی ایرانی شاعران شہر آشوبوں کو ہندُستان میں لاتے ہیں۔ اکبری اور جہاں گیری عہد میں لکھی ہوئی اس قسم کی چند نظموں کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے۔

مگر شاہ جہاں کے زمانے کے آخری حصّے میں بہشتی (تخلص ایک شاعر) اس نظم کے ہجویہ اور ہزلیہ رنگ کو ترک کرتے ہوئے، ایک آشوب نامہ خالص سیاسی مضمون پر لکھتا ہے۔ جس میں مُلکی اور سیاسی معاملات اور رعایا کی بےچینی کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس آشوب نامے سے متین شہر آشوبوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ اسی کے بعد چند باقاعدہ اور بےقاعدہ شہر آشوب لکھے جاتے ہیں۔ جن میں ہندُستان کے مختلف صوبوں کی سیاسی بدنظمی اور ابتری کا ذکر آتا ہے۔ عہدِ محمد شاہ کے عبرت نامے اور آشوب نامے اس سلسلے میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اُردو میں شہر آشوب کا آغاز قریب قریب اسی زمانے میں ہوتا ہے۔ شفیق اورنگ آبادی، شاکر ناجی، میر تقی میر اور مرزا رفیع السودا وغیرہ (جن کا ذکر آئے گا) شہر آشوب کو ایک منظّم شکل اور صورت بخشتے ہیں۔ جس سے یہ صنف ایک باقاعدہ نوع بن جاتی ہے۔ ان شاعروں نے مُلکی ابتری اور اقتصادی بےچینی کا طنزیہ تذکرہ کیا ہے۔

۱۸۵۷ء کے غدرِ دہلی میں شہر آشوب کا دامن خون سے رنگین ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد قدیم طرز کا شہر آشوب بھی ختم ہوجاتا ہے۔ ان شہر آشوبوں میں مرثیے کا رنگ نمایاں ہے۔

انقلابِ دہلی کے بعد ہندُستان میں نئے دَور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس تبدیلیٔ حالات سے نظم و نثر کا رنگ بدل جاتا ہے۔ چناں چہ بہت سی اصلاحی، قومی اور تعلیمی نظمیں لکھی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض کو "بےقاعدہ" شہر آشوب کی صف میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ سیاسی شاعری کی ترقّی اور اقتصادی نظموں کے فروغ نے شہر آشوب کی "فارم" کو تو پیغامِ موت دیا۔ مگر شہر آشوب کی رُوح کو ازسرِنو زندہ کردیا۔ مضمون اور معنے کے لحاظ سے ان نظموں کو اسلام آشوب، موذی آشوب، شکم آشوب، شہوت آشوب وغیرہ وغیرہ کے ناموں سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔

موجودہ عالم گیر اقتصادی بےچینی کے اظہار کے لیے جو نظمیں لکھی جارہی ہیں —— ان کو علامہ کیفی نے "عالم آشوب" کے موزوں نام سے موسوم کیا ہے۔

شہر آشوب کے ادوار مندرجۂ بالا بیان کی رو سے شہر آشوب کو ذیل کے ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :-

پہلا دور - ترکی کے ہزلیہ اور فارسی کے ہجویہ شہر آشوب جسے "خندۂ بے جا" کہہ دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

دوسرا دور - ہندستان کے متین فارسی شہر آشوب ــــ یا "خونِ برادر" (عہدِ شاہ جہانی کے بعد)

تیسرا دور - اُردو کے اقتصادی شہر آشوب ــــ "فاقہ مستی" (عہدِ محمد شاہ کے بعد)

چوتھا دور - غدرِ دہلی کے شہر آشوب ــــ "دلی کے آنسو"

شہر آشوب کے رسوم و قواعد مضمون کے لحاظ سے ابتدائی "شہر آشوب" کی بنیادی صفت صرف اسی قدر تھی کہ اس میں باشندگانِ شہر کے مختلف طبقوں سے متعلق کسی آشوب انگیز امر کا ذکر نظم میں موجود ہوتا تھا۔ ترکی شہر آشوبوں میں مختلف جماعتوں اور گروہوں سے تعلق رکھنے والے نازنیں نوخیزوں (یعنی لڑکوں اور لڑکیوں کے حسنِ شہر آشوب کا تذکرہ ہوتا تھا) فارسی شہر آشوبوں میں بنیادی صفت کے لزوم کے ساتھ طبقاتِ شہر کی ہجو اس میں شامل ہوئی۔ اُردو کے اقتصادی سیاسی شہر آشوب طنز، مرثیے اور نوحے کے انداز پر لکھے گئے۔

مگر ان مضامین کے اظہار کے لیے کسی خاص نوعِ نظم کی قید ملحوظ نہیں رکھی گئی۔ مثنوی، رباعی، مسدس، مخمس، غرض ہر صنف میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ ضرور کہنا پڑتا ہے کہ ہر دور میں ایک خاص صنف کو زیادہ مقبولیت ہوئی۔ مثلاً ابتدائی دور میں مثنوی اور رباعی، میر و سودا کے زمانے میں مخمس اور غدرِ دہلی کے دور میں مسدس ــــ! مگر اس معاملے میں پابندی لازماً نہیں کی گئی۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ شہر آشوب کی ہیئت اور ساخت اُردو میں معین ہوئی۔ میر اور سودا اور نظیر کے شہر آشوب ایک طرز کے ہیں۔ دہلی کے شہر آشوبوں میں شروع میں صفتِ دہلی اس کے بعد گریز، پھر بربادی کا ذکر، پھر دعا ــــ! یہ خصوصیات تقریباً سب میں پائی جاتی ہیں۔ چناں چہ ان کا مفصل تذکرہ بعد میں آئے گا۔

شہر آشوب کی اہمیت

شہر آشوب میں صداقت، اصلیت اور واقعیت کا رنگ موجود ہی اگر مجموعی طور پر اس کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ ایک ایسے گھرانے کی سچی مگر عبرت ناک داستان معلوم ہوتی ہو۔ جس کی حالت دیکھتے دیکھتے بدل گئی۔ ابھی ابھی خوشی کے شادیانے بج رہے تھے۔ رقص و سرود کی محفلیں جمی ہوئی تھیں۔ "لا" اور "پلا" کی صدائیں اُٹھ رہی تھیں۔ ناو نوش کے ہنگامے گرم تھے۔ قہقہے، کھیل کود، چھیڑ چھاڑ، لاگ اور لگاؤ، ہر روز روزِ عید، ہر شام شامِ طرب — ! لام کاف، ہزل اور ظرافت ایہ شہر آشوب کا اوّلین رنگ تھا۔

پھر نقشہ بدلتا ہو، انقلاب کی نظر لگتی ہو۔ خانہ جنگی اور آویزش سے جمعیتیں بکھر جاتی ہیں۔ شیرازے منتشر ہوجاتے ہیں۔ اس سے بدنظمی اور اختلال رونما ہوتے ہیں۔ اقتصادی بدحالی کا آغاز ہوتا ہو —— شعرا اس بدنظمی سے طنز کے رنگ میں ذکر کرتے ہیں۔

پھر خونیں انقلاب! ہنگامہ ہائے مرگ! جنازے پر جنازہ! فارغ البالی کے ماتم کے ساتھ جوہرِ انسانیت کے تلف ہوجانے کا غم —— یہ شہر آشوب کے آخری دوْر کا رنگ ہو۔

شہر آشوب کا پہلا دوْر

شہر آشوب کی ابتدا ترکی میں

پروفیسر رگب کا خیال ہو۔ کہ شہر آشوب کا موجد ایک ترکی شاعر مسیحی تھا۔ جس نے پہلے پہل ادرنہ کے حسینوں کی مدح میں ایک مثنوی لکھی۔ میں اس مثنوی کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے، شہر آشوب کی ابتدا کے متعلق پروفیسر براؤن کے خیالات یہاں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جن کی رائے یہ ہو کہ مسیحی کو اس صنف کا موجد قرار دینا کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کیوں کہ عین اسی زمانے میں ایران کے شعرائے فارسی شہر آشوبیں لکھتے نظر آتے ہیں۔ اور لطف یہ ہو کہ ان شاعروں میں سے کسی کا یہ دعوا نہیں کہ یہ کوئی غیر معمولی اور انوکھی صنفِ ادب ہو۔ اس کے علاوہ جن تذکرہ نگاروں نے اس قسم کی نظموں کا ذکر کیا ہو، ان میں سے کسی نے بھی اس کو جدید نوع قرار نہیں دیا۔

مگر پروفیسر براؤن کی اس رائے کے باوجود، اس امر کا قطعی فیصلہ نہیں ہوسکا کہ اس صنف کا بانی کون

ہے؟ اور سب سے پہلے کس زبان میں شہر آشوب لکھے گئے۔ تحفۂ سامی سے پہلے کسی تذکرہ نگار یا مورخ نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ ایک شہر آشوب، امیر خسرو کی طرف منسوب ہے اور ''جواہر خسروی'' (طبع علی گڑھ) میں چھپ چکی ہے۔ اس نسخے کے مرتب نے بھی اس بحث کو غیر فیصلہ شدہ چھوڑ دیا ہے۔ دیباچے میں ان رباعیات کو ''مثنوی شہر آشوب'' کہہ کر خسرو کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ شاید خسرو نے سنسکرت شاعری کا تتبع کیا ہے اور اس سلسلے میں گوپال کوی کسی ہندی شاعر کا تذکرہ کیا ہے۔ جس نے قدیم زمانے میں اس طرح کی نظمیں پیشہ وروں کے متعلق لکھی تھیں۔

یہ گوپال کوی کون تھے؟ انھوں نے سنسکرت کی نظمیں اس طرح کی لکھی تھیں یا نہیں؟ خسرو نے ان سے متاثر ہوکر کوئی شہر آشوب مثنوی تصنیف کی یا نہیں؟ ان سب سوالات کا جواب فی الحال میرے پاس نہیں۔ خسرو کی تصانیف میں اس قسم کی کسی کتاب کا شمار نہیں۔ یہ رباعیات جن کو غلطی سے مثنوی کہا گیا ہے، خسرو کی چیز معلوم نہیں ہوتی ——— بلکہ قیاس یہ کہتا ہے کہ یہ اکبری جہاں گیری دور کا کام ہے ——— ! ان حالات میں نتیجہ یہی نکالنا پڑتا ہے کہ شہر آشوب کا آغاز دسویں صدی ہجری میں ہی ہوا ——— ترکی میں خواہ ایران میں!

اس میں شک نہیں کہ شہر آشوب کی ترکیب اس صدی سے بہت پہلے کے ادب میں استعمال ہوئی ہے معالم العلما کے مصنف کا نام محمد بن علی بن شہر آشوب تھا۔ ان کا انتقال ۵۸۸ھ میں ہوا تھا ——— حافظ کے مشہور شعر ؎

فغاں کیں لولیانِ شوخ و شیریں کار و شہر آشوب چناں بُردند صبر از دل کہ تُرکان خوانِ یغما را

میں شہر آشوب کی ترکیب بطورِ صفت آئی ہے۔ اس شعر کو پڑھتے ہوئے میرا تخیل یہ کہتا ہے کہ بہت ممکن ہے کہ خود یہ شعرِ حافظ ہی اس صنفِ شہر آشوب کی ایجاد کا محرک ہوا ہو۔ اس لیے کہ یہ صنف اپنے ابتدائی دور میں ''لولیانِ شوخ'' اور ''شیریں کار'' محبوبوں کے وصف پر ہی مشتمل ہے۔ حافظ کے شعر میں یہ لفظ جس خوب صورتی کے ساتھ استعمال ہوا ہے، اس میں شدید ہیجان اور تحریک موجود ہے جیسا کہ صاحبانِ ذوق سے پوشیدہ نہیں۔ مگر یہ سب کچھ محض قیاس ہے اور ظاہر ہے کہ صرف قیاس پر استدلال کی پختہ عمارت تعمیر نہیں کی جاسکتی۔

شہر آشوب کی ابتدا کے متعلق یہ سب کچھ کہنے کے بعد اب میں سب سے پہلے ترکی شہر آشوبوں کا ذکر کرتا ہوں ——— ترکی کا اس لیے کہ سب سے پہلا ترکی شہر آشوب نویس یعنی مسیحی تاریخِ وفات (۹۱۸ھ) کے لحاظ سے اقدم ہے۔ فارسی کے پہلے شہر آشوب نویس کا نمبر اس کے بعد آتا ہے۔

شہر انگیز مسیحی

مسیحی اصلاً البانوی تھا۔ بایزید ثانی کے عہد میں قسطنطنیہ آیا۔ علی پاشا وزیر مسیحی کا قدردان تھا۔ مسیحی علی پاشا کے پاس بہ طورِ خوش نویس ملازم تھا۔ مگر لاأبالی اور رندِ مشرب ہونے کی وجہ سے فرائضِ منصبی کی انجام دہی اچھے طریق سے نہ کیا کرتا تھا۔ وہ عام طور پر "شہر اُغلان" (City lad) کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس کا انتقال بہ روزِ جمعہ بہ تاریخ ۱۶ر جمادی الاولیٰ ۹۱۸ھ (مطابق ۳۰ر جولائی ۱۵۱۲ء) میں ہوا۔

پروفیسر گب، مسیحی کے شاعرانہ کمالات کے بڑے معترف معلوم ہوتے ہیں۔ خاص کر، اس کی جدّت طرازی کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ غزل اور قصیدے کے علاوہ، اس نے منکررات اور مربّعات بھی لکھے ہیں جو یورپ میں بے حد مقبول ہوئے۔ مگر گب کے نزدیک، مسیحی کی اختراع اور ابداع کا سب سے بڑا ثبوت اور کارنامہ اس کی مثنوی شہر انگیز ہے جو ۱۸۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں اس نے ادرنہ کے نوخیز لڑکوں کی ایک منظوم فہرست پیش کی ہے۔ مصنّف مذکور کی رائے میں یہ مسیحی کی ایجاد ہے اس لیے کہ اس کے سامنے فارسی کا کوئی نمونہ موجود نہ تھا۔ مزید یہ کہ ترکی شاعری میں بذلہ اور ظرافت کی پہلی مثال ہے۔ مسیحی اس تصنیف کو اپنے لیے باعثِ فخر خیال نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک، اس کی غرض و غایت یہ ہے کہ لوگ اس کو پڑھ کر محظوظ ہوں۔ اور دوسری متین اور دقیق شاعری سے جب اُکتا جائیں تو یہ مثنوی ضیافتِ طبع کا کام دے۔

بہ ہر حال اس مثنوی کا مقصد ہنسنا ہنسانا ہے۔ اس کا اسلوب غزل کے اسلوب سے بالکل جدا ہے۔ سادہ، صنائع بدائع سے پاک، عوام کے لیے قابلِ فہم، تلمیحات آسان، فارسی اثرات کم اور مقامی اور عوامی رنگ زیادہ ——— یہی اس کے اسلوب کی خصوصیات ہیں۔

کتاب تین حصّوں پر مشتمل ہے (۱) تمہید یا دیباچہ (۲) فہرستِ حسیناں (۳) خاتمہ۔ دیباچے کی پانچ فصلیں ہیں۔ پہلی دو فصلوں میں شاعر اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہے اور خدا سے مغفرت کا طالب ہوتا ہے۔

تیسری فصل میں اس شہرانگیز کی مقبولیت کے لیے دعا کرتا ہے چوتھی فصل میں ایک رات کا سماں بیان کرتا ہے۔ اور پانچویں فصل میں ایک صبح کی کیفیت، ایڈریانوپل کی مدح، اور دریاے طنجہ میں نوخیز لڑکوں کے نہلانے کا حال!

اس کے بعد "حسینوں" کا بیان شروع ہوتا ہے نماتے میں غزل ہے۔ یہ حسین شہر کے عام یا متوسط طبقوں سے متعلق ہیں یا پیشہ وروں کے بیٹے ہیں۔ ان حسینوں کا تذکرہ ان کے باپوں کے پیشے کے اعتبار سے کیا گیا ہے بیش تر رعایتِ لفظی اور تجنیس کے ذریعے لطف پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان حسین لڑکوں کے نام بھی دیے گئے ہیں مگر قیاساً یہ اصل نام نہیں۔ گب کی راے ہے کہ یہ مثنوی ترکی ادب میں بہ لحاظِ جدت کے ایک بے نظیر کارنامہ ہے۔ اس کی مقبولیت کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ ترکی میں اس کے بعد اس صنف کا بہت چرچا ہوا اور مسلسل تین سو سال تک بڑے بڑے شعرا، اپنے وقار اور ثقاہت کو بالاے طاق رکھتے ہوے اس "ہزلیہ شاعری" کا "ارتکاب" کرتے نظر آتے ہیں (کچھ آگے چل کر ان شعرا کی ایک فہرست دی جاتی ہے)

شعراے ترکی میں مسیحی کے بعد عزیزی نے ایک "شہر انگیز" لکھا جو لڑکوں کی بجاے قسطنطنیہ کی لڑکیوں کی مدح میں ہے۔ یہ مثنوی بھی شہرانگیزِ مسیحی کی بحر میں ہے۔ اس کے بھی تین حصے ہیں۔ وہی رات اور صبح کا سماں، وہی انداز، وہی رنگ، وہی بذلہ، وہی ظرافت! اُسی طرح پیشہ وروں اور کاری گروں کا تذکرہ! غرض ہر لحاظ سے مسیحی کا جواب ہے۔

مسیحی اور عزیزی کے علاوہ چند ترکی "شہرانگیز" نویسوں کے نام یہ ہیں:

لامعی —— شہرانگیز مواضع بروصا یا نامۂ شہرانگیز محابیبِ دل فریب بروصا۔ (اس کا ذکر (Flügel) فلوگل نے فہرستِ مخطوطاتِ وائنا میں کیا ہے)

وحید مختوم —— لالہ زار یعنی شہرانگیز وحید آفندی۔

فقیری [1] —— !

---

[1] فان ہیمر نے اپنی کتاب "عثمانی شاعری کی تاریخ (جلد ا صفحہ ۱۳۶ و صفحہ ۲۷۵)" میں فقیری کو شہرانگیز کا موجد قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ "مسیحی اس کا مخترع اور موجد نہیں" اس کے متعلق گب لکھتے ہیں کہ "یہ تو صحیح ہے کہ فقیری نے "ایک طرح کا شہرانگیز" لکھا ہے۔ مگر یہ درست نہیں کہ وہ شہرانگیز ہے۔ اس میں تو مختلف پیشہ وروں اور کاری گروں کے متعلق اشعار ہیں، مثلاً شعرا، چاوش، اُلاغ، بازی گر وغیرہ، نیز اس کا بھی ثبوت موجود نہیں کہ فقیری نے مسیحی سے پہلے یہ مثنوی لکھی" (گب۔ ج۔ صفحہ ۲۳۷)

ترکی شہرانگیزوں کی اہمیت

ترکی شہرانگیزوں کی اہمیت اس مقالے کے سلسلے میں صرف اسی قدر ہے کہ ان سے ہمیں شہرآشوب کی بعض بنیادی صِفات کا پتا چل جاتا ہے۔ اور وہ میرے خیال میں یہ ہیں ـــــ (۱) کسی شہر یا خطّے کا ذِکر (۲) عوام یا متوسّط طبقے کی مجلسی زندگی کے کسی آشوب انگیز پہلو کا ذِکر (۳) شہر کے پیشہ وروں اور کاری گروں کا ذِکر۔

اس لحاظ سے 'ابتدا ہی سے اس نظم میں عوامی رنگ پایا جاتا ہے اور طبقات یا شہر کے پرولتاری فرقوں کا ذِکر اس کا وہ بنیادی وصف ہے جو آخری دور تک سب شہرآشوبوں میں ـــــ کبھی کم کبھی زیادہ ـــــ موجود ہے۔

شہرآشوب فارسی میں

جیسا کہ ابھی بیان ہوا ہے، فارسی میں شہرآشوب کا آغاز بھی تقریبًا اسی زمانے میں ہوتا نظر آتا ہے۔ جس میں ترکی کے ابتدائی شہرآشوب لکھے جاتے ہیں۔

ہمیں 'تحفۂ سامی' سے چند شہرآشوبوں کا حال معلوم ہوتا ہے:۔

شہرآشوب ہرات

سلطان حسین مرزا کے ایک معاصر شاعر آگہی خراسانی نے جو "منشی" اور "فاضل" تھے اور قصیدے کی طرف میلان رکھتے تھے، اہلِ ہرات کی ہجو میں ایک شہرآشوب لکھا۔ اس شخص کی طبیعت پر ہزل گوئی اور ہجو نویسی غالب تھی۔ بہ قول 'تحفۂ سامی'[1] "امّا خباثت بر مزاجش غالب" اِس رجحانِ طبع کا اکثر اس سے اظہار ہوتا رہتا تھا۔ چناں چہ اسی سے مجبور ہوکر اس نے ایک قصیدہ لکھا جس میں ہرات کے بڑے بڑے لوگوں کو بُرا بھلا کہا۔ خواجہ معین کمیال کے متعلّق بھی اس میں دو شعر تھے۔ مگر اتنے برمحل اور برجستہ کہ خواجہ کو حفظ تھے اور وہ بہ طورِ مطائبہ اِدھر اُدھر ان کو پڑھ کر سُنایا کرتا تھا۔ ایک شعر احمد اتون کی مذمت میں بھی تھا، اس کی وجہ سے امیر خاں حاکمِ ہرات نے مشارٌ الیہ کے ورغلانے سے آگہی کی کی زبان اور دایاں ہاتھ کاٹ ڈالے۔ کہتے ہیں کہ زبان کا کٹنا اس کے لیے کچھ مفید ہی رہا کیوں کہ اس کے بعد اس کی زبان اور صاف ہوگئی۔ بائیں ہاتھ سے لکھا کرتا تھا۔ ۹۳۲ھ میں بہ مقام ہرات انتقال ہوا۔

اس قصیدے میں آگہی نے بہت رکیک الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اور اتنے فحش کہ 'تحفۂ سامی'

---

[1] 'تحفۂ سامی' (اقبال حسین ایڈیشن) صفحہ ۷۵

کا مصنف ان کو دُہرانے سے احتراز کرتا ہے۔ خصوصیت اس میں شہر آشوب کے سلسلے میں صرف اس قدر ہے کہ "تحفۂ سامی" نے اس ہجویہ قصیدے کا نام شہر آشوب لکھا ہے۔ اس میں باشندگانِ ہرات کے مختلف طبقوں کا ذکر مذمت کے رنگ میں موجود ہے۔ اور غالباً اسی بنیادی صفت کی وجہ سے اس کا نام شہر آشوب رکھا گیا ہے اس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

عرصہ شہر ہری رشکِ بہشت انور است　　　درگہش راشمہ خورشید گل میخ زر است

شہر ہرات کی خوب صورتی کی تعریف کے بعد اہلِ ہرات کی مذمت یوں شروع ہوتی ہے ؎

چرخِ کج رو بیں کہ از تاثیر او شہرے چنیں　　　مسکنِ جمعِ پریشاں روزگارِ ابتر است

شہر انگیز تبریز اسی زمانے کے ایک اور شاعر وحیدی قمی (متوفی ۹۴۲ھ) نے ایک "شہر انگیز تبریز" لکھا۔ یہ صاحب بہ قول صاحبِ "تحفۂ سامی" بڑے شکم پرست اور طماع تھے۔

"در وادے غلوِ طمع ہم وارہ چشم بر آب و علف می داشت"

اس کا یہ شہر انگیز مثنوی میں ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

شکر للہ کہ بہر شہر انگیز　　　از ہری آمدم سوے تبریز
تا بہ وصفِ بتانِ تبریزی　　　ہم چو طوطی کنم شکر ریزی
وہ چہ تبریز رشکِ ہشت بہشت　　　مردمش خوبروے پاک سرشت
نازنیناں بہ ناز و محبوبی　　　در کمال و لطافت و خوبی

اس شہر انگیز کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شہر کے "پیشہ وروں" اور "کاری گروں" کے نوخیز بیٹوں اور بچوں کے حُسن و جمال کا تذکرہ بہ قیدِ طبقات ہے۔ مثلاً "شیشہ گر پسر" کی صفت میں دو شعر یہ ہیں ؎

دل برِ شیشہ گر بہ رعنائی　　　مردمِ دیدہ راست بینائی
بس کہ شد شیشہ اش پسندیدہ　　　ہم چو عینک نہند بر دیدہ

تبریز اور ہرات کے علاوہ بعض اور شہر آشوبوں کا ذکر بھی "تحفۂ سامی" میں آیا ہے مثلاً فغفور لاہجی کا شہر آشوب گرجستان، عشقی کا شہر آشوب تبریز۔ اسی طرح وجیہ الدین عبداللہ لسانی شیرازی کا شہر آشوب خطۂ تبریز۔

'تاثرِ رحیمی' میں فغفور لاہجی کے شہر آشوب کا تذکرہ ہے۔ اور 'طبقاتِ اکبری' اور بدایونی نے عزیزی قزوینی کی نظم شہر آشوب کا ذکر کیا ہے۔

جہاں تک اندازہ لگایا جاسکتا ہے، ان سب شہر آشوبوں کی ایک دو باتیں مشترک ہیں۔ یعنی (۱) کسی شہر کا مدحیہ یا ہجویہ ذکر اور (۲) کسی شہر کے باشندوں کے مختلف طبقات کا حال کسی خاص مجلسی سرگرمی کے تعلق میں۔

افسوس ہے کہ عہدِ مغلیہ میں اس قسم کی نظمیں بہ کثرت دست یاب نہیں ہوسکیں۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ اس دور میں ان نظموں کا رواج تھا۔ مگر ان کا مضمون ہجویہ تھا۔ جو شہر آشوب خسرو کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ بھی غالباً اسی دور سے تعلق رکھتا ہے۔

آشوب نامہ بہشتی

مورخین کا خیال ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کا روزِ آغاز عہدِ شاہ جہانی کا آخری حصہ تھا۔ اسی دور میں ترکی حسیات کا خاتمہ ہوتا ہے جس کے ساتھ ساتھ "ہندستانی" تحریکوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ سلطنتِ دہلی کے لیے کش مکش اور مسابقت، شاہ جہاں کے بیٹوں کے درمیان خود باپ کی زندگی میں شروع ہوگئی تھی۔ چناں چہ شاہ جہاں کے ضعیف ہوتے ہی ریشہ دوانیاں شروع ہوئیں جو بڑھتے بڑھتے باقاعدہ جنگ میں مبدّل ہوئیں۔ یہ جانشینی کی وہ جنگ تھی جس میں آخرکار اورنگ زیب کو فتح ہوئی۔

ان جنگوں کا حال یوں تو تاریخ کی سب کتابوں میں ملتا ہے مگر اس دور کے ایک شاعر بہشتی نے آشوب نامۂ ہندستان کے نام سے ایک مثنوی لکھی ہے جس میں "سوانحے کہ در اثنائے ۱۰۶۷ و ۱۰۶۸ ھ دریں عالمِ کون و فساد بہ ظہور آمدہ" آشوبِ سلطنتِ ہند کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔ بہشتی دراصل مراد بخش کا حامی اور خانہ زاد تھا اسی لیے جا بہ جا اپنے آقا کے حق میں کلماتِ خیر کہتا سنائی دیتا ہے۔ ہندستان میں جانشینی کے سلسلے میں کسی معین قانون کی غیر موجودگی پر افسوس کرتا ہے اور کہتا ہے کہ روم میں یہ مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہوجاتا ہے۔

یہ کتاب کئی اعتبارات سے بڑی اہم ہے۔ مگر موجودہ مضمون کے نقطۂ نگاہ سے بھی اس کی بہت

اہمیت ہے۔ اس کا نام شہر آشوبِ ہندستان ، آشوب نامۂ ہندستان ہے۔ اس کی رعایت سے مصنف نے ہندستان میں تیموری شاہزادوں کی خانہ جنگی کا حال بیان کرتے ہوے، رعایا کے مختلف طبقات کی اقتصادی بدحالی اور مجلسی اختلال کا مؤثر تذکرہ کیا ہے، پیشوں اور صنعتوں پر جو بُرا اثر پڑا ہے، اس کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ ”بے نوکری“ اور بے روزگاری کی عام شکایت اور اس سے جو تجارتی کساد بازاری پیدا ہوئی، اس کا عام شکوہ کیا ہے۔

اس مثنوی کو پڑھ کر یہ راے قائم کرنا کہ آگے چل کر ہمیں اُردو کے شہر آشوب عہدِ محمد شاہی کے لگ بھگ جو ملتے ہیں۔ وہ گمانِ غالب ہے کہ اسی مثنوی آشوب نامے سے متاثر ہوکر لکھے گئے ہوں گے اور غالباً یہی وہ نظم ہے جس نے قدیم شہر آشوبوں کے ہجویہ یا ہزلیہ رنگ کی بجاے نئے شہر آشوبوں میں اقتصادی اور سیاسی رنگ بھرنے کی ابتدا کی۔ پس اس لحاظ سے بہشتی کا شہر آشوب بڑی قابلِ قدر تصنیف ہے۔ [۱]

شہر آشوب کا دوسرا دور

اورنگ زیب عالمگیر کے بعد ہندستانی شہر آشوبوں کا (فارسی اُردو دونوں زبانوں میں) بڑا رواج رہا۔ اور سچ یہ ہے کہ حالاتِ زمانہ کا اقتضا بھی یہی تھا۔ سیاسی فضا کے ساتھ ساتھ عام شاعری کا رنگ بدلا ہو یا نہ بدلا ہو شہر آشوب کا رنگ بالکل بدل گیا۔ ہندستان کے طول و عرض میں مُلکی اختلال، خانہ جنگی، بے روزگاری، مجلسی بے اعتمادی، معاشرتی گڑبڑ اور بے چینی اس قدر عام ہوگئی تھی کہ اس کے احساس سے کوئی صاحبِ دل خالی نہ ہوگا۔ غلام علی آزاد نے ”خزانۂ عامرہ“ میں جابجا عسکری نظام کی شکست اور فنِ سپاہ گری کے زوال کا ماتم کیا ہے۔ شعراے عصر اگرچہ خاص حقائق کے اظہار سے عموماً مجتنب تھے جس کی وجہ سے واقعاتِ تاریخی کی تفصیل ان کے کلام میں کچھ زیادہ نہیں ملتی پھر بھی ان کا کلام عام سیاسی بے چینی اور بے قراری کی غمازی ضرور کرتا ہے۔

اس بارے میں عہدِ محمد شاہی بڑا عبرت ناک دور تھا۔ اس زمانے کے مصنفوں پر اس زمانے کی مصیبتوں

---

[۱] ل راے شوقی صوبے دار پنجاب کے ایک متوسل تھے۔ انھوں نے پنجاب کے حالات کی ابتری کی شکایت کرتے ہوے ایک قصیدہ اورنگ زیب کو لکھا تھا جو انوری کے قصیدے اشکِ خراسان کی زمین میں ہے۔ اس کا رنگ بھی شہر آشوبی ہے۔ مگر اس کا نام شہر آشوب نہیں (گل دستۂ سخن قلمی)

اور ہلاکت خیزیوں کا بڑا اثر نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ کتابوں کے عنوان اور نام بھی اس کا اظہار کرتے ہیں۔ اس زمانے میں عبرت نامے، فلک آشوب اور شہرآشوب لکھے جاتے ہیں۔ جن کے مضامین واقعی عبرت اور آشوب کے مرقعے ہیں۔

جعفر زٹلی کی فریاد، فائز محمد شاہی کا شہرآشوب، شفیق اورنگ آبادی کا شہرآشوب اسی پُرہلاکت دور کی یادگاریں ہیں۔

نادرشاہ کے حملے نے ان مصائب میں اور اضافہ کیا۔ مغل صوبے داروں کے عسکر منتشر ہوگئے۔ بے روزگاری عام ہوگئی۔ شریف اور نجیب امیری کے مسند سے اُتر کر فقیری اور گداگری کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے۔

اس تمام صورتِ حال کو اس دور کے شہرآشوبوں نے بڑی عمدگی اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ محمد شاہ کے عہد سے لے کر بہادر شاہ ظفر کے انجام تک جو شہرآشوب منظوم ہوے، ان کا رنگ اقتصادی ہے۔ اور ان کو پڑھ کر عام "بے نوکری" اور معاش کے فُقدان کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

ان شہرآشوبوں کی فہرست یہ ہے:-

(۱) شہرآشوب شفیق اورنگ آبادی (۲) شہرآشوب کم ترین دہلوی (بہ حوالہ گلشنِ ہند) (۳) مخمّس شاکر ناجی (بہ حوالہ مجموعۂ نغز) (۴) شہرآشوب قطعہ و مخمّس سودا (۵) شہرآشوب مخمّس میر تقی میر (۶) شہرآشوب نظیر اکبرآبادی (۷) شہرآشوب راسخ عظیم آبادی۔

یہ اقتصادی شہرآشوب اپنی نوع کی افضل ترین اور مکمل ترین نظمیں ہیں۔ میر، سودا، نظیر اور راسخ کے شہرآشوبوں سے ادبِ اُردو کا کوئی طالبِ علم ناواقف نہیں ہوسکتا۔ یہی وہ نمونے ہیں جن کی وجہ سے اُردو میں شہرآشوب کو مستقل حیثیت ہوئی۔ میرے ناقص خیال میں میر اور سودا نے ہمارے لیے اس نظم کا ایک بلند پایہ معیار قائم کیا ہے۔ اقتصادی رنگ اور طبقات کا تذکرہ ان کی بنیادی صفت ہے اور شہر کے وصف کی جگہ عام مُلک کی حالت بیان کی ہے۔ غدرِ دہلی کے شہرآشوب نویسوں نے اس دور کی بہت سی بنیادی خصوصیات کو اپنی نظموں میں قائم رکھا ہے۔ [اُردو کے اس دور کے شہرآشوبوں کا تبصرہ اورنٹیل کالج میگزین میں شائع ہورہا ہے۔ جہاں اس کے سب پہلوؤں پر مفصّل لکھا ہے]

شہر آشوب کا تیسرا دور

دہلی کے شہر آشوب

غمِ بربادیِ دہلی میں بجائے مئے ناب ؎
خونِ دل پیتے ہیں اب بادہ کشانِ دہلی

غدرِ دہلی سے شہر آشوب کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ جس میں اس مضمون کی ہیئت اور مضمون میں ہمیں بہت سے تغیرات نظر آتے ہیں۔ اُدھر زمانے کا رنگ اور سیاسی واقعات کی رفتار بدلی۔ اِدھر شہر آشوب کا لباس اور پیرہن مختلف ہوگیا۔ پہلے وقت کی شکایت، بدنظمی اور بے روزگاری کا شکوہ عسکری نظام کے اختلال کا گلہ ہجو اور طنز کے انداز پر تھا۔ مگر اب نہ لشکر رہا اور نہ صاحبِ لشکر، جو برائے نام سی شہریاری باقی تھی۔ اُسے بھی غدر کا سیلاب بہا کر لے گیا۔ اس طوفان میں صدیوں کی کمائی خس وخاشاک ہوکر بہ گئی۔ اس لیے ہجو اور طنز نے مرثیے کی جگہ لے لی اور مرثیہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا غدر کے بعد سوا حسرت کے باقی ہی کیا رہا تھا۔ گھر میں الخ

اس دور کے شہر آشوب میں (سوا ایک کے[1]) سب کے سب بربادیٔ دہلی سے متعلق ہیں۔ یہ شہر آشوب ہیں کیا ہیں خون کے آنسو ہیں، آہیں ہیں نالے ہیں۔ دِل کے ٹکڑے ہیں جو الفاظ و حروف کا کاغذی پیرہن پہنے ہوئے ہیں۔ اِس آشوبِ بلا میں کون سی مُصیبت تھی جو آفت زدگانِ دہلی پر نہ ٹوٹی اور کون سی قیامت تھی جو برپا نہ ہوئی۔ یہ وہ ہنگامۂ محشر تھا جس کا حال سُن کر دشمن بھی رنج واندوہ سے دل گیر ہوئے۔ پھر وہ کیوں نہ ہوتے جن پر غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، جن کی آنکھوں کے سامنے عزیز ترین متاع لُٹ گئی۔ جن کی پیاری یادیں اور محبوب یادگاریں غُبار ہوکر اُڑگئیں۔ یا خاک کا ڈھیر ہوکر پیوندِ زمیں ہوگئیں۔ ؎

سب کہاں، کچھ لالہ وگُل میں نمایاں ہوگئیں　　خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں　　لیکن اب نقش ونگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

شعرائے دہلی نے اِس قیامت خیز مصیبت اور حادثے پر بڑی کثرت کے ساتھ نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں۔ ان

---

[1] میاں داد خاں سیاح کا شہر آشوب۔

نظموں اور غزلوں میں درد اور غم کی فراوانی ہے۔ حقیقی اور سچے جذبات ہیں۔ زخمی دلوں کی فریاد ہے اور مجروح سینے کی آہ و بکا ——— ! ——— یعنی ایام غدر میں جو گزری سو گزری مگر مصیبت زدگان کا قافلہ جب مٹی ہوئی اور لُٹی ہوئی دلّی میں واپس آتا ہے تو دہلی کو ویرانہ اور خرابہ پاتا ہے ——— اس پُر وحشت منظر سے کون تھا جو متاثر نہ ہوتا۔ پھر کیا وہ نہ ہوتے جن کی آنکھوں نے وہ بھی دیکھا جو دیکھنے کے لائق تھا اور اب وہ دیکھا جو نہ دیکھنے کے لائق تھا۔

پس آشفتگی اور دیوانگی کے عالم میں شعرائے دہلی، عرب شاعر کی طرح، عظمت اور شوکت کے ہر ہر کھنڈر پر اشکِ خون بہاتے نظر آتے ہیں۔ کبھی قلعے کو دیکھتے ہیں، کبھی چاندنی چوک پر عبرت کی نظر ڈالتے ہیں۔ کبھی اُجڑے ہوئے محلات اور مسمار شدہ مکانات پر حسرت کی آنکھ ڈالتے ہیں کبھی جامع مسجد کی سیڑھیوں کی خاک کو آنکھوں سے لگاتے ہیں جہاں کے میلے ٹھیلے اور چہل پہل اور ہنگامے دلّی کی جان ہوا کرتے تھے ——— انھی برباد شدہ آثار اور تاراج شدہ مقامات کا مرثیہ اس دور کے شہر آشوبوں کا موضوع ہے۔

شہر آشوب دہلی کے مجموعے

دہلی کے شہر آشوبوں اور آشوب ناموں کے دو مجموعے میری نظر سے گزرے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام فغانِ دہلی ہے اور دوسرے کا نام فریادِ دہلی۔

فغانِ دہلی جسے محمد تفضّل حسین کوکب نے ۱۲۷۹ھ میں مرتّب کیا تھا۔ ۱۲۸۰ھ میں مطبع احسن المطابع دہلی میں چھپی۔ یہ مجموعہ تین شراروں میں منقسم ہے:-

شرارۂ اوّل۔ کلام حضرت محمد سراج الدّین ظفر و مرزا رفیع السودا

شرارۂ دوم۔ در مسدسات شہر آشوب کہ در زمانۂ آشوبِ دہلی بہ زبانِ سخن وراں رسیدہ۔

شرارۂ سوم۔ در غزلیات وغیرہ۔

اس مجموعے کی نظمیں حروفِ تہجّی کے اعتبار سے مرتّب ہوئی ہیں۔ لیکن "پاسِ ادب" سے ظفر اور مرزا سودا کو اس ترتیب سے مستثنا قرار دیا ہے۔ مسدسات شہر آشوب جنھیں آج کے موضوع سے اصل تعلق ہے۔ تعداد میں ہیں۔ سودا کا کلام اس سے پہلے دور سے متعلق ہے۔ باقی رہیں غزلیات اور مختصر قطعات سو وہ معناً شہر آشوب ہیں حقیقتاً شہر آشوب نہیں۔

شہرِ آشوبِ دہلی کا دوسرا مجموعہ موسوم بہ انقلابِ دہلی (معروف بہ فریادِ دہلی) ۱۹۳۱ء میں نظامی پریس یو۔پی میں طبع ہوا۔ اس میں ۷۷ نظمیں ہیں۔ ان میں مسدسات، مخمسات، غزلیات، قطعات سب شامل ہیں۔ ترتیب اس مجموعے کی بھی حروفِ تہجی کے اعتبار سے ہے۔ مگر تیمناً و تبرکاً مرزا سودا کا کلام (یعنی ان کا آشوبیہ کلام) آخر میں بطور خاتمے کے لایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس مجموعے کی بنیاد بھی کوکب کی فغانِ دہلی پر رکھی گئی ہے۔ بجز اس کے کہ ایک آدھ غزل کا اس میں اضافہ ہے مثلاً غالب کی غزل "مقتلِ دہلی" سے متعلق۔ انقلابِ دہلی پر دیباچہ خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے یا حالی کی غزل "تذکرۂ دہلی مرحوم"۔

شہرِ آشوب دہلی کی فہرست

دہلی کے شہرآشوب جن جن شعرا نے لکھے ہیں ان کی ایک فہرست درج ذیل ہے:-

آزردہ دہلوی	سالک	کامل
افسردہ دہلوی	سوزاں	مبین
تشنہ	ظہیر	محسن
داغ	عیش	

وہ شعرا جنھوں نے آشوبیہ غزلیں لکھی ہیں اُن کے نام یہ ہیں:-

احسن	راقم	طالب
احقر	سالک	ظہیر
اکرام	سپہر	صاحب
احمد	شیفتہ	عیش
تجمل	شاطر	عاقل
ثاقب	شائق	عزیز
داغ	صابر	عاصی
رضوان	ضمیر	عابد

قمر	لطف	محسن
کوکب	مبین	ہنر
کامل	ہدی	

اسی کے ساتھ حسامی دہلوی، حالی پانی پتی، رضوان دہلوی، شمشیر دہلوی، صفیر دہلوی، ضمیر دہلوی، طالب دہلوی، ظاہر دہلوی، عابد دہلوی، عزیز مرزا دہلوی، عباس دہلوی، مرزا غالب، فرحت آں جہانی دہلوی، مجروح دہلوی کو شامل کر لینا چاہیے۔

اِن شہر آشوبوں کی خصوصیات

دہلی کے شہر آشوب اپنی ہیئت (Form) کے اعتبار سے پہلے دور کے شہر آشوبوں سے کچھ مختلف ہیں۔

یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس دور میں اس نظم نے معنے اور ہیئت دونوں کے اعتبار سے کسی حدتک نئی شکل اختیار کر لی ہے یہ صحیح ہے کہ اس دور میں بھی طبقات کا ذکر اور اقتصادی عنصر ضرور ملتا ہے مگر شہر آشوب کی پرانی شرائط کی پابندی میں وہ شدت موجود نہیں۔

ان شہر آشوبوں میں چند باتیں ایسی ہیں۔ جو تقریباً سب میں مشترک ہیں۔ مثلاً سب سے پہلے دہلی کی عظمت کا ذکر آتا ہے۔ اس موضوع پر شعرا نے بڑا زور قلم صرف کیا ہے۔ بعض بعض شعرا نے اس حصے کو بڑی طوالت دی ہے مثلاً سوزاں نے اس ضمن میں ۱۶ بند لکھے ہیں۔

اس کے بعد گریز آتی ہے۔ جس میں بیشتر شعرا نے نظرِ بد لگ جانے کا تذکرہ کیا ہے۔

اس کے بعد غدر کی آمد اور تباہی کی داستان، شاعرانہ، حکیمانہ یا مورخانہ انداز میں بیان ہوئی ہے۔ اِس کے بعد غدر سے جو نقصانات دہلی اور اہلِ دہلی کو پہنچے اور جو جو مصیبتیں اُن پر نازل ہوئیں اُن کا حال ہے۔ درحقیقت نظم کا یہی حصہ ہے جس میں شعرا نے سب سے زیادہ طبیعت کا زور دکھایا ہے۔ اس مضمون کو ہر کسی نے اپنے اپنے مزاج، حالات اور رجحان کے مطابق نباہنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں کسی نے ہر بند میں پہلی اور پچھلی حالت کا تقابل دکھایا ہے۔ کسی نے تسلسل اور یک رنگی کی خاطر پہلے مسلسل ایک مضمون پھر مسلسل دوسرا مضمون باندھا ہے۔

آخری حصّے میں عمومًا دُعا آئی ہو۔ جس میں دہلی پر پھر سے بہار آنے کی تمنا ہو۔ لیکن کہیں کہیں سنئے بادشاہوں سے صلح صفائی کر لینے کی تلقین ہو۔

معنوی لحاظ سے ایک خصوصیت یہ بھی نظر آتی ہو کہ اس دوَر کے شہرآشوب میں ہجویہ اور طنزیہ رنگ کی جگہ مرثیے اور نوحے کا رنگ آگیا ہو جیسا کہ ان شہرآشوبوں کی حقیقت اور ان کے موضوع کا تقاضا تھا۔

دہلی کے شہرآشوبوں میں وطنی اور خالص سیاسی رنگ بہت کم ہو۔ اور اگر مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہو کہ دہلی کے یہ غم نامے دِلّی کی بادشاہی اور دہلی کی معاشرت اور کلچر کے مرثیے ہیں۔

خالص مذہبی رجحان کا بھی ان میں فُقدان ہو۔ صِرف چند شہرآشوبوں اور آشوبیہ غزلوں میں اسلام یا دین کے مٹنے کا ذِکر ہو۔

عجیب بات یہ ہو کہ ان شہرآشوبوں کی نظم کے وقت موجودہ فرقہ پرستانہ نظریہ ابھی ہندستان میں عام نہ ہُوا تھا بغاوت کے محرّک ہونے کے لحاظ سے پوربیوں کی طرف سے پہل ایک مسلّم بات ہو مگر شہرآشوب لکھنے والوں نے اس کو ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ داؔغ نے ان کے " دین دین " کے نعروں کی تضحیک ضرور کی ہو مگر اس پر ایک آدھ بند سے زیادہ نہیں لکھا۔ اسی طرح جہاں پوربیوں کا ذِکر ہو وہاں "بخت خاں" "کم بخت"، پر بھی لعن طعن کی ہو۔ اس کے برعکس آشوبیہ غزلوں میں ہندوؤں کا حصّہ بھی ہو چناں چہ فرحتؔ اور ظاہرؔ کی غزلیات ملاحظہ ہوں۔

ان شہرآشوبوں میں عام بھوک اور اقتصادی نظام کے درہم برہم ہونے کا مضمون بھی موجود ہو۔ مگر دہلی کے مجلسی اختلال کے ماتم نے اس رنگ کو مدّھم کردیا ہو۔ عوام کی تباہ حالی اور فلاکت کا ذِکر ضرور موثّر ہو مگر شاہی خاندان اور اعلا طبقات کے جان و مال اور عزّت و آبرو کے تاراج ہونے کا جو اثر ان شعرا کے دِل پر ہو، اس کے سامنے قدرتاً فقر و فاقے کی کوئی حقیقت نہیں رہتی۔

دہلی کے شہرآشوبوں کا بغور مطالعہ کرنے سے غدر کے متعلق اہلِ دہلی کے خاص نقطۂ نظر کا پتا چلتا ہو اسی طرح دہلی کی سابقہ عظمت اور غدر کے بعد دہلی کی بربادی کے متعلق ہر شاعر کا زاویۂ نگاہ مختلف معلوم ہوتا ہو۔ یعنی دہلی کے ساتھ محبّت کے وجوہ ہر شاعر کے پاس مختلف ہیں۔ چناں چہ جب دِلّی برباد ہوئی تو ہر شاعر اس کا

مرثیہ اپنے رجحانِ خاص کے مطابق لکھتا ہو۔ اور یوں تو دہلی کی مجموعی بربادی اور خرابی سے سبھی شاعر متاثر ہوے مگر کسی کو کسی ایک بات نے مغموم بنایا اور کسی کو کسی دوسری بات نے۔ غرض اپنے اپنے مزاج اور حالات، اپنے اپنے طرزِ زندگی اور اپنے اپنے مشرب و مسلک کے مطابق ہر ایک نے اپنے اپنے نوحے میں اپنے انفرادی رنگ کو ظاہر کیا ہو۔ چناں چہ کوئی شاہ پرست ہو کوئی جاہ پرست، کوئی احباب کے غم میں آنسو بہارہا ہو کوئی اپنے زن و فرزند کے قتل اور ہلاکت پر نوحہ کناں ہو۔ کسی کو اس بات کا رنج ہو کہ دلی کی مجلسیں ختم ہوگئیں۔ کوئی اس بات سے اندوہگیں ہو۔ کہ دلی کے آثار و عمارات کا صفایا ہوگیا۔ کوئی اس دکھ سے نڈھال ہو کہ دلی کے علم و کمال کا خاتمہ ہوگیا کوئی اس مصیبت کا مرثیہ خواں ہو کہ دلی کا ادب اور دلی کی صاف اور ستھری زبان اب کہاں ہو؟ غرض ہر ایک کی فریاد جُدا ہو اور ہر ایک کی لَے الگ، کچھ ایسے بھی ہیں جنھیں بادشاہ سے تو عقیدت ہو مگر وقت کی مصلحتوں کے پیشِ نظر اگلے رنجوں کو بھول جانے اور "حاکمانِ عادل" سے صلح و صلاح کا سبق دے رہے ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جنھیں صرف "عیشِ مرحوم" کا ماتم ہو۔ اور وہ بھی ہیں جن کی زبانیں کمال اور اہلِ کمال کی یاد سے تر ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ان شہر آشوبوں میں، باوجودے کہ واقعہ ایک ہو اور محلِ ایک، مضمون اور نقطۂ نظر کی رنگارنگی ہو۔ اور مزاج اور حالات کے فرق کے ساتھ ساتھ معنی اور مضمون بھی جُدا جُدا ہیں۔ چناں چہ داغ، ظہیر، محسن، عیش، کامل شاہ پرست ہیں۔ کامل اور سوزاں اور محسن دہلی پرست۔ آغا جان عیش اور تشنہ دہلی کی مجلسی پُرعیش زندگی اور دہلی کے کمالِ فن کے عاشق۔ افسردہ اور آزردہ ماتمیِ احباب۔ ظہیر اور سوزاں "آیندہ را صلوات" کے داعی۔

شہر آشوبوں کے علاوہ آشوبیہ غزلوں میں بھی ہمیں رجحان کا یہی فرق نظر آتا ہو۔ کسی کے ہاں شہر کی سابقہ خوب صورتی پر زور دیا ہو، کسی نے اس کی گزشتہ معاشرت کو یاد کیا ہو۔ کسی نے گم شدہ اہلِ کمال کا مرثیہ لکھا ہو اور کسی نے دہلی کے قاعدہ دانوں اور باوضع بزرگوں کا نوحہ کہا ہو۔

کسی نے دہلی کی زبان اور اس کی پاکیزگی کی مدح کی ہو۔ کسی نے اس کے بٹ جانے کا اندیشہ ظاہر کیا ہو۔ ؎

غمِ بربادیٔ دہلی میں بجاے مَے ناب خونِ دل پیتے ہیں اب بادہ کشانِ دہلی

(احسن)

دہلی کے شہر آشوبوں کا سیاسی اور مجلسی پس منظر

دہلی کے شہر آشوبوں کو سمجھنے کے لیے اس بات کو سمجھنے کی بے حد ضرورت ہو کہ اہلِ دہلی کے لیے دہلی اور قلعۂ معلّا کی تمدنی اور تہذیبی اہمیت کیا تھی؟ یوں تو اورنگ زیب عالمگیر کے بعد معظّم یا شاہ عالم اوّل کے جلوس سے ہی (جس کی تخت نشینی کی تاریخ بعض اربابِ بصیرت نے شہِ بے خبر سے نکالی تھی جو ۱۱۱۹ھ کے برابر ہو) سلطنتِ مغلیہ میں ضعف کے آثار پیدا ہو گئے تھے مگر سچ بات یہ ہو کہ احمد شاہ ابدالی کے متواتر حملوں، شاہ عالم ثانی کی بکسر میں انگریزوں کے ہاتھ سے شکست اور غلام قادر رُہیلے کی ناشائستہ اور ظالمانہ حرکت کے بعد مغل شاہنشاہیت کے وقار کو سخت دھکّا لگا۔ غلام قادر اور اس کے ابنائے جنس کی طرف سے شاہ عالم ثانی کے ساتھ جو دردناک سلوک ہوا۔ اس پر خود شاہ عالم نے بھی ایک قطعے میں رنج و اندوہ کا اظہار کیا ہو۔ یہ قطعہ اس شعر سے شروع ہوتا ہو ؎

صرصرِ حادثہ برخاست پئے خواریٔ ما۔ وغیرہ

داد افغان بچہ شوکتِ شاہی برباد۔ وغیرہ

مگر باوجود اِن سب باتوں کے تخت نشینِ دہلی ہزار سالہ عظمت و شوکت کا وارث اور جانشین تھا اور اس کی ذات ان سب روایاتِ سربلندی اور آثارِ عزّ و جلال کا مجمع سمجھی جاتی تھی اور قلعۂ دہلی میں عزّت اور احترام کے وہ سارے دستور پورے کیے جاتے تھے جو ایک شاہنشاہ کے علاوہ کسی اور کے حصّے میں نہیں آ سکتے۔ غالباً آپ کو وہ واقعہ یاد ہوگا جب ایک مرتبہ شاہ عالم اودھ کے نواب وزیر شجاع الدولہ سے ملنے فیض آباد گئے۔ ایک دن تخت پر سوار سیر کے لیے نکلے۔ شجاع الدّولہ پا پیادہ پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ ہوا خوری کے بعد جب تخت سے اُترنا چاہا تو اتّفاقاً بادشاہ کا چرن بردار ذرا پیچھے رہ گیا تھا۔ اس پر شجاع الدّولہ نے اپنی کفش نذر کی بادشاہ نے پہن لی اور شجاع الدّولہ خود برہنہ پا ساتھ ہو لیے۔ جب چرن بردار حاضر ہوا تو بادشاہ نے شجاع الدّولہ کو اشارہ کیا۔ نواب وزیر نے نذر دی۔ آداب بجا لایا اور کفش شاہی بطورِ فخر بجائے کلغی اپنے سر پر باندھی![1]

---

[1] بہادر شاہ ظفر۔ امیر احمد علوی صـ۵۔ بہادر شاہ کے متعلق دیکھو 'بزمِ آخر' منشی ضامن الدین، 'داستانِ غدر' وغیرہ۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے شاہنشاہِ دہلی اپنے شان دار ماضی کا عکس لطیف ہو جانے کے باوجود سیاسی لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا تھا اور قلعۂ دہلی ہزار سالہ تہذیبی اور شاہی آئین و روایات کا واحد وارث تھا۔ جہاں مغل شاہنشاہیت کے دستور اور قاعدے اپنی پوری پابندی اور ضبط کے ساتھ قائم تھے۔ چناں چہ منشی فیاض الدین کی کتاب "بزمِ آخر" اور عرش تیموری اور ناصر نذیر فراق دہلوی کی کتابوں سے اچھی طرح سے ظاہر ہوتا ہے۔

دہلی اگرچہ اس لحاظ سے بدنصیب تھی کہ کئی بار بنی اور کئی بار لٹی مگر کلچرل اعتبار سے جو رتبہ ہندستان کے شہروں میں دلی کو حاصل رہا ہے کسی اور شہر کو وہ نصیب نہیں ہوا علی الخصوص عہدِ شاہ جہانی کے بعد سے جب لال قلعہ تعمیر ہوا اور مغل تہذیب اور شائستگی آگرہ سے ہٹ کر دلی میں آگئی تو دلی ہر علمی مجلسی اور ادبی جوہر کا معیار بن گئی تھی۔ ہندستان کی ہزار سالہ تہذیبی روایات کا ورثہ ہندستان میں اہلِ دہلی کے سوا کسی کے پاس موجود نہ تھا۔ تہذیبی لحاظ سے اس تسلسل اور وحدت سے دہلی کی معاشرت اتنی منظّم اور منضبط ہوگئی تھی کہ اسے قریب قریب مذہب کا درجہ حاصل ہوچکا تھا۔ چناں چہ ملنے جلنے کے طریقوں، نشست برخاست، دید و دید، معاملہ و مراسلہ، بات چیت، ملاقات و مشافہہ اور اس نوع کے ہزاروں مراسم کے لحاظ سے دہلی کی معاشرت کو ایک خصوصیت اور ایک ایسا امتیاز حاصل ہوگیا تھا، جو کسی اور بستی کو حاصل نہ تھا۔ ہر بات میں سلیقہ اور آداب' ہر کام آئینِ اخلاق۔ زندگی میں ایک منظّم وضع اور دستور کی پابندی، ہر حالت میں اور ہر صورت میں ضروری ہے۔ مولانا حالی نے حکیم محمود خاں صاحب کی وفات پر جو مرثیہ لکھا ہے، اس میں اہلِ دہلی کی معاشرت کے اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے۔

دلی کی محبت اور وصف

دہلی کے شہر آشوبوں میں دہلی کی محبت کا یہ جذبہ بے حد شدّت اور فراوانی کے ساتھ ظاہر ہوا ہے۔ وہ کون سی صفت ہے جو دہلی سے منسوب نہیں ہوئی اور وہ کون سی تعریف ہے جس سے اہلِ دہلی کو متصف نہیں قرار دیا گیا ہے۔

کوچۂ رشکِ جناں، بہشت مکان (تشنہ)، فلک زمین، ملائک جناب، بہشت و خلد میں انتخاب' لاجواب، ہر انس و جان کا دل، ہر قدردان کا دل بلکہ ہندستان کا دل۔ نہیں سارے جہان کا دل ہے

یہ شہر وہ تھا کہ سایہ بھی نور تھا اس کا۔ چراغ رشکِ تجلی طور تھا اس کا (داغ) منتخب جہان، جہاں آباد، بلند شہر ہر ایک ذرہ یہاں کا تھا مہر کا ہم سر ع یہاں کی خاک تھی اکسیر سے بہتر۔ یہاں کی آب و ہوا میں آبِ حیات کا اثر ع ہر اک مکان یہاں کا تھا اک مکانِ سرور، ہر ایک کوچہ یہاں کا تھا اک جہانِ سرور۔ ہر اک دُکان دکانِ سرور ع غرض کہ شہر نہ تھا تھا یہ ایک کانِ سرور (قربان علی سالک) انتخابِ جہاں، جہان آباد کے ذرّے میں تھی زرافشانی۔ کلاہِ زر تھی گرا کی یہ زر کی ارزانی ؎

ہر ایک خوبی و حسن و جمال اس میں تھا کمالِ اہلِ کمال اور کمال اس میں تھا

بحرِ جود و سخا، کانِ سیم و گوہر، جامِ جم، رشکِ ارم، بحرِ کرم، چشمۂ فردوس، سر تاج ہفت کشور، غریب پرور وکانِ کمال، بے عدیل (سوزاں) ع ہو بیٹھے پہ بھی سوا عرش سے شانِ دہلی (شاطر) ملکے کے بعد اشرف البلاد، مینو سواد، مرجع شاہانِ نامور، حصار فلک سے بلند تر (صفیر) فرشتہ مسکن، جنت نشان زمین کے پردے پہ آسمان اہل بصیرت کی جان ؎

یہ وہ جگہ ہو زمیں جس کی زر اُگلتی تھی یہ خاک وہ تھی کہ اکسیر ہاتھ ملتی تھی

عرش احتشام، بیاض مردمک خاص و عام، زمین پر چرخ کی قائم مقام ؎

یہ شہر وہ تھا کہ غنچہ تھا حسن والوں کا یہ شہر وہ تھا کہ تختہ تھا نونہالوں کا
یہ شہر وہ تھا کہ مجمع تھا خوش جمالوں کا یہ شہر وہ تھا کہ مرجع تھا باکمالوں کا (ظہیر)

باغ و بہار، غیرت صد لالہ زار، ریاض قدرت پروردگار، گل چمن روزگار، ابر گہر بار، گلشن بے خار، مریض غم کے لیے خانۂ شفا، دردِ دل و جان کے لیے دَوا، اس کی خاک کیمیا، وہاں کا ذرہ رشکِ صد خورشید قفلِ درِ آرزو کی کلید۔ اس کی ہَوا مشکبار عنبر بیز، ہر ایک دل فرحت فزا طرب انگیز، مجمع اہلِ کمال و ہنر ؎

ہر ایک چیز میں اس شہر کی لطافت تھی اور اہلِ شہر کی ہر وضع میں شرافت تھی
طبیعتوں میں نفاست تھی اور لطافت تھی ہر اک سخن میں لطیفہ تھا اور ظرافت تھی

(آغا جان عیش)

گلشنِ عیش و سرور۔ عشرت و فرحت ظہور۔ مطلع خورشید نور۔ غیرت صد کوہِ طور۔

ہر ایک کوچہ یہاں کا تھا اک مکانِ عیش　　یہ شہر تھا کہ الٰہی کوئی جہانِ عیش (کامل)

پسند خاطر ہر خاص و عام، طلسمِ دل کش و جنّت مقام ؎

مثالِ خلدِ بریں بے مثال تھی دہلی　　گلِ کمال سے پُر یہ کمال تھی دہلی

سپہر اوجِ تجلّی مآل تھی دہلی　　غبارِ غم سے صفا، مہ جمال تھی دہلی

گلشنِ عشرت، جانِ جہاں، جنّت نشاں، آرامِ جہاں، گوہر فشاں، رشکِ جناں، حُسن کدہ، عیشِ وطن، حورستان ؎

یہ وہ جگہ تھی ...... الخ

یہاں کا روز تھا ہر روز روزِ عیدِ جہاں　　یہاں کی شب تھی شبِ قدر ماہ نور افشاں

یہاں کی شام تھی جوں زلفِ عنبرینِ بُتاں　　یہاں کی صبح تھی ہم نور عارضِ خوباں

یہ دہلی وہ تھی کہ جس سے جہان روشن تھا

یہ شہر وہ تھا کہ نام اس کا نورِ مخزن تھا　　(مبیّن)

ثریا جاہ، فلک بارگاہ، افتخارِ ہفت اقلیم، محلِ پایۂ اورنگِ خسروانِ قدیم ؎

شکوہ و رفعت و شوکت میں رشکِ عرشِ عظیم　　فضاؤ حُسن میں غیرت فزاے باغِ نعیم

رشکِ خطۂ کشمیر، مرقّعِ تصویر، بے عدیل و بے نظیر ع ہوسوں کے لیے اس کی خاک تھی اکسیر (محسن)

دہلی کا جنازہ | ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کی شام تک مرحوم دہلی کا یہ نقشہ تھا مگر ۱۱ مئی کو دہلی پر ایک ایسا انقلاب آیا کہ دلّی کی یہ حالت ہوگئی ؎

یہاں کھودو وہیں بنیاد کے پتھر نکلتے ہیں　　بہت معمورۂ ہستی میں اُجڑے گھر نکلتے ہیں

یہ وہی انقلاب ہے جسے درسی تاریخوں میں غدرِ دہلی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس ہول ناک واقعے کی تفصیل لکھنا مورّخ کا کام ہے۔ جہاں تک موجودہ مضمون سے اس کا تعلق ہے۔ وہ مختصراً اتنا ہی ہے کہ اس سانحۂ ہوش ربا میں اہلِ دہلی پر دونوں طرف سے بلائیں نازل ہوئیں۔ پہلے انھیں باغی فوجوں نے لوٹا پھر انھیں انگریزی افواج نے تاراج کیا۔ کالوں سے جو متاع بچی اُسے گورے لے گئے۔ اور جو گوروں سے نہ ہو سکا اس کی کسر پنجاب اور سرحد کی ہندو مسلمان اور سکھ فوج نے پوری کر دی۔

ان شہر آشوبوں سے اہلِ دہلی کا عندیہ غدر کے متعلق اچھی طرح واضح ہوتا ہے۔ ظہیر دہلوی نے "داستانِ غدر" میں بہادر شاہ کی ایک تقریر نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں :-

"بادشاہ سلامت نے ارشاد فرمایا تم لوگ نہیں جانتے جو کچھ میں جانتا ہوں۔ مجھ سے سُن لو میرے بگڑنے کا کوئی سامان نہ تھا یعنی بنائے فساد، مال و دولت، خزانہ مُلک اور سلطنت وغیرہ ہوا کرتے ہیں، میرے پاس ان میں سے کوئی موجود نہ تھی۔ مَیں تو پہلے ہی فقیر ہوا بیٹھا تھا۔ مجھ کو کسی سے خصومت کیا تھی یعنی فقیر کو کسی سے کیا رشک و حسد اور طمع ہوگی ؎

کس نیاید بخانۂ درویش　　　که خراجِ زمین و باغ بده

مَیں تو اک گوشۂ ایزدی میں فقیر کا تکیہ بنائے ہوئے چار صورتوں کو ہمراہ لیے ہوئے بیٹھا روٹی کھاتا تھا۔ میرے بگڑنے کا کوئی سامان نہ تھا اب جو من جانب اللہ غیب سے میرٹھ میں آگ لگی اور دلّی میں آکر بھڑکی فتنہ برپا ہوا ہے تو معلوم ہوا کہ فلکِ غدّار اور زمانۂ ناہنجار کو میرے گھر کی تباہی منظور ہے آج تک سلاطینِ چغتائی کا نام چلا آتا تھا اور اب آیندہ کو نام و نشان یک قلم معدوم و نابود ہو جائے گا یہ نمک حرام جو اپنے آقاؤں سے منحرف ہوکر یہاں آکر پناہ پزیر ہوے ہیں کوئی دن میں ہَوا ہوے جاتے ہیں جب یہ اپنے خاوندوں کے نہ ہوے تو میرا کیا ساتھ دیں گے یہ بدمعاش میرا گھر بگاڑنے آئے تھے، بگاڑ چلے۔ ان کے جانے کے بعد انگریز لوگ میرا اور میری اولاد کا سر کاٹ کر قلعے کے کنگرے پر چڑھا دیں گے اور تم لوگوں میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑیں گے اور اگر کوئی باقی رہ جائے گا تو آج کا قول میرا یاد رکھو کہ تم روٹی کا ٹکڑا منھ میں لوگے اور وہ منھ میں سے اُڑکر دُور جا پڑے گا اور رؤسائے ہند کو لوگ ایسا سمجھیں گے جیسے گانو کا ادنا آدمی ہوتا ہے۔" (داستانِ غدر ص۹۹ و بعد)

ظہیر دہلوی غدر کے وقت قلعۂ دہلی کے متوسّلین میں سے تھے۔ ان کا بیان ایک چشم دید گواہ کا بیان ہے۔ ان کی روایت کے مطابق بہادر شاہ کا غدر سے کچھ تعلق نہ تھا مگر جب باغی افواج کا دہلی پر تسلط ہوگیا اور بہادر شاہ ان کے ہاتھ میں مجبور و اسیر ہوگئے تو انھوں نے باغیوں کی مزاحمت کرنے کو بے سُود خیال کیا۔ اس سے فائدہ اُٹھاکر باغیوں نے شاہی نام کو اپنی تحریک کی تقویت کے لیے استعمال کیا۔ مرزا مغل کو افواج کا کمانڈر بنادیا اور یوں ناکردہ گناہ بہادر شاہ پر غدر کی تہمت لگادی۔ دہلی کے شہر آشوب اس نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہیں۔

ان شہر آشوبوں سے اس امر کی بھی تائید و تاکید ہوتی ہے کہ بہادر شاہ کی طرح خود اہلِ دہلی بھی اس معاملے میں اتنے مجرم نہ تھے جتنا ان کو فرض کرلیا گیا تھا۔ زیرِ نظر مضمون میں 'بلا استثنا' باغی فوجوں کی دہلی میں آمد کو منحوس و مذموم قرار دیا گیا ہو اور ان کی حرکات کو بہ نفرت دیکھا ہو۔

چناں چہ مفتی صدر الدین خاں آزردہ ؎ کا لے میرٹھ سے یہ کیا آئے کہ آفت آئی۔

افسردہ ؎ ہائے کیا دہلی پہ آفت آگئی　　چین سے بیٹھے تھے شامت آگئی

شہر پہ عالم کے مصیبت آگئی　　فوج کیا آئی قیامت آگئی

وقتِ تنگ آمد ترحّم یا رحیم

لطف کن بر دردمندانِ سقیم

داغ ؎ غضب میں آئی رعیت بلا میں شہر آیا　　یہ پوربی نہیں آئے خدا کا قہر آیا

زباں سے کہتے ہوئے دین دین آئے لعین　　جو مانتا دین تھا کوئی تو کوئی گنگا دین

یہ جانتے ہی نہ تھے چیز کیا ہو دینِ متین　　کیے ہیں قتل زن و بچہ کیسے کیسے حسین

روا نہ تھا کسی مذہب میں جو وہ کام کیا

غرض وہ کام کیا، کام ہی تمام کیا

؎ لے گئے لوٹ کے اب شوکت و شانِ دہلی　　پوربیئے پہلے اُڑاتے تھے زبانِ دہلی

سالک ؎ چلی تھی دہر میں گویا ہوا یہ چوپائی　　کہ فوج باغیہ چاروں طرف سے یاں آئی

تمام شہر کی خوب خاک آکے اُڑائی　　یہ باد بند تھی خاشاک کی تمنائی

. . . .

سوزاں ؎ بلا یہ پوربیئے میرٹھ کے جو یہاں لائے　　عمل ہمارے مجسّم یہ سامنے آئے

انھوں کے آتے ہی دلی میں قتل عام ہوا ۔ الخ

کامل ؎ یہ فوج باغیہ کیا شہر میں خدا آئی　　کہ قہر آیا غضب آیا اک بلا آئی

نہ دین دار تھی یہ فوج اور نہ دیں داری سیاہ رووں کو آتی تھی بس سیہ کاری

. . . .

تمام نامۂ اعمال کو سیاہ کیا ملایا خاک میں سب شہر اور تباہ کیا

محسنؔ ؎ گناہ گار ہوئی بے گناہ تھی دہلی

؎ مٹانے تخت کو آیا تھا بخت خاں، کم بخت

تجمّل ؎ کالے آئے تھے یہ کیا کالی بلا آئی تھی ہوگئے خاک بہ سر خورد وکلانِ دہلی

یہ اشعار اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہیں۔ کہ اہلِ دہلی نے باغی افواج کے ہجوم کو بہ نظرِ استحسان نہیں دیکھا۔ کیوں کہ جب یہ افواج شہر میں داخل ہوگئیں اور قلعے اور شہر پر ان کا قبضہ ہوگیا تو اسی وقت سے شہر دہلی کے امن و امان کا خرمن خاک و خاکستر ہوگیا۔ ان فوجوں نے سب سے پہلے انگریزوں کا صفایا کیا اور اس قتلِ عام میں زن و بچّہ، پیر و جوان کسی کا لحاظ نہیں رکھا۔ جب یہ کام ہوچکا تو شہر کے چور، بدمعاش اور اوباش جو ایسے وقت کے دِل و جان سے منتظر تھے، فتنہ و فساد کے لیے اُٹھ کھڑے ہوے، دُکانوں کی لوٹ مار کے علاوہ انھوں نے مخبری کا سلسلہ شروع کیا اور شرفا اور باعزّت لوگوں کو لوٹنے اور ان کو ذلیل کرنے کی غرض سے باغیوں کو یہ کہہ کہہ کر مشتعل کرنے لگے کہ "فلاں کے گھر میں میم چھپی ہوئی ہے" اور فلاں انگریزوں کا جاسوس یا ہواخواہ ہے۔ اس طوفانِ بےتمیزی میں شرفا کے لیے دوگونہ رنج و مصیبت کا سامنا تھا وہ کیا کرتے اور کیا نہ کرتے۔ جس نے جس بات میں مصلحت دیکھی، اس نے وہ کیا۔ ظہیر دہلوی "داستانِ غدر" میں لکھتے ہیں :۔

"شہر کی یہ کیفیت تھی کہ بدمعاش شہر کے پوربیوں کو ہم راہ لیے ہوے بھلے مانسوں کے گھر لٹواتے پھرتے تھے اور جس کو مال دار دیکھا اس کے گھر پوربیوں کو لے جاکر کھڑا کردیا کہ یہاں میم چھپی ہوئی ہے ..... بادشاہی ملازموں کی حقیقت یہ تھی کہ ہر وقت اجل سر پر کھڑی تھی ہر دفعہ لوگ آکر ہم کو گھیر لیتے تھے اور سینے پر بندوقیں رکھ دیتے تھے ......" (داستانِ غدر صفحہ ۸۳)

ظہیرؔ نے اپنے شہرآشوب میں بھی انھی خیالات کا اظہار کیا ہے اور باغی فوج کے ساتھ رندان و اوباشانِ شہر کے اِس نامبارک تعاون کا بہ تفصیل تذکرہ کیا ہے۔ سوزاںؔ کے شہرآشوب سے بھی اس

کی تائید ہوتی ہے ؎

یہاں کے جتنے تھے اوباش مل کے ان کے ساتھ کہا بتائیں تمھیں زر کے ہاتھ آنے کے گھات
مگر یہ شرط ہے گر آئے کچھ ہمارے ہاتھ براے نام بکالی یہ لوٹنے کی بات
جو اونچا گھر کوئی تکتے تو اس پہ چڑھ جاتے
'فرنگی اس میں ہیں' یہ کہ کے گھر وہ لٹواتے

سوزاں کے شہر آشوب میں باغی فوج کے قبضۂ دہلی کی تفاصیل باقی شہر آشوبوں کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ چناں چہ ان کے دہلی میں آنے کے وقت سے لے کر آخری شکست تک انھوں نے جو کچھ کیا اس کا اجمالی ذکر اس شہر آشوب میں ہے۔ پوربی افواج کی عام درشتی اور تلخ مزاجی اور تندخوئی کا تذکرہ یوں کیا ہے:

؎ اکڑ کے پنجوں کے بل جو زمین پہ چلتے جو سیدھی بات کرے ان سے اس کو وہ دلتے
تفنگ و تیغ کو چمکاتے ہر گھڑی ملتے نشے میں لاف وہ کرتے تو سُن کے سب جلتے

. . . .

رعایا کو ہوا دشوار شہر کا رہنا ہوے خراب جنھوں نے نہ مانا تھا کہنا
نہ جانتے تھے کہ ہوتا ہے کیا ستم سہنا بجاے اشک ہوا خونِ چشم سے بہنا
نہ تھی وہ قابلِ رحمت پڑے نہ اب پالا
جہان آباد پہ اس فوج نے ستم ڈالا

شہر پر قبضے و غلبے کے بعد جو جو انتظام ہوے اور جو جو تدبیریں باغیوں نے دہلی کی مدافعت کے سلسلے میں کیں، ان کے متعلق شہر آشوب بالکل خاموش ہیں۔ لہٰذا میرے آج کے موضوع سے بھی ان واقعات کا تذکرہ خارج ہے۔ اس لیے میں داستانِ غدر کے اِس حصّے تک براہِ راست آتا ہوں کہ سخت مقابلے و مقاتلے کے بعد کچھ اپنی بے تدبیریوں اور کچھ دوسروں کے استقلال اور حُسنِ تدبیر کی بدولت باغیوں کو شکست ہوگئی۔ ظہیر دہلوی داستانِ غدر میں اس کے بعد کے واقعات لکھتے ہیں:۔

"اب شہر میں سواے رعیت کے پوربیا نام کو نہ رہا۔ . . . . . اب شہر میں دن کو تو شہر کے آدمی

چلتے پھرتے ہیں اور مارنے مرنے پر آمادہ ہیں اور شب کو سپاہ انگریزی نکل کر گھروں میں قتل کرجاتی ہے۔ اب شہر کی یہ کیفیت ہے کہ دُکانیں سب بند اور رسد آنی بند، دانہ پانی خلقت پر حرام، لگے بھوکے پیاسے مرنے، تین روز تک یہی کیفیت رہی۔ آخر تیسرے روز شام کے وقت بادشاہ قلعے سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے پہنچے، اور رعیت بھی سراسیمہ حیران و پریشان ہوکر شب کے وقت سب گھربار اثاث البیت جوں کا توں گھروں میں چھوڑکر اپنے بال بچّوں عورات وغیرہ کا ہاتھ پکڑ پکڑ کے شہر سے نکلنی شروع ہوگئی۔ غرض کہ اس وقت وہ قیامتِ عظیم برپا ہوئی کہ بیان نہیں ہوسکتی ؂

نکلنا شہر سے خلقت کا بے سروساماں — وہ جانا پردہ نشینوں کا پاسر عریاں
وہ چاک چاک گریباں لگا کے تاداماں — وہ دار و گیر سپاہِ شریرِ بے ایماں
دراز دستِ تطاول ستم شعاروں کا
فلک کو پاس سے تکنا جفا کے ماروں کا
نکلتے شہر سے ہیں پر نکل نہیں سکتے — ہزار چال سے چلتے ہیں چل نہیں سکتے
کروڑ شکل کو بدلیں بدل نہیں سکتے — قدم قدم پہ ہے لغزش سنبھل نہیں سکتے
کمندِ موت نے کیا بند بند جکڑے ہیں
زمینِ شہر نے اک اک کے پانو پکڑے ہیں

غرض کہ اس وقت خلقت کا اضطراب اور خرابی پریشانی اور بے سروسامانی اور مستوراتِ پردہ نشین جنھوں نے عمر بھر کبھی ایک قدم باہر نہیں رکھا تھا اُن کا گھبراہٹ میں سروپا برہنہ نکلنا اور بچّوں کی واویلا کا شور اور گھبراہٹ کا حال دیکھنے سے کلیجے کے ٹکڑے ہوے جاتے تھے جس شخص کی نظر سے یہ معرکہ گزرا ہے، کچھ وہی خوب جانتا ہے۔" (داستانِ غدر ص۱۱۵ تا ۱۱۶)

پردہ نشین بی بیاں اور ننھے ننھے بچّے اور دیگر زن و مرد حواس باختہ ہو ہوکر نکلے۔ ظہیر دہلوی کا بیان ہے کہ یہ منظر قیامت کے منظر سے کسی طرح کم نہ تھا۔ وہ مستورات جنھیں کبھی چشمِ فلک نے بھی نہ دیکھا تھا، برہنہ پا اور برہنہ سر چلی جاتی تھیں۔

نکلنے کو تو یہ لوگ شہر سے نکل آئے مگر کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ منزل کہاں ہے۔ جدھر قدم اُٹھ گئے، چل نکلے۔ کوئی کسی شہر میں، کوئی کسی گاؤں میں —— !

اُدھر شہر کا یہ حال ہوا کہ بادشاہ قلعے سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے میں پناہ گزین ہوے۔ اس

کے بعد جو کچھ ہوا اور شہزادگان کے ساتھ ساندرس نے جو کچھ کیا؛ اس کے متعلق شہر آشوب بالکل خاموش ہیں۔ شہزادوں کے بے دردانہ قتل کا ماجرا ان نظموں میں کہیں بیان نہیں ہوا البتہ ظہیر نے اپنے شہر آشوب میں اس کی طرف سرسری سا اشارا کیا ہے ۔

نہالِ گلشنِ اقبال پائمال ہوئے — گلِ ریاضِ خلافت لہو میں لال ہوئے
یہ کیا کمال ہوئے اور کیا زوال ہوئے — کمال کو بھی نہ پہنچے تھے جو زوال ہوئے
جو عطرِ گُل کو نہ مَلتے ملے وہ مٹی میں
جو فرشِ گُل پہ نہ چلتے ملے وہ مٹی میں

اندرونِ شہر کا حال اس سے بھی بدتر ہوا۔ انگریزی فوج جب مظفر و منصور شہر کے اندر داخل ہوئی اس نے "جو گھر خالی پایا اُسے دھڑی دھڑی لوٹنا شروع کیا اور جہاں آدمی دیکھے بے غل وغش قتل کرنا شروع کر دیا" ۔

جہاں کی تشنۂ خوں تیغ آب دار ہوئی — سانِ نیزہ ہر اک سینے سے دوچار ہوئی
رسن ہر ایک بشر کے گلے کا ہار ہوئی — ہر ایک سمت سے فریادِ گیر و دار ہوئی
ہر ایک دشتِ قضا میں کشاں کشاں پہنچا
جہاں کی خاک تھی جس جس کی وہ وہاں پہنچا

ہر ایک شہر کا پیر و جوان قتل ہوا الخ [1]

ان شہر آشوبوں کا سب سے دردناک حصہ وہ ہے جس میں اہلِ دہلی کے شہر سے پریشانی کے عالم میں نکلنے، جائے امن کی تلاش میں بھٹکتے پھرنے، سفر میں دیہاتیوں اور گوجروں اور میواتیوں کے ہاتھ سے لُٹنے اور پٹنے اور سرکاری جاسوسوں کے سائے کی طرح درپے ہونے کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔ ظہیر دہلوی اسی صحرا نوردی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ہزارہا عوراتِ پردہ نشین اور بچے ہم راہ تھے منزل دراز تھی، اوپر کی دھوپ نیچے پاؤں کے جلتی ہوئی ریت، جنگل لق و دق سائے کا نام نہیں،

---

[1] ظہیر: داستانِ غدر: ص۱۲۵

آب و دانے کا کام نہیں تلووں میں آبلے زبانوں میں بے آبی سے کانٹے پڑے ہوئے روتے دھوتے ہوئے چلے جاتے تھے۔" ؎

وہ فوج فوج ہر اک سُو سے نرغۂ اعدا   وہ دھوپ اور وہ ریگِ طپاں وہ گرم ہَوا

اور اس پہ ظلم گنواروں کا وہ کہ واویلا   وہ کینہ ورزیِ غارت گرانِ بے پروا

جو ہم سے سُنتے ہیں وہ انقلاب کی باتیں

تو لوگ کہتے ہیں کرتے ہو خواب کی باتیں

وہ گُل سے چہرے حرارت سے تمتمائے ہوے ... الخ

بعض بعض شہر آشوبوں میں ایک دو بند بعض نیک دِل انگریزوں کی مدح میں ہیں۔ ان میں سے ایک کوپر صاحب ہیں۔ جنھیں ظہیر دہلوی نے اپنے شہر آشوب میں "حاکمِ عادل" لکھا ہے۔ یہ کوپر صاحب ڈپٹی کمشنر دہلی تھے۔ "جنھوں نے دِلّی کو آکر پھر سے آباد کیا، اور خلقت کو شہر میں بسایا۔ اور وہ رعیّت نوازی فرمائی کہ رعیّت کے دِل سے سب رنج و غم زمانۂ غدر کا بھُلا دیا۔"

ظہیر دہلوی اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ "مَیں نے شہر آشوب میں کوپر صاحب بہادر کی مدح میں ایک بند لکھا ہے فی الحقیقت وہ بیان واقعی ہے اُس میں کچھ مبالغہ نہیں ہے۔"

مفصّل تبصرہ افسوس ہے کہ ان سب شہر آشوبوں کے تفصیلی تبصرے اور تجزیے کی اس موقع پر گنجایش نہیں۔ مَیں ان میں سے چند بہترین شہر آشوبوں کا انتخاب کرتے ہوے ان کے متعلق نسبتاً تفصیل سے کام لوں گا۔ باقیوں کے متعلق مختصراً اظہارِ خیال کرتا ہوا آگے گزر جاؤں گا۔

مَیں نے سطورِ بالا میں اس عہد کے شہر آشوبوں کی جو طویل فہرست پیش کی ہے۔ ان میں سے تفصیلی تذکرے کے لائق صرف وہ ہیں جو مرزا داغ، مبیّن، محسن، ظہیر، سوزان اور عیش کے ہیں۔ ان میں سے مَیں مبیّن کے شہر آشوب کو سب سے پہلے لیتا ہوں۔

مبیّن کی لائف مبیّن کے آشوبیہ کلام میں ایک مخمّس دو مسدّس اور ایک غزل 'مجموعہ انقلابِ دہلی' میں موجود ہے۔ مَیں نے مبیّن کو اوّلیّت کا اعزاز اس لیے دیا ہے کہ اس

کی آشوبیہ نظموں میں شہر آشوب کی بنیادی خصوصیات مثلاً اقتصادی رنگ، طبقاتِ عوام کا ذکر بھی نہایت نمایاں اور مکمل شکل میں موجود ہیں۔ اور اس عہدِ آشوب کے مقامی اور ہنگامی خصائص بھی اپنی عمدہ ترین شکل میں بھی پائے جاتے ہیں۔ دہلی مرحوم کا ماتم کس کس نے نہ کیا؟ انسان تو انسان پتھر اور درخت بلکہ اجرامِ فلکی بھی اس پر رویا کیے اور شام و سحر رویا کیے۔ مگر مبینؔ کے شہر آشوب میں مخلصانہ درد و گداز کے علاوہ حکیمانہ بصیرت کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ وہ صرف غدرِ دہلی کی تباہ کاریوں کا ماتمی ہی نہیں بلکہ آنسوؤں اور آہوں کے اس طوفان میں ان اسباب و علل کی تلاش بھی کرتا ہو جن کے سبب دلی پر یہ آفت آئی۔ خاندانِ گورگانی کا خاتمہ ہوگیا اور پرانی شوکت و عظمت کے قصرِ رفیع کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ مبینؔ کے نزدیک غدر کے اسباب میں اقتصادی اونچ نیچ اور عدمِ مساوات کو بہت بڑا دخل تھا۔ اور اس وقت کے زردار طبقے مال و دولت کو جس طریق پر خرچ کرتے تھے۔ اور غریبی و امیری میں جو رقابت اور تفاوت پیدا ہوگئی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ قوم کی تنظیم کی ترازو اپنا توازن کھو بیٹھے اور امورِ انسانی میں وہ اختلال پیدا ہو جو بعد میں ہوا۔ مبینؔ کی ایک مسدس سے میرے اس بیان کی تائید ہوگی جس کا پہلا بند یہ ہے ؎

دل غنی رکھا سخاوت پہ نہ زر والوں نے　　شکرِ نعمت نہ کیا ہم سے بد اقبالوں نے
گھر سے بے گھر جو کیا ہو تو انھی حالوں نے　　پھینکا صحرائے پُر آفت میں انھیں جالوں نے
ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

اس اقتصادی رنگ کے باوجود مبینؔ ایک مذہبی آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ جن کے نزدیک غدر کے اسباب میں سے ایک بڑی بات یہ تھی کہ اہلِ ثروت نے مکروہات میں وقت گزارنا شروع کر دیا تھا۔ اور مذہبی احکام و فرائض کے بارے میں کوتاہی اور غفلت انتہا درجے تک پہنچ چکی تھی ؎

ہائے کیا کیا نہ زمانے کے کیے مکروہات　　ناچ اور رنگ میں دن رات گزاری اوقات
عشق میں محو رہے بھول گئے صوم و صلوٰۃ　　نہ کی الفت میں ادا ہی نہ کیے حج و زکات
ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

مجمعِ وعظ سے گریز، حسینوں کی طرف رغبت، خرابات سے محبّت، محرّمات سے اُلفت گناہوں کے دن اور عصیاں کی راتیں ——! غفلت اور مدہوشی —— یہ سب مبین کے نزدیک وہ اندرونی اسباب ہیں جن سے قوم کے اخلاق اور ایمان و ایقان کو نقصان پہنچا جس کا نتیجہ حسیات کا زوال اور ضعف تھا۔ مبین کے نزدیک قدرت کسی کو بے سبب تکلیف نہیں دیتی بلکہ گردشِ تقدیر کے اسباب ہوتے ہیں جن میں سے ایک ایمان اور حسیات کی کم زوری ہی ؎

بے سبب کاہے کو دیتی ہی یہ گردش تقدیر　　　ہیں سزاوارِ جفا یاد ہی ہر اک تقصیر
کیا زباں میں ہو اثر اور دعا میں تاثیر　　　یعنی ہر جُرمِ گزشتہ کی عیاں ہی تعزیر
ظُلم گوروں نے کیا ہی نہ ستم کالوں نے الخ

مبین کا ایک شہر آشوب مسدس ذیل کے شعر سے شروع ہوتا ہی ؎

پسند خاطرِ ہر خاص و عام تھی دہلی　　　طلسم دِل کش و جنّت مقام تھی دہلی

یہ شہر آشوب شاعری کا عمدہ نمونہ ہی۔ اس میں درد اور گداز بہ درجہ اتم موجود ہی، بیان میں مرثیے کا رنگ ہی۔ الفاظ موزوں اور موثّر، اور مضمون گو واقعاتی نہیں مگر واقعی اور حقیقی ضرور ہی۔

مبین شاہ پرست تو معلوم نہیں ہوتا مگر اُسے بہادر شاہ ظفر سے عقیدت تھی۔ دہلی کی بربادی کے بعد تیموری شاہ زادوں اور شاہ زادیوں کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا، س کا دِل گداز منظر مبین کے اس مسدس میں کھینچا گیا ہی۔ علی الخصوص اس دردناک واقعے کا ذکر بے حد دِل پاش ہی کہ ؎

پدر کے سامنے بیٹے کو قتل ہاے کیا　　　غم آئے یاد نہ کیوں کر جناب اصغر کا
یہ کربلا کا نمونہ دکھاتی ہی دہلی　　　پدر کو نعشِ پسر پہ رُلاتی ہی دہلی

لیکن اس بلند مرتبہ خاندان سے کہیں زیادہ مبین دہلی کے اہلِ کمال کا ماتمی ہی "جہاں کے لوگ علم و ہنر میں کامل تھے" "جہاں کے شاعر اور عالم مہندس اور عاقل مشہور آفاق تھے" مگر افسوس کہ تصویریں بن بن کر بگڑ گئیں اور محشر سے پہلے ہی گناہوں کی تعزیریں ملیں۔" اہلِ کمال کے ماتم کے ساتھ مبین دِلّی کی عمارتوں کی سابقہ عظمت اور موجودہ تباہی اور شکست و ریخت کا بھی ماتم گسار ہی۔

پُرانے باحیثیت خاندانوں کی مفلوک الحالی اور در بہ دری کا ذکر بھی مبینؔ کے شہر آشوب کا خاص بیان ہو وہ لوگ جن کے دروں پر ہجومِ خلقت تھا اور ان کے نام سے حاتم کا نام زندہ تھا' اب وہ فاقوں میں بسر کرتے ہیں۔

خُدا کی شان ہو جو کل تک نقیب چوب دار رکھا کرتے تھے' اب وہ ایسے ہوگئے کہ خود اپنے نوکروں سے بدتر ہوگئے۔ کل تک جو لوگ دوشالہ پوش تھے' انھیں وقتِ مرگ کفن تک میسر نہ آیا۔ غرض ہفت ہزاریوں اور پنج ہزاریوں کی اولاد یوں بے آب و دانہ پھر رہی ہو کہ ؎

بجائے آب ملے اشک رونے کی جا ہو   غذا ہو غم کی شب و روز حال ایسا ہو
نہ شیر خواروں کو ملتا ہو شیر وائے غضب
زبان پھیرتے معصوم ہیں لبوں پر اب

باغی فوج کی شکست کے بعد جب انگریزی اور پنجابی فوج دہلی میں داخل ہوئی تو اس نے بے تحاشا زن و مرد کو قتل کرنا شروع کیا اور معمولی سے شبہے کی بنا پر شرفا کی گرفتاریاں اور ان کے گھروں کے تاراج کا آغاز کیا تو شرفاے دہلی نے بدحواس اور سراسیمہ ہوکر دہلی سے نکل جانے کی ٹھان لی اگرچہ اس وقت انھیں زیرِ آسمان کوئی امن کی جگہ معلوم نہ تھی۔ مگر انھوں نے صحراؤں کی خاک چھاننے اور جنگلوں میں بھوکے ننگے مارے مارے پھرنے کو دہلی میں رہنے پر ترجیح دی۔ ان لوگوں میں مرد عورتیں، بچّے بوڑھے سبھی شامل تھے۔ ناز و نعمت میں پلے ہوے ان لوگوں پر دہلی سے نکلنے پر جو جو مصائب نازل ہوے' ان کے تذکرے کے لیے ظہیر کی 'داستانِ غدر' اور خواجہ حسن نظامی کے 'وقائع غدر' کو دیکھنا چاہیے۔ مبینؔ نے بھی اس خاص واقعے پر ترجیع بند مسدّس لکھا ہو جس کا پہلا بند یہ ہو ؎

یہ نئی ہو گردشِ چرخِ کہن   دشمنِ جاں ہو جفاے دل شکن
وہ بلا آئی، گئی بھول بل یہ بن   اب نہیں ہو ہاے جاے دم زدن
پا برہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

پہلے محشر سے قیامت آگئی حشر کی سر پر مصیبت آگئی

لب پہ گردوں کی شکایت آگئی جانِ پُر افسوں پر آفت آگئی

پا برہنہ گھر سے نکلے مرد و زن الخ

اس ترجیع بند میں مبینؔ نے دہلی میں مال واسباب کے لُٹ جانے، اس صحرائے مصیبت کی کربت وغربت، بے آب ودانہ سفر، تن کی عریانی، افراتفری یعنی باپ سے بیٹا غافل اور بھائی سے بھائی بیزار — غرض مصیبت اور غم کا ماتم انگیز حال لکھا ہے۔

شہرآشوب داغؔ داغؔ کا شہرآشوب، دِلّی کی بربادی کے متعلق سب شہرآشوبوں میں خاص امتیاز رکھتا ہے۔ ان کے عام کلام کی طرح اس مسدس کی زبان بھی لاجواب و بےنظیر ہے۔ واقعاتِ دہلی کی جو تصویر انھوں نے کھینچی ہے اس میں واقعاتی عنصر کو تخیلی رنگ کے ساتھ اس درجے چمکایا ہے کہ یہ بیانِ درد بے حد موثر اور دردناک ہوگیا ہے۔ سب سے پہلے دِلّی کی سابقہ شان و شوکت اور اہلِ دہلی کے کمال و ہنر اور ان کی مجلسی زندگی کی چھوٹی سی تصویر دی ہے۔ اس کے بعد پوربیوں کا شہر میں آنا، اور زن و مرد کا بے تحاشا قتل ہونا، پھر شرفاے دہلی کا گھروں کو چھوڑ چھاڑ کر بھاگنا، اور راستے میں زمیں داروں اور گنواروں کے ہاتھ سے لٹنا، گانو گانو سر چھپاتے پھرنا اور جاے امن کا یسّر نہ آنا ———— غدر کے فرو ہوجانے کے بعد دہلی کے شرفا اور اہلِ کمال کا قید و بند کے مصائب میں پھنسنا۔ غرض آفتوں اور مصیبتوں کا حال، غم کی زبان اور ماتم کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ یہ شہرآشوب اگرچہ مفصّل نہیں اور اس میں واقعے کے ساری جزئیات درج نہیں مگر مجموعی تاثیر کے لحاظ سے اہلِ دِلّی کی مصیبت کا کامیاب ترین مرقّع ہے۔ بےضرورت بھرتی اور لاطائل تفصیل کی بجاے ایجاز و ایما سے کام لیا گیا ہے۔

داغؔ کے شہرآشوب میں تمام مصائب کا ذمّے دار پوربیوں کو قرار دیا گیا ہے جو"دین دین" کے نعرے بلند کرتے ہوے میرٹھ سے دلّی پر چڑھ دوڑے۔ مگر یہ گنگادین اور ماتادین کیا جانیں کہ دین کس بلا کا نام ہے؟ یہ پوربی نہیں آئے خدا کا قہر آیا۔ تعجب ہے کہ داغؔ نے انگریزی فوج کی تباہ کاریوں کا ذکر نہیں کیا اور نہ بادشاہِ دہلی کا صراحت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔ البتّہ ناز و نعمت میں پلے ہوے نونہالوں

کے انقلاب احوال پر ضرور آنسو بہائے ہیں۔ یہ شہرآشوب کسی حد تک شاہی خاندان کے جذبات کا آئینہ دار ہے۔

داغ کے شہرآشوب میں کمال اور شایستگی کے مرثیے کے ساتھ اقتصادی بدحالی اور مصیبت کا رونا بھی موجود ہے ؎ جو مال مست تھے اب ان کو فاقہ مستی ہے ——— بجائے ابرِ کرم مفلسی برستی ہے ———

یہ تنگ جینے سے ہیں ایسی تنگ دستی ہے

شہرآشوب حکیم محمّد تقی خاں سوزاں | سوزاں کا شہرآشوب اس لحاظ سے خاص امتیاز رکھتا ہے کہ اس میں غدر کے واقعات کی جزئیات کی تفصیل کافی ہے۔ مثلاً میرٹھ کی فوج کا کارتوس کو نہ کاٹنا، ان کی بغاوت اور دہلی پر حملہ، انگریزوں کا بے دریغ قتل، دہلی کے اوباشوں کا باغیوں سے مل جانا، اور فرنگیوں کو تلاش کرنے کے بہانے سے شرفا کے گھروں پر یورش، پوربیوں کی درشت مزاجی اور مطلق العنانی، رعایا کا شہر کو چھوڑ کر بھاگ نکلنا اور دشتِ ابتلا میں آوارگی اور آشفتگی —— وغیرہ وغیرہ، سوزاں کے خیال میں غدر چند مفسدوں کا ایک غلط منصوبہ تھا کیوں کہ اپنے آقاؤں اور سرداروں سے جنگ اصولاً درست بات نہ تھی۔ سوزاں اگرچہ غدر کے سلسلے میں بادشاہ کو بے قصور قرار دیتے ہیں۔ مگر یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ شہر کی تمام مصیبتیں اہلِ قلعہ کی بدولت رونما ہوئیں۔ سوزاں کو دہلی کے آثارِ قدیم کے مٹنے کا بے حد ملال ہے مگر قدیم خاندانوں کے مٹ جانے اور ان لوگوں کی تباہی کا بھی رنج ہے جو کبھی امیر بن امیر تھے مگر اب غریب ہیں۔

اس شہرآشوب کے پہلے ۲ بندوں میں مرحوم جہان آباد کی تہذیب کا شاعرانہ مگر حقیقی تذکرہ ہے اور دِلّی کی ان قدردانیوں اور کمال پرستیوں کی طرف اشارہ ہے جو دہلی کا امتیازِ خاص تھا ؎

غریب پرور و کانِ کمال تھا یہ مقام   عدیل اس کا نہ تھا جانتے ہیں خاص و عام
بر آتی آرزو ان کی جو آتے یاں ناکام   یہاں سے نام وہ پاتے جو ہوتے تھے گُم نام
سند جہاں کو تھی عالی مقام سے اس کے   یہ اعتبار تھا عالم کو نام سے اس کے

شہرآشوب ظہیر دہلوی | یہ وہی ظہیر ہیں جنھوں نے "داستانِ غدر" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ اس شہرآشوب کو اسی کتاب کا منظوم ملخّص سمجھنا چاہیے۔ یہ بہادر شاہ کے

متوسلین میں سے تھے۔ اسی وجہ سے ان کا شہر آشوب ملازمانِ شاہی کے خیالات کی نمایندگی کرتا ہو۔ جیسا کہ انھوں نے وقائع غدر میں بھی ثابت کیا ہو۔ بہادر شاہ کا اس غدر سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان کی طرف سے جو کچھ ہوا اسے محض مجبوری کا نتیجہ خیال کرنا چاہیے۔

ظہیر کے شہر آشوب میں دہلی کے تقدس اور عظمت سے متعلق بند نہایت زوردار ہیں۔ دہلی کی عظمت اس تذکرے کے بعد تلنگانِ پُرجفا کے دھاوے اور اس کے بعد مصائب کے ہجوم اور بالآخر لوگوں کے دہلی سے نکل بھاگنے کا ذکر نہایت مؤثر اور درد انگیز ہو جس کی نثری تفصیل اگر وقائع غدر سے پڑھ لی جائے تو اثر اور بھی ہوش ربا ہو جاتا ہو۔ ظہیر نے دہلی کے اوباشوں اور مخبری کی گرم بازاری کا تذکرہ بھی بڑے چُبھتے ہوے الفاظ میں کیا ہو۔

آخر میں لفٹننٹ گورنر کوپر صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوے "گزشتہ را صلوات" کی نصیحت کی ہو۔ یہ کوپر صاحب وہی ہیں جن کا ذکر وقائع میں ظہیر نے کیا ہو۔

زبان و بیان کے اعتبار سے یہ شہر آشوب، داغ کی مسدس کے مماثل اور شاعرانہ رُتبے میں اس کے قریب قریب ہو۔

شہر آشوب محمد علی تشنہ

محمد علی تشنہ کا شہر آشوب شعر و سخن کے ایک پرستار کے خیالات کا ترجمان ہو۔ اس میں اقتصادی اور تاریخی عنصر کچھ زیادہ نہیں۔ تختِ سلطنت اور بارگاہِ سلطانی کے ماتم کے ساتھ دہلی کی مجالسِ عیش اور محافلِ نشاط کا غم تشنہ کو سب سے زیادہ ہوے

ہزاروں زلفِ پری وش کے یاں تھے سودائی　　ہزاروں مے کش و مے خوار و مست و صہبائی
شرابِ عیش پلاتا تھا چرخِ مینائی　　قبول کرتے تھے اس در کی سب جبیں سائی

. . . .

مریضِ عشق کے بھی واسطے مسیحا تھا　　ہر ایک شخص کے حق میں یہ شہر اچھا تھا

تشنہ جیسے ادب پرست اور شعر پسند کو اس بات کا بہت دُکھ ہو کہ دہلی کی بربادی کے بعد شعر و موسیقی کے چرچے ختم ہوگئے اور وہ محبوبوں کے تذکرے اور حسینوں کے شکوے نہ رہے ۶ رہا نہ گانے سے شوق اور نہ نہ بجانے سے۔ جو لوگ پہلے شعر و سخن میں وقت گزارتے تھے اور ان کی قدر ہوتی تھی، اب اِن محفلوں

کی ابتری کی وجہ سے منقار زیرِ پر ہو کر بیٹھ گئے ہیں ؎

جو شعر کہتے ہیں اور لوگوں کو سُناتے ہیں وہ بیٹھے رہتے ہیں اور آتے ہیں نہ جاتے ہیں
جو قدرداں نہیں اپنا کسی کو پاتے ہیں تو دِل ہی دِل میں وہ خونِ جگر کو کھاتے ہیں
غزل کا ذکر نہ چرچا کسی یگانے سے
مذاقِ شعر و سخن اُٹھ گیا زمانے سے

سالک ۔ قربان علی بیگ سالک کا شہر آشوب مسدّس اپنے اندر کوئی خاص رنگ نہیں رکھتا۔ باقی آشوبوں کی طرح، اس کی ابتدا بھی دہلی کی عظمتِ گزشتہ کے تذکرے سے ہوتی ہے۔ سالک کے نزدیک مرحوم دہلی "کانِ سرور" بلکہ "جہانِ سرور" تھی۔ بس کو اب کسی کی نظرِ بد کھا گئی ہے۔ مِٹی ہوئی دِلّی میں وہ پُرانی چہل پہل اور وہ پُرانے نقشے نہ دیکھ کر ماتم گسار شاعر آب دیدہ ہے۔ مسجدِ جامع جہاں صفِ ملائکہ نماز گزار ہوتی تھی، اب وہاں نہ نماز ہے نہ اذان ہے ؏

جب اس کو دیکھیے خالی تو جی بھر آتا ہے

اُس کے گرد کے بازاروں کی زیب و زینت جس سے طبیعت کو فرحت ہوتی تھی، اب وہاں وحشت اور افسردگی کے بغیر کچھ نہیں۔

سالک کا نظریہ بھی آشوبِ دہلی کے متعلق یہ ہے کہ اس میں دِلّی کے ثقات اور عام شرفائے شہر بے جُرم قتل ہوئے اور اہلِ دہلی کا باغی فوج کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ اس شہر آشوب میں وہ بند قابلِ ذکر ہیں جن میں دِلّی کے لوگوں کا شہر کو چھوڑ کر بھاگنے اور کسی جگہ جائے امن نہ ملنے کا ذکر ہے ؎

سمجھ کے اپنا ٹھکانا جہاں گئے ہم لوگ ذلیل یاں سے زیادہ ہوئے وہاں ہم لوگ

اس مصیبت میں پردہ نشینوں کی جو حالت ہوئی۔ اس کی کیفیت بھی کچھ کم دِل گداز نہیں۔

دہلی کے اِرد گِرد میواتیوں اور گوجروں کے ہاتھ سے شرفا کے لُٹ جانے اور ذلیل ہونے کی سرگزشت اور بھی اندوہ ناک ہے۔

عام شہر آشوبوں کے برعکس، اس شہر آشوب کا خاتمہ دعا پر نہیں بلکہ ایک مژدۂ امّید پر ہے ؏

رسید مژدہ کہ ایّامِ غم نہ خواہد ماند

شہرآشوبِ محسن محسن کی مسدّس کئی اعتبارات سے کامیاب شہرآشوب ہے - اس کو پڑھ کر عرب کے ان عاشق شاعروں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے جو محبّت کے مٹے ہوے نقوش کی یاد میں نکل کر ان اطلال و دمن کا طواف کیا کرتے تھے جہاں ماضی نے حسین و جمیل معاملاتِ عشق کو رونما ہونے کا موقع دیا تھا -

محسن کا شہرآشوب مرحوم دہلی کی شان دار مجلسی زندگی اور شایستہ معاشرت اور شہر دہلی کی آرایش اور زیب و زینت کا واضح اور ہو بہو عکس ہے - محسن مرحوم دہلی کی شکستہ عمارتوں اور آثارِ عظمت کے کھنڈروں میں سے ہر ایک پر کھڑے ہوتے ہیں، اور عرب شاعر کی طرح ان رنگین لمحات کو یاد کرتے ہیں، جب دہلی زندہ اور موجود تھی - اور دہلی کی عظمت کا رنگ اگرچہ بہت کچھ پھیکا ہوچکا تھا مگر ہنوز اس کے خدوخال اپنے پورے حُسن اور آرایش کے ساتھ اچھی طرح دکھائی دیتے تھے -

دہلی کی مرکزیت اور شوکت کے ذکر کے بعد محسن ایک ایک پُرشوکت عمارت کا ذکر کرتے ہیں اور انقلابِ زمانہ پر اشکِ حسرت بہاتے ہیں - وہ لال قلعہ، جس میں شاہ زادے رہتے تھے جنھیں سب حضور حضور کہہ کر پکارتے تھے - وہ لال پردہ جو پردہ پوشِ عالم تھا جسے اب مزدور کھودتے پھرتے ہیں - وہ نومحلہ جو رشکِ کوچہ و بازار تھا وہ جنگلی ڈیوڑھی جو رشکِ وادیٔ ایمن تھی - وہ چاندنی چوک اور اس کے مصفّا بازار اور حوض جو بجاے آبِ نور سے یک سر لبریز - اور اس کے دونوں کناروں کی نہر جس کا پانی پی کر حور وش اپنے لبوں کو چاٹتے تھے ---- اور اس کے گرد درختوں کی کثرت اور ان کے آس پاس پھولوں کی فراوانی اور نکہت ---- اور سب سے زیادہ ---- وہ جامع مسجد جو حُسنِ وسعت اور رفعت کی جامع تھی - اور اس کے چارسو چوپڑ کے خوش نما بازار، اُن میں سے اکثر عمارتیں اب سنگ و خشت کا ڈھیر بن گئی ہیں - مزدور ان کی بنیادوں کو اُکھاڑکر زمین کو ہموار کر رہے ہیں - اور وہ ہجومِ خلائق اور میلے ٹھیلے جو ان مقامات سے وابستہ تھے سب ماضی کی داستانِ عبرت بن کر رہ گئے ہیں ؏

وہ لال قلعہ جسے کوہِ طور کہتے ہیں الخ [1]

محسن کے شہر آشوب میں غدر سے پہلے کی دہلی کی معاشرت کی تصویر نہایت تفصیل اور کامیابی کے ساتھ کھینچی گئی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ محسن کا قلم اُن جزئیات اور تفصیلات کے بیان کرنے میں خاص مشق رکھتا ہے اور محسن کو اس تقریبِ درد میں خاص لطف حاصل ہوتا ہے ـــــ ایسا لطف جو عاشق کو اپنے محبوب کے حُسن وجمال اور سراپا کے بیان میں حاصل ہوا کرتا ہے ـــــ وہ دہلی کی رنگین اور شایستہ مجلسوں سے متعلق زرا زرا سی بات کو لیتا ہے اور اس کو شاعری کے رنگ کے ساتھ نہایت نمایاں اور دل نشین بناتا جاتا ہے۔ اس میں رنگ کی گہرائی بھی اور تفصیلات کی فراوانی بھی! ـــــ جیسے کوئی حقیقت نگار کسی واقعے یا منظر کا نقشہ ضروری تفصیل کی مدد سے بیان کیا کرتا ہے، بلاخوفِ تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ معاشرتِ دہلی کے متعلق کوئی نظم اتنی مفصل اور مشرح شاید موجود نہ ہوگی بلکہ نثر میں بھی صرف ایک دو ماخذ ہی ایسے ہوں گے جن میں غدرِ دہلی سے پہلے کی شایستہ اور مہذّب مجالس کا اتنا عمدہ حال دیا گیا ہوگا۔

محسن کے شہر آشوب نے دہلی کی مجلسی زندگی کی جو تصویر ہمارے سامنے رکھی ہے، وہ ایک توانا اور پُرقوت سوسائٹی کی تصویر نہیں بلکہ اس بیمارِ شایستگی کی تصویر ہے جس کے خصائص میں فنونِ لطیفہ کی پرستش اور شراب و شعر کی عبادت، رقص و سرود کی یاری غرض توانائی اور جذبۂ استیلا کی کمی اور بزمیہ مشاغل کی کثرت کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ محسن کے الفاظ میں دہلی کیا تھی عشق آباد تھی جس میں حُسن وعشق باہم کھیلا کرتے تھے اور جس کے نازنین تمام دُنیا کے حسینوں پر فوقیت رکھتے تھے ؎

یہ شہر وہ ہے کہ تھے اس میں خلد کے ساماں — ہر ایک شخص یہاں تھا بجاے خود رضواں
ہر ایک طفل یہاں کا تھا ثانیٔ غلماں — دبیر چرخ کا ہم سر تھا یاں ہر ایک جواں
ہر ایک مکاں تھا یہاں رشک روضۂ رضواں

رہا نہ کوئی جواں اور نہ کوئی پیر امیر — براے مخبری کے رہ گئے ہیں چند شریر الخ[۱]

ہمارے آخری دَور کی معاشرت میں مہذّب ناچنے والیوں (یعنی وہ جنھیں بہ اصطلاحِ سابق رنڈیاں کہا جاتا تھا) کو ایک خاص مقام اور رتبہ حاصل تھا۔ ہمارے آج کل کے دوست، تو شاید اس "طائفۂ علیا" کے

[۱] فریاد، صفحہ ۱۳

اثر و رسوخ کا اس لیے اندازہ نہ کرسکیں کہ آج کل وہ سارے کمالات حوا کی شریف بیٹیوں نے اپنے لیے ضروری کرلیے ہیں مگر قدیم زمانے میں جب کہ گھر والیوں کے فرائض ذرا مختلف تھے۔ رنگین مزاج نوجوانوں بلکہ فنِ لطیف کے بہانے سے عشق میں دم مارنے والے بوڑھوں کے لیے بھی 'بائی جی' کی کوٹھی کے بغیر کوئی جائے بازگشت نہ تھی۔ نتیجہ اس کا یہ کہ رقاصاؤں کا طبقہ معاشرت میں نہایت شدت کے ساتھ اثر انداز ہوا۔

محسن نے بھی اس شہر آشوب میں رنڈیوں کا ذکر کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر محسن اپنے مرقعے سے "رنڈیوں" کے حال کو حذف کر دیتے تو یقیناً دہلی کی معاشرت کی تصویر مکمل نہ ہوتی۔ [1]

وہ ہائے رہتی تھیں دہلی میں رنڈیاں جو حسیں		کوئی تھی حور شمائل کوئی تھی زہرہ جبیں
خجل تھا عارضِ روشن سے جن کے ماہِ مبیں		سرود و رقص سے پامال ان کے اہلِ زمیں
یہ انقلابِ فلک سے وہ ہوگئیں ناچار
جہاں میں پھرتی ہیں آوارہ مثلِ گرد و غبار

حضرات! اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ دہلی صرف یہی کچھ تھی اور اس کا کلچر صرف رنڈیوں کے ترقی پسندانہ ــــــ تک محدود تھا۔ نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دہلی کے آخری دور کا تمدن ــــــ اگرچہ ماضی کا صرف عکس ہی تھا ــــ مگر پھر بھی علم و ادب کے لحاظ سے شان دار دور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں بھی علم و ادب کے میدان میں ہم ان بلند پایہ شخصیتوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ جن کا ذکر سطورِ بالا میں آچکا ہے۔

افسوس ہے کہ محسن صاحب نے علمی اور ادبی لحاظ سے، اپنے بیان کو نہایت مختصر رکھا چناں چہ صرف ایک بند میں، اس اہم اور ضروری پہلو کو بیان کرکے آگے بڑھ گئے ؎

ہر اک حکیم یہاں تھا ارسطوے ثانی		ہر اک امیر کو تھا دعوئے سلیمانی
ہر اک حسین یہاں رشکِ ماہِ کنعانی		ہر اک فقیر کو حاصل تھا علمِ عرفانی
بسانِ نقشِ قدم ہوگیا ہر اک پامال
دیارِ ہند سے سب اٹھ گئے ہیں اہلِ کمال

مگر اس کے برعکس عام لوگوں کی تفریحوں اور دل چسپیوں اور دیگر مجلسی آرائشات و تجملات کا ذکر نہایت

[1] فریاد، صفحہ ۱۱

شوق و شغف سے کیا ہے۔ مثلاً چاندنی چوک میں لوگوں کی بھیڑ بھاڑ، جوانوں کا اکڑ کر سرِ بازار پھرنا جن میں بعض کے سروں پر زرّیں ٹوپیاں اور بعض کے دستار، کسی کے ہاتھ میں بانڈی کسی کے ہاتھ میں تلوار۔ کوئی گھوڑے پر سوار کوئی ہاتھی پر! جامع مسجد کی سیڑھیوں پر پچھلے پہر میلہ لگنا، بازار میں کٹوروں کی جھنکار، گُل فروشوں کے پھولوں کے ٹوکروں کی بہار، سودا بیچنے والوں کا پکار پکار کر سودا بیچنا، خوانچے والوں کا قطار قطار پھرنا —— جمنا سے نہاکر واپس آنے والیوں کی قطاریں اور بہاریں —— ان کا مچل مچل کر چلنا، وہ شوخیاں، وہ ادائیں —— ۵

وہ لال جوڑے پہن کر کوئی نکلتی تھی | وہ بانک پن سے اُٹھا پائنچوں کو چلتی تھی
وہ ہاتھ پانو میں مہندی کو اپنے ملتی تھی | وہ بات بات میں انداز سے مچلتی تھی

ہوے ہیں رنج و تردّد میں اب تو وہ محبوس
بجاے مہندی کے مَلتے ہیں وہ کفِ افسوس

یہ اُن کا ہوگیا ہے اب تباہی سے احوال
کہ ساری بھول گئے وہ ادا کی چال

محسن کے شہرآشوب میں اقتصادی پریشانی کا حال بہت کم ہے۔ ان کی ذہنیت ایک باثروت شخص کی ہے جس کا تعلق خاندانِ شاہی سے تھا۔ وہ خاندانِ شاہی، قلعے کی شان و شوکت، تفریحی چہل پہل، امیرانہ سج دھج اور عیشِ رفتہ کے ماتمی ہیں۔ وہ اس ساری بربادی کا ذمّے دار جرنیل بخت خاں کو قرار دیتے ہیں اور بادشاہ کو بےقصور قرار دیتے ہیں۔ اور اہلِ قلعہ کی مصیبتوں پر اشک افشاں ہیں۔ غدر کے اسباب پر گہری نظر ڈالنے سے قاصر ہیں اور موجودہ عسرت و پریشاں حالی کو پیشِ خیمۂ جنّت سمجھتے ہیں۔ بایں ہمہ ان کا شہرآشوب کامیاب قطعۂ نظم ہے۔ اس میں اثر اور سوز و گداز کافی ہے جس کی وجہ وہ زیر و بم اور نشیب و فراز ہے جسے انھوں نے اثرانگیزی کے لیے التزام کیا ہے۔ یعنی یہ التزام کہ ہر بند میں سابقہ عیش و آرام اور شان و شکوہ کا موثر ذکر کرنے کے بعد آخری شعر میں موجودہ حالت کا تذکرہ کیا ہے۔ اس تقابل سے دہلی

کی زندگی کے سابق و حال کی تصویریں بہ یک وقت آنکھوں میں پھر جاتی ہیں۔

شہر آشوبِ افسردہ | یہ مسدس بہ طرزِ مناجات ہے۔" نوحہ گری و مویہ سرائی بہ طرزِ مناجات کردہ۔" اسلوب کے لحاظ سے یہ نظم شہر آشوبِ داغ کی طرز کی حامل ہے۔ جس میں واقعات اور تاریخ کی جزئیات کی تفصیل دینے کی بجائے معمولی تاریخی اشاروں کے ضمن میں درد و غم کی داستان سُنائی گئی ہے۔ چناں چہ جذباتِ درد کا اظہار نہایت شدّت کے ساتھ ہُوا ہے اور واقعہ نویسی کے بوجھ نے نظم کی لطافت کو نقصان نہیں پہنچایا۔ ہر بند کے تیسرے شعر میں دعا ہے۔ جس سے اثر انگیزی اور بھی بڑھ گئی ہے ؎

داغِ غم سینے پہ کھائے بیٹھے ہیں　　　فکر میں سر کو جھکائے بیٹھے ہیں
تھا جو سرمایہ لُٹائے بیٹھے ہیں　　　ہاتھ دُنیا سے اُٹھائے بیٹھے ہیں

رحم بر بےکساں اے دادرس
آہ از دل برلب آید ہر نفس
مجھ سا دُنیا میں نہیں اندوہ گیں　　. . . الخ

اس نظم کا تاریخی، اقتصادی اور سیاسی رنگ پھیکا ہے۔ اور عام اجتماعی احساس کے ساتھ ساتھ اس نظم میں انفرادی غم کا عنصر زیادہ نمایاں ہے جس میں مال و متاع کے لُٹ جانے، اور عزّت، و حرمت کی بربادی اور احباب کے قتل کے ماتم نے تلخئ الم کو تیز کیا ہُوا ہے۔ مخبروں کے فتنے سے بچنے کی دعا ہر وقت افسردہ کی زبان پر اور دوبارہ امن کی آمد کی حسرت دِل میں ہے ؎

دِل کو افسردہ کے خوش کر اے خدا　　　رات دن یہ رنج میں ہے مبتلا
در پئے ایذا ہیں حاسد جا بہ جا　　　دامِ مکر و کید سے اُن کے بچا

ہر بلائے صعب از وے دُور دار
دُشمنش را از غضب مقہور دار

نوحۂ دہلی از آزردہ | مفتی صدر الدّین آزردہ کے شہر آشوب کا پہلا بند یہ ہے ؎

آفت اس شہر میں قلعے کی بدولت آئی واں کے اعمال سے دِلّی کی بھی شامت آئی
روزِ موعود سے پہلے ہی قیامت آئی کالے میرٹھ سے یہ کیا آئے کہ آفت آئی
گوش زد تھا جو فسانوں سے وہ آنکھوں دیکھا
جو سُنا کرتے تھے کانوں سے وہ آنکھوں دیکھا

اسی بند سے مُفتی صاحب کا نظریہ غدر کے متعلق واضح ہوجاتا ہے۔ جس کی رُو سے وہ دہلی کی تمام مصیبتوں کا ذمّے دار اہلِ قلعہ کو ٹھیراتے ہیں۔ مُفتی صاحب کے اِس شہر آشوب سے تاریخی، اقتصادی اور سیاسی رنگ بالکل نابود ہے۔ ان کی ذات سے توقع تھی کہ انھوں نے دِلّی کے علم، دلّی کے تمدن، دلّی کی بہترین معاشرت کی تباہی اور بربادی کا ماتم کیا ہوگا۔ مگر افسوس ہے کہ انھوں نے اس شہر آشوب میں اپنی تمام تر توجہ ناز و نعمت میں پلے ہوے اُمرا و شاہ زادگان کی سابقہ پُرنشاط زندگی اور موجودہ پریشانی، فلاکت اور مصیبت کی کیفیت نگاری میں صرف کردی۔ اگر صرف اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ نوحہ اچھا خاصا مؤثر ہے اس لیے کہ اس باعزت اور پُرتنعم طبقے کا انقلابِ احوال بھی کچھ کم غم انگیز نہیں۔ مگر دِلّی صرف اسی ایک طبقے سے عبارت نہ تھی اور اس کی بربادی کا ماتم صرف ان لوگوں کے مصائب تک محدود نہ تھا بلکہ دِلّی کی بربادی گویا ہزار سال کی شائستگی اور کمال اور ہنر اور تہذیب کے مٹنے کے مرادف تھی۔ تاہم شہر آشوب کے اس کم زور پہلو کی تلافی کسی حد تک اس طرح ہوجاتی ہے کہ مفتی صاحب نے اس نظم میں بعض احباب کا پُرسوز ماتم کیا ہے جس سے خلوص اور صداقت نمایاں ہے ؎

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے سر ہے اور جوشِ جنوں سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر جی ہی پہ بن جاتی ہے مصطفا خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے
کیوں کہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جُرم جو صہبائی ہو

یہ شہر آشوب بھی اثر اور تاثیر کے لحاظ سے افسردہ وغیرہ کے شہر آشوب سے کسی طرح کم نہیں بلکہ اہلِ ناز و نعم کی موجودہ اور سابقہ زندگی کی کیفیت نگاری کے اعتبار سے اس کا رُتبہ خاصا بلند ہے۔

شہر آشوب آغا جان عیش

حکیم آغا جان عیش نے دو شہر آشوب مسدس اور ایک قطعۂ آشوبیہ لکھا ہے۔ ان سب نظموں میں وہ ہمیں ایک ہنر پرست اور کمال پرست نظر آتے ہیں۔

پہلے شہر آشوب میں انھوں نے دہلی کی زندگی کی تعریف میں ۱۴ بند لکھے ہیں۔ جن میں جہان آباد کے اہلِ کمال اور اہلِ ہنر کہ جن میں سے ہر ایک وحیدِ عصر تھا۔ یہاں کی شایستگی، مجلسی طریقے، وضع داریاں اور رکھ رکھاؤ، نفاست اور شرافت، نکتہ آفرینی، لطافت اور ظرافت، زبان و بیان، بازاروں کی صفائی، کوچہ و بازار کی آراستگی، در و دیوار کے نقش و نگار، عمارات و آثار، گل و گلزار ——— غرض تمام مجلسی اور تہذیبی نظام کی کیفیت بیان کی ہے۔

دوسرے شہر آشوب میں بھی اہلِ کمال کی سابقہ قدر و منزلت اور موجودہ اقتصادی پریشانی (کہ جس کے سبب وہ ”ارذل پیشے“ اختیار کرنے پر مجبور ہیں) نیز اہلِ تنعم کی پریشانی اور ادبار، ان کی نزاکت اور عیش و نشاط، اسی طرح آثارِ کہنہ اور باغ و گل زاروں کی بربادی کا تذکرہ ہے۔

غرض آغا جان عیش کا شہر آشوب ایک ہنر پرست، کمال کے ماتم گسار، دہلی کے عاشقِ صادق کا شہر آشوب ہے۔ افسوس ہے کہ اس قابلِ قدر پہلو کے ساتھ ساتھ یہ خامی بھی موجود ہے کہ ان کی شاعری میں قوت اور سوز نہیں۔ اس شہر آشوب میں جا بجا ”طبیبانہ“ اصطلاحیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً

مریضِ غم کے لیے خانۂ شفا تھی وہ — جہاں میں دردِ دل و جان کی دوا تھی وہ
جو خاک بھی تھی وہاں کی تو کیمیا تھی وہ — بھلا میں کیا کہوں تم سے کہ چیز کیا تھی وہ
تھی اہلِ دید کو وہ فرح بخش جانوں کی الخ

تھے وہ جن باغوں میں اقسام کے میوے پُر نور — ناشپاتی و بہی سیب و انار و انگور
اور اسی قسم کے میووں سے چمن تھے معمور — ان کی بو باس سے ہو جاتا تھا خفقان بھی دور
یا انھی باغوں میں ہیں چار طرف خاک کے ڈھیر
اور گل و غنچہ کی جا ہیں خس و خاشاک کے ڈھیر

اس کمزوری کے علاوہ پھسپھساپن بہت ہے، موثر منظرکشی کی بجائے بے ضرورت طول بہت ملتا ہے۔

قلعہ اور اہلِ قلعہ کی بربادی پر عیش کا غم پُرخلوص ہی مگر ان کی طبیبانہ شاعری ان کے خلوص کا ساتھ نہیں دیتی۔ ان کے آشوبیہ قطعات اور غزلوں کا بھی یہی رنگ ہی۔ البتہ وہ غزل جس کی ردی "کیا تھا کیا ہوا" اور قافیہ دم اور غم ہی، نسبتاً بہتر ہی۔

شہر آشوب کامل اس شہر آشوب میں دہلی کی اجتماعی زندگی اور معاشرت کے مِٹ جانے کا ماتم ہی۔ بادشاہ، شاہ زادوں اور دیگر اہلِ قلعہ کے مصائب کے ساتھ ساتھ عام اہلِ کمالِ دہلی کی پریشانیوں پر غم کے آنسو بہائے گئے ہیں۔ کامل بھی محسن کی طرح دہلی کے آثار و عمارات کے کھنڈروں کے پاس کھڑے ہو ہوکر عیشِ رفتہ کو یاد کرکر کے روتے ہیں۔ وہ قلعہ رشکِ روضۂ گُلِستانِ رضواں تھا —— وہ لال پردہ —— وہ چوک ہی مسجدِ جامع —— کہ

.... اس کی رونق بازار چارسو مت پوچھ
کہ ہم سے ہو نہیں سکتی ہی گفتگو مت پوچھ

—— یہ سب کچھ اب کہاں ہی؟ اور اس ساری متاعِ عزیز کے لُٹ جانے کا حال کیسے بیان کیا جائے۔ کامل کا نقطۂ نظر غدر کے متعلق وہی ہی جو قلعے کے متوسلین کا تھا۔ وہ باغی فوج کی اس حرکت کو تمام مصائب کا ذمّے دار قرار دیتے ہیں اور بادشاہِ دہلی کے حال پر گریاں ہیں۔ انھوں نے نازونعمت میں پلے ہوے لوگوں کی آبلہ پائیوں اور صحرانوردیوں کا بھی تذکرہ کیا ہی۔

یہ شہر آشوب مجموعی لحاظ سے متوسّط درجے کی چیز ہی۔ اور سیاسی، اقتصادی اور اَدَبی لحاظ سے اس میں کوئی خاص بات نمایاں معلوم نہیں ہوتی۔

مجموعی رائے ان شہر آشوبوں میں داغ کا مسدّس شاعرانہ کمال سے متصف ہی۔ اس میں تفصیل کی کمی ہی مگر اثر، تاثیر اور خوبیٔ بیان کے لحاظ سے کوئی شہر آشوب اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ افسردہ، ظہیر داغ کی طرز ہی —— ظہیر شاعری کے ساتھ ساتھ تاریخی تفصیل بھی دیتے ہیں۔

تمبین کے شہر آشوب میں یہ خصوصیت ہی کہ اس کا رنگ حکیمانہ ہی وہ غدر کے اسباب و علل کی تلاش کرتا ہی۔ اس کے علاوہ اس میں اقتصادی رنگ نہایت گہرا ہی ع ظلم گوروں نے کیا ہی نہ ستم کالوں نے

سوزاں اور محسن کے شہرآشوب نہایت مفصل ہیں اور تاریخی جزئیات اور معاشرت و آثارِ دہلی کی مرقع کشی کے اعتبار سے سب پر ممتاز ہیں۔

عیش کی شاعری طبیبانہ ہے لہٰذا اس میں سوز و گداز کی کمی ہے۔

سالک متین اور سنجیدہ ہیں مگر سیاسی معتقدات کا اخفا روا رکھا ہے۔

مفتی صدرالدین آزردہ کا شہرآشوب موثر ہے مگر جس حکیمانہ نظر کی ان سے توقع تھی اس سے وہ خالی ہے۔

آشوبیہ غزلیں انقلابِ دہلی کے متعلق غم و الم کا اظہار کرنے کے لیے شعرا نے صرف شہرآشوب ہی نہیں لکھے بلکہ انھوں نے متعدد غزلیات میں اپنے درد کا اظہار کیا ہے۔ چناں چہ مرزا قربان علی سالک نے فغانِ دہلی کی تقریظ میں لکھا ہے :-

"کسی نے اپنے فغاں کو بطرزِ مسدس شہرآشوب بلند کیا، کسی نے اپنے نالے کو طرزِ غزل بخشا۔ اگر غور کیجیے تو ہر ایک غزل ایک نوحہ ہے، کس کی طاقت کہ سُنے اور نہ روئے کس کا جگر ہے کہ اس درد سے خون نہ ہووے۔ جب کوئی کسی کا شعر اس باب میں سُنا جاتا ہے کان گُنگ ہوجاتے ہیں، کلیجہ منھ کو آتا ہے، اپنی مصیبت یاد آتی ہے، وہی بیاباں نوردی نظروں میں پھر جاتی ہے، وہ گٹھریاں بغلوں میں دابنے، وہ شہر سے نکل کر کئی چاہنے، زمیں داروں سے پناہ کا مانگنا غرض کہ جو جو کچھ مصیبتیں لوگوں پر گزری ہیں اس سے آشکارا ہوتی ہیں۔"

(فغانِ دہلی صک)

حقیقت یہ ہے کہ دہلی کے مصائب پر شعرا نے جو غزلیں لکھیں، وہ اثر اور تاثیر کے لحاظ سے شہرآشوبوں سے کسی طرح کم نہیں۔ غزل میں جو اجمال اور ایمائیت ہوتی ہے، اس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ شاعر مطالب و معانی کی پوری پوری تلخیص کرے اور ایک لمبے مضمون کو ایک شعر یا دو شعروں میں بیان کردے۔ اس سے سامع کا ذہن بے ضرورت تفاصیل کے انتظار سے بچ جاتا ہے اور فی الفور وہ اثر قبول کرلیتا ہے جو ایک کام یاب شاعر کسی کام یاب طویل نظم میں ظاہر کرسکتا ہے۔

انقلابِ دہلی سے متعلق آشوبیہ غزلوں میں غالب کے بعض قطعے اور غزلیں آپ میں سے کسے یاد نہ ہوں گی جن میں سے ایک قطعے کا پہلا شعر یہ ہے ؎

بس کہ فعالِ مایُرید ہے آج　　　　ہر سلح شور انگلستان کا

اس قطعے کے دو اشعار یہ ہیں ؎

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا

. . . . — . . . .

. . . . — . . . .

شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

ان غزلوں اور قطعوں میں مرزا غالب نے آشوبِ دہلی کے متعلق درد اور مصیبت کے مجموعی تاثر کو جس طرح ظاہر کیا ہے، وہ دیل مسدس یا مخمس شہر آشوبوں سے کہیں زیادہ ہے۔

بہ ایں ہمہ فنی نقطۂ نظر سے یہ غزلیات، شہر آشوب کی ساری شرائط کو پورا نہیں کرتیں۔ ان میں شہر دہلی کی تعریف اور پھر اس کی بربادی کا نام تو ضرور ہے مگر ان میں سے بیشتر طبقات کے ذکر سے خالی ہیں۔ ان میں عوام کی اقتصادی تکلیف اور پریشانی کی طرف اشارہ تک نہیں اور آخری شعر میں (سوائے بعض کے) دعا بھی موجود نہیں۔ ان غزلیات کو زیادہ سے زیادہ عبرت انگیز غزلیں یا آشوبیہ قطعات کے خودساختہ نام سے تعبیر کیا جاسکتا ہے مگر شہر آشوب نہیں کہا جاسکتا۔

اب میں ان شعرا کی فہرست پیش کرتا ہوں جن کے قلم سے آشوبِ دہلی کے متعلق غزلیات نکلی ہیں :-

احسن	داغ دہلوی	شیفتہ دہلوی	عاصی دہلوی
احقر بجنوری	راقم "	صابر "	عاقل "
احمد دہلوی	رضوان "	صغیر "	عباس "
اکرام "	سالک	ضمیر "	عزیز "
تجمل "	سپہر "	طالب "	عزیز مرزا "
ثاقب "	شاطر "	ظاہر "	عیش "
حالی پانی پتی	شائق "	ظہیر "	غالب "
حسامی	شمشیر "	عاید "	فرحت "

قمر دہلوی	لطف لکھنوی	محسن دہلوی
کامل "	مبین دہلوی	مہدی "
کوکب "	مجروح "	ہنر "

شعرا کی یہ فہرست میں نے مجموعۂ فریادِ دہلی سے اخذ کی ہے (جو فغانِ دہلی از کوکب) پر مبنی ہے۔ ان غزلیات میں سے بیش تر ہم قافیہ و ہم ردیف ہیں۔ چناں چہ مرزا داغ کی غزل کا مطلع یہ ہے ؎

یوں مٹا جیسے کہ دہلی سے گمانِ دہلی	تھا مرا نام و نشاں نام و نشانِ دہلی

ظہیر دہلوی کی غزل کا مطلع یہ ہے ؎

بل بے دہلی و زہے شوکت و شانِ دہلی	لامکاں بن گیا ایک ایک مکانِ دہلی
زمزمے بھول گئے نغمہ طرازانِ چمن	ہے ہر اک نوحہ گر و مرثیہ خوانِ دہلی
ہیں نئے ڈھنگ نئے رنگ نئی گفت وشنید	ایک عالم سے نرالا ہے جہانِ دہلی
رات دن گریہ ہے اور سنگ ہے اور سینہ ہے	اور ظہیر جگر افگار و بیانِ دہلی

ان سب غزلیات و قطعات میں بربادئ دہلی کا ماتم ہے ؎

غم بربادئ دہلی میں بجائے مئے ناب	خونِ دل پیتے ہیں اب بادہ کشانِ دہلی

اس کے علاوہ شہر کی توصیف، اس کے آثار و عمارات کی تعریف، اس کی معاشرت اور وضع داریوں اور قاعدوں کی تحسین بلکہ "ہستی و بانِ دہلی" کی تحسین، اس کے اہلِ کمال و اہلِ فن کا ذکر اور ان کے قتل کا ماتم، غرض وہ سارے مضامین ملخصاً موجود ہیں؛ جو تفصیلاً شہرآشوب کے بیان میں بیان ہو چکے ہیں۔ مگر ایک بات ایسی بھی ہے جو شہرآشوبوں میں شاذ ہے یعنی دہلی کی زبان کی خوبی اور لطافت کا تذکرہ ـــــ اس موضوع پر ان غزلیات میں اس قدر تکرار سے لکھا گیا ہے کہ اگر ان کو درصفتِ زبانِ دہلی کہہ دیا جائے تو ناموزوں نہ ہوگا۔

اس سارے مجموعے میں سے صرف تجلّی، ثاقب، فرحت، مبین اور داغ کی غزلیات ایسی ہیں جن میں شہرآشوب کی خصوصیات باقیوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہیں۔ تجلّی کی تین غزلیں اور ایک قطعہ مجموعۂ فریادِ دہلی

میں ہے۔ پہلی غزل کا مطلع یہ ہے۔ ؎

صرف اِک نام کو باقی ہے نشانِ دہلی نہ وہ رفعت ہے نہ شوکت ہے نہ شانِ دہلی

اس میں دلّی کی توصیف اس کے بازاروں اور کوچوں کی خوبصورتی کا ذکر، اس کے ہنرمندوں کی یاد —— اس کے بعد انقلاب احوال یعنی کالوں کا آنا۔ اور لوگوں کا شہر سے نکلنا، اور اب سینہ کوبی اور در بہ دری۔ اور بالآخر "حکامِ عدالت گستر" یعنی انگریزوں کا داخلۂ شہر اور بحالیٔ امن و امان کا مجمل تذکرہ ہو۔

دوسری غزل جس کا مطلع یہ ہے "جل گئے خاک میں سب غنچہ لبانِ دہلی" —— اس میں دہلی کی معاشرت کی تصویر کھینچی گئی ہے اور گزشتہ عیش و نشاط کی محفلوں کے اُٹھ جانے کے بعد موجودہ فاقہ کشی کی طرف اشارہ ہے ؎

فاقہ مستی میں ہیں وہ عشرتیانِ دہلی مال مستی سے جنھیں ہوش نہ تھا دُنیا کا

تیسری غزل ؎ پھر بندھا دل پہ خیالِ دہلی پھر ہوا رنج و ملالِ دہلی

کا بھی یہی انداز ہے اور قطعے میں بھی انھی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔

داغ، ثاقب اور مبین کی شہرآشوبیہ غزلوں کا رنگ بھی یہی ہے۔ فرحت نے جن کا نام کنورشن پرشاد دہلوی تھا، ایک مخمّس لکھا ہے جس پر خفیف سا اقتصادی رنگ ہے مگر اس میں شہرآشوب کی باقی شرائط نہیں لیکن سوز و گداز کی فراوانی ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے ؎

کوئی مفلسی میں ہے مبتلا کوئی تنگ حالی سے خوار ہے
کوئی بےکسی میں اُداس ہے کوئی رنج سے تہِ بار ہے
جسے دیکھو آہ زمانے میں وہ الم سے زار و نزار ہے
ہے کوئی قلق سے شکستہ دل کوئی غم سے سینہ فگار ہے
یہ اُٹھائے لوگوں نے غم پہ غم نہ حساب ہے نہ شمار ہے

نئے دور کا آغاز

غدرِ دہلی کے بعد مُلک کی سیاسی فضا میں زبردست انقلاب آیا۔ جس کے ساتھ ہی شاعری کا عام رنگ بھی بدل گیا۔ سیّد صاحب کی تعلیمی تحریک اور قومی احیا اور تعمیر ہی سب سے بڑے مسائل تھے،

جن کی طرف لوگ متوجہ تھے۔ چناں چہ اس دور کے شعرا میں مولانا حالی، مولانا اسماعیل میرٹھی نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا۔ حالی کی مسدس اور شکوۂ ہند اور اسماعیل میرٹھی کا قصیدۂ عبرت، نوائے زمستاں اور قلعۂ اکبرآباد وغیرہ کو بے قاعدہ شہر آشوب قرار دیا جاسکتا ہے۔

شبلی نے ایک شہر آشوبِ اسلام جنگِ بلقان کے زمانے میں لکھا۔ ان کے تتبع میں ز۔خ۔ش صاحبہ نے بھی ایک شہر آشوب اسلام لکھا۔

مولانا ظفر علی خاں اور علامہ اقبال کی شاعری میں بے قاعدہ شہر آشوب بہت ہیں۔

روس کے اقتصادی خیالات عام ہونے کے بعد اقتصادی رنگ شاعری میں بہت گہرا ہوگیا ہے۔ مگر شہر آشوب کی فارم کسی شاعر کے پیشِ نظر نہیں۔

علامہ کیفی کی کتاب 'واردات' میں عالمگیر اقتصادی پریشانی کے متعلق ایک "عالم آشوب" موجود ہے جو اردو کے سرمایے میں انوکھی چیز ہے۔

ولی کی زبان

دیباچۂ کلیاتِ ولی جدید

(از جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی صدر شعبۂ عربی جامعہ الٰہ آباد)

زبان ہمیشہ بدلتی رہتی ہی۔ لفظوں کی جو صورتیں، جو ترکیبیں آج سے سو پچاس برس اُدھر عام تھیں، آج اُن میں سے بہت سی ایسی ہیں کہ اِس زمانے کے لوگ اُن سے واقف تک نہیں۔ اِسی طرح جو آج رائج ہیں، نہیں کہا جاسکتا، اُن میں سے کون کون سی آگے چل کے سراسر ترک ہوجائیں گی، کن کن کی شکل بدل جائے گی، کیا کیا محاورے اور لفظ نئے پیدا ہوجائیں گے۔ زبان کی یہ بدلتے رہنے کی صلاحیت اُس کی زندگی کی علامت ہی۔ جو زبان اِس صلاحیت کو کھو بیٹھی ہو، اُس کا مُردہ ہوجانا ایسا ہی یقینی ہی جیسے سورج ڈوب جانے پر رات کا آجانا۔ زبان جوں جوں بدلتی جاتی ہی، اُس کی صحت اور فصاحت کے معیار میں ترمیم ہوتی جاتی ہی۔ اِس لیے واجب ہی کہ جو نظم یا نثر ہمارے سامنے ہو اُسے ہم اُسی زمانے کی زبان اور صحت و فصاحت کے معیار سے جانچیں پرکھیں جس زمانے میں وہ نظم یا نثر وجود میں آئی ہو۔ جو نقاد اِس چودھویں صدی کی زبان کو بِنا قرار دے کے بارھویں یا تیرھویں صدی کے شاعروں کی زبان کو غلط یا غیر فصیح کہہ اٹھتے ہیں، وہ ایسی بنیادی غلطی کرتے ہیں کہ اُن کی تحقیق کی دیوار ثُریّا تک ٹیڑھی ہی چلی جاتی ہی۔ افسوس ہی کہ اِس کلیات کی پہلی اشاعت میں بھی، ایک حد تک اِسی انداز سے دکّی کی زبان کو کہیں غلط کہیں غیر فصیح بتایا ہی[1] کہیں ولی کے "غلط الفاظ کے استعمال" کی تاویل، عذر خواہی کے طور پر کی ہی بلکہ[2] اور پھر اِسی سلسلے میں "غلط الفاظ" کی فہرستیں دی گئی ہیں! اس بحث کے دوران میں

---

[1] "کلیات ولی" — انجمنِ ترقی اردو — اورنگ آباد ۱۹۲۷ء، مقدمہ ص ۹۸، نیز ص ۱۰۱-۱۰۲: "غیر فصیح الفاظ تین قسم کے"۔

[2] مگر ساتھ ہی ساتھ "عالمگیری اردو" کو "صحیح اور قابلِ قدر" بھی مانا ہی (ص ۹۷-۹۸) اِس طرح زبان کی بحث اُلجھ کر رہ گئی ہی۔

کچھ دکنی لفظ بھی گنائے گئے ہیں، مگر ان میں سے بہت سے وہ ہیں کہ ولی سے سو برس بعد کے دِلی کے مستند شاعروں کے کلام میں بھی جابہ جا آئے ہیں۔

دلی کی زبان کو لوگ عموماً "دکنی" کہتے ہیں۔ اِس لیے پہلے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ دکنی (یا دکھنی) زبان کب وجود میں آئی، اُس نے کیا مدارج طے کیے اور کیا صورتیں اختیار کیں اور دلی کی زبان کو اُس سے کہاں تک واسطہ ہے۔ ساتویں صدی ہجری کے آخر تک دکھن پر کوئی اثر دِلی کی سلطنت یا شمالی ہند کے تمدن کا نہ تھا۔ ۶۹۴ھ میں علاء الدین خلجی نے دیوگیر پر حملہ کیا اور اُس کے سپہ سالار، مَلک کافور نے ۷۰۹ھ میں مشرقی اور جنوب مشرقی دکن پر حملے شروع کیے اور دو تین برس میں اُدھر کے کئی راج واڑوں کو دِلی کا باج گزار بنایا۔ ان مہموں کا سلسلہ جاری رہا اور دیوگیر، دکن میں دِلی کی سلطنت کا ایک مرکز بن گیا، یہاں تک کہ ۷۲۵ھ میں سلطان محمد تغلق کا دور آیا اور پایۂ تخت ہی دِلی سے اُٹھا کر دیوگیر پہنچا دیا گیا۔ دِلی شہر کے بسنے والوں کو حکم ہوا کہ سب کے سب دیوگیر جا بسیں۔ دیوگیر کا نام دولت آباد رکھا گیا اور ایک بڑا بارونق شہر وہاں آباد ہوگیا۔ دِلی سے لاکھوں آدمی وہاں پہنچ کر بس گیا اور علاوہ معمولی لوگوں کے، وزیروں اور سپہ سالاروں، عالموں اور شاعروں، کاری گروں اور ہنروروں کا دولت آباد میں جمگھٹا ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ اِس زمانے میں دولت آباد ایک چھوٹا دِلی بن گیا ہوگا اور وہاں کی زبان وہی ہوگئی ہوگی جو اُس وقت میں دلی اور اُس کے اطراف میں بولی جاتی تھی یہ بات تو دکن کے کسی اور خطے کو حاصل نہیں ہوئی۔ پر اس سے اِنکار نہیں ہو سکتا کہ اِس نئی زبان کا اثر دکن کے اور حصّوں تک کچھ نہ کچھ پہنچا ہوگا۔ محمد تغلق کے بعد حسن بہمنی نے دکن میں سلطنت جمائی تو گل برگہ کو پایۂ تخت بنایا۔ بہمنیوں کو تلنگانے، بیجانگر اور کرناٹک میں بڑی فتوحات ہوئیں اور ۷۶۴ھ میں گول کنڈا بھی فتح ہوگیا۔ ان سب جگہوں میں دِلی کی زبان نے کچھ نہ کچھ رواج پایا مگر وہ صورت نہیں ہو سکتی تھی جو دولت آباد اور اُس کے پڑوس میں تھی۔ ۸۱۵ھ میں سیّد محمد گیسو دراز گل برگہ پہنچتے ہیں اور تھوڑے ہی زمانے میں صوفیوں کا اثر سارے دکن میں پھیل جاتا ہے۔ اِس طرح دِلی کی زبان نے دکن میں بہت رواج پایا، مگر دراوڑی زبانوں کے علاقوں میں، جو دولت آباد سے دور تھے، اس پردیسی زبان نے کچھ نہ کچھ اثر دراوڑی زبانوں کا ضرور قبول کیا۔ چناں چہ

آج بھی مدراس کے علاقے میں جو اُردو بولی جاتی ہی اس میں تامل کا موسیقی لہجہ موجود ہی، جو اور کہیں کی اُردو میں نہیں پایا جاتا کچھ فرق زبان یا لہجے میں ہوجانا اس لیے بھی ضرور تھا کہ یہ لوگ اپنے اصلی مرکز سے بہت دور جا پڑے تھے[1] دِلّی کی آب و ہوا اور دراوڑی مُلک کی آب و ہوا میں بھی بڑا تفاوت تھا بہ خلاف اِس کے، دکن کا شمال مغربی حصّہ، جس میں دولت آباد واقع ہی، مرہٹہ واڑی مُلک تھا، اور اُس میں صدیوں پہلے سے جو زبان بولی جاتی تھی وہ بھی مثل ہندستانی کے ایک آریائی زبان تھی جسے شمالی ہند کی بولیوں سے گہرا تعلق تھا۔ پھر، دکن کے اور مقاموں کے مقابلے میں دولت آباد، دِلّی سے زیادہ قریب بھی تھا اور شمالی ہند سے اُس کے تعلقات آئے دن تازہ ہوتے رہتے تھے۔ یہاں کی آب و ہوا بھی اُتنی مختلف نہ تھی جتنی دراوڑی علاقوں کی۔ علاوہ مرہٹی زبان کے گجراتی زبان کا بھی، جو ایک دوسری آریائی زبان تھی کسی قدر اثر پڑا۔

اِن حالات کو ذرا غور کی نگاہ سے دیکھیے تو یہ بات صاف دکھائی دینے لگتی ہی کہ دسویں صدی ہجری کے آخر تک دکن میں ہندستانی زبان کی دو صورتیں ہوگئی تھیں: ایک وہ جو دولت آباد کے علاقے سے باہر دکن کے دراوڑی علاقوں میں رائج تھی اور جسے دِلّی کی زبان کے ساتھ تعلقات کو تازہ کرنے کے موقعے بہت کم ملے اور جس میں ایک طرف گول کنڈہ کے قطب شاہیوں، دوسری طرف صوفیوں نے ایک خاص دکنی ادب پیدا کردیا تھا۔ دوسری صورت زبان کی وہ صورت تھی جو دولت آباد اور اس کے نواح میں رائج تھی۔ گیارھویں صدی کے آغاز میں مغلوں نے دکن کا رُخ کیا اور اُن کا اثر تیزی سے بڑھتا گیا۔ اِنھوں نے بھی اپنا مرکز دولت آباد ہی کو بنایا اور اورنگ زیب نے دولت آباد سے چند میل ہٹ کر اورنگ آباد بسایا۔[2] شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے زمانے میں لوگ دلّی سے جوق جوق اورنگ آباد آئے اور اپنے ساتھ دلّی کی اُردوے معلّا لائے، جس نے دولت آبادی علاقے کی زبان کو تازگی بخشی اور دِلّی کی نئی زبان کو اورنگ آبادیوں نے

---

[1] پھر بھی ”دکنی“ زبان نے، خاص کر حیدرآبادی دکنی نے بہت کم دراوڑی اثر قبول کیا، اور اِس کے اسباب تھے۔

[2] دونوں شہروں میں ۱۴ میل کا فصل ہی، مگر یہ اُس وقت جب کہ دونوں کا رقبہ بہت گھٹ گیا ہی۔ فرانسیسی سیاح تے ورنیئر صرف ۴ کوس یا ۸ میل کا فصل بتاتا ہی۔ اِس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ اورنگ زیب کے زمانے میں یہ دونوں شہر اتنے پھیلے ہوے تھے کہ دونوں کے بیچ میں صرف ۸ میل کا فصل تھا۔

شوق سے اختیار کیا[1] جس پر وہ آج تک فخر کرتے ہیں۔ یہی وہ زبان ہو جسے ہم ولی کے کلام میں پاتے ہیں اور، سوا چند بہت خفیف اختلافات کے، یہ وہی زبان ہو جو ولی کے زمانے میں دِلّی میں بولی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہو کہ جب اُس کا دیوان دِلّی پہنچا تو دِلّی والوں نے اُسے سر آنکھوں پر رکھا، شاعروں نے اُس کی غزلوں پر غزلیں کہیں، اور زبان دانوں نے اُس کے کلام کو سند پکڑا۔ اگر اُس کے دیوان میں کہیں دو چار لفظ دِلّی کی اُس وقت کی زبان سے مختلف پائے ہوں گے، تو اُن کو چاہے شاعر کا اِختراع جانا ہو، چاہے اُس کی زبان کا پُرانا پن یا دکنیت، پر اُسے عیب نہیں مانا۔ آج بھی، کہ دِلّی کا تعلّق چھوٹے ڈیڑھ دو سو برس ہو چکے، اورنگ آباد کی زبان کو دلّی کی زبان سے بہت مناسبت باقی ہو اور دکن کے اور حصّوں کی زبان سے وہ الگ دکھائی دیتی ہو۔ اِس لیے زیادہ صحیح ہوگا، اگر ہم ولی کی زبان کو "اورنگا بادی" کہیں۔ دکن کے باقی حصّے میں اب سے سو ڈیڑھ سو برس پہلے تک جو زبان رائج تھی، اور جو اب بھی بولی جاتی ہو، اُسے "دکنی" یا "دکھنی" کہنا نادرست نہ ہوگا۔[2]

تیرھویں صدی کے اوائل کا ایک اورنگ آبادی مصنّف اسی فرق کو اپنی کتاب "چراغِ ابدی" کے دیباچے میں، جو ۱۲۲۱ھ میں اُس نے تصنیف کی تھی، اِن لفظوں میں ظاہر کرتا ہو:

> "اگرچہ بعض عزیزوں نے زبانِ دکھنی ہندی آمیز میں تفسیر جزِ آخر کی لکھی ہو لیکن بہ سبب الفاظِ دکھنی لطف زبانِ ہندی کا پورا نہیں پاتا اور دل یاروں کا داسطے مطالعے اوس کے رغبت کم لاتا۔ اِس واسطے خاطرِ قاصر میں اِس فقیر کی آیا کہ تفسیر جزِ اخیر کی زبانِ ہندی میں کہ بالفعل اورنگ آباد کے لوگوں کا محاورہ ہو لکھے ..... کہ عوام اُس سے باوجود قلتِ بضاعت کے فائدۂ تمام اُٹھاویں۔"[3]

اِس سے معلوم ہوتا ہو کہ خود اورنگ آباد کے لوگ اپنی زبان کو دکنی سے کتنا دور اور دِلّی کی زبان سے کتنا قریب جانتے تھے، اور اورنگ آباد کے عوام بھی دکھنی زبان کی کتابوں سے پورا فائدہ نہ اُٹھا سکتے تھے۔ دونوں

---

[1] یہ ایک اور وجہ اورنگ آباد کی زبان اور باقی دکن کی زبان میں فرق ہو جانے کی ہوئی۔ اُس کی تجدید ہوگئی اور اُس نے پُرانی صورت کو محفوظ رکھا۔

[2] اِس زمانے میں تو حیدرآباد کی اُردو اور لکھنؤ دِلّی کی اُردو میں کم فرق رہ گیا ہو، مگر اُس سے یہاں بحث نہیں۔

[3] دیکھو مولوی عبدالحق صاحب کا مقالہ "پُرانی اُردو میں قرآن شریف کے ترجمے" (رسالۂ "اُردو" اورنگ آباد ۱۹۳۷ - ج ۱، ص ۳۲)

بولیوں میں اِس طرح اِمتیاز کر لینے کے بعد، یہ بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ "اورنگا بادی" پر ایک حد تک "دکھنی" کا اور اُس کا اِس پر اثر پڑا ہے۔

اب دلّی کی زبان کو دیکھنا چاہیے۔ پہلے اُن اجزا سے بحث کر لی جائے، جو دلّی کی زبان اور دِلّی کے شاعروں میر، سودا، درد اور اُن کے ہم عصروں کی زبان میں مشترک ہیں:

ا۔ لفظ:۔ بوجھنا (پہچاننا، سمجھنا)، بولنا ("کہنا" کی جگہ)، پَوَن (ہوا)، پی، پیو، سجن، موہن (محبوب کے لیے)، پیونا (پینا)، تجھ، مجھ (تیرا، میرا)، جیو (جی)، لگ (تلک)، نیَن، نَیَن (آنکھ، آنکھیں)، ستی، سیتی (سے)، کنے (پاس)، نپٹ، نپٹھ (بالکل، سراسر)۔ یہ اور اس طرح کے بہت سے لفظ شاعروں کے کلام کے علاوہ دِلّی، پنجاب، صوبۂ متحدہ اور بہار میں اب تک بولے جاتے ہیں۔ کسی لفظ میں حرفِ علت کا گھٹ کر ایک حرکت ہی رہ جانا یا حرکت کا کھنچ کر حرفِ علت ہوجانا، جیسے اُپر (اوپر)، دِکھو (دیکھو)، لاگا (لگا)، لوہو (لہو)، اُودھر، ایدھر، جیدھر۔ تشدید کا جاتا رہنا یا اِکہرے حرف پر تشدید کا آجانا، جیسے "اتنا" سے "اِتا" اور پھر "اِتّا" اور "پات" سے "پتّا" ہوجانا، یہ سب صورتیں دِلّی کے شاعروں کے کلام میں بھی موجود ہیں۔ نونِ غنّہ پُرانے زمانے میں بہت تھا، یہاں تک کہ بعضے لوگ فارسی لفظوں "کوچہ"، "پیچ"، "پایچہ" کو "کونچہ"، "پینچ"، "پانچہ" لکھا کرتے تھے۔ توں (تو)، کوں (کو)، سیں (سے)، نیں (نے)، سداں (سدا)، دیکھناں (دیکھنا) وغیرہ بہت عام تھے۔ ملفوظ ہ، خاص کر دِلّی اور پچھاں کے اور مقامات میں، اکثر جاتی رہتی ہے اور اُس کی جگہ اکثر ایک مخلوط یَ یا ہمزہ لے لیتا ہے، جیسے "بہت" کی جگہ "بوت"، "کہتا" کے لیے "کَتا"، "کہوں" ("کوں")۔ اسی طرح "کہیں" یا "کئیں" اور "وئیں" اور "نئیں" عام طور پر سُنا جاتا ہے۔ لکھاوٹ میں اگر ایک صورت کی ترجمانی نہیں ہوتی یا نہیں ہوسکتی، تو وہ صورت زبان سے مٹ نہیں جاتی۔ ملفوظ ہ کہیں حذف ہوجاتی ہے، جیسے "گھبراہٹ" سے "گھبراٹ"، کہیں مخلوط ہوجاتی ہے، جیسے "وہاں" سے "وھاں"، "یہاں" سے "یھاں" کہیں مخلوط ھ اپنی جگہ بدل لیتی ہے، جیسے "گڑھنا"، (گھڑنا)، بعضے لفظوں میں ان دونوں کا قلب اور اِبدال ایک ساتھ ہوا ہے، جیسے "پہچان" اور "پچھان"، "پہونچا" اور "پونچھا"۔ لفظ کے بیچ یا آخر میں

سے مخلوط ھ اکثر جاتی رہتی ہو اور بھوک (بھوکھ)، تڑپ (تڑپھ)، دھوکا (دھوکھا)، سامنا (سامھنا)، مانجنا (مانجھنا)، بھکاری (بھکھاری) اب سے تھوڑے دن پہلے تک دونوں طرح سے لکھے جاتے رہے ہیں۔

۲۔ جنس یا تانیث تذکیر کا اختلاف ہر دور میں رہا ہو اور یہ اختلاف مکان اور زمان دونوں پر مبنی ہو۔ بعض صورتیں ایسی بھی ہیں کہ زمان و مکان کا تفاوت نہیں پھر بھی اختلاف موجود ہو۔ ایک ہی شاعر ایک لفظ کو کبھی مونث کبھی مذکر کہہ جاتا ہو۔ بات یہ ہو کہ اُردو نے مختلف اور متعدد زبانوں سے لفظ لیے ہیں۔ جب کوئی نیا لفظ آیا، اگر اُس میں اُردو کی رو سے کوئی علامت تانیث یا تذکیر کی نہ تھی، تو ایک مدت تک اُس کی جنس معیّن نہ ہوسکی اور اسی لیے اکثر لفظوں کا آج تک قطعی فیصلہ نہ ہوسکا۔ جنس ہی کے معیّن ہونے پر جمع کی صورت کا انحصار ہوا کرتا ہو۔ اِس لیے اُردو میں جنس اور عدد دونوں ایک سیّال حالت میں ہیں، اور یقین ہوتا ہو کہ شمالی ہند کے لوگوں نے ولی کے زمانے میں، اور اس کے بعد بھی، اُس کے کلام میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں کی۔ خود ولی نے بھی ایک ہی لفظ کو کہیں مونث کہیں مذکر باندھا ہو۔

۳۔ نحوی ترکیب کو دیکھیے تو اُس میں بھی ولی کے ہاں بیش تر وہی ترکیبیں ملتی ہیں جو شمالی ہند کی پُرانی زبان میں ہیں، جیسے "نے" کا استعمال کبھی کرنا، کبھی نہ کرنا اور کبھی اس کا استعمال آج کل کے استعمال سے مختلف ہونا یا اِضافی ترکیب میں "کا"، "کی"، "کے" کا مقدر رکھنا۔

۴۔ لوگ اکثر اِملا کو بھی زبان سمجھ بیٹھتے ہیں، حال آں کہ اِملا تو لفظوں کی تصویر کھینچنے کی ایک کوشش ہو جو ہمیشہ کام یاب نہیں رہتی۔ اِملا کے قاعدے کیسے ہی ہمہ گیر اور مکمل بنائے جائیں، زبان کی پوری اور سچی ترجمانی اُن سے مشکل ہی سے ہوسکتی ہو۔ ایک "کوئی" کا لفظ ہم کئی طرح پر ادا کرتے ہیں: (۱) فِعْلُن (۲) فَعِل، (۳) فع، "کو"، "کے"، "کا"، "کی"، "سے" وغیرہ کو کبھی فع کے وزن پر کبھی صرف ایک حرکت کے برابر کر دیتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ حال "کہیں" اور "نہیں" کا ہو کہ کبھی فَعِل کے وزن پر، کبھی ہ کو گرا کے فع کے وزن پر بولتے ہیں۔ پُرانے شاعروں میں کوئی ایسا نہیں جس نے ان مختلف صورتوں میں اِن لفظوں کو نہ برتا ہو۔ اِملا کی یکسانی کے لیے لفظ کی شکل ایک معیّن کرلی جاتی، تلفظ مختلف طرح سے ہوتا ہو۔ آخری دور کے شاعروں نے یہ اُلٹی گنگا بہائی کہ زبان کو رسم کتابت

کے تابع کرکے زبان پر قیدیں لگائیں۔ اس میں لوگوں نے بعض ایسی غلطیاں کی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ بطور ایک مثال کافی ہوگی: ایک لفظ تھا "کیوں کر"۔ "کر" کا بدل ہے "کے"، اس لیے "کیوں کر" کا بدل ہوا "کیوں کے"۔ بالکل اُسی طرح جیسے "آکر، جاکر، کرکر" کی جگہ "آکے، جاکے، کرکے" بھی بولتے ہیں۔ پُرانے زمانے میں "کیونکے" لکھتے تھے۔ ایک دوسرا لفظ تھا "کیوں کہ" (جس کا پہلا ٹکڑا ہندی، دوسرا فارسی ہے)۔ اس کا بدل ہے "کس لیے کہ" یا "اس لیے کہ"۔ بھلا فارسی "کہ" کو ہندی "کے" سے، جو "کر" کا قائم مقام ہے، کیا واسطہ؟ اگر اصرار ہے کہ "کیونکے" غلط ہے، "کیونکہ" لکھو۔ اگر کوئی کہے کہ یہ لفظ اب بولا نہیں جاتا، تو یہ دعوا بھی غلط ہے۔ دلی والے آج بھی بولتے ہیں اور اس کی صحیح کتابت "کیونکے" (یا "کیوں کے") ہے۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کے ہو رشکِ فارسی   گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سُنا کہ یوں

نہ جانوں کیوں کے مٹے داغ طعنِ بدعہدی   تجھے کہ آئنہ بھی ورطۂ ملامت ہے

ولی کے کلام میں اس کے علاوہ "جیوں کر" اور "جیوں کے" بھی ہے (مثلاً غزل ۱۵)۔ اور معنے اس کے: جس طرح، جس ڈھنگ یا وجہ سے۔

۵۔ ایک بڑا اعتراض ولی اور اور پُرانے شاعروں پر یہ کیا جاتا ہے کہ عربی فارسی لفظوں کو، جن کے بیچلے حرف کو جزم ہے، انھیں حرکت دے دی ہے جیسے "شہر" اور "مہربان" "ہ" کے زیر سے، "طبع" اور "شمع" کو "ب" اور "م" کے زبر سے باندھا ہے اور "ثلث" کو "ل" کی حرکت سے۔ ان اعتراض کرنے والوں کو یہ بھی تو نہیں معلوم کہ کس عربی لفظ کے حرکات عربی میں کیا ہیں۔ "شمع" کا "م" مفتوح اور ساکن دونوں طرح صحیح ہے اور "ثلث" کا "ل" ساکن بھی درست ہے اور مضموم بھی۔ یہ لفظ کلام اللہ میں کئی جگہ آیا ہے اور ہر جگہ "ل" کے پیش سے ہے۔ "خطِ ثلث" کو عربی میں "الخطُّ الثُلُثی" ("ل" کے پیش سے) کہتے ہیں۔ اب رہے وہ لفظ جو سچ مچ عربی یا فارسی میں بیچلے حرف کے جزم ہی سے ہیں، سو اُن کو بھی اکثر حرکت کے ساتھ بولتے ہیں۔ "ذِکر" اور "فکر" اور "تخت" اور "مہر" اور "شہر" بیچلے حرف کی حرکت سے اُردو کے فصیحوں کی زبانوں پر ہیں اور سید انشا نے تو صاف صاف کہا ہے کہ اُردو میں یہ لفظ یوں ہی صحیح ہیں۔ ولی پر اس طرح کے اعتراض کرنا نادانی ہے۔ اُس کے تو برسوں کے بعد لوگوں نے حکم لگایا کہ شعر میں وہی

صورت ان لفظوں کی جگہ پائے جو فارسی یا عربی میں ہو۔ مگر مزا یہ کہ خود ایرانیوں نے عربی لفظوں میں بہت تصرف کرلیے تھے۔ پھر جب فارسی عربی لفظ ہندستانی میں آئے تو اس نے انھیں اپنے جنتر پر کھینچا۔ سوا دو چار قاریوں کے کون ہو جو ح اور ع کو حلق کی گہرائی سے نکالتا ہوگا اور ز، ذ، ض، ظ یا س، ث، ص میں فرق کرتا یا کرسکتا ہوگا۔ اور تو اور ہندستان کے ممتاز فارسی شاعر جب اردو میں شعر کہتے، تو ان لفظوں کو اسی صورت سے اپنے کلام میں لاتے، جس صورت سے وہ ہندی عوام کی زبانوں پر تھے۔ ناصر علی سرہندی کا سا سربرآوردہ فارسی شاعر جب اردو کہتا ہو، ”حیران“ (ی کی تخفیف سے)، ”بے چارا“ کو ”بچارا“، ”مصر“ (ص کے زبر سے)، ”شرحِ مُلّا“ کو ”شرح مُلّاں“ اور ”درس“ (ر کے زبر سے) باندھتا، ”فکر“ اور ”مکر“ کو ”اثر“ اور ”سفر“ کا قافیہ کرتا ہو۔ اسی کا ایک مصرع ہو۔ ؎

بُتِ فرنگی بہ قتلِ ہمنا رکھے جو پُرچیں جبیں دمادم“ [۱]

اب کیوں کر کہیے کہ ”ہمنا“ اور ”تمنا“ دکن کی مخصوص بولی تھی اور ہندی لفظ کو فارسی ترکیب میں نہ لاتے تھے؟

۶۔ اسی طرح کا ایک اور وسوسہ ہو کہ مجہول اور معروف و یا ی کا یا ز کو ض کا اور س کو ص کا قافیہ کرنا دکنی زبان کی خصوصیت یا دکن کے شاعروں کی سادگی ہو۔ معروف اور مجہول کا قافیہ فارسی کے اساتذہ کے کلام میں بھی کثرت سے ہو اور اردو کے مستند شعرا نے بھی بے تکلف اس طرح کہا ہو۔ ہم مخرج بلکہ قریب المخرج حرفوں کے قافیہ کرنے کا حال یہ ہو کہ فردوسی نے ”دخی“ کو ”تہی“ کا، سعدی نے ”صباحی“ کو ”ماہی“ کا اور ”عدل“ کو ”فضل“ کا اور ”کشب“ کو ”اسپ“ کا، کاتبی نے ”افضل“ کو ”نسل“ کا، اور ظہوری نے ”خرّاط“ کو عامیوں کے تلفظ کے مطابق ”خرّاد“ قرار دے کے ”نہاد“ کے ساتھ قافیہ کیا ہو۔ پھر اگر ولی نے ”تسبیح“ کو عین اہلِ اردو کے تلفظ کے مطابق ”تسبی“ کہا تو کیا گناہ کیا اور ز اور ض کا قافیہ کیا تو کیا بدعت ہوئی؟

یہ تو اُن لفظوں اور ترکیبوں کا بیان ہوا جن کو دکنی زبان سے مخصوص جاننا درست نہیں، اس لیے کہ یہ سب صورتیں شمالی ہند کے مستند شاعروں کے ہاں بھی ملتی ہیں۔ مگر شمالی ہند کے شاعروں میں

[۱] شیرانی، ”پنجاب میں اردو“، ص ۱۴۱-۱۴۲۔

سے جن جن کا کلام ایک اچھی مقدار میں ملتا ہی وہ سب ولی سے بعد کے لوگ ہیں۔ ولی کے ہم عصروں یا اُس سے پہلے کے شاعروں یا مصنفوں کا کلام بہت ہی کم اور ناکافی ہی جس سے یہ معلوم کرنا مشکل ہی کہ کون کون سے لفظ اُس وقت کی زبان میں رائج تھے اور کون کون سی ترکیبیں استعمال ہوتی تھیں۔ اس لیے یہ طے کرنا بھی آسان نہیں کہ جو لفظ ہم صرف ولی یا اور بعد کے مصنفوں کے ہاں پاتے ہیں، وہ اُس وقت کی شمالی زبان میں بھی تھے اور بعد کو شمال میں ناپید ہو گئے مگر جنوب میں باقی رہے، یا شمال میں کبھی تھے ہی نہیں اور حقیقت میں دکن کی پیداوار ہیں۔ آئندہ جب مزید معلومات بہم پہنچیں تو فیصلہ ہو سکے گا کہ ان کو شمالی زبان کے اجزا ماننا چاہیے یا جنوبی زبان کے۔ اس وقت موجودہ حال کو سامنے رکھ کر یہاں اُن اجزا سے مختصر طور پر بحث کی جاتی ہے۔

ان لفظوں میں تغیرات کی مثالیں بیان کی جاتی ہیں:

(ا) ہ اور ھ کے حذف، قلب اور ابدال سے اوپر بحث ہو چکی ہی۔ دکن کی خصوصیت یہاں بھی وہی ہی کہ تغیر میں تعمیم زیادہ ہوئی ہی۔ "سوکھا" کو "سُکّا" اور "باہر" کو "بھار" بولتے ہیں۔ "آنکھواں" کو "ہانکاں"، "انکھیاں" کو "ہنکیاں" بولتے ہیں (گو کہ کتابت اِس طرح نہیں کی جاتی)۔

(ب) ٹ، ڈ، ڑ میں سے اگر دو حرف یا ایک ہی حرف دو بار کسی لفظ میں آئے تو پہلا ٹ کے بجاے ت، ڈ کے بجاے د ہو جائے گا: "توٹ گیا" یا "تُٹ گیا" (ٹوٹ گیا)، "دنڈا" (ڈنڈا)، "تُکڑا" (ٹکڑا)، "داٹنا" (ڈانٹنا)، "دیڑ" (ڈیڑھ)، "دیوڑی" (ڈیوڑھی)، "تھاٹ" (ٹھاٹ)، "تھٹ" (ٹھٹ)

(ج) حرف حصر یعنی "ہی" کی ہ حذف ہو جاتی ہی، جیسے تُمی (تُمھی)، مگر ایسی صورتوں میں چ یا چہ لگاتے ہیں: "وہچ" (وہ ہی)، "تُمچ" (تُم ہی)۔ یہ چ یا موقوف ہوتی یا مکسور اور کتابت میں اِس کا مکسور ہونا ہ سے ظاہر کیا جاتا ہی۔ اِس کو ھ (مخلوط) قرار دینا درست نہیں یعنی یہ چھ نہیں ہی۔ یہ لاحقہ غالباً گجراتی زبان سے دکن کی بولی میں آیا۔ سنسکرت میں چ بہ طور لاحقے کے آتی ہی، مگر وہ حصر کے بجاے ترقی کا حرف ہی یعنی "بھی" کے معنے دیتی ہی اور دکن میں "بھی" (تلفظ: "بی") بالکل اُسی طرح استعمال ہوتا

ہی جیسے سنسکرت میں چ لاحقہ، یعنی دو اِسموں کے بیچ میں چ آتی ہی۔ دکن میں کہیں گے: "ماں بی بچّہ" (یعنی "ماں اور بچّہ" یا "ماں بھی بچّہ بھی")۔ عجب نہیں کہ گجراتی اور دکنی میں یہ چ سنسکرت سے آئی ہو مگر معنے بدل کر بجائے حصر کے ترقی کے ہو گئے۔

۲۔ اُردو والوں کا دستور ہی کہ لفظ کے بیچ یا آخر میں یا ہو تو ی کو الف سے مخلوط کر دیتے ہیں جیسے ہندی "پ یار"، "پ یاس"، "دِھ یان" سے "پیّار"، "پیّاس"، "دھیّان"، فارسی "پ یاز" اور "م یان" سے "پیّاز" اور "میّان"، عربی "خَ یال" سے "خیّال"۔ دکن میں یہ تصرّف بہت عام ہوگیا اور "دریا" اور "دُنیا" بھی "دریّا" اور "دُنیّا" ہوگئے۔ اسم سے گُزر کر فعل کے صیغوں تک پر اِس کا عمل ہوا: چلیّا، لکھیّا، کھلیّا، ملیّا وغیرہ۔

۳۔ اں لگا کر جمع بنتی ہی (اسم چاہے مذکر ہو چاہے مونث)، اور یہ پنجاب، پانی پت، سہارن پور وغیرہ میں عام ہی اور دکن میں بہت ہی عام: بات ـ باتاں، تروار ـ ترواراں، ہات (ہاتھ) ـ ہاتاں، پانو ـ پانواں، بیچ ـ بیچاں، آنکھ ـ آنکھاں، جورو ـ جوروواں، ابرو ـ ابرواں، وغیرہ۔

(ا) واحد مونث الف پر ختم ہوتا ہو، تو ایک ی (ملفوظ) بڑھا کر اں لگائیں گے: ادا ـ ادایاں، دعایاں، دوایاں۔ یہ ی کبھی مخلوط نہیں بولی جاتی۔

(ب) اگر واحد مونث یا مذکر ی (معروف) پر ختم ہوتا ہو، تو اں کے لگنے سے وہ ی مخلوط ہو جائے گی: انکھی ـ انکھیاں، پشانی (پیشانی) ـ پشانیاں، تسبی ـ تسبیاں، چھری ـ چھریاں، چھتری ـ چھتریاں، برچھی ـ برچھیاں، موتی ـ موتیاں، درزی ـ درزیاں، مالی ـ مالیاں، گھوڑی ـ گھوڑیاں۔ اگر واحد ئی (رباعی)، یا ہی پر ختم ہو تو جمع میں ء، ع یا ہ حذف ہو کر ی ملفوظ ہو جاتی ہی: بھائی ـ بھایاں، رباعی ـ رُبایاں (کتابت: "رُباعیاں")، سپاہی (تلفظ: "سپائی") ـ سپاہیاں (تلفظ: سپایاں)

(ج) الف پر ختم ہونے والے مذکر لفظوں کی جمع قائم حالت میں تو الف کو ے (مجہول) کر کے بنتی ہی، جیسے "بکرا" اور "گھوڑا" سے "بکرے" اور "گھوڑے" مگر مُحرّف حالت میں "بکریاں کو" اور "گھوڑیاں سے" وغیرہ۔ اِس طرح محرّف حالت میں مونث مذکر میں گویا فرق ہی نہیں رہتا اور سیاقِ عبارت

سے تانیث تذکیر میں امتیاز کرنا پڑتا ہی۔

(۴) نحوی خصوصیتوں کی تفصیل یہاں نہیں بیان کی جاتی ۔ چند غزلیں غور سے پڑھنے پر وہ خصوصیتیں آپ ہی نمایاں ہوجاتی ہیں ۔

آخر میں یہ کہہ دینا ضروری ہی کہ ولی بڑا شاعر نہ تھا۔ اُس کے دیوان میں جا بجا ایسے مقامات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہی کہ وہ اپنے زمانے کے اہلِ علم میں سے تھا۔ عربی نظم و نثر کے شہ کار ہی اُس کے مطالعے میں نہ رہتے تھے، علوم پر بھی اُس کی نظر تھی ۔ کلام کے صواب و خطا کو وہ خوب جانتا تھا ۔ یہ بھی سمجھتا تھا کہ لفظوں کے زراسے ہیر پھیر سے شعر میں کیوں کر جان پڑجاتی ہی ۔ یہ بات حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ شاعر صحیح اور فصیح کو نہ پہچانے اور شعر کے فن کو نہ جانے ۔ ولی کے کلام سے ہم شعر اور زبان دونوں کا لطف اُٹھا سکتے ہیں، اگر ہم اُس زمانے کی زبان سے واقف ہونے کی سچّی کوشش کریں ۔

تبصرے

ادبیات

منتخب نظمیں (۱۹۴۴ء) اس کتاب میں ادارۂ ادبِ لطیف، لاہور نے گزشتہ سال کی چیدہ نظمیں، چھوٹی تقطیع کے ۱۱۲ صفحات پر بہت صاف، خوش خط چھاپ کر شائع کی ہیں۔ قیمت عہ/ ملنے کا پتا مکتبۂ اردو، لاہور ہی۔

کتاب ایک نثری "ابتدائیہ" سے شروع ہوتی ہی، جسے افتتاحیہ کا نومولود بھائی سمجھنا چاہیے۔ مجموعے میں زیادہ تر نظمیں وہ ہیں جو رسالہ ادبِ لطیف میں شائع ہوئیں۔ ان میں ایک حصہ ایسے جدید شعرا کے کلام کو دیا گیا ہی، جو قدیم عروضی قیود ایک طرف، الفاظ کو بھی مقررہ معنی کا پابند رکھنا ضروری نہیں سمجھتے۔ اس کلام پر تفصیلی بحث کے بغیر تنقید و تحسین کرنا موزوں نہ ہوگا لیکن مشہور و مشاق کہنے والوں کی نظمیں اور گیت بھی اس انتخاب میں موجود ہیں جیسے جوش، حفیظ، سالک، فراق وغیرہم۔

زبانِ اردو کی شاعری میں جو قوت و وسعت گزشتہ تیس چالیس برس میں پیدا ہوئی اور برابر بڑھ رہی ہی، یہ مختصر مجموعہ بھی اس کی ایک تازہ شہادت پیش کرتا ہی۔ ورق ورق پر تخیل کی تازہ نزاکتیں اور اسلوبِ بیان کی جدتیں نظر کے سامنے آتی ہیں اگرچہ ان میں سے بعض بے ڈھنگی اور بعض یورپ کی تقلیدِ بے جا کا نمونہ ہیں۔ شاد عارفی نے "بیٹے کی شادی" اور مہدی علی خاں نے "ایک جہلم پر" خوب نظمیں لکھی اور ہمارے بعض معاشرتی افکار و اعمال کا خاکہ اُتارا ہی۔ اسی جہلم والی نظم میں یہ مصرعہ دو تین بار آتا ہی "خدا اس کو بخشے ہمیں مل کے جاتا" اردو میں ملنا کا صلہ "سے" آتا ہی ورنہ ملاقات کے معنی پیدا نہیں ہوتے۔ ایک صاحب لکھتے ہیں ؎

کسی دستِ گُل اندوزِ حنا میں   زمانے کے حسیں رتھ کی لگامیں

یہاں شاعر کے تصور میں شاید وہ قدیم جنگی رتھ ہی جس میں گھوڑے جوتے جاتے تھے۔ ورنہ بیل کی ناک میں

کوئی لگام نہیں لگاتا۔ ایک صاحب نے پیشہ ور یا بازاری عورت کے لیے "رقم پیشہ" کی نئی ترکیب نکالی ہو (صفحہ ۴۹) جوش صاحب کے گیت میں "تن نگر" بھی محلِ نظر ہو۔ ن، م، راشد حسب معمول ایک "صنفی" اور معرا نظم داشتہ کے ساتھ محفل میں آئے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

تجھے اندوہ کی دَل دَل سے جو آزاد کرے   وہ سہارا بھی تجھے دینے پہ آمادہ ہوں

دَل دَل میں آدمی پھنس جاتا ہو اور اس کا مرادف ہو گرفتاری، لہٰذا شاعر دَل دَل سے نکالنے کو آزاد کرنا لکھ گیا ہو۔ ایک صاحب جو بظاہر یوپی کے رہنے والے ہیں لکھتے ہیں ع آگے ہو وہ کُہرا جو اُجالا نہیں جاتا۔ اس قسم کی لغوی اور ترکیبی جدتیں جگہ جگہ پائی جاتی ہیں۔ مجموعی طور پر کتاب نہایت دِل چسپ اور اہلِ ذوق کے مطالعے کے لائق ہو۔ (س)

دھوپ چھانو فضل الرحمان صاحب (حیدرآبادی) کی چالیس نظموں کا مجموعہ جو چھوٹی تقطیع کے سوا سو صفحات پر مجلد چھپا اور پونے دو رُپے میں مکتبۂ ابراہیمیہ وغیرہ حیدرآباد کے مشہور کتب فروشوں سے طلب کیا جا سکتا ہو۔ اکثر نظمیں قدرت کے مناظر و مظاہر پر لکھی گئی ہیں۔ آغاز "شاعر کی التجا" سے ہوتا ہو مگر اس میں مخاطب کا کہیں ذِکر نہیں پہلا شعر جسے آخر میں پھر جلی حروف سے دہرایا ہو، یہ ہو ؎

نوا میں آگ کی تاثیر بھر دے   پیامِ شوق کو سوزِ اثر دے

کتاب میں عاشقانہ شاعری اور غزلیں نہیں ہیں اس لیے "پیامِ شوق" کے عنوان سے اُلجھن پیدا ہوتی ہو۔ مجموعے میں "دکن کا دل دادہ" بہت صاف اور اچھی نظم ہو اور شاعر کی حُبِّ وطن پر دلالت کرتی ہو۔ "جامِ حیات" چھ شعر کا ایک قطعہ وزنِ رباعی میں خاصا دِل چسپ ہو ؎

اٹھو کہ دوبارہ جام آنے کا نہیں   جاگو کہ یہ دن مدام آنے کا نہیں

فضل الرحمان صاحب کے کلام میں روانی اور ترنم موجود ہو۔ اچھے جذبات کی بھی کمی نہیں۔ لیکن کلام کے بلند معیار تک پہنچنے کے لیے فکر و پختگی کی ضرورت پائی جاتی ہو۔ (س)

تسنیم از قیسی صاحب رام پوری، عبدالحق اکاڈیمی، اشاعت منزل، اُردو گلی، حیدرآباد دکن۔ ۱۹۳ صفحات قیمت چار رُپے۔

قیسی رام پوری صاحب اس زمانے کے ایک کام یاب ناول نگاروں میں ہیں جنھوں نے کچھ پُرانے اور کچھ نئے طرز کو سمو کر ایک ایسا طرز بنا لیا ہی جو بازار میں بہ آسانی چالو ہی۔ اور ایک حد تک اس سے اُردو لٹریچر کی اشاعت بھی ہوتی ہی۔ زیرِ نظر ناول بھی ان کا اسی قبیل کا ہی اور اسی حیثیت سے کام یاب بھی کہا جاسکتا ہی لیکن ناشر صاحب نے اس کتاب کا تعارف کراتے ہوے قیسی صاحب کو حضرتِ شرؔر لکھنوی سے اس طرح ٹکرایا ہی کہ بیچ کی ساری کڑیاں توڑ کر رکھ دی ہیں اور اس دوران میں جو کئی اور کام یاب ناول نویس گزرے یا موجود ہیں وہ کالعدم ہوگئے مثلاً حکیم محمد علی یا پریم چند وغیرہ۔ پھر قیسی صاحب کو حضرت شرر لکھنوی سے ٹکرا دینے کے یہ معنی ہوے کہ دونوں کی ادبی حیثیتیں پاش پاش ہوجائیں۔ یعنی قیسی صاحب اور شرر صاحب دونوں اپنے اپنے معیار سے گر جائیں اس لیے کہ علاوہ اور باتوں کے رام پور کی "مٹول" زبان میں لکھنؤ کی زبان کا لوچ اور لطافت کہاں۔ یہ تو ناشر صاحب کے تقابل کا تاثر تھا۔ جہاں تک زیرِ نظر افسانے کا تعلق ہی وہ پلاٹ افسانہ اور کردارکشی کے لحاظ سے خاصا دل چسپ ہی اور سُراغ رسانی کے اچھے ناولوں کے ساتھ رکھنے کے قابل ہی۔ ایک ہیرو اور دو ہیروین کے ساتھ جو ضمنی افراد رکھے گئے ہیں وہ اپنی اپنی جگہ جاذبِ توجہ ہیں۔ اور ڈاکوؤں کے سردار اختر کے آغاز و انجام کو بہت ہی عبرت انگیز انداز میں پیش کیا گیا ہی۔ (ر۔ ع۔ ا)

مُسکراتے آنسو | از بھارت چند صاحب کھنہ، عبدالحق اکیڈمی، اشاعت منزل، اُردو گلی، حیدرآباد دکن، ۱۵۱ صفحات، قیمت ۱۲/

مسٹر بھارت چند کھنہ کے دس مختصر افسانوں کا یہ مجموعہ روزمرہ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور مختلف زاویوں پر روشنی ڈالتا ہی، اور مصنف کے ہونہار افسانہ نگار ہونے پر دال ہی۔ آغا محمد اشرف صاحب نے اس مجموعے پر ایک مقدمہ لکھا ہی جس میں بتایا ہی کہ کس طرح وہ مصنف کو ایک کھلاڑی اور ایک مدرس کی زندگی سے نکال کر اُردو افسانہ نویسی کی راہ پر لائے۔ مختصر افسانوں کو اگر اصلاحِ معاشرت کے پیشِ نظر لکھا جائے تو بہت مفید نتیجہ نکلتا ہی، اور روسی انقلاب کی بِنا انھی قصّے کہانیوں اور افسانوں میں رکھی گئی تھی۔ کھنہ صاحب کے افسانوں میں بھی زندگی کی جیتی جاگتی تصویروں سے اُن معاشرتی عیوب کو نمایاں کیا گیا ہی جن میں اصلاح کی ضرورت ہی، اور افسانے عام طور پر دل چسپی سے پڑھے جائیں گے۔

انقلاب اور دوسرے افسانے ڈاکٹر اعظم کریوی صاحب کے مختصر افسانوں کا یہ نیا مجموعہ ہے جس کو کتاب خانہ دانش محل لکھنؤ نے نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع کیا ہے۔

اُردو کے مختصر افسانہ نگاروں میں اعظم صاحب کا تعلق اس حلقے سے ہے جس نے پریم چند کے زیرِ اثر اچھا خاصا ایک گروہ قائم کرلیا تھا اور جو اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ ابھی زندہ ہے۔ اگرچہ اُردو افسانہ نگاری نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے لیکن یہ لوگ اپنے رنگ کو چھوڑکر کوئی دوسرا رنگ اختیار نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کا رنگ خود بڑا گہرا ہے اور آسانی سے کسی دوسرے رنگ کو قبول نہیں کرسکتا۔

ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہندُستان کی زندگی اور خصوصًا ہندُستانی دیہاتوں کی زندگی کو سیدھے سادے اور بھولے بھالے انداز میں افسانے کے رنگ میں پیش کردیتے ہیں۔

اعظم صاحب کے یہ افسانے بھی انھی خصوصیات کے حامل ہیں۔ فنّی اعتبار سے یہ مغربی نظریۂ افسانہ نگاری سے ہم آہنگ نہ سہی لیکن دِل چسپ ضرور ہیں۔ قیمت ایک رُپیہ بارہ آنے۔ ملنے کا پتا دانش محل لکھنؤ۔ (ع۔ی۔خ)

راہ گزر عاشق حسین صاحب بٹالوی کے سترہ افسانچوں کا مجموعہ ہے۔ جن کے موضوعات میں تنوّع، اندازِ بیان میں شگفتگی اور خیالات میں افادیّت ہے۔

اس مجموعے کے افسانوں میں خالص رومان کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں اور ساتھ ہی زندگی کی ٹھوس، تلخ اور سنگین حقیقتوں کی ہوبہو تصویریں بھی! البتّہ بعض جگہ ان کی پیش کردہ رومانیت کھوکھلی سی ہوگئی ہے اور اس نے بے معنی جذباتیت کا رُوپ دھار لیا ہے۔ لیکن عاشق صاحب کے افسانوں کو دیکھ کر اس بات کا پتا ضرور چلتا ہے کہ انھوں نے زندگی کو بہت قریب سے اور بہت غور سے ایک نقّاد کی طرح دیکھا ہے۔

ان کے بعض افسانے اگرچہ فنّی اعتبار سے زیادہ بلند نہیں لیکن ہیں دِل چسپ!

ناشر لاہور بک شاپ نسبت روڈ لاہور۔ قیمت ایک رُپیہ بارہ آنے۔ (ع۔ی۔خ)

جھروکے اشرف صبوحی صاحب کے یہ چودہ افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں سے بعض کو مضامین کہنا بھی بےجا نہ ہوگا۔ کئی کہانیاں اس میں دلّی سے متعلق ہیں یعنی اس کا پس منظر بھی دلّی ہے۔ اور ان پر حقیقی ہونے کا خیال ہوتا ہے۔ کچھ کہانیاں دوسری زبانوں سے ماخوذ ہیں۔ بہرحال ہیں سب دل چسپ اور

خصوصاً وقت گزارنے کے لیے تو بہت ہی اچھی ہیں۔

زبان اشرف صاحب نے بڑی پیاری لکھی ہے۔ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت دو رُپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتا کتب خانہ علم و ادب دہلی۔

(ع۔ ی۔ خ)

یہ دلّی ہے | سیّد یوسف بخاری صاحب کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے دلّی اور اس کی آغوش میں پرورش پائی ہوئی تہذیب کا نقشہ بڑی خوبی سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہیں دِلّی کی گلیوں کا بیان ہے، کہیں دلّی کی شادی کا تذکرہ ہے، کہیں شاہی زمانے کی عید کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور کہیں دلّی کے "کرخن داروں" دھوبیوں اور شہدوں کی زندگی کی تصویریں بے نقاب کی گئی ہیں۔

یوسف صاحب چوں کہ خود دلّی والے ہیں، اس لیے دلّی کے متعلق ان کی معلومات بڑی گہری ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والے کے سامنے دلّی کی زندگی کا سارا نقشہ آجاتا ہے۔ کتاب میں اگرچہ اکثریت ایسے مضامین کی ہے جو ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں، لیکن انھوں نے دو تین بالکل نئے مضامین بھی شامل کر دیے ہیں۔

مکتبۂ جہاں نما دہلی نے اس کو شائع کیا ہے اور دو رُپے میں وہاں سے مِل سکتی ہے۔　　(ع۔ ی۔ خ)

اشارہ | بہار کے جدید شاعروں کی نظموں کا یہ مجموعہ ہے جس کو تمنّائی صاحب نے مرتّب کیا ہے۔ ان شاعروں کو صرف بہار کے مشہور شاعروں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اُردو یا ہندستان کے مشہور شاعروں میں نہیں!

ان شاعروں کی نظموں میں بھی کوئی خاص بات نہیں۔ وہی انداز اور وہی موضوعات ہیں جو قریب پندرہ بیس سال سے اُردو شاعری میں رائج رہے۔ لیکن اب جن کو جدید شاعر ترک کرتے جاتے ہیں، اور جنھوں نے اب بیسیوں نئی نئی راہیں نکالی ہیں۔ کسی ایسی جدّت کے اثرات اس مجموعے کے شاعروں کے یہاں نہیں ملتے جن کو اُردو شاعری میں کوئی اضافہ کہا جاسکے۔

بہرحال یہ مجموعہ اگرچہ اُردو شاعری کے کسی مُڑتے ہوے دھارے کا پتا نہیں دیتا لیکن بہار کی جدید اُردو شاعری کا ایک نقشہ ضرور پیش کر دیتا ہے۔ اس میں بعض بعض نظمیں اچھی بھی ہیں۔

نیا سنسار کتاب گھر بانکی پور پٹنہ نے اس کو شائع کیا ہے اور چھوٹے سائز کے ۲۰۹ صفحات کی قیمت تین رُپے رکھی ہے۔

(ع۔ ی۔ خ)

تاریخ و سوانح و سیاسیات

تاریخِ گجرات | از مصنفہ شاہ ابوتراب ولی، مترجمہ شبیہ احمد صاحب ایم اے - ہندستانی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد۔ قیمت پانچ روپے کتاب چھوٹی تقطیع کے تقریباً دو سو صفحات پر مجلد شائع ہوئی ہے۔ اس میں چند تصویریں بھی شامل ہیں۔ لکھائی چھپائی معمولی اور کتابت کی اغلاط بھی موجود ہیں۔ فاضل مترجم نے اپنے مقدمے میں صوبہ گجرات کی تاریخ کا مختصر سا خلاصہ دہرایا ہے اور اس میں عام انگریز مصنفوں کی آنکھ بند کرکے تقلید کی گئی ہے۔ اصل کتاب فارسی میں ہے جسے ڈینی سن راس نے جب وہ کلکتہ میں تھے، ایک مختصر دیباچے کے ساتھ طبع کرادیا تھا۔ مصنف، اکبر بادشاہ کی فتوحاتِ گجرات کے وقت اس ملک میں متوطن ہوگیا تھا اور اس کی تاریخ میں بعض دلچسپ تفصیلات درج ہیں۔ یقین ہے کہ یہ اُردو ترجمہ تاریخِ ہند کے طلبہ کے واسطے مفید ہوگا اگرچہ اس پر حواشی اور دوسری کتابوں سے مقابلہ کرکے تعلیقات لکھنے کی ضرورت تھی۔ (س)

عہدِ حاضر کے بڑے لوگ | از مولوی محمد مرزا دہلوی، دارالاشاعتِ سیاسیہ (مجلس اتحاد المسلمین)، حیدرآباد دکن۔ صفحات ۲۲۴۔ قیمت للعہ

مولوی محمد مرزا صاحب نے اِس کتاب میں عہدِ حاضر کے بعض ممتاز افراد کے حالاتِ زندگی اور عملی کارنامے جمع کیے ہیں اور ان حالات کو چار حصّوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصّے میں ہندستان کے زعما کا ذکر ہے، دوسرے میں چین و ایران، تیسرے میں عراق و عرب کے اور چوتھے میں مصر و مراکش کے۔ ہندستانی زعما میں مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی، دیش بندھو داس اور قائدِ اعظم مسٹر محمد علی جناح کا انتخاب کیا گیا ہے، دوسرے میں مارشل چیانگ کائی شیک اور رضا شاہ پہلوی کا، تیسرے میں امیر فیصل ابنِ حسین اور سلطان ابنِ سعود کا، اور چوتھے میں سعد زاغلول پاشا اور غازی محمد بن عبدالکریم کا۔ چوں کہ کتاب کے ساتھ کوئی مقدمہ یا دیباچہ نہیں ہے اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ انتخاب کا معیار یا اسلوب کیا رکھا گیا ہے، اور عہدِ حاضر میں کس مدت کو شمار کیا گیا ہے۔ بہ ظاہر محض زندہ زعما مقصود نہیں تھے ورنہ دیش بندھو داس اور امیر عبدالکریم کا ذِکر نہ ہوتا، لیکن پھر کمال اتاترک اور جمال الدین افغانی جیسی شخصیتوں کو نظر انداز کرنے کے کیا معنی ہوے۔ اس سے غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے۔ لیکن جہاں تک

خود حالاتِ زندگی کا تعلق ہے وہ بظاہر غیر جنبہ داری سے جمع کیے گئے ہیں گو رائے زنی کرتے وقت اس اصول کو اکثر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ جن زعما کا حال درج کیا گیا ہے اُن کی زندگی اور تحریکات سے اُن کے گرد و پیش کے حالات میں کیا تغیرات رونما ہوئے اس سے بھی مصنف نے بحث کی ہے اور حتی الامکان استدلالی پہلو اختیار کیا ہے۔

(ر۔ ع۔ ا)

جرم و سزا | از باری صاحب، اُردو اکیڈمی، لاہور، صفحات ۱۸۱ قیمت عہ۔

اس کتاب میں بارہ ممتاز تاریخی ہستیوں کے حالاتِ زندگی بیان کیے گئے ہیں جنھیں مروّجہ توہمات و اعتقادات سے اختلاف کرنے اور تحقیق و تدقیق سے مسائل کو سمجھنے کی پاداش میں مصائب و اذیتوں سے دو چار ہونا پڑا اور حکم راں افراد و جماعتوں نے انھیں مستوجب سزا قرار دیا۔ ان میں سقراط، ابنِ رشد، برونو، گیلیلو، مادام رولاں، طامس مور، لوئی چہاردہم اور تیمر وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی ہستیاں ہیں جو حق کوشی اور حق گوئی کی راہ میں قربان ہوئیں اور جو صداقت انھیں محسوس ہوئی اُس کا انھوں نے اپنی جان پر کھیل کر اعلان کیا۔ ان حالات کے پڑھنے سے جو ولولہ اور جوش پیدا ہوتا ہے وہ ان کی تاریخی حیثیت سے زیادہ قابلِ قدر ہے۔ سارے حالات دل چسپ پیرائے میں لکھے گئے ہیں اور طباعت وغیرہ بھی دیدہ زیب ہے۔

(ر۔ ع۔ ا)

مشاہیر کی بیویاں | از مبارز الدین صاحب ایم اے، دارالاشاعتِ سیاسیہ، اشاعت منزل، اُردو گلی، حیدرآباد دکن۔ ۱۶۱ صفحات، قیمت ۱۰ؕ ار

دارالاشاعتِ سیاسیہ نے مشاہیر کی بیویوں کے حالات کا جو سلسلہ شروع کیا ہے یہ اس کا دوسرا حصہ ہے جس میں مشرقی مشاہیر کی بیویوں کا حال ہے اور اس سلسلے میں مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی، پنڈت جواہر لال نہرو، سعد زاغلول پاشا اور مارشل چیانگ کائی شیک کی بیویوں کے حالات درج کیے گئے ہیں۔ خانگی زندگی کا اثر انسان کے حالات پر کس حد تک پڑتا ہے اس کے لیے بڑے آدمیوں کی بیویوں اور ماؤں کے حالات بہت کچھ سبق آموز ہیں۔ لیکن مشرق میں اس قسم کے حالات کا جمع کرنا بہت دشوار ہے اس لیے کہ اس کا مواد بمشکل ملتا ہے۔ مولوی مبارز الدین صاحب نے بڑی کاوش سے یہ چند صفحات جمع کیے ہیں جن سے اصل حصولِ

مقصد سے زیادہ اس شعبۂ فن کی رہ نمائی ہوتی ہی اور یہ اُمید کی جاسکتی ہی کہ آیندہ ایسے مبحث پر مزید توجہ اور کاوش کی جاسکے گی۔ بیویوں کے حالات لکھنے میں ہمارے نزدیک شوہر کے امتیاز کے علاوہ خود بیبیوں کے امتیاز کو بھی پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہی اس لیے کہ بعض خواتین ایسی ہیں جو اپنے شوہروں سے زیادہ ممتاز شخصیت رکھتی ہیں۔ مثلاً مسز سروجنی نائیڈو یا مرحومہ بیگم حسرت موہانی۔ ان میں سے آخر الذکر نے اپنے شوہر کی زندگی پر قوی اثر ڈالا مگر اوّل الذکر نے اتنا اثر نہیں ڈالا۔ یہ کیوں؟ اس کی وجہ بتانا تذکرہ نگار کا کام ہی۔ بہرحال یہ سلسلہ دلچسپ اور مفید ہی۔

(ر۔ع۔ا)

مشاہیرِ چین

از میر عابد علی خاں صاحب بی اے۔ دارالاشاعت سیاسیّہ (انجمن اتحاد المسلمین) اشاعت منزل اُردو گلی، حیدرآباد دکن، ۱۲۴ صفحات۔ قیمت عہ۔

اس کتاب میں چین کے نو مشاہیرِ گزشتہ وحال کے حالات جمع کیے گئے ہیں جن میں دو مذہبی پیشوا کنفیوشش اور لیوزے اور باقی سات وہ مدبرین و سیاسی ہیں جنھوں نے چین کو وقتاً فوقتاً بیداری کا درس دیا۔ چین میں اس وقت علاوہ اسلام اور مسیحیت کے تین مذاہب رائج ہیں جن میں سے ایک بدھ مذہب ہندُستان سے گیا اور دو کنفیوشش اور لیوزے کی اصلاحی سرگرمیوں کے رہینِ منت ہیں جو چین ہی میں پیدا ہوے تھے۔ ان دونوں چینی رہ نماؤں کا فلسفہ ایک، دوسرے سے بالکل مختلف ہی لیکن اخلاقی استواری کی تعلیم دونوں کی بنیاد ہی۔ ایک میں اس کی بنیاد مادّی دُنیا کے حالات پر رکھی گئی ہی اور دوسرے میں روحانیت پر۔ اور دونوں کے فلسفۂ حیات کا اہلِ چین کی زندگی پر بہت بڑا اثر ہی۔ مشاہیرِ چین کے حالات پڑھ کر یہ اندازہ کیا جاسکتا ہی کہ اس ملک کو ایک وحدت میں منسلک کرنے کی جتنی تحریکات ہوئیں وہ پایے دار نہیں ثابت ہوئیں، جس کی وجہ ممکن ہی کہ ان تحریکات کی خامیاں بھی ہوں، اس لیے موجودہ چین کو اتحاد کی کوئی اور بنیاد تلاش کرنی چاہیے۔ مگر صدیوں کے مسلسل سیاسی خلفشار نے اہلِ چین کے شعور و احساس کو جامد کردیا ہی اور وہ آج بھی گو ایک طاقت ور دشمن سے دست و گریباں ہیں لیکن دُور رس تدابیر سوچنے سے قاصر ہیں۔ بہرحال اس کتاب میں جو مشاہیر کے حالات جمع کیے گئے ہیں اُن سے اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ اہلِ ہند کو اور خصوصاً اُردو داں پبلک کو اپنے ایک ہم سایہ ملک کے افکار و خیالات کا کچھ حال معلوم ہوجائے گا اور اس کی تاریخ میں جو اہم واقعات رونما ہوے ہیں ان کا علم ہوجائے گا۔ داستان

کی تکمیل کے لیے کتاب کے دیباچے میں تاریخی پس منظر بھی دیا گیا ہی اور آخر میں اُن کتابوں کی ایک فہرست بھی ہی جن سے مزید تفصیلی حالات معلوم ہوسکتے ہیں ۔ (ر ۔ ع ۔ ا)

تاریخ حُسن کاری

از میر امجد علی صاحب ، حیدرآباد بک ڈپو ، سانچہ توپ ، حیدرآباد دکن ، ۱۲۸ صفحات قیمت ۲/ عہ

حُسن کاری یا آرٹ پر اُردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہی اور اسی وجہ سے یہ مغربی ماخذوں سے جمع کی گئی ہی جس میں مشرقی آرٹ کا حال محض برسبیلِ تذکرہ آگیا ہی ، اور گو کتاب کے اشتہار اور دیباچے میں ساری دُنیا کے آرٹ پر مختصر تبصرے کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہی مگر غالباً مواد اور وسائل کی کمی اس میں مانع ہوئی جس کی وجہ سے ایشیا اور خصوصاً ہندُستان کی بہت سی صناعیاں نظرانداز ہوگئیں خاص کر آگرہ کا تاج محل جو آرٹ کی حیثیت سے عجائباتِ عالم میں شمار ہوتا ہی اس کتاب میں چند سطروں کے تذکرے کا بھی حق دار نہ ہوسکا۔ پھر ہندُستان کے قدیم آرٹ پر تو نہایت ہی سرسری نظر ڈالی گئی ہی مگر وہ فن جسے مغل آرٹ کہتے ہیں ۔ اور جس کے تعمیری اور مصوری اثرات اس وقت تک زندہ ہیں اور شاید رہتی دُنیا تک رہیں گے وہ بھی محرومِ تذکرہ رہ گیا ۔ کتاب میں بیش تر تعمیری آرٹ کا ذِکر ہی اور مصوری پر برائے نام توجہ کی گئی ہی ۔ یہ برائے نام ذکر بھی نہ ہوتا تو زیادہ بہتر تھا اس لیے کہ کسی مضمون کو اس قدر تشنہ رکھنے سے بہتر یہی تھا کہ اس کا ذِکر ہی نہ کیا جاتا اور جو مختصر جگہ اس کے لیے نکالی گئی ہی وہ تعمیری آرٹ ہی کے ذِکر کو زرا زیادہ واضح کرنے میں صرف کی جاتی ۔ بہرحال اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہونے کے لحاظ سے ان کوتاہیوں کو نظرانداز کیا جاسکتا ہی اور یہ امید کی جاسکتی ہی کہ کاغذ اور طباعت کی مزید آسانیاں مہیا ہونے پر دُوسرے اڈیشن میں ان کی تلافی ہوسکے گی ۔ (ر ۔ ع ۔ ا)

لینن گراڈ تا سمرقند

از عشرت علی صدیقی ، عبدالحق اکاڈیمی ، اشاعت منزل ، اُردو گلی ، حیدرآباد دکن ، ۱۱۷ صفحات ۔ قیمت عہ

سویٹ روس کے اندرونی حالات ، وہاں کے باشندوں کے طرزِ بود و ماند ، اور دیہاتوں اور شہروں کی عام حالت ، زراعت حرفت اور تجارت کی ترقّی اور سویٹ نظام کے عمل کا عام ملکی حالت پر اثر اس کتاب

میں سفرنامے کے طرز پر بیان کیا گیا ہو جو دل چسپی سے خالی نہیں اور جو لوگ سویٹ روس کے نئے معاشی، معاشری اور سیاسی نظریات کی عملی شکل معلوم کرنے کے مشتاق ہیں انھیں یہ کتاب خاص کر دل چسپ معلوم ہوگی۔ جس نظام نے جرمنی کے آہنی فوجی نظام کا ایسا کام یاب اور شان دار مقابلہ کیا، اُس کی تفصیلات سے اس وقت ساری دُنیا کو دِل چسپی ہو اور ہر شخص جو اخباروں میں روسی افواج کی دلاوری اور جاں بازی کے حالات پڑھتا ہو اُسے یہ بھی معلوم کرنے کی خواہش ہو کہ جو قوم معرکۂ کارزار میں اتنی سرفروش ہو وہ روزمرہ کی زندگی میں کن کیفیات کی حامل ہو اس کا جواب اس کتاب میں دینے کی کوشش کی گئی ہو جو یقیناً مقبول ہوگی۔ (ر.ع.ا)

سوشلزم

از فریڈرک اینگلز، مترجم سبطِ حسن صاحب، شائع کردہ قومی دارالاشاعت بمبئی ۱۲ عہ

یہ چھوٹی سی کتاب فریڈرک اینگلس کی مشہور تصنیف سوشلزم کا ترجمہ ہو۔ اینگلس کا نام اشتراکیت سے دِل چسپی رکھنے والوں کے لیے محتاجِ تعارف نہیں۔ وہ اشتراکیت کے سب سے پہلے بانی کارل مارکس کا سب سے بڑا دوست تھا جس نے اپنی ساری زندگی انسانیت کے بنیادی اور پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں صرف کردی۔ اس کا مطالعہ بہت ہی وسیع تھا اور علوم کے مختلف شعبوں یعنی فلسفہ، تاریخ معاشیات، عمرانیات، سائنس ان سب پر اس کی نظر نہایت گہری پڑتی تھی۔

اس کتاب میں بھی اس کی یہ ساری خصوصیات نظر آتی ہیں۔ سرمایہ داروں اور مزدوروں کی طبقاتی دشمنی اور اس کے حل کو اس میں کھول کر بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ اس نے یہ بتایا ہو کہ صرف اشتراکی اصولوں کا رواج ہی سرمایہ داری کو موت کے گھاٹ اُتار کر انسانیت کو امن وسکون سے ہم کنار کرسکتا ہو۔

ترجمے میں اصل کی شان ہو۔ اور سبطِ حسن صاحب چوں کہ خود بھی اشتراکیت سے دِل چسپی رکھتے ہیں اور انھوں نے اس کا مطالعہ بھی بہ غور کیا ہو اس لیے وہ اس کتاب کے بعض مشکل حصّوں کو بھی آسان بنانے میں کام یاب ہوے ہیں۔

شروع میں فریڈرک اینگلس کے حالاتِ زندگی بھی تفصیل سے دے دیے گئے ہیں۔ جس نے اس کی اہمیت کچھ اور بڑھادی ہو۔ قیمت ایک رُپیہ آٹھ آنے۔ (ع۔ی۔خ)

مارکس اور ہندُستان

مترجم اشرف عالم: شائع کردہ قومی دارالاشاعت، بمبئی ۱۲ عہ

ہندستان کے مسائل پر کارل مارکس کے مقالات کا یہ مجموعہ ہی جس کو شرف عالم صاحب کے اُردو کے قالب میں ڈھالا ہی۔

کارل مارکس ایشیائی معیشت کے مخصوص مسائل سے اچھی خاصی دِل چسپی لیتا تھا۔ چناں چہ اس کی تصانیف میں ہندستان اور چین کے بنیادی اقتصادی اور معاشی مسائل کا بارہا ذِکر آیا ہی۔ خود "سرمایہ" (Capital) میں جگہ جگہ ہندستان کا تذکرہ ملتا ہی۔ چناں چہ انھی جگہ جگہ بکھرے ہوے خیالات کو ایک لڑی میں پرو دیا گیا ہی جو اب اس کتاب کی صورت میں موجود ہی۔

ترجمہ سلیس اور صاف ہی۔ قیمت ایک رُپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتا:۔ قومی دارالاشاعت بمبئی۔ (ع۔ی۔خ)

مارکس کی تعلیمات

از لینن، مترجمہ شرف عالم۔

مارکس کی تعلیمات کو جس قدر اچھی طرح لینن نے سمجھا ہی شاید ہی کسی دوسرے نے سمجھا ہو۔ اس کتاب میں انھی تین مقالات کو جمع کر دیا گیا ہی جن میں لینن نے مارکس کی تعلیمات کو سمجھانے کی کوشش کی ہی۔

اس میں مارکسیت کے تمام اجزاے ترکیبی مثلاً فلسفیانہ مادّیت، جدلیات، تاریخ کا مادّی تصوّر، طبقاتی جدّوجہد، اس کا معاشی نظریہ — غرض یہ کہ ان تمام موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہی۔ جس سے اشتراکیت کی بنیادی اور اساسی چیزیں پوُری طرح سمجھ میں آجاتی ہیں۔

شرف عالم صاحب نے ترجمہ خوب کیا ہی۔ قیمت ایک رُپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتا قومی دارالاشاعت بمبئی۔

(ع۔ی۔خ)

سویٹ یونین کا دستورِ اساسی

مترجم سلامت اللہ صاحب ناشر ہندستانی پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ قیمت عہ

یہ ترجمہ ہی سویٹ یونین کے اس دستورِ اساسی کا جو اسٹالنی دستور ۱۹۳۶ء کے نام سے مشہور ہی۔

اس میں سویٹ یونین کے نظامِ حکومت کی ساری تفصیلات درج ہیں۔ جس پر نظر ڈالنے کے بعد سویٹ یونین کے متعلّق بہت سی غلط فہمیوں کو دوُر کرنے کی کوشش کی گئی ہی۔ اور اس حقیقت کو واضح کیا

گیا ہو کہ سویٹ یونین کا نظامِ حکومت صحیح معنوں میں جمہوری اصولوں پر مبنی ہو جہاں چھوٹی سے چھوٹی پنچایت سے لے کر مرکزی حکومت کی بڑی سے بڑی مجلسِ اعلا تک حکومت کے تمام اہم ادارے جمہوری اُصولوں پر منتخب کیے جاتے ہیں۔

ساتھ ہی اس میں اسٹالن کی وہ تقریر بھی شامل کردی گئی ہو جو اس نے اس دستور کے متعلق کی تھی۔ اس کے مترجم سلامت اللہ صاحب ہیں جنھوں نے صاف اور عام فہم زبان میں اس کو اُردو کا جامہ پہنایا ہو۔ (ع۔ی۔خ)

سویٹ روس کی عورتیں یہ چھوٹی سی کتاب رضیہ سجاد ظہیر صاحبہ نے روس کی عورتوں کے متعلق لکھی ہو جس میں یہ دکھایا گیا ہو کہ اشتراکی نظام میں عورت کا کیا مرتبہ ہونا چاہیے۔ روس میں اشتراکیت کے پرچار سے قبل زار کے دورِ حکومت میں اس کی کیا حالت تھی اور یہ کہ اشتراکیت کے زیرِ سایہ اس نے اب ترقی کی کتنی منزلیں طے کرلی ہیں۔

عورت کا مسئلہ ہر دور اور ہر زمانے میں موضوعِ بحث رہا ہو لیکن بہت کم دور ایسے آئے جن میں اس کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ تہذیب و تمدن کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے سے اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہو کہ قریب قریب ہر دور میں ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ اور مہذب سے مہذب سماجی نظام کے اندر بھی اس کو وہ حیثیت حاصل نہیں ہوسکی جو حاصل ہونی چاہیے تھی۔

روس نے اس معاملے میں قدم آگے بڑھایا ہو اور وہاں کے سماجی نظام میں اب صنفِ نازک کو وہی حقوق حاصل ہیں جن کے مستحق مرد سمجھے جاتے ہیں۔

کتاب سطحی ہونے کے باوجود اچھی ہو۔ قومی دارالاشاعت بمبئی نے اس کو شائع کیا ہو اور وہاں سے ۸؍ میں مل سکتی ہو۔ (ع۔ی۔خ)

(۱) **اسلامی نظام** - (۲) اسلام کا سیاسی نظریہ اور **فلاحِ عالم** (از حکیم محمد اسحاق صاحب سندیلوی)
(۳) **علما اور اسلام** (از مولوی منظہر الدین صاحب صدیقی)

یہ تینوں کتابچے دارالاشاعت نشاۃِ ثانیہ (جدید ملے پلی، حیدرآباد دکن) سے شائع کیے گئے ہیں جس کی

بعض دوسری مطبوعات پر بھی ان اوراق میں تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ ان سب میں مودودی صاحب کی تحریک کے اثرات نمایاں ہیں۔ یورپ کی لادینی اور دہری اخلاق یا بداخلاقی کی اچھی طرح خبر لی گئی ہے اور اسلامی احکام وعقائد کی خوبیاں زمانۂ حال کے مذاق کے مطابق ثابت کی گئی ہیں۔ زیرِ تبصرہ رسائل میں بھی خطیبانہ جوش کے باوجود اسلام کے سیاسی نظام اور خلافتِ الٰہی کے تصوّرات کو واضح کیا اور یورپ کے دساتیر و آئین پر اس کی فضیلت قوی دلائل سے نمایاں کی گئی ہے۔ اُس طومار کے مقابلے میں جو آج کل کے بعض انگریزی خواندہ مغرب زدہ نوجوان اشتراکی و کمیونسٹی اصول کی حمایت میں چھاپ رہے ہیں اور صداقت و حقیقت کا لحاظ کیے بغیر سویت روس کی بھٹئی کرتے پھرتے ہیں، یہ تحریریں کہیں زیادہ معقولیت پر مبنی ہیں۔ مگر جذباتی خوش اعتقادی سے یہ بھی خالی نہیں اور اس لیے ان کا اثر غالباً زیادہ دیرپا نہ ہوگا۔ لائق مصنّفوں کو چاہیے کہ وہ یہ نکتہ فراموش نہ کریں کہ عقلی اور کتابی دلائل یعنی قال سے کہیں بڑھ کر لوگ حال کو دیکھا کرتے ہیں۔ آپ کے مذہبی نظامِ سیاست پر آزاد اسلامی ممالک نے عمل نہ کیا یا نہ کرسکے تو محکوم ہندستان میں اِس وقت اُس کے سرسبز و کام یاب ہونے کی کیا اُمید کی جاسکتی ہے۔ بہرحال مغربیت و اشتمالیت کے مقابلے میں اس قسم کی تحریروں کا مُلک میں شائع ہونا، فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ اور ناظرین تصویر کا سیاہ رُخ بھی دیکھ سکیں گے۔

ان کتابوں کی زبان عموماً مشکل اور غیر سلیس ہے۔ اور یہ وصف ان کی قبولیت میں حارج ہوگا۔ انگریزی الفاظ کو بھی اکثر بلا ضرورت بولا اور انگریزی رسم الخط میں لکھ دیا ہے، جو بدنما معلوم ہوتا ہے اور جن سے فاضل مصنّفوں کی انگریزی دانی پر بھی شبہہ پیدا ہوتا ہے مثلاً (اِن فی ری اوریٹی کوم پلیکس) کو حقارتی مرکّب ترجمہ کرنا (اسلامی نظام، ص ۵۳) نہ صرف مولویانہ تصنّع بلکہ معناً بھی نادرست معلوم ہوتا ہے۔ کتابوں میں تاریخ و سیاسیات کے متعلق بہت سے دعاوی ایسے پیش کیے ہیں جن کے حوالوں کی ضرورت تھی۔ کتابوں کی لکھائی چھپائی اچھی اور قیمتیں بھی زیادہ نہیں ہیں۔ (س)

معاشیات

معاشیات پر تین اہم کتابیں

(بہ قلم جناب ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی، صدر شعبۂ معاشیات

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد)

فاضل ڈاکٹر صاحب کی مستعدی اپنے ہم چشموں میں لائقِ رشک اور اہلِ اُردو کی نظر میں کمال تحسین وشکر کی مستحق ہی کہ درسی اور دوسری سرکاری مصروفیات کے باوجود اپنے وقت اور علمی سرگرمی کا ایک حصہ تصنیف وتالیف کے لیے نکال لیتے ہیں اور اپنے خاص فن میں، جو دورِ حاضرہ کی زندگی کا نہایت اہم شعبہ بنتا جاتا ہی، اُردو زبان کی اور بالواسطہ اہلِ ہند کی، بیش بہا خدمت انجام دے رہے ہیں۔ آپ نے ایک اِدارۂ معاشیات حیدرآباد میں قائم کیا ہی جو معاشی مضامین پر بہت سے مفید رسائل اور چند مبسوط کتابیں شائع کرچکا ہی۔ مقصد یہ ہی کہ حتی الامکان آسان پیرائے میں اُردو خواں حضرات کو دولت اور اس کی آمد وخرچ وغیرہ کے وہ پیچیدہ مسائل سمجھائے جائیں جو آج کل دُنیا میں بہت سی بحث ونزاع بلکہ جدال وقتال کی بنیاد بن گئے ہیں اور جن سے اقوام وملل کی خوش حالی اور افلاس کے اسباب کا پتا چلایا جاتا ہی۔ اِس ادارے کی بعض مطبوعات پر "اُردو" میں پہلے تبصرہ کیا جاچکا ہی۔ اب خود ڈاکٹر انور اقبال صاحب کی لکھی ہوئی تین کتابیں شائع ہوئی ہیں جو ہر اعتبار سے تعلیم یافتہ حضرات کے مطالعے کے لائق ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:- (۱) ہندُستان کی آبادی۔ (۲) اسلام اور سود۔ (۳) ہندُستان کا نظامِ زر۔

ان میں سے پہلی کتاب کے ابتدائی تین باب میں انسانی آبادی اور اس کی کمی بیشی کے اسباب واثرات سے ایک مشرح علمی اور تاریخی بحث کی ہی اور اس کے بعد ہندُستان کی آبادی اور پچھلے پچاس ساٹھ برس میں اُس کی تیز ترقی سے یہاں کی معیشت ومعاشرت پر جو اثر پڑا، انھیں وضاحت سے بیان کیا گیا ہی۔ کثرتِ آبادی سے وسائلِ خورونوش کی بہم رسانی میں جو دُشواریاں پیش آرہی ہیں یا آیندہ جس قسم کے احتمال ہیں، اُن پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی ہی اور ثابت کیا ہی کہ فقط صنعتی ترقی سے بھی ہندُستان کی "نیستی اور برخورداری" کی بیماری دوٗر نہیں ہوسکتی۔ فاضل ڈاکٹر صاحب کی رائے میں ہندُستان کی آبادی فی الواقع بہت بڑھ چکی ہی اور اس کا معقول سدِ باب نہ کیا گیا تو یہاں گرانی اور افلاس میں اضافہ ہوتا جائے گا اور عجب نہیں کہ ۱۹۴۳ء کے بنگالے کی طرح دوسرے علاقوں میں بھی آیندہ عام فاقہ کشی کی نوبت آجائے۔

ہندُستان کے نظامِ زر میں بعض اصولی اور تاریخی مباحث کے علاوہ، ڈاکٹر انور اقبال صاحب نے پہلے

سکّے، کاغذی زر، اُس کی افراط (جسے نفخِ زر کہنا اِن فلیشن، کا صحیح مرادف ہوگا) اور اس کے اثرات، اجناس کی گرانی نیز تجارت کی کساد بازاری پر تفصیل سے بحث کی ہو اور تالیفِ کتاب یعنی آغازِ ۴۵ء تک زر کے حالات اور تازہ ترین مسائل کے مالۂ و ماعلیہ کو صاف زبان میں اُردو خواں ناظرین کے سامنے پیش کردیا ہو۔

اسلام اور سوٗد بڑے معرکے کی کتاب ہو اور اس پر ڈاکٹر صاحب نے مقدمہ مولانا مناظر احسن صاحب سے لکھوایا ہو جو جامعۂ عثمانیہ میں غالباً شیخ الحدیث ہیں اور مغربی علوم و تہذیب وغیرہ کے خلاف اکثر پُرجوش مضامین تحریر فرماتے رہتے ہیں۔ لیکن چند سال ہوے آپ نے غیر مسلموں سے سود لینے کے جواز پر ایک مقالہ یا بسیط فتوا شائع کیا تھا اور ممکن ہو کہ بنک سوٗد کی نسبت بھی بعض مولویوں کے ہم خیال ہوں جو ایسے سوٗد کو تجارتی نفع قرار دیتے ہیں۔

مگر فاضل مصنّف، جو یورپ کے اعلا تعلیم یافتہ ہیں، کوٹ پتلون پہنتے اور ڈاڑھی منڈاتے ہیں، وسیع مطالعے اور غور کے بعد اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بینک کا سوٗد بھی دُنیا کے لیے لعنت اور بدترین خرابیوں کا موجب ہو۔ انھوں نے خود یورپ کے مستند علما اور ماہرینِ معاشیات کے اقوال نقل کیے ہیں اور دلائلِ عقلی اور مشاہدات و تجرّبات کی بنا پر ثابت کیا ہو کہ بینک میں سوٗد کے لیے سرمایے کو رکھنا، رُپے کے دَوران کو روکتا ہو اور افزایشِ دولت و تجارت کے حق میں مضر ہوجاتا ہو۔ حالیہ جنگ میں شرحِ سود گھٹتے گھٹتے ایک فی صدی تک رہ گئی اور بعض اربابِ فکر و راے اب قومی فلاح اور آسودگی کے لیے بہتر یہی سمجھتے ہیں کہ اسے گھٹاکر صفر کردیا جائے۔ مطلب یہ کہ دُنیا چکّر کھاکر اُسی اُصول کی طرف آرہی ہو جس کی محکم بنیاد اسلام نے اس قطعی اور دوٹوک حکم سے رکھی تھی کہ احلّ اللہ البیع وحرّم الرّبٰوا۔ اور لالچ خوروں کے کان میں یہ غیبی آواز کڑکا دی تھی کہ یمحق اللہ الرّبٰوا ویُربی الصدقات۔ واللہ لا یحبّ کلّ کفّارٍ اثیم۔

ڈاکٹر انور اقبال صاحب کی کتاب اوّل سے آخر تک اتنی پُرمغز، مفید معلومات سے لب ریز ہو کہ اس کی تلخیص کرنا بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ ہمیں یقین ہو کہ وہ ملک میں خصوصاً تعلیم یافتہ مسلمانوں میں وقعت و قبولیت پائے بغیر نہ رہے گی جس کی وہ مستحق ہو۔ حکیم امّت اقبال مرحوم نے ایک جگہ شیطان کی زبان

سے کہہ دیا ہے کہ ؎

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

جو حضرات عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس مبارک شریعت کے رموز و برکات آشکارا ہونے کا وقت آگیا ہے، ان کے لیے ڈاکٹر انور اقبال صاحب کی یہ کتاب ایک بہت عمدہ اور تازہ شہادت فراہم کرتی ہے۔

تینوں کتابیں تقریباً تین تین سو صفحات کی ضخامت رکھتی ہیں۔ اور خاص سلیس زبان میں صاف ستھری چھاپ کر مجلد شائع کی گئی ہیں۔ ہر ایک کی قیمت تین روپے ہے۔ ادارۂ معاشیات، فاطمہ منزل، حمایت نگر حیدرآباد دکن کے پتے سے دست یاب ہوں گی (س)

ہندستان کی معیشت اور جنگ

ادارۂ معاشیات حیدرآباد دکن کے سلسلۂ مطبوعات کی چوتھی کتاب' جس میں لائق مولف محمد احمد خاں صاحب بی۔اے، ایل۔ایل۔بی نے خاص تفصیل سے بتایا ہے کہ جنگ نے ہندستان کی زراعت، صنعت و تجارت پر کیا اثرات ڈالے اور ہماری مالیات اور سکہ ہائے رائج کی قیمت کو کیسے کیسے نشیب و فراز دیکھنے پڑے۔ آخر میں بعد از جنگ مسائل پر بحث کی ہے اور ہندستان کی معاشی مشکلات اور ترقی کے امکانات، دونوں کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔ غرض ہر اعتبار سے کتاب مفید اور بروقت کہی جاسکتی ہے۔ صفحات ۲۹۶، قیمت سے، ملنے کا پتا:- ادارۂ معاشیات، حمایت نگر، حیدرآباد دکن۔ (س)

ہندستان کی معاشی ترقی کے لیے ایک لائحۂ عمل (حصۂ دوم)

مترجمہ سعید احمد مینائی بی اے (عثمانیہ) ادارۂ معاشیات۔ فاطمہ منزل، حمایت نگر، حیدرآباد دکن، ۷۰ صفحات۔ قیمت ۱۲ر۔

یہ ہندستان کی تعمیر بعد از جنگ کے مشہور و معروف منصوبے "بمبئی پلان" کے دوسرے حصے کا اردو ترجمہ ہے۔ پہلے حصے کا ترجمہ جو پیدائش دولت کی تجاویز سے متعلق تھا اس سے پیش تر ادارۂ معاشیات حیدرآباد دکن سے شائع ہو چکا ہے۔ اس دوسرے حصے میں تقسیم دولت اور حکومت کے فرائض کے متعلق تجاویز پیش کی

گئی ہیں نیز پہلے حصّے پر جو اعتراضات کیے گئے تھے ان کے جوابات بھی دورانِ استدلال میں دیے گئے ہیں۔ تعمیر بعد از جنگ کا یہ خاکہ جو ملک کے آٹھ سربرآوردہ کاروباری اصحاب نے مشترکہ کوشش سے تیار کیا تھا اس لیے خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں کاروباری نقطۂ نظر سے ملک کی مالی حالت کو سدھارنے پیداوار میں اضافہ کرنے اور دولت کی مساویانہ تقسیم کے لیے تجاویز پیش کی گئی ہیں، اور تعمیر بعد از جنگ کے جتنے خاکے اس وقت تک منظرِ عام پر آئے اُن میں سب سے زیادہ مقبولیت اسی خاکے کو ہوئی جو بمبئی پلان کے نام سے مشہور ہے۔ اِدارۂ معاشیات نے اُردو دان پبلک کو اس کی تفصیلات سے آگاہ کرنے کے لیے یہ اُردو ترجمہ شائع کیا ہے اور ادارے کا یہ کام مستحقِ تحسین ہے۔ ہمارے عوام میں معاشی مسائل سے جو عام بے اعتنائی برتی جاتی ہے اُس کے پیشِ نظر اس قسم کی مطبوعات کی بہت ضرورت ہے۔ اس پلان کے نقائص اور خامیوں سے بحث یہاں بے موقع ہوگی اس لیے کہ زیرِ نظر کتاب محض اُس کا ترجمہ ہے اور اس کا مقصد صرف پلان کی تفصیلات سے آگاہ کرنا ہے۔ چناں چہ مترجم نے اس غرض کو خوبی سے انجام دیا ہے اور ایک مشکل مبحث کو سلیس اور عام فہم زبان میں پیش کیا ہے۔ بہ ہر حال اتنا کہ دینا بے محل نہ ہوگا کہ اس پلان میں کاروباری اور تجارتی نقطۂ نظر ملحوظ رکھا ہے جو ہندستان کے عام افلاس کا علاج کرنے سے قاصر ہے۔ ضرورت ایک ایسے خاکے کی ہے جو خالص عوام الناس کی فلاح پر مبنی ہو اور ایسا کوئی خاکہ ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آیا ہے۔

(ر۔ع۔ا)

فاقہ کیوں؟

از میوسانی مترجمہ مرزا عصمت اللہ بیگ، دارالاشاعتِ سیاسیہ، اشاعت منزل، اُردو گلی، حیدرآباد دکن، ۵۸ صفحات، قیمت ۱۲ر

اس کتاب کے مصنّف نے ہندستان کے غذائی مسئلے پر سیر حاصل بحث کی ہے اور سبق آموز شمار و اعداد دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ ہندستان میں غذائی قلّت کی ذمّے داری حکومت کی غیر ہمدردانہ پالیسی پر ہے جس میں رُپے کی بہتات کردی گئی ہے اور پیداوار کے اضافے کی موثّر تدابیر اختیار نہیں کی گئی ہیں۔ چناں چہ اس کا علاج یہی ہے کہ رُپے کی افراط کم کی جائے، غلّے کی پیداوار بڑھائی جائے اور باہر سے غلّہ کافی مقدار میں درآمد کیا جائے۔ فاضل مصنّف کے نزدیک جو لوگ ہندستان کو جنگ میں شامل کرنے کے

ذمّے دار ہیں انھی پر یہاں کی غیر فوجی آبادی کو غذا بہم پہنچانے کی بھی ذمّے داری ہے۔کتاب میں آبادی، پیداوار، کسان اور مواشی کی زبوں حالی کے جو اعداد دیے گئے ہیں وہ بہت ہی عبرت انگیز اور سبق آموز ہیں - ترجمہ سلیس اور اچھا ہے۔

(ر-ع-ا)

مذہب واخلاق

بشریٰ | مولفہ مولانا عنایت رسول صاحب عباسی چڑیاکوٹی مرحوم ، شائع کردہ شروانی پرنٹنگ پریس، علی گڑھ صفحات ۳۴۴ ، صرف محصول ڈاک بھیجنے پر بلا قیمت دی جاتی ہے۔

مولانا عنایت رسول صاحب چڑیاکوٹی مرحوم کی یہ معرکہ آرا تصنیف جس میں اناجیل و تورات وزبور سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعثت کی پیش گوئیاں جمع کی گئی ہیں اور بڑی تحقیق وکاوش سے عبرانی یونانی اور لاطینی نسخوں کی چھان بین کرکے ایسے واضح اشارات جمع کیے ہیں جن سے پیامِ الٰہی کی مذہبِ اسلام میں تکمیل دکھائی گئی ہے اور آں حضرت صلی اللہ وسلّم کے زمانۂ نبوت کے بعض اہم حالات بھی بیان کیے گئے ہیں ، حتیٰ کہ خلافتِ راشدہ اور حادثۂ کربلا کا بھی ذکر موجود ہے۔جسے پڑھنے اور سوچنے کے بعد اہلِ کتاب مذاہب کے ماننے والوں کو اسلام کی صداقت میں کسی حیل وحجت کی گنجایش باقی نہیں رہتی اور ثابت ہوجاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علی نبیّنا وعلیہ السّلام سے لےکر حضرت عیسیٰ علیہ السّلام تک تمام پیغمبر جس آنے والے ہادیٔ برحق یا تسلّی دہندہ کا انتظار کرتے رہے ہیں وہ یہی پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات قدسی صفات تھی۔شروع سے آخر تک تمام مباحث میں اصل عبرانی عبارات اور اُن کا اُردو ترجمہ دیا گیا ہے اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بعض عبارتیں انجیل وتورات وغیرہ کی آیاتِ قرآنی سے بالکل ملتی جلتی ہیں۔حیرت اس لیے ہوتی ہے کہ مروّجہ نسخوں میں ان عبارتوں کو مسخ کرکے کچھ کا کچھ کردیا گیا ہے ورنہ تمام صحفِ آسمانی جن کا منبع لوحِ محفوظ ہے اُن کا بنیادی امور میں یکساں ہونا کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔سابقہ صحفِ آسمانی اپنی اصلی صورت میں تو آج ناپید ہیں ، لیکن قدیم نسخے جو یونانی لاطینی اور عبرانی زبانوں میں کہیں کہیں محفوظ ہیں وہ مروّجہ نسخوں کے بہ نسبت کم مسخ شدہ ہیں ، اور انھی سے اِس حقیقت کا انکشاف کیا گیا ہے مثلاً انجیل برنابا یا برنباس

جس کا ایک اطالی نسخہ ویانا پایۂ تخت آسٹریا کے شاہی کتب خانے میں دست یاب ہوا تھا اُس کے بیانات قرآنی بیانات سے بہت ہی قریب ہیں اور خصوصاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا حال جو اس انجیل کے نسخے میں ہے وہ بہ نسبت مروّجہ نسخوں کے بیان کے قرآن شریف کے بیان سے بہت مِلتا جلتا ہے، اور کتاب زیر نظر میں دونوں کا ترجمہ بالمقابل دیا گیا ہے۔ جو مروّجہ عیسائی عقائد سے مطابقت نہیں رکھتا۔ قرآن شریف میں کئی جگہ سابق صحفِ آسمانی کی ان پیش گوئیوں کا ذکر کیا گیا ہے، اور یہاں تک مذکور ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے صحابۂ کبار کا ذِکر بھی ان صحفِ سماوی میں موجود ہے لیکن توریت زبور اور انجیل کے مروّجہ نسخوں میں یہ باتیں کہیں نہیں ملتیں۔ مولوی عنایت رسول صاحب نے بڑی تلاش سے قدیمی نسخوں سے ایسے بیانات کو جمع کیا ہے جس سے قرآن شریف کے اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔ جہاں تک تحقیق و تفتیش و مطالعے کا تعلق ہے "بشریٰ" ایک بے نظیر تالیف ہے اور مولانا عبّاسی کی محنت و کاوش ہر طرح مستحقِ تحسین ہے۔ مگر افسوس ہے طرزِ بیان میں دل کشی مضمون کی اہمیت کے اعتبار سے نہیں پیدا کی جا سکی اور وہی قدیم طرزِ ادا اختیار کیا گیا ہے جس سے ہمارے علما کی کتابیں زمانۂ حال میں مقبول نہیں ہو سکی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو عبرانی عبارات کی کثرت ہے جن کا ترجمے کے ساتھ ساتھ دینا استناد کے لیے ضروری تھا۔ لیکن یہی عبارتیں اگر فٹ نوٹ میں دی جاتیں اور کتاب کے متن میں صرف ان کا ترجمہ ہوتا تو کتاب میں کافی دِل چسپی پیدا ہو جاتی اور ہر چند سطر کے بعد ایک غیر مانوس زبان کے الفاظ و فقرات بلکہ لمبی لمبی عبارتیں جن کے حروف بھی نہیں پہچانے جا سکتے اور پڑھنے والے کی طبیعت پر سخت بار ہو جاتی ہیں، یہ بات نہ ہوتی۔

اس قسم کی کتاب کا اگر انگریزی میں ترجمہ شائع ہوتا تو اور بھی مفید ہوتا اور بہت سے عیسائیوں اور یہودیوں کی ہدایت کا باعث ہوتا جو اُردو سے ناآشنا ہیں۔ لیکن اُردو نسخے کی اشاعت میں جو دقّتیں پیش آئیں اور جن کا بالتفصیل ذِکر مولوی محمد مقتدیٰ خاں شروانی نے اپنے مقدمے میں کیا ہے اُس کے بعد اس کی توقع ہی فضول ہے کہ کوئی صاحبِ دل اسے انگریزی میں ترجمہ کرا کے شائع کرنے کی جرات کر سکے۔

(ر۔ ع۔ ا۔)

ہم وار زندگی | از سردار گوربخش سنگھ، مترجمہ سردار شمشیر سنگھ خنجر، پریت نگر شاپ، ۲۳ نسبت روڈ لاہور

۲۲۴ صفحات قیمت درج نہیں -

یہ کتاب سردار گوربخش سنگھ کی ایک پنجابی زبان کی کتاب کا ترجمہ ہو جس میں خوش حال و فراغ بال معاشی زندگی کا ایک خاکہ کھینچا گیا ہو اور ایک ایسی سوسائٹی کی تعمیر کا نقشہ بتایا ہو جس میں ہر چھوٹا بڑا امیر غریب خوش حالی اور تمیز سلیقے کی زندگی بسر کر سکے - اس خاکے کی بنیاد اس اصول پر ہو کہ زندگی کا مقصد خوشی لینا اور خوشی دینا ہو، یعنی دوٗسروں کو خوش کرنا، اور خود بھی استفادہ کرنا - افلاطون نے آج سے بہت پہلے ایک بہترین ریاست کا خاکہ تیّار کیا تھا، جس میں یہ نقص تھا کہ اس کے نفاذ کی کوئی قوّت اس کی پشت پر نہ تھی - یہی وجہ ہو کہ تاریخِ عالم کے کسی زمانے میں بھی اس خیالی نقشے پر عمل نہ ہوسکا - قریب قریب اسی قسم کا اعتراض سردار گوربخش سنگھ کے ہموار زندگی کے خاکے پر ہوسکتا ہو اور پھر زندگی کا بنیادی مقصد جو خوشی دینا اور خوشی لینا قرار دیا گیا ہو وہ بھی ایک اختلافی بات ہو - اور اس مقصد کے حصول کی تدابیر اس سے بھی زیادہ مختلف فیہ ہیں - بہرحال ایک مفکّرانہ بحث کی حیثیت سے کتاب خاصی دل چسپ ہو اور اگر جماعتوں کے لیے نہیں تو افراد کے لیے اس سے بہت کچھ اپنی زندگی سدھارنے کا سبق مِل سکتا ہو - اُردوٗ ترجمہ صاف اور سلیس ہو -

(ر - ع - ا)

نئے رسالے

مجلّہ کلّیہ گُل برگہ وسطانیہ کالج کا سہ ماہی رسالہ ہو جس کی دوٗسری جلد کا تیسرا نمبر ہمارے زیرِ نظر ہو - کاغذ کی خرابی کا رونا تو آج کل تضاد قدر کی شکایت کے مرادف ہوگا لیکن خط اور چھپائی بھی "گُل برگہ" میں اچھی میسّر نہ آئی کہ معنوی اعتبار سے ایک پسندیدہ رسالے کی صورت بگڑ گئی - ورنہ طلبہ اور اساتذہ کے جو مضامین فراہم کیے گئے، سب اچھے اور لائقِ تحسین ہیں - جہاں گیر علی خاں صاحب نے مقامی طرزِ تعمیر پر خاصا بسوط مضمون تحریر کیا ہو - اگرچہ لکھو کی تصاویر سے بھی اصل عمارتوں کی کہنگی ٹپکتی ہو - ایک دوٗسرے اُستاد رُشدی صاحب ظرافت کے پیرائے میں بہت کارآمد اور دِل نشین نصیحتیں کر گئے ہیں - رام چندر صاحب طالب علم سال اوّل کا مضمون بھی اثر سے خالی نہیں - فانیؔ پر ایک اور طالب علم نے

بہت اچھا ناقدانہ مضمون لکھا ہی۔ رسالے کے لائق کارپردازوں کو چاہیے کہ وہ اس کی طباعت کو بہتر بنانے پر توجہ فرمائیں۔ کیوں کہ دُنیا میں ظاہربینوں کی کچھ کمی نہیں، شاید بیشی ہوگئی ہی۔ رسالے کی ضخامت ۷۰ صفحے اور بیرونی خریداروں سے قیمت (علاوہ محصول ڈاک) کے ۸؍ کافی ارزاں ہی۔ کالج کے پتے سے دست یاب ہوسکے گا۔

گُل دستہ گزشتہ سال جنوری میں حکّام بجنور نے ہفتۂ جنگ کے ساتھ ایک کُل ہند مشاعرہ بھی منعقد کیا جو بہت کام یاب رہا۔ مقامی شعرا کے علاوہ باہر کے متعدد مشہور سخن وروں نے شرکت کی۔ جگر، سیماب، حفیظ جالندھری، احسان بن دانش، جاں نثار اختر، نخشب، شعری وغیرہم بہت سے مختلف رنگ میں اور اچھا کہنے والے جمع تھے۔ طرح، بےطرح، غزلیں نظمیں رباعیات سُنائی گئیں اور زیر نظر روداد سے اندازہ ہوتا ہی کہ نہایت پُرلطف صحبت رہی۔ دوسری صبح کو ادبی موضوعات پر مقالے پڑھے گئے، تقریریں ہوئیں۔ مشاعرے کے میر سرسیّد رضا علی صاحب تھے اور ادبی مجلس کی صدارت رائے بہادر سکسینا صاحب نے کی۔ اس یادگار اجتماع میں جو غزلیں اور مضامین وغیرہ سُنائے گئے، ان کو خواجہ زکریا صاحب فیاضی وکیل بجنور نے مندرجہ بالا عنوان سے چھاپا اور اہلِ ذوق کی ضیافتِ طبع کا اچھّا خاصا سامان مہیّا کردیا ہی۔ سرسری انتخاب میں غزلوں کے بعض اشعار جو ہمیں پسند آئے، جی چاہتا ہی کہ ناظرین کو بھی سُنادیے جائیں ؎

کوئی کس طرح رازِ اُلفت چھپائے		نگاہیں ملیں اور قدم ڈگمگائے
ترے رُو بہ رُو گر نظر مطمئن ہو		تو سینے میں دِل بھی دھڑکنے نہ پائے
ترا غم بھلا کیا چھُپائے سے چھُپتا		بہت اشک روکے بہت مسکرائے

(از نخشب جارچوی)

سرورِ بےخودیٔ کام یاب لایا ہوں		تری نظر سے چُراکر شراب لایا ہوں
متاعِ دردوغمِ اضطراب لایا ہوں		تجلّیوں کا مکمّل جواب لایا ہوں

(شعری بھوپالی)

بجھے جو دِل تو حقیقت کی لَو نکلتی ہی		یہ شمع گُل ہو تو عرشِ بریں پہ جلتی ہی

(انوپ شرما ہیڈ ماسٹر دھام پور)

جگرؔ صاحب نے اپنے نفیس رنگ میں کئی غزلیں پڑھیں۔ مشاعرے کا خاتمہ انھی کی ایک غزل پر ہوا جس کا عنوان "منزلِ آخر" درج ہے۔ اس کے چند منتخب شعر نقل کرنے کے لائق ہیں ؎

شبِ فراق ہے اور نیند آئی جاتی ہے — کچھ اس میں اُن کی توجہ سی پائی جاتی ہے
بنا بنا کے جو دُنیا مٹائی جاتی ہے — ضرور کوئی کمی ہے کہ پائی جاتی ہے
وہ چیز کہتے ہیں فردوسِ گُم شدہ جس کو — کبھی کبھی تری آنکھوں میں پائی جاتی ہے

قریب منزلِ آخر ہے الفراق، جگرؔ
سفر تمام ہوا نیند آئی جاتی ہے

مقالاتِ نثر میں ضیاء احمد صاحب استاد جامعۂ اسلامیہ علی گڑھ کا مضمون اقبال کی تلمیحات پر بہت دل چسپ اور اس قابل ہے کہ تکمیل پاکر کتابی صورت میں محفوظ کیا جائے۔ سلطان زماں صاحب (تحصیل دار نجیب آباد) نے غزل گوئی میں اصولی تجدید کی ضرورت پر زور دیا اور اپنی تجویز یہ پیش کی کہ ہندی شاعری کے اسلوب کو جس میں عورت کی طرف سے اظہارِ عشق کیا جاتا ہے، اختیار کرلیا جائے۔ یعنی مناسب ترمیم وتہذیب کے ساتھ وہ صِنف رائج کی جائے جسے ریختی کے نام سے رنگین وانشا وغیرہ نے ایجاد کیا تھا۔ زماں صاحب کی تبلیغ کا "زنانہ پن" مذاقِ زمانہ سے تو ہم کنار ہے لیکن مرد شاعر اس پر عمل کرنے میں شاید لجیائیں گے۔

آخری مقالہ مشاعرے کے صاحبِ ذوق وسرگرم سکریٹری سید حامد صاحب ڈپٹی کلکٹر نے آتش پر پڑھا اور اس لکھنوی شاعر کی افسردہ یاد کو دوبارہ بھڑکانے کی کوشش کی۔ حامد صاحب کی محنت وکاوش قابلِ داد ہے لیکن راکھ پھونکنے سے ... نہیں سُلگتی۔ ایسی غزل گوئی ... جذبات کی گرمی ہو نہ فکر کی گہرائی، نئے تعلیم یافتہ طبقے میں مشکل سے مقبول ہوگی۔ مگر حامد صاحب نے ... کہ جوشِ آتش پرستی میں یہاں تک لکھ گئے کہ غالبؔ پر آتشؔ کا کافی اثر پڑا تھا۔ ہمیں خوف ہے کہ ادبی دُنیا میں یہ باتیں کلمۂ کفر سمجھی جائیں گی۔ خود مرزا کی رُوح کے آگ لگ گئی ہوگی۔

(س)

خلاصہ رپورٹ ۱۹۴۴ء

انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی کی سالانہ رپورٹ بابت ۱۹۴۴ء جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انجمن کے کاروبار کے ہر شعبے میں ترقی ہوئی۔ خاص خاص اُمور یہ ہیں کہ اس سال کُل ہند اُردو کانفرنس ناگ پور اور صوبائی اُردو کانفرنس کراچی کا کام یابی کے ساتھ انعقاد ہوا۔

اُردو کے معیاری امتحانات جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور اس کے قواعد و ضوابط شائع کیے گئے اور ایک ماہ وار رسالہ 'معاشیات' شائع کرنا تجویز ہوا جس کے لیے حکومتِ ہند سے اجازت اب حاصل ہوگئی ہے اور اجرا کے انتظامات شروع ہو گئے ہیں۔ مزید سرگرمیوں کا خلاصہ یہ ہے:-

سفرا۔ انجمن کے مقاصد کی تبلیغ و اشاعت اور کاروبار کی توسیع کے لیے پہلے صرف ایک سفیر خیر بھوردی صاحب تھے ۱۹۴۴ء میں ایک مزید سفیر محمد ابراہیم صاحب فنا کا اضافہ کیا گیا۔ دونوں سفرا کام یابی سے کام کر رہے ہیں۔

مطبوعات۔ کاغذ کی گرانی اور کنٹرول کی پابندیوں کے باوجود انجمن نے اس سال دس علمی و ادبی کتابیں شائع کیں یعنی (۱) 'آدمی اور مشین'، امریکی مصنف اسٹوارٹ چیز کی شہرۂ آفاق کتاب 'مین اینڈ مشین' کا ترجمہ حجم ۴۹۲ صفحات قیمت مجلد ے، بلا جلد صہ، (۲) '۱۹۴۱ء کی مردم شماری پر تبصرہ' مولفہ چودھری رحم الہاشمی جس میں مردم شماری ۱۹۴۱ء کے ضروری اعداد و شمار اور ان پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ حجم ۱۲۲ صفحات قیمت مجلد عہ، بلا جلد عہ، (۳) 'بچے کی صحت اور نگہداشت' ایک نہایت ہی ضروری مبحث پر ڈاکٹر محمد عثمان صاحب کی نادر تالیف حجم ۱۶۸ صفحات قیمت مجلد عا، بلا جلد عہ، (۴) خطباتِ عبدالحق حصہ دوم معتمد اعزازی انجمن ہذا کے بعض مفید خطبات اور تقریروں کا مجموعہ۔ پہلا حصہ اس کا بہت مقبول ہوا تھا۔ اس دوسرے حصے میں ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۴ء تک کے خطبات ہیں حجم ۱۵۸ صفحات قیمت مجلد عا، بلا جلد عہ، (۵) 'اصلی خالق باری'، ایک قدیم مستند نسخے سے پروفیسر علامہ شیرانی نے نہایت تحقیق سے مرتب کیا اور ایک فاضلانہ خطبہ لکھ کر اس عام خیال کی تردید کی ہے کہ یہ امیر خسرو رحمۃ اللہ کی تصنیف ہے۔ حجم ۱۰۰ صفحات قیمت مجلد عہ، بلا جلد عہ، (۶) 'شوکتِ اعظم' ڈاکٹر ایم حفیظ سید کی محققانہ تالیف حجم ۱۳۲ صفحات قیمت مجلد عا، بلا جلد عہ، (۷) الف لیلہ و لیلہ حصہ پنجم۔ اصل عربی سے ترجمہ جس کے چار حصے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ پانچواں حصہ اس سال شائع ہوا اور چھٹا ... حصہ ۱۹۴۵ء میں شائع ہوگا۔ حجم حصہ پنجم ۴۰۷ صفحات قیمت مجلد صہ، بلا جلد للعہ، (۸) 'تاریخ مگدھ' علاقۂ بہار کی مفصل تاریخ جس میں ابتدا سے اس وقت تک کے حالات جمع کیے گئے ہیں۔ مصنفہ فصیح الدین صاحب بلخی حجم ۴۸۰ صفحات قیمت مجلد صہ، بلا جلد للعہ، (۹) 'مختصر تاریخ تمدن' ایس ای ہینڈ کی مشہور کتاب کا ترجمہ حجم ۲۵۸ صفحات قیمت مجلد ہے، بلا جلد عا، (۱۰) 'اصطلاحاتِ پیشہ وراں' جلد ہشتم۔ یہ انجمن کے ایک نہایت ہی مفید سلسلے کی آٹھویں کڑی ہے جس میں پیشہ وروں کی خاص مصطلحات کو محفوظ کیا گیا ہے۔ حجم جلد ہشتم

۵۰۲ صفحات قیمت مجلّد ہے بلا جلد ہا۔ کُل ضخامت سال زیرِ رپوٹ کی مطبوعات کی ۴۲۶۱ صفحات ہوتی ہی اور ان کے علاوہ پانچ کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع کیے گئے جن کی مجموعی ضخامت ۱۲۷۸ صفحات ہوتی ہی۔ انجمن کے تبلیغی لٹریچر کی اشاعت اور رپوٹ کُل ہند اُردو کانفرنس ناگ پور دکتابچہ متعلق تحریک اُردو یونی ورسٹی انگریزی و اُردو زبان میں اس کے علاوہ ہی۔

سالِ آیندہ یعنی ۱۹۴۵ء کے پروگرام میں بھی دس کتابیں رکھی گئی ہیں، یعنی (۱) کلیات وَلی کا مستند اڈیشن (۲) گورکی کی آپ بیتی، حصہ سوم (۳) ’داستانِ ریاضی‘ (۴) ’محاضراتِ اغانی‘، (۵) ’انتخاب ذوق و ظفر (۶) الف لیلہ ولیلہ جلد ششم (۷) ’مشاہیرِ یونان و رومہ‘ جلد سوم (۸) ’تاریخ الحکما‘ (۹) ’رندِ پارسا‘ اور (۱۰) ’جدید معلوماتِ سائنس‘ جلد اوّل۔

رسالے انجمن کے رسالے سہ ماہی ”اُردو“، ماہ وار ”سائنس“ اور پندرہ روزہ ”ہماری زبان“ کام یابی سے چل رہے ہیں اور سال زیرِ رپوٹ میں ہر پہلو سے ان میں ترقی ہوئی۔ ایک اور رسالہ ماہ وار ”معاشیات“ کا عنقریب انجمن کی موقت الشیوع مطبوعات میں اضافہ ہونے والا ہی۔

سندھ اُردو مرکز۔ سب سے اہم اقدام سال زیرِ نظر میں سندھ اُردو مرکز کا قیام ہی جس کی وجہ سے چند ہی ماہ میں اُردو کی تحریک صوبہ سندھ میں زور پکڑ گئی اور حکومتِ سندھ کے تعاون سے مدارس میں اُردو کی تعلیم کا رواج ہوا بلکہ ابتدائی اور مڈل کلاسوں میں اُردو زبان لازمی قرار دے دی گئی جس کے لیے وزیرِ تعلیم صاحب حکومت سندھ و ڈائرکٹر تعلیمات صوبہ سندھ کی ہم دردی اور اعانت مستحقِ صد شکریہ ہی۔

چھوٹا ناگ پور اُردو مرکز رانچی بھی کام یابی کے ساتھ کام کرتا رہا اور مالیے کی کمی کے باوجود اس مرکز میں اچھا کام ہوا

انجمن ترقی اُردو پنجاب اہلِ پنجاب کی اُردو زبان سے مناسبت کے پیشِ نظر انجمن نے صوبہ پنجاب کے لیے ایک صوبائی شاخ کے قیام کی تدابیر اختیار کیں اور اس صوبائی شاخ کا باقاعدہ قیام عمل میں آگیا۔ صوبہ سرحد اور صوبہ بمبئی میں بھی صوبائی شاخوں کے قیام کی تدابیر عمل میں لائی گئیں۔

انجمن کی عمارت کے لیے زمین انجمن کی عمارت کے لیے حصول اراضی کی جو کوششیں کئی سال سے ہو رہی تھیں وہ اس سال روبہ راہ ہوئیں اور حکومت نے ایک نہایت ہی موزوں قطعۂ اراضی نئی دہلی میں مناسب شرائط کے ساتھ انجمن کو دے دیا ہی جس کا نذرانہ وغیرہ ادا کر دیا گیا ہی اور زمین پر قبضہ اختتامِ جنگ پر مل جائے گا۔ اب عمارت کی تعمیر کے لیے چندے میں خاص کوشش ہونی چاہیے۔

اُردو کالج دہلی میں پنجاب کے اُردو امتحانات کے لیے طلبہ کی تیاری کا کام سرگرمی سے جاری رہا اور اس کالج کے طلبہ کی کام یابی سارے صوبے میں نمایاں رہی۔ انجمن کی مختلف شاخوں میں بھی سرگرمی کے ساتھ کام ہوتا رہا۔ معتمدِ اعزازی کے دورے بھی وقتاً فوقتاً مختلف حصص ملک میں ہوتے رہے جن کا تبلیغی اثر بہت ہی عمدہ ہوا۔

مالیہ۔ سال زیرِ نظر میں انجمن کی مجموعی آمدنی ۹۸۰۶۷ رُپے ۱۱ آنے ۹ پائی اور خرج ۹۵۴۹۱ رُپے ۱۰ آنے ۱ پائی ہوا اور بچت ۲۵۷۶ ... ۱۴۳۰۷ رُپے ۱ آنہ ۸ پائی۔ تفصیلی اعداد اور دیگر معلومات کے لیے ’رپوٹ ۱۹۴۴ء‘ ملاحظہ فرمائیں۔

فہرستِ مطبوعاتِ انجمن

ادب (نثر)

۱، ۲۔ رُوسی ادب (حصّۂ اوّل و دوم) پروفیسر محمد مجیب نے جو رُوسی زبان جانتے ہیں، بڑی محنت سے یہ کتاب بہت صاف اور شستہ زبان میں لکھی ہی۔ ہر ہندُستانی کے لیے اس کا مطالعہ لازم ہی۔ قیمت حصّۂ اوّل مجلّد دو رُپے آٹھ آنے بلا جِلد دو رُپے۔ حصّۂ دوم مجلّد دو رُپے آٹھ آنے بلا جِلد دو رُپے۔

۳۔ ہماری قومی زبان اُردوٗ زبان کے محسن اور بہی خواہ سرتیج بہادر سپرؤ کے ان مقالات کا مجموعہ، جو انھوں نے اُردوٗ زبان سے متعلق سپردِ قلم فرمائے ہیں۔ قیمت بلا جِلد آٹھ آنے۔

۴۔ انشائے داغ فصیح الملک داغ دہلوی کے خطوط کا یہ مجموعہ جناب احسن مارہروی مرحوم نے بڑی کاوش اور تلاش سے جمع کیا ہی۔ داغ اور احسن کی تصویریں بھی ہیں۔ قیمت مجلّد ایک رُپیہ بارہ آنے بلا جِلد ایک رُپیہ چھ آنے۔

۵۔ چند ہم عصر (جدید) بابائے اُردوٗ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے خاص اسلوب نگارش میں اپنے چند ممتاز معاصرین کی سیرتوں کا خاکہ کھینچا ہی۔ یہ دوٗسرا ایڈیشن اضافۂ مضامین کے ساتھ شائع کیا گیا ہی۔ قیمت مجلّد دو رُپے آٹھ آنے، بلا جِلد ایک رُپیہ آٹھ آنے۔

۶۔ دِلّی کی چند عجیب ہستیاں اشرف صبوحی صاحب دہلوی نے دہلی کے مغلیہ دوٗرِ آخر کے چند پُرلطف اشخاص کے حالات بہت دل کش پیرائے میں لکھے ہیں۔ یہ کتاب اُس زمانے کی معاشرت کا بہت دِل چسپ مرقع ہی۔ قیمت مجلّد تین رُپے آٹھ آنے (للعہ) بلا جِلد دو رُپے آٹھ آنے (عہ)

۷۔ سب رس یعنی قصۂ حسن و دل | یہ کتاب سلطان عبداللہ قلی قطب شاہ کے نامور شاعر اور ادیب مولانا وجہی کی تصنیف ہے، ۱۰۴۵ھ / ۱۶۳۶ء اس کا سنِ تصنیف ہے۔ اُردو نثر کی یہ نایاب اور سب سے قدیم کتاب بہت تلاش اور جستجو کے بعد خاص اہتمام اور صحت سے چھاپی گئی ہے۔ شروع میں بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کا محققانہ مقدمہ بھی شامل ہے۔ قیمت مجلّد چار رُپے بلا جلد تین رُپے آٹھ آنے۔

۸۔ داستان رانی کیتکی | یہ کہانی اُردو کے نامور شاعر و ادیب سید انشاء اللہ خاں انشا کی جدّتِ طبع کا نتیجہ ہے۔ اس میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ فارسی، عربی کا ایک لفظ بھی نہ آنے پائے۔ لطف یہ ہے کہ آج کل کی سی ہندی نہیں کہ لکھنے والا سمجھے اور نہ پڑھنے والا، قیمت صرف چار آنے۔

۹-۱۰۔ دخترِ فرعون (حصّۂ اوّل و دوم) | یہ کتاب ماہرِ علومِ مصریہ جارج مارس ایبرس مشہور جرمن مصنف کی معرکہ آرا تصنیف کا ترجمہ ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصر اور ایران کا طرزِ معاشرت اور تمدن کیا تھا قیمت حصّۂ اوّل بلا جلد دو رُپے۔ حصّۂ دوم بلا جلد دو رُپے۔

۱۱۔ فاوسٹ | جرمنی کے الہامی شاعر گوئٹے کے مشہور و مقبول ڈرامے (فاوسٹ) کا ترجمہ ہے جو ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی اچ ڈی (برلن) نے کیا ہے۔ قیمت مجلّد چار رُپے بلا جلد تین رُپے آٹھ آنے۔

۱۲۔ معمارِ اعظم | یورپ کے بلند پایہ ڈراما نگار ابسن کے ممتاز ڈرامے "ماسٹر بلڈر" کا ترجمہ ہے، جو پروفیسر عزیز احمد صاحب بی اے آنرز (لندن) نے ایسی خوبی سے کیا ہے کہ پڑھنے میں اصل کا لطف آتا ہے۔ قیمت مجلّد ایک رُپیہ چار آنے بلا جلد بارہ آنے۔

۱۳۔ پیاری زمین | امریکہ کی مشہور خاتون مسز پرل بک کے ناول "گڈ ارتھ" کا ترجمہ ہے، جو ڈاکٹر اختر حسین صاحب رائے پوری نے سلیس اُردو میں کیا ہے۔ اسی تصنیف پر مسز پرل بک کو نوبل پرائز ملا تھا۔ قیمت مجلّد دو رُپے بارہ آنے بلا جلد دو رُپے چھ آنے۔

۱۴۔ شکنتلا | ہندستان کے قدیم سنسکرت زبان کے شاعر و ادیب کالی داس کے مشہور ڈرامے کا

سلیس اُردو ترجمہ ہی جو بہ راہِ راست سنسکرت سے ڈاکٹر اختر حسین صاحب نے کیا ہی۔ زیرِ طبع۔

۱۵ تا ۱۹۔ الف لیلہ ولیلہ (اوّل تا پنجم) اس مشہورِ عالم عربی افسانے کے ترجمے مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ اُردو میں بھی اس کا وجود ہی، لیکن مسخ صورت میں، ڈاکٹر منصور احمد مرحوم (پروفیسر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ) نے بہ راہِ راست اصل عربی سے سلیس اور بامحاورہ اُردو میں نہایت اچھا ترجمہ کیا ہی۔

جلد اوّل مجلّد تین رُپے آٹھ آنے بلا جلد تین رُپے   جلد دوم مجلّد تین رُپے آٹھ آنے بلا جلد تین رُپے

" سوم " پانچ رُپے   " چار رُپے   " چہارم " پانچ رُپے   " چار رُپے

" پنجم " پانچ رُپے آٹھ آنے   " چار رُپے آٹھ آنے

۲۰، ۲۱۔ حکایاتِ رومی (جلد اوّل و دوم) مولانا رومی کی مثنوی شریف میں حکایات اور مطائبات کے پیرایے میں اخلاق و نفسیات کے باریک مسائل کو نہایت خوبی سے سمجھایا گیا ہی۔ انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) نے ان حکایتوں کے انتخاب کا بڑے اہتمام سے سلیس اور شگفتہ زبان میں ترجمہ کرایا ہی۔ زیرِ طبع۔

۲۲۔ حکایاتِ اغانی عربی ادب میں اس شہرۂ آفاق کتاب کی حیثیت مسلّم ہی انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) نے بہ راہِ راست عربی سے سلیس اُردو ترجمہ کرایا ہی۔ قیمت مجلّد پانچ رُپے بلا جلد چار رُپے۔

۲۳، ۲۴۔ (خلاصہ) جوامع الحکایات (حصّۂ اوّل و دوم) سید بدرالدین محمد عوفی کی تصنیف ہی، جو شمس الدین التمش (۶۰۷ھ و ۶۳۳ھ) کے عہد کے ممتاز فاضل تھے۔ انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) نے اس کے خلاصے کا سلیس اور بامحاورہ ترجمہ کرا کے شائع کیا ہی۔ یہ کتاب تاریخی واقعات و روایات کا معتبر ماخذ مانی جاتی ہی۔ قیمت مجلّد حصّۂ اوّل تین رُپے چار آنے بلا جلد دو رُپے چار آنے۔ حصّۂ دوم مجلّد چار رُپے بلا جلد تین رُپے۔

۲۵۔ اخوان الصفا یہ عربی کی مشہور کتاب کا ترجمہ ہی، جس میں حکایات و مقالات کے پیرایے میں بڑے بڑے علمی مسائل و معارف ادا کیے گئے ہیں۔ قیمت مجلّد بارہ آنے بلا جلد آٹھ آنے۔

۲۶۔ طربیۂ خداوندی اٹلی کے زندۂ جاوید شاعر ڈانٹے کی شہرۂ آفاق تصنیف "ڈی وائن کامیڈی" کا ترجمہ ہی جو پروفیسر عزیز احمد صاحب نے بڑی قابلیت سے کیا ہی۔ قیمت مجلّد چار رُپے بلا جلد تین رُپے۔

ادب (نظم)

۱۔ دیوانِ اثر — سید محمد اثر دہلوی خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی کا کلام سلاست اور فصاحت کا اعلا نمونہ ہے۔ یہ دیوان جو اب تک نایاب تھا، بڑی نعمت ہے۔ شروع میں بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کا محققانہ مقدمہ بھی ہے۔ قیمت مجلّد دو رُپے بلا جلد ایک رُپیہ آٹھ آنے۔

۲۔ دیوانِ تاباں — سید عبدالحی تاباں دہلوی کا یہ مجموعہ کلام زبان و بیان کے لحاظ سے اور لطافت و سلاست کے اعتبار سے بہت دل چسپ اور پڑھنے کے قابل ہے۔ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کا مقدمہ بھی شروع میں ہے۔ قیمت مجلّد دو رُپے چار آنے بلا جلد دو رُپے۔

۳۔ دیوانِ یقین — انعام اللہ خاں یقین کا یہ مجموعہ کلام مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے بڑے سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ قیمت مجلّد دو رُپے بلا جلد ایک رُپیہ آٹھ آنے۔

۴۔ دیوانِ نظیر اکبرآبادی — نظیر کا کلام جامعیت کے اعتبار سے آج بھی اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی نے بڑی تلاش اور کاوش سے انجمنِ ترقیِ اُردو (ہند) کے لیے ترتیب دیا ہے اور مبسوط مقدمہ بھی شامل کیا ہے۔ قیمت مجلّد تین رُپے بلا جلد دو رُپے آٹھ آنے۔

۵۔ دیوانِ جوشش — پٹنہ کے مشہور و قدیم شاعر و اُستاد حضرت جوشش کا یہ مجموعۂ کلام قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر ایٹ لا نے بڑی محنت سے مرتب کیا ہے۔ شروع میں فاضل مرتب کا محققانہ مقدمہ ہے۔ قیمت مجلّد ایک رُپیہ آٹھ آنے بلا جلد ایک رُپیہ دو آنے۔

۶۔ دیوانِ بہرام — زمانۂ حال کے ایک پارسی اہلِ علم دستور بہرام جی جاماسپ جی صاحب اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہیں۔ آپ کے کلام کا مطالعہ حامیانِ اُردو کے لیے باعثِ مسرت ہے۔ قیمت مجلّد دو رُپے چار آنے بلا جلد ایک رُپیہ چار آنے۔

۷۔ مثنوی قطب مشتری — یہ مثنوی ۱۰۱۸ھ کی یادگار ہے۔ سب رس کے مصنف مولانا وجہی کی تصنیف ہے۔ قدیم دکنی اُردو کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی

عبدالحق صاحب نے اسے مرتّب فرمایا ہے، شروع میں ڈاکٹر صاحب کا محققانہ مقدمہ اور آخر میں ضمیمہ اور فرہنگِ الفاظ ہے۔ قیمت مجلّد ایک رُپیہ بارہ آنے بلا جلد ایک رُپیہ آٹھ آنے۔

۸۔ جگ بیتی | یہ مثنوی اُردو زبان کے مشہور ادیب و شاعر علامہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی صاحب کی تصنیف ہے اور ایسا سلیس اندازِ بیان ہے کہ اضافت کہیں نہیں آئی۔ قیمت مجلّد چودہ آنے بلا جلد آٹھ آنے۔

۹۔ انتخابِ کلامِ میر | خدائے سخن میر محمد تقی میر کے کلام کا یہ بہترین انتخاب بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے کیا ہے، شروع میں ڈاکٹر صاحب موصوف کا مبسوط اور محققانہ مقدمہ ہے زیرِ طبع۔

۱۰۔ انتخابِ وحید | یہ حضرت وحید کے کلام کا انتخاب ہے حضرت وحید، مولانا اکبر الہ آبادی کے اُستاد تھے قیمت مجلّد ایک رُپیہ چار آنے بلا جلد ایک رُپیہ۔

۱۱۔ انتخابِ جدید | اُردو کے جدید شعرا کے کلام سے بہترین انتخاب کرکے یہ مجموعہ مرتب کیا گیا ہے۔ یہ اپنی طرز کا پہلا مجموعہ ہے۔ قیمت مجلّد تین رُپے آٹھ آنے بلا جلد دو رُپے آٹھ آنے۔

۱۲۔ سہ نظمِ ہاشمی | مولوی سیّد ہاشمی صاحب فرید آبادی کی تین بیش بہا نظموں کا مجموعہ ہے، ہاشمی صاحب کا کلام رنگینی اور دل آویزی میں انفرادیت کا مالک ہے۔ قیمت چار آنے۔

۱۳۔ بزمِ مشاعرہ | عالی جناب مہاراجا سر کشن پرشاد صاحب کی اورنگ آباد میں تشریف آوری کے موقع پر ایک پُرتکلف اور شاندار مشاعرہ بھی حضرت موصوف کی صدارت میں بمقام مقبرہ ہوا۔ یہ اسی مشاعرے کا گلدستہ ہے۔ جو نہایت خوش نما دو رنگوں میں طبع کیا گیا ہے۔ آخر میں وہ قصائد بھی ہیں جو اورنگ آباد کالج میں پڑھے گئے تھے قیمت آٹھ آنے۔

۱۴۔ جنگ نامہ عالم علی خاں | سیّدوں اور نظام الملک آصف جاہ کی جنگ کا حال ایک دکنی شاعر نے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ یہ نظم تاریخی حیثیت رکھتی ہے اور اس سے اس زمانے کی زبان کا بھی پتا لگتا ہے۔ قیمت چھ آنے۔

تاریخ ادب

۱۔ خطباتِ گارسان دتاسی

یہ اُردو کے شیدائی اور محسن گارسان دتاسی کے لیکچروں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے بہ حیثیت پروفیسر سنہ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۹ء تک پیرس کے السنۂ مشرقیہ کے کالج میں دیے۔ قیمت مجلّد پانچ رُپے، بلا جلد چار رُپے آٹھ آنے۔

۲و۳۔ مقالاتِ گارسان دتاسی (حصّۂ اوّل و دوم)

دتاسی نے خطبات کے بعد بھی اُردو زبان و ادب پر سالانہ تبصرے جاری رکھے اور انھی مقالات کا یہ مجموعہ ہے۔ قیمت حصّۂ اوّل مجلّد پانچ رُپے بلا جلد چار رُپے، حصّۂ دوم مجلّد پانچ رُپے بلا جلد چار رُپے۔

۴۔ اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام

تصنیف ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب، اس کتاب سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اُردو زبان کی اشاعت و ترویج میں صوفیائے کرام نے کیا کام کیا۔ قیمت بلا جلد آٹھ آنے۔

۵۔ تاریخ ادبیاتِ ایران در عہدِ جدید

یہ پروفیسر براؤن کی شہرۂ آفاق کتاب A LITERARY HISTORY OF PERSIA کی چوتھی جلد کا ترجمہ ہے جس میں سنہ ۱۵۰۰ء سے لے کر سنہ ۱۹۲۴ء تک ایران کی تاریخ ادبیات کا حال شرح و بسط کے ساتھ دیا گیا ہے، قیمت مجلّد ساڑھے چار رُپے بلا جلد چار رُپے۔

۶۔ ترکوں کی اسلامی خدمات اور ان کی زبان و ادبیات

ڈاکٹر جولیس جرمانس پروفیسر بڈاپسٹ یونی ورسٹی کے تین لیکچروں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے جامعۂ عثمانیہ میں دیے تھے۔ اس کتاب میں ترکی ادبیات کی تاریخ ترقی اور موجودہ عہد کے ادبی رجحانات کو بیان کیا گیا ہے۔ قیمت ایک رُپیہ آٹھ آنے۔

۷۔ مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر

یہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی محققانہ تصنیف ہے۔ فارسی زبان کے جو اثرات مرہٹی کے قواعد و اسالیب اور مختلف نوعیتوں کی تحریروں پر پڑے ہیں ان کو اس کتاب میں نہایت محنت اور قابلیت سے واضح کیا گیا ہے۔ قیمت بلا جلد آٹھ آنے۔

۸۔ ادبیاتِ فارسی میں ہندوؤں کا حصّہ | ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب ایم اے پی ایچ ڈی نے تلاش حالات و واقعات میں بڑی تحقیق و تجسّس سے کام لیا ہے۔ اس کتاب پر مصنف کو پنجاب گورمنٹ سے انعام بھی ملا ہے۔ قیمت مجلّد چار رُپے بلا جلد تین رُپے۔

تنقید

۱۔ چند تنقیداتِ عبدالحق | اُردو کے محسن اعظم ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے بعض دلچسپ و پُرمغز تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ قیمت صرف آٹھ آنے۔

۲۔ تنقیدِ شعرالعجم | پروفیسر حافظ محمود شیرانی صاحب سابق پروفیسر پنجاب یونی ورسٹی نے علامہ شبلی مرحوم کی مشہور تصنیف شعرالعجم پر مفصّل و مبسوط تنقید کی تھی جو رسالۂ "اُردو" میں سلسلے وار شائع ہوتی رہی۔ اب حافظ صاحب موصوف نے نظرِ ثانی و اضافے کے بعد اسے ایک کتاب کی صورت میں مکمل کر دیا ہے۔ قیمت مجلّد چھے رُپے بلا جلد پانچ رُپے۔

۳۔ فردوسی پر چار مقالے | پروفیسر حافظ محمود شیرانی صاحب نے فردوسی کے متعلق بہت عالمانہ اور تحقیقی مقالات لکھے ہیں۔ قیمت مجلّد تین رُپے آٹھ آنے بلا جلد دو رُپے آٹھ آنے۔

۴۔ پرتھی راج راسا اور چند بردائی | چند کا ہندی رزمیہ پرتھی راج کے کارناموں اور شہاب الدین غوری کے ساتھ اس کی جنگوں کا ایک طولانی جائزہ ہے جو خود پرتھی راج کے عہد کی تالیف مانا جاتا ہے۔ اُردو میں راسا کے مطالب بالکل نامعلوم تھے۔ پروفیسر شیرانی صاحب نے راسا کے مضامین کا خلاصہ پیش کر کے اس پر تنقید کی روشنی ڈالی ہے اور ثابت کیا ہے کہ اس تالیف کے متعلق قدامت کا دعوا بالکل بے بنیاد ہے۔ کتاب تین حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصّے میں راسا کی داستانوں کا خلاصہ دوسرے حصّے میں تنقید و تبصرہ اور تیسرے حصّے میں مغربی و مشرقی علما کی مخالف و موافق آرا مندرج ہیں۔

قیمت مجلّد ۲ روپے ۱۲ آنے بلا جلد ۲ روپے

۵۔ کیفیہ | علامہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے اس کتاب میں اردو ادب کے انما سے متعلق

اپنے زندگی بھر کے مطالعے کا نچوڑ پیش کردیا ہے۔ اُردو ادب و انشا سے متعلق یہ تصنیف بہت ہی پُر از معلومات، دل چسپ اور سبق آموز ہے۔ قیمت مجلّد چار رُپے بلا جلد تین رُپے۔

۶۔ خطباتِ عبدالحق ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی بعض پُرمغز اور یادگار تقریروں کا مجموعہ، تاریخِ ادبِ اُردو کے طلبہ کے لیے یہ خطبے نہایت مفید اور بصیرت افروز ہیں قیمت مجلّد حصّۂ اوّل ایک رُپیہ۔ بلا جلد دس آنے۔ حصّۂ دوم مجلّد دو رُپے آٹھ آنے بلا جلد ایک رُپیہ آٹھ آنے۔

۷۔ اقبال انجمن نے "اُردو" کا ایک خاص نمبر شائع کیا تھا جس میں ہماری زبان کے فاضل ادیبوں نے اقبال کی زندگی، شاعری اور فلسفے پر عالمانہ اور محققانہ مضامین لکھے، یہ انھی بے نظیر مضامین کا مجموعہ ہے۔ زیرِ طبع۔ دوسرا ...

۸۔ فنِ شاعری "بوطیقا" فنِ شاعری پر ارسطو کی تصنیف POETICS (بوطیقا) کا اُردو ترجمہ جناب عزیز احمد صاحب اُستاد جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے سلیس زبان میں کیا ہے۔ قیمت مجلّد ایک رُپیہ دس آنے بلا جلد ایک رُپیہ چار آنے۔

۹۔ مقالاتِ حالی (حصّۂ اوّل) مولانا حالی مرحوم کے ۳۲ مضامین کا مجموعہ جو مذہب، اخلاق، تعلیم، ادب، فلسفہ اور سیاسیات وغیرہ موضوعات پر مشتمل ہے۔ قیمت مجلّد چار رُپے بلا جلد تین رُپے

۱۰۔ مقالاتِ حالی (حصّۂ دوم) اس میں مولانا حالی مرحوم کی تمام تقریریں اور مشہور و نامور کتابوں پر تبصرے اور تقریظیں ہیں اُردو ادب کی بے مثل کتاب ہے۔ قیمت مجلّد عہ بلا جلد عہ

تذکرے

۱۔ نکات الشعرا میر تقی میر کا مشہور تذکرہ جس میں میر صاحب نے تنقید و تحقیق کا بھی حق ادا کیا ہے، قیمت مجلّد دو رُپے چار آنے بلا جلد ایک رُپیہ بارہ آنے۔

۲۔ تذکرۂ ریختہ گویاں مؤلفہ سید فتح علی حسینی گردیزی، مرتبۂ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب۔ اس میں ۶۸ ریختہ گو شاعروں کے حالات اور ان کے کلام کے نمونے ہیں، یہ تذکرہ دراصل

میر صاحب کے تذکرے "نکات الشعرا" کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ قیمت مجلد ایک رُپیہ چار آنے بلا جلد ۱۴ار

۳۔ **مخزن الشعرا** | مؤلفہ قاضی نورالدین فائق مع مقدمۂ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب۔ اس میں گجرات کے ایک سو گیارہ اُردو شاعروں کا تذکرہ ہے، اور ۱۲۶۸ھ میں لکھا گیا ہے۔ اس تذکرے سے اُردو زبان کی تاریخ میں ایک قیمتی اضافہ ہوا ہے۔ قیمت مجلد ایک رُپیہ چار آنے، بلا جلد چودہ آنے۔

۴۔ **تذکرۂ ہندی** | از مصحفی۔ قیمت مجلد دو رُپے، بلا جلد ایک رُپیہ دس آنے۔

۵۔ **ریاض الفصحا** | از مصحفی۔ قیمت مجلد دو رُپے آٹھ آنے بلا جلد دو رُپے۔

۶۔ **عقدِ ثریا** | از مصحفی۔ قیمت مجلد ایک رُپیہ دو آنے۔ بلا جلد بارہ آنے۔

اُردو زبان کے مشہور اُستاد اور ریختہ گو شاعر مصحفی نے یہ تین تذکرے لکھے تھے پہلے تذکرے میں تقریباً دو سو اُردو گو شعرا کے حالات ہیں اور دوسرے میں تقریباً سوا تین سو شاعروں کا ذکر ہے۔ تیسرے میں تقریباً ایک سو پچاس فارسی گو شعرا کے حالات ہیں۔ شروع میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کا فاضلانہ مقدمہ بھی ہے۔

۷۔ **گلزارِ ابراہیم** | یہ تین سو بیس اُردو گو شعرا کا تذکرہ ہے جو ۱۱۹۸ھ ۱۷۸۴ء کے قریب میں تحریر ہوا۔ مؤلفہ نواب علی ابراہیم خاں خلیل، مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، مع مقدمہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب۔ قیمت مجلد دو رُپے آٹھ آنے بلا جلد دو رُپے۔

۸۔ **چمنستانِ شعرا** | ایک قدیم و نایاب اُردو زبان کے شاعروں کا تذکرہ ہے۔ اس کے مؤلف دکن کے مشہور مورخ و تذکرہ نویس لالہ لچھمی نرائن صاحب شفیق ہیں۔ دُنیا میں اس کا ایک نسخہ تھا، قیمت مجلد پانچ رُپے آٹھ آنے بلا جلد چار رُپے بارہ آنے۔

۹۔ **تذکرہ شعرائے اُردو** | یعنی میر حسن مصنف مثنوی "بدرِ منیر" کا قابلِ قدر تذکرہ۔ یہ تذکرہ اس سے پہلے بھی انجمن کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ لیکن اب مختلف نسخوں سے مقابلہ کرکے خاص اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد ایک رُپیہ چودہ آنے بلا جلد ایک رُپیہ چھ آنے۔

۱۰۔ **مخزنِ نکات** | یہ اُردو شعرا کا نایاب تذکرہ مصنفہ شیخ محمد قیام الدین صاحب قائم چاند پوری ہے شروع

میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کا ایک مقدمہ ہے آخر میں قائم کے کلام کا انتخاب بھی دے دیا ہے۔قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے بلا جلد ایک روپیہ دو آنے۔

۱۱۔ ذکرِ میر — اُردو کے خدائے سخن حضرت میر کی یہ نادرہ روزگار سوانح عمری جو اُنھی کے پُرسوز و گداز قلم کی تراوش ہے شروع میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کا مقدمہ قابلِ دید ہے۔قیمت مجلد عگ بلا جلد عہ

۱۲۔ گلِ عجائب — یہ تذکرۂ شعرا اسد علی خاں اورنگ آبادی کی تصنیف ہے۔ زیادہ تر دکن کے اُردو شعرا کے حالات ہیں۔قیمت مجلد ایک روپیہ دس آنے بلا جلد ایک روپیہ دو آنے۔

تاریخ و سیاسیات

۱۔ تاریخِ ہند — مؤلفہ مولوی ذکاءاللہ صاحب فرید آبادی، قیمت ایک روپیہ نو آنے۔

۲۔ البیرونی — مصنفہ مولوی سید حسن صاحب برنی بی۔اے، اِس کتاب میں علّامہ ابوریحان بیرونی کے حالات ہیں اور اُن کی مشہور و معروف تصنیف کتاب الہند اور دیگر تصانیف پر تفصیل کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے، قیمت مجلد دو رُپے بلا جلد ایک رُپیہ آٹھ آنے۔

۳ و ۴۔ تاریخِ اخلاقِ یورپ (حصہ اوّل و دوم) — مترجمۂ مولوی عبدالماجد صاحب بی اے دریابادی، یہ کتاب کئی ہزار برس کے تمدن، اصول، اخلاق اور مذہب و خیالات کا مرقع ہے۔قیمت حصۂ اوّل مجلد تین رُپے بلا جلد دو رُپے آٹھ آنے حصۂ دوم مجلد دو رُپے آٹھ آنے بلا جلد دو رُپے۔

۵۔ تاریخِ دستورِ حکومتِ ہند — مؤلفۂ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب پروفیسر جامعۂ عثمانیہ۔ اس میں ابتدائے تسلطِ برطانیہ سے اب تک کے دستور و آئینِ حکومت پر مفصل بحث کی گئی ہے۔قیمت مجلد تین رُپے چار آنے بلا جلد دو رُپے چار آنے

۶۔ حقیقتِ جاپان — شیخ محمد بدرالاسلام صاحب فضلی بی۔اے۔بی۔ٹی (علیگ) نے جو ٹوکیو یونی ورسٹی

میں ایک مدّت تک اُردو کے پروفیسر رہے ہیں، جاپان کے حالات پر ایک قابلِ قدر کتاب لکھی ہے۔ کتاب میں تیس سے زیادہ ہاف ٹون بلاک تصاویر ہیں۔ قیمت ہر دو حصے مکمل مجلد تین روپے آٹھ آنے بلا جلد تین روپے۔

۷ و ۸۔ تاریخِ تمدّن حصہ اوّل و دوم — سر تامس بکل کی مشہور آفاق کتاب کا ترجمہ ہے۔ قیمت حصۂ اوّل مجلد دو روپے بلا جلد ایک روپیہ آٹھ آنے۔ حصہ دوم مجلد دو روپے بلا جلد ایک روپیہ آٹھ آنے۔

۹۔ مختصر تاریخِ تمدّن — ایس ہالینڈ ایم۔ اے (کیمبرج) کی مشہور کتاب کا ترجمہ ہے اس میں انسانی تمدّن کی تاریخ اختصار و جامعیت کے ساتھ بیان کی گئی ہے قیمت مجلد ۱۲؍ بلا جلد ۸؍۔

۱۰۔ رہ نمایانِ ہند — مرتبہ بابو نرائن پرشاد ورما مہر و مسٹر من متھ دت ایم اے کی مشہور و معروف کتاب " PROPHETS OF INDIA " کا ترجمہ ہے۔ کتاب کے آخر حصے میں شنکر اچاریہ، رامانج اور رامانند وغیرہ کے حالات درج ہیں۔ قیمت مجلد دو روپے، بلا جلد ایک روپیہ آٹھ آنے۔

۱۱۔ اُمراے ہنود — مرتبہ مولوی محمد سعید احمد صاحب مارہروی۔ اس میں پانچ سو سے زیادہ اُن ہندو امرا کے حالات درج ہیں جو شاہانِ مغلیہ کے زمانے میں بڑے مناصب اور عہدوں پر ممتاز و سرفراز تھے۔ قیمت مجلد تین روپے آٹھ آنے بلا جلد تین روپے

۱۲۔ بزمِ اکبر — اکبر الہ آبادی کے سوانح حیات اور کلام پر تنقید۔ از مولوی قمر الدّین صاحب بدایونی "بزمِ اکبر" کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں اکبر کے مشہور اشعار کی تشریح اور محل بھی بتایا گیا ہے۔
قیمت مجلد دو روپے بارہ آنے بلا جلد ایک روپیہ بارہ آنے

۱۳۔ ملِک محمد جائسی — پدماوت کے مشہور مصنف کے حالاتِ زندگی کا مفصّل تذکرہ ہے اور اُن کے کلام پر مؤرخانہ اور ناقدانہ بحث کی گئی ہے قیمت مجلد دو روپے بلا جلد ایک روپیہ دس آنے۔

۱۴۔ حیاتِ جاوید — مولانا حالی مرحوم نے اپنی اس قابلِ قدر تصنیف میں سر سیّد احمد خاں مرحوم کے حالات نہایت شرح و بسط سے لکھے ہیں۔ قیمت مجلد پانچ روپے چھ آنے بلا جلد پانچ روپے

۱۵۔ ۱۶۔ گورکی کی آپ بیتی حصہ اوّل و دوم — مترجمہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری روس کے نامور مصنف

بیگم گورکی نے اپنی سرگزشت اپنے الفاظ میں پیش کی ہو۔ یہ کتاب اس کی خود نوشت سوانح کا ترجمہ ہو۔ قیمت حصّۂ اوّل مجلّد دو رُپے آٹھ آنے بلا جلد دو رُپے، حصّۂ دوم مجلّد تین رُپے چھ آنے بلا جلد تین رُپے۔

۱۷۔ نصرتی | گیارھویں صدی ہجری کے نامور اور باکمال شاعر مُلّا نصرتی ملک الشعراے بیجاپور کے حالات اور کلام پر تبصرہ، تالیفِ لطیف ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب۔ اس کی رنگین اور چند سادہ تصاویر سے کتاب کی زینت دوبالا ہوگئی ہو۔ قیمت مجلّد تین رُپے چار آنے بلا جلد تین رُپے۔

۱۸۔ رندِ پارسا | حضرتِ ریاض مرحوم (خیرآبادی) کی مفصّل سوانح حیات اور شاعری پر ایک جامع تبصرہ بقلم رئیس احمد صاحب جعفری (مدیر روزنامۂ "ہندستان"، بمبئی)۔ فاضل مصنّف ریاض مرحوم کے عزیز اور دیرینہ عقیدت مند ہیں۔ زیرِ طبع۔

۱۹۔ سودا | یہ کتاب شیخ چاند مرحوم ایم۔ اے ریسرچ اسکالر عثمانیہ یونی ورسٹی نے نہایت تحقیق اور محنت سے لکھی ہو۔ سودا کے کلام اور حالات کے متعلق اس سے بہتر اور محققانہ کوئی کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی۔ قیمت مجلّد تین رُپے بلا جلد دو رُپے آٹھ آنے۔

۲۰۔ اندرونِ ہند | نامور ترکی خاتون خالدہ ادیب خانم کی جدید تصنیف "INSIDE INDIA" کا ترجمہ جو مولوی سید ہاشمی صاحب نے نہایت فصیح اور سلیس زبان میں کیا ہو، بہت دل چسپ کتاب ہو۔ قیمت مجلّد تین رُپے چار آنے بلا جلد تین رُپے۔

۲۱۔ تاریخِ مگدھ | ملک بہار کی مفصّل تاریخ جسے بہت سے مستند ماخذوں سے مولوی فصیح الدین صاحب نے مرتب کیا ہو اور ابتدا سے لے کر زمانۂ حاضرہ تک کے واقعات جمع کر دیے ہیں۔ قیمت مجلّد صہ؍ بلا جلد للعہ؍

۲۲ تا ۲۴۔ مشاہیرِ یونان و روما (حصّۂ اوّل، دوم و سوم) | وطن پرستی اور بے نفسی، عزم و جواں مردی کی مثالوں سے اس کا ہر صفحہ معمور ہو۔ قیمت حصّۂ اوّل بلا جلد تین رُپے حصّۂ دوم بلا جلد دو رُپے آٹھ آنے طبعِ ثانی حصّۂ اوّل مجلّد چار رُپے آٹھ آنے بلا جلد تین رُپے آٹھ آنے، حصّۂ دوم مجلّد پانچ رُپے آٹھ آنے بلا جلد چار رُپے آٹھ آنے۔ جلد سوم پانچ رُپے آٹھ آنے بلا جلد للعہ؍

۲۵۔ تاریخ ملل قدیمہ | ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے، اس میں بعض قدیم اقوام، سلطنت کلدانی، آشوری، بابل بنی اسرائیل و فنیقیہ کی معاشرت، عقائد اور صنعت و حرفت وغیرہ کے حالات دلچسپی اور خوبی کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، قیمت مجلد ایک رپیہ بارہ آنے۔

۲۶۔ ریاست | تصنیف حکیم افلاطون۔ یہ اس حکیم اعظم کی سب سے بڑی اور قابل قدر تصنیف ہے۔ جو اس کے تمام فلسفے اور عمر بھر کے غور و فکر کا نچوڑ ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے بڑی خوبی سے ترجمہ کیا ہے، قیمت مجلد پانچ رپے بلا جلد چار رپے آٹھ آنے۔

۲۷۔ مرحوم دہلی کالج | مؤلفہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب، اس میں دہلی کالج کی تاریخ، نصاب تعلیم، تدریجی ترقی، اور اس کے اساتذہ اور ممتاز طلبہ کے حالات درج ہیں۔ زیر طبع۔ دوسرا ایڈیشن

۲۸۔ اخبار مجموعہ | یہ اندلس کے اسلامی عہد کی بہت قدیم تاریخ ہے۔ اصل عربی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد تین رپے آٹھ آنے بلا جلد دو رپے آٹھ آنے۔

۲۹۔ ایران بہ عہد ساسانیاں | یہ بے نظیر کتاب پروفیسر آرتھر کرسٹن سین پروفیسر السنۂ شرقیہ جامعہ کوپن ہاگن ڈنمارک کی تصنیف ہے۔ ساسانیوں کی تاریخ پر اس سے بہتر اور جامع کتاب آج تک کسی زبان میں نہیں لکھی گئی۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال نے اصل فرانسیسی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ قیمت مجلد دس رپے آٹھ آنے۔ بلا جلد دس رپے۔

۳۰۔۳۱۔ علم الاقوام حصۂ اول و دوم | انجمن ترقی اردو (ہند) کی فرمایش پر ڈاکٹر بیرن عمر ایہرن فیلس نے اس کتاب کا مسودہ انگریزی زبان میں تیار کیا جس کو ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے اردو کا جامہ پہنایا۔ قیمت حصۂ اول مجلد دو رپے دس آنے بلا جلد دو رپے چار آنے حصۂ دوم مجلد دو رپے بلا جلد عہ

۳۲۔ تاریخ سلاطین بہمنیہ (منظوم) | یہ کتاب تاریخ دکن امجدیہ کے چوتھے باب کا اردو نظم میں ترجمہ ہے، جسے ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے تصحیح کے بعد مرتب کیا، قیمت مجلد ایک رپیہ چھ آنے (عہ) بلا جلد ایک رپیہ (عہ)

۳۳۔۳۴۔ کتاب الہند (البیرونی) حصۂ اول و دوم | البیرونی کی اس معرکہ آرا تصنیف کے ترجمے کی کئی بار

مختلف اداروں نے کوشش کی لیکن تنوعِ علمی موضوعات اور دقیق مسائل کی بہتات کے سبب اس کی تکمیل سے قاصر رہے۔ سات سال کی محنت کے بعد متعدد ماہرینِ علم سے رجوع کر کے انجمن اس کتاب کا قابلِ اطمینان ترجمہ کرانے میں کامیاب ہوئی، قیمت حصۂ اول مجلّد تین رُپے آٹھ آنے بلا جلد تین رُپے حصۂ دوم مجلّد چار رُپے بلا جلد تین رُپے۔

۳۵۔ سفرنامۂ ناصر خسرو | مترجمہ مولانا عبدالرزاق صاحب "البرامکہ" کے نامور مصنف نے اس نادر کتاب کا ترجمہ اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے۔ قیمت مجلّد تین رُپے آٹھ آنے بلا جلد تین رُپے۔

۳۶۔ نسل اور سلطنت | (تاریخ اور سیاسیات میں نسل کا تصوّر) مؤلفۂ عزیز احمد صاحب بی۔ اے آنرز (لندن) لیکچرار انگریزی جامعۂ عثمانیہ قیمت مجلّد دو رُپے، بلا جلد ایک رُپیہ دس آنے۔

۳۷۔ اشوکِ اعظم | یہ کتاب ڈاکٹر محمد حفیظ سیّد ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، ایل ڈی نے بڑی تحقیق سے لکھی ہے اس میں صرف اشوک کے حالات ہی نہیں بلکہ نظمِ مملکت، مذہب، معاشرت اور اس وقت کی تہذیب و تمدّن کا بھی تذکرہ ہے۔ قیمت مجلّد دو رُپے آٹھ آنے بلا جلد ایک رُپیہ آٹھ آنے۔

۳۸۔ مانڈو | ریاست دھار کی اس جنّتِ گم گشتہ کے حالات جناب غلام یزدانی صاحب ناظم آثارِ قدیمہ حکومتِ آصفیہ نے بڑی ہی تحقیق اور محنت کے ساتھ انگریزی میں لکھے تھے۔ انجمن نے مصنف موصوف کی اجازت سے اُردو میں اس کا ترجمہ شائع کیا ہے۔ قیمت مجلّد تین رُپے بلا جلد دو رُپے

۳۹۔ بدھ اور اس کا مت | پروفیسر محمد حفیظ سیّد صاحب (الہ آباد یونیورسٹی) نے بدھ اور اس کے مت کے متعلق بہت ہی پُر از معلومات اور تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ قیمت مجلّد عہ بلا جلد عہ

فلسفہ

۱۔ فلسفۂ جذبات | مصنفہ مولانا عبدالماجد دریابادی۔ جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت قابلیت کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ قیمت مجلّد دو رُپے آٹھ آنے، بلا جلد دو رُپے۔

۲۔ یوں گفت زردشت | مترجمہ ڈاکٹر منصور احمد صاحب۔ جرمنی کے نامور فلسفی نٹشے نے اپنا فلسفہ زردشت کے نام سے بیان کیا ہے اور حقیقت میں یہ کتاب نٹشے کے تمام فلسفے اور تعلیم کا نچوڑ ہے قیمت مجلّد للعہ بلا جلد سے

۳۔ ہماری نفسیات | ای اے مین ڈر کی کتاب "PSYCHOLOGY FOR EVERY MAN AND WOMAN" کا ترجمہ ہے۔اس پر نفسیات کے مختلف پہلوؤں پر خوب دل چسپ بحث کی گئی ہے۔قیمت مجلّد ایک رُپیہ چار آنے (عہ) بلا جلد ایک رُپیہ (عہ)

۴۔ تنقیدِ عقلِ محض | ترجمۂ ڈاکٹر عابد حسین صاحب۔یورپ کے نامور فلاسفر کانٹ کی بلند پایہ تصنیف کا ترجمہ۔قیمت مجلّد چھ رُپے آٹھ آنے بلا جلد چھ رُپے۔

۵۔ مکالماتِ افلاطون | اس شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے کیا ہے۔ قیمت مجلّد پانچ رُپے بلا جلد چار رُپے۔

۶۔ داستانِ دانش | علم فلسفہ کی ابتدا، ترقی اور تاریخ کا مفصل اور محققانہ بیان ہے، فلسفے کے تمام نظریات اور مسلّمات تاریخی ترتیب کے ساتھ سلیس زبان میں پیش کیے گئے ہیں اور اُن پر ناقدانہ بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب ایم۔اے۔پی۔ایچ ڈی استاذ فلسفہ عثمانیہ یونی ورسٹی حیدرآباد دکن سے انجمن نے خاص طور پر یہ کتاب لکھوائی ہے۔قیمت مجلّد چار رُپے بلا جلد تین رُپے۔

صرف و نحو

۱۔ صرف و نحو اُردو | یہ کتاب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے عثمانیہ یونی ورسٹی کے طلباے میٹریکولیشن کے لیے لکھی ہے۔اس میں اُردو زبان کے تمام ضروری قواعد بہت جامعیت کے ساتھ سلیس زبان میں قلم بند کیے گئے ہیں۔قیمت ایک رُپیہ۔

۲۔ دریائے لطافت | یہ اُردو زبان کے نامور شاعر سید انشاءاللہ خاں انشا کی تالیف ہے جس میں اُردو صرف و نحو، منطق، عروض قافیہ اور معانی و بیان سے بحث کی گئی ہے۔قیمت مجلّد تین رُپے (سے) بلا جلد دو رُپے آٹھ آنے (عہ)

۳۔ قواعدِ اُردو | یہ کتاب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی تالیف ہے، زبانِ اُردو کے قواعد پر اب تک اس سے بہتر اور جامع کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔قیمت مجلّد دو رُپے آٹھ آنے بلا جلد دو رُپے۔

۴ و ۵ - اسباق النحو (حصۂ اوّل و دوم) ملک کے ادیب کامل مولانا حمید الدین صاحب بی۔ اے مرحوم کی تالیف ہے، اختصار کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک ضروری مسئلہ درج ہے۔ قیمت حصۂ اوّل بلا جلد ۶ر حصۂ دوم بلا جلد ۴ر

سائنس

۱- ارتقا مؤلفہ مولوی مشتاق احمد صاحب وجدی، اس میں مسئلۂ ارتقا پر سائنس اور فلسفہ دونوں اعتبار سے عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ قیمت مجلد ایک رُپیہ چھ آنے، بلا جلد ایک رُپیہ۔

۲- بجلی کے کرشمے یہ کتاب مولوی محمد معشوق حسین خاں صاحب بی۔ اے نے مختلف انگریزی کتابوں کے مطالعے کے بعد لکھی ہے۔ برقیات پر ابتدائی کتاب ہے اور سہل زبان میں لکھی گئی ہے طبع ثانی قیمت عہ

۳- القمر قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی حرارت کے بعد چاند کے متعلق جو جدید انکشافات ہوئے ہیں اُن سب کو جمع کر دیا ہے۔ قیمت مجلد ایک رُپیہ۔ بلا جلد دس آنے

۴- رسالہ علم نباتات اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے، علمی اصطلاحات سے معرّا۔ قیمت مجلد عہ، بلا جلد عہ

۵- حیات کیا ہے؟ اس میں حیات (جان) کی ابتدا اور اس کے ارتقا کو سلیس زبان میں بیان کیا گیا ہے، اور وضاحت کے لیے بہت سی رنگین و سادہ تصاویر اور اشکال دی گئی ہیں۔ قیمت مجلد ایک رُپیہ دس آنے (عہ) بلا جلد ایک رُپیہ چھ آنے (عہ)

۶- مکالمات سائنس سائنس کے نقطۂ نظر سے زندگی اور انسان کی تخلیق پر دلچسپ مکالمے ہیں جنھیں پروفیسر نصیر احمد صاحب عثمانی نے خاص سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ قیمت مجلد دو رُپے بلا جلد ایک رُپیہ آٹھ آنے

۷- اضافیت یہ کتاب ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی پروفیسر ریاضیات جامعۂ عثمانیہ کی تصنیف ہے، نظریۂ اضافیت کو عام فہم زبان میں بیان کیا ہے۔ قیمت مجلد ایک رُپیہ چار آنے (عہ) بلا جلد بارہ آنے (۱۲ر)

۸- ہماری غذا اُردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے، جس میں ان تمام اشیا کی جنھیں ہم بطور معمولی غذا کے استعمال کرتے ہیں، ان کی ماہیت، خاصیت اور افادیت بیان کی گئی ہے، یہ کتاب حکومتِ ہند کی فرمائش پر لکھی گئی ہے، آخر میں جدول کے ذریعے متفرق غذاؤں کے حیاتین اور دوسرے مفید اجزا کا تناسب بتایا

گیا ہی، قیمت مجلد ایک رُپیہ دس آنے (عہ۱۰) بلا جلد ایک رُپیہ چار آنے (عہ۴)

۹۔ حیوانی دُنیا کے عجائبات | مؤلفہ پروفیسر عبدالبصیر خاں صاحب، زمین پر پانی کے بے شمار چھوٹے بڑے جانوروں کی خصوصیات اور ان کے عادات و اطوار نہایت دل چسپ طریقے پر پیش کیے گئے ہیں۔ قیمت مجلد دو رُپے چھ آنے (عہ۶) بلا جلد دو رُپے (عہ)

۱۰۔ آدمی اور مشین | بین الاقوامی شہرت رکھنے والے امریکی مصنف اسٹورٹ چیز (STURAT CHASE) کی ممتاز و مقبول انگریزی تصنیف "مین اینڈ مشین" (MAN AND MACHINE) کا ترجمہ محمد عاقل صاحب اُستاد جامعۂ ملیّہ دہلی نے انجمن کے لیے کیا ہی۔ یہ اپنی نوعیت کی اُردو میں پہلی کتاب ہی، قیمت مجلد چھ رُپے (لعہ) بلا جلد پانچ رُپے (عہ)

۱۱۔ پودے اور ان کی زندگی | نباتات پر یہ انجمن کی دوسری کتاب ہی۔ اس میں پودوں کی دُنیا کے پُراسرار حالات درج ہیں۔ بہ کثرت تصاویر کتاب میں شامل ہیں۔ پروفیسر سعیدالدین صاحب (صدر شعبۂ نباتیات، جامعۂ عثمانیہ) نے خاص طور پر انجمن کے لیے لکھی ہی قیمت مجلد عہ۱۲ بلا جلد عہ۱۲

۱۲۔ بچے کی صحت اور نگہداشت | یہ کتاب انجمن کی مجلسِ سائنس، حیدرآباد نے خاص اہتمام سے ڈاکٹر محمد عثمان خاں صاحب سے تالیف کرائی ہی۔ قیمت مجلد عہ۱۲ بلا جلد عہ۱۲

۱۳۔ حیوانیات | اس سے پہلے اس موضوع پر انجمن کی طرف سے ایک کتاب "حیوانی دُنیا کے عجائبات" کے نام سے ۱۹۴۲ء میں شائع ہو چکی ہی اُردو میں اس نوع کی یہ پہلی کتاب ہی۔ قیمت مجلد تین رُپے چار آنے (سہ۴) بلا جلد دو رُپے چار آنے (عہ۴)

معاشیات

۱۔ ہمارے بینک | اس کتاب میں بینک کی ابتدا، معاشی و اقتصادی نظام میں اس کی اہمیت اس کے ارتقا کی تاریخ اور اس کے نظام کا مفصل تذکرہ ہی۔ قیمت مجلد عہ۱۲ بلا جلد عہ۱۲

۲۔ علم المعیشت | مصنفہ پروفیسر محمد الیاس صاحب ایم۔ اے معاشیات۔ یہ بڑی جامع کتاب ہے۔ قیمت مجلد پانچ رُپے آٹھ آنے بلا جلد پانچ رُپے۔

۳۔ ہمارے مزدور | مؤلفہ پروفیسر عبدالقادر صاحب۔ اس کتاب میں ہندستانی کارخانوں کے اہم معاشی مسئلوں سے بحث کی گئی ہے اور ان پر تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے۔ قیمت صرف نو آنے (۹ر)

۴۔ ہماری ریلیں اور سڑکیں | اس موضوع پر اُردو میں کوئی کتاب موجود نہ تھی، فاضل مصنف ڈاکٹر جعفر حسین صاحب نے سلیس اُردو اور عام فہم زبان میں ہمارے ملک کے وسائلِ حمل و نقل کے مفصل اور جامع حالات بیان کیے ہیں، اور اُن پر تنقیدی روشنی ڈالی ہے۔ قیمت مجلد عہر بلا جلد عہ

تعلیم

۱۔ جاپان اور اُس کا تعلیمی نظم و نسق | مصنفہ سر سید راس مسعود، کتاب کے ابتدائی حصے میں جاپان کی تاریخ اور اس کی ترقی کے اسباب پر نہایت دل چسپ اور فاضلانہ بحث کی ہے، اس کے بعد وہاں کا تعلیمی نظم و نسق تفصیل سے بیان کیا ہے۔ قیمت مجلد للعہ ر بلا جلد عگ۔

۲۔ فلسفۂ تعلیم | ہربرٹ اسپنسر کی مشہور اور مسئلۂ تعلیم کی نادر کتاب کا ترجمہ قیمت مجلد ... پر (عگ) بلا جلد عہر

۳ و ۴۔ نظریۂ تعلیم حصۂ اوّل و دوم | اصولِ تعلیم پر مشہور جرمن ماہر تعلیم جارج کرشین اشائی نر کی معرکہ آرا تصنیف کا ترجمہ ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب نے جو جرمن زبان کے ماہر ہیں، سلیس اُردو میں کیا ہے، قیمت حصۂ اوّل مجلد تین رُپے دو آنے بلا جلد دو رُپے بارہ آنے۔ حصۂ دوم مجلد چار رُپے بلا جلد تین رُپے۔

۵۔ تعلیمی نفسیات | اس کتاب میں بچوں کی نفسیات اور ان کے طریقۂ تعلیم پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ اُردو میں اس موضوع پر یہ پہلی جامع کتاب ہے حجم ۲۰۵ صفحات قیمت مجلد تین رُپے بلا جلد دو رُپے۔

مذہب

۱۔ القول الاظہر | امام مسکویہ کی معرکہ آرا تصنیف "فوز الاصغر" کا اُردو ترجمہ ہے، قیمت مجلد ۱۲ر بلا جلد ۸ر

۲۔ حقیقتِ اسلام | اس کتاب میں مصنف نے نہایت خوبی کے ساتھ موجودہ خیالات سائنس سے اسلام کی تطبیق اور اس کی صداقت کو بیان کیا ہے۔ قیمت بلا جلد بارہ آنے (۱۲ر)

۳۔ اسلامی تہذیب | یہ نامور مستشرق اور فاضل پروفیسر ڈی، وی بارٹولڈ کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اصل روسی زبان سے اس کا ترجمہ انگریزی میں پروفیسر شاہد سہروردی نے کیا اور انگریزی سے اب اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ حجم ۱۴۷ صفحات۔ قیمت مجلد دو رپے آٹھ آنے بلا جلد ایک رپیہ آٹھ آنے۔

لغات

۱۔ دی اسٹنڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری | جس قدر انگلش اردو ڈکشنریاں اب تک شائع ہوئی ہیں ان میں سب سے زیادہ جامع اور مکمل یہ ڈکشنری ہے، اس میں تخمیناً دو لاکھ انگریزی الفاظ اور محاورات کی تشریح کی گئی ہے، (۱) یہ بالکل جدید ترین لغت ہے، انگریزی زبان میں اب تک جو تازہ ترین اضافے ہوے ہیں، وہ تقریباً تمام کے تمام اس میں آگئے ہیں۔ (۲) ادبی، مقامی اور بول چال کے الفاظ کے علاوہ ان الفاظ کے معنی بھی شامل ہیں جن کا تعلق علوم و فنون کی اصطلاحات سے ہے، اسی طرح اُن قدیم اور متروک الفاظ کے معنی بھی درج ہیں جو ادبی تصانیف میں استعمال ہوے ہیں۔ (۳) ایسے الفاظ جن کے مختلف معنی ہیں، اور اُن کے نازک اختلافات کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا ان کی وضاحت مثالیں دے دے کر کی گئی ہے۔ طباعت کے لیے اردو انگریزی ہر دو خوب صورت ٹائپ استعمال کیے گئے ہیں، جلد بہت پائے دار اور خوش نما بنوائی گئی ہے، ڈمائی سائز، حجم ۱۵۴۶ صفحات، قیمت اٹھارہ رپے (عہ۱۸)

۲۔ اسٹوڈنٹس انگلش اردو ڈکشنری | یہ بڑی لغت کا اختصار ہے صرف متروک اور غریب الفاظ یا بعض ایسی اصطلاحات جن کا تعلق خاص فنون سے ہے اور ادب میں شاذ و نادر استعمال ہوتے ہیں خارج کردیے گئے ہیں، قیمت مجلد چھ رپے (ے،)

۳۔ وضع اصطلاحات | یہ کتاب ملک کے نامور انشاپرداز و عالم مولوی وحیدالدین سلیم مرحوم نے سال ہا سال کے غور و فکر اور مطالعے کے بعد تالیف کی ہے۔ اس میں وضعِ اصطلاحات

کے ہر پہلو پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور اس کے اصول قائم کیے گئے ہیں قیمت مجلد ۱۲ بلا جلد ۸

۴۔ **فرہنگ اصطلاحاتِ علمیہ** انجمن نے یہ فرہنگ آج سے کئی سال پہلے مرتب اور شائع کی تھی، لیکن دورِ جدید میں علم و فن کی روز افزوں ترقی اور مقبولیت کے باعث اس پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس ہوئی، چناں چہ ان تمام اصطلاحات پر نظرِ ثانی کی گئی ہے اور جا بہ جا مناسب اضافے اور ترمیمیں کرنے کے بعد اس کتاب کو مختلف حصّوں میں شائع کیا گیا ہے۔

پہلا حصّہ اصطلاحاتِ کیمیا کے نام سے ہے، دوسرے حصّے میں معاشیات تاریخ و سیاست اور عمرانیات کی اصطلاحیں دی گئی ہیں، تیسرا حصّہ طبعیات کی اصطلاحات پر مشتمل ہے، کوئی مدرسہ اور کوئی کتب خانہ اِن کتابوں سے خالی نہ رہنا چاہیے۔ ہر حصّے کی قیمت صرف ایک رُپیہ رکھی گئی ہے۔

۵ تا ۱۲:۔ **فرہنگِ اصطلاحاتِ پیشہ وراں** حصّہ اوّل۔ دوم۔ سوم۔ چہارم۔ پنجم۔ ششم۔ ہفتم۔ ہشتم) یہ بہت ہی قابلِ قدر کتاب ہے۔ جس کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ ہماری زبان میں کیسا کچھ خزانہ بھرا پڑا ہے جو ہماری غفلت سے ناکارہ اور زنگ آلود ہوگیا ہے۔ مولوی ظفر الرحمان صاحب نے سالہا سال کی محنت سے مرتب کی ہے، ہر ادیب کی میز پر اور ہر کتب خانے کی الماری میں رکھنے کے قابل ہے قیمت حصّہ اوّل تا پنجم فی حصّہ مجلد دو رُپے چار آنے بلا جلد ایک رپیہ بارہ آنے، حصّہ ششم مجلد تین رُپے آٹھ آنے بلا جلد دو رُپے آٹھ آنے۔ حصّہ ہفتم مجلد دو رُپے بارہ آنے بلا جلد ایک رُپیہ بارہ آنے۔ حصّہ ہشتم مجلد ہے بلا جلد عہ۔

معلوماتِ عامہ

۱۔ **جائزۂ زبانِ اُردو** سنہ ۱۹۳۵ء میں زبانِ اُردو کا جائزہ لینے کی تجویز کی گئی تھی۔ اس کے مطابق مسلسل چار سال تک کام ہوتا رہا۔ سرِ دست پہلا حصّہ شائع کیا گیا ہے۔ جس میں ریاست ہائے راج پوتانہ کے حالات درج ہیں جو نہایت عبرت انگیز ہیں۔ قیمت مجلد دو رُپے بلا جلد ایک رُپیہ آٹھ آنے

۲۔ **فنِ صحافت** اُردو زبان میں فنِ صحافت کے اصول و ضوابط اور اخبار کی تیاری کے مختلف مراحل کے متعلق کوئی کتاب موجود نہ تھی۔ جناب چودھری رحم علی الہاشمی صاحب بی اے نے جنھیں

اخبار نویسی کا پچیس سالہ تجربہ ہی اس فن پر پہلی کتاب تیار کی ہی جو انجمن کی طرف سے شائع کی گئی ہی قیمت مجلد تین رُپے چار آنے بلا جلد دو رُپے چار آنے

۳۔ مردم شماری سنہ ۱۹۴۱ء | گزشتہ مردم شماری کے اعداد وشمار پر ایک سیر حاصل اور پُر از معلومات تبصرہ۔ یہ کتاب ہر اخبار نویس اور سیاسی کام کرنے والے کو سامنے رکھنی چاہیے۔ قیمت مجلد دو رُپے چار آنے بلا جلد ایک رُپیہ چار آنے۔

۴۔ اصلی خالق باری | اس مشہور نظم کو حضرت امیر خسروؒ سے منسوب کیا جاتا رہا ہی لیکن پروفیسر محمود شیرانی کی عالمانہ تحقیقات میں یہ بہت بعد کی تصنیف ہی اس قیاس کو ایک قدیم نسخے نے حیرت انگیز طریق پر درست ثابت کر دیا ہی قیمت مجلد عہ بلا جلد عہ

قانون

۱۔ جنایات بر جایداد | اس کتاب میں اسلامی قانون اور بالخصوص امام اعظمؒ اور امام شافعیؒ کے قرارداده ضوابط اور انگریزی قانون کی مطابقت اور اختلاف کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہی۔ کوئی اسلامی مدرسہ اور کتب خانہ اس سے خالی نہ رہنا چاہیے۔ قیمت مجلّد دو رُپے آٹھ آنے بلا جلد دو رُپے۔

متفرق

۱۔ حبش و اطالیہ | اس میں حبش و اطالیہ کی آویزش اور حبش کے متعلق تمام ضروری معلومات نہایت محنت سے جمع کی گئی ہیں، قیمت ایک رُپیہ (عہ)

۲۔ تقویم ہجری وعیسوی | اس میں سنہ ۱ھ سے سنہ ۱۵۰۰ھ تک عیسوی سنوں سے مطابقت دکھائی گئی ہی۔ اس تقویم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہی کہ صحیح سن اور تاریخ کے علاوہ دن بھی آسانی سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ قیمت صرف ۸ر

۳۔ ہمارا رسم الخط | مصنفہٗ مولوی عبدالقدوس ہاشمی صاحب، اس میں رسم الخط پر علمی بحث کی گئی ہی اور بتایا گیا ہی کہ ہندستان کی مشترکہ تہذیب کے لیے اُردو رسم الخط ضروری ہی۔ قیمت دو آنے۔

۴۔ خطبۂ سر سپرو — یہ سر تیج بہادر سپرو کا وہ خطبہ ہے جو انھوں نے ۱۹۳۹ء میں جامعۂ عثمانیہ کے جلسۂ تقسیم اسناد میں پڑھا ہے۔ قیمت صرف ۱ر

۵۔ خمسۂ کیفی — یہ اُردو کے فاضل ادیب جناب پنڈت برج موہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی کے اُردو شہ پارے ہندو مسلمانوں کے کلچرل تعلقات، ترقی اُردو نظم، ہماری زبان، اُردو لسانیت وغیرہ ہیں قیمت ۴ر

۶۔ جاپانی بچوں کے گیت (حصۂ اوّل و حصۂ دوم) — پروفیسر نورالحسن صاحب برلاس نے بعض جاپانی گیتوں کا انتخاب کر کے انھیں اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اُردو زبان میں یہ بالکل نئی اور بچوں کے پڑھنے کے لائق چیز ہے۔ پہلے حصے میں چھوٹے بچوں کے گیت ہیں، دوسرے میں بڑے بچوں کے۔ ہر حصے کی قیمت ۴ر

۷۔ شہد کی مکھیوں کا کارنامہ — نواب مظفر جنگ بہادر نے مختلف کتابیں پڑھ کر اور خود مکھیوں کی پرورش کر کے یہ کتاب ٹھیٹ اور بامحاورہ اُردو میں لکھی ہے۔ تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ قیمت مجلّد دس آنے (۱۰ر) بلا جلد چھ آنے (۶ر)

۴۵ء کے پروگرام کی کتابیں

(زیر طبع)

۱۔ رند پارسا
۲۔ جدید معلومات سائنس
۳۔ تاریخ الحکما (قفطی)
۴۔ مشاہیر یونان و روما جلد سوم
۵۔ الف لیلہ و لیلہ جلد ششم
۶۔ انتخاب ذوق و ظفر
۷۔ کلیات ولی
۸۔ گورکی کی آپ بیتی (حصۂ سوم)
۹۔ داستان ریاضی
۱۰۔ محاضرات اغانی

جلد ۲۵ اکتوبر سنہ ۴۵ء نمبر ۴

اُردُو

انجمنِ ترقّیٔ اُردُو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر:- عبدُالحق

شائع کردہ
انجمنِ ترقّیٔ اُردُو (ہند) دہلی

اُردو

جلد ۲۵ — اکتوبر سنہ ۴۵ء — نمبر ۴

فہرستِ مضامین

سیّد اخلاق دہلوی نے جیّد پریس بَلّی ماراں دہلی میں چھپواکر
دفتر انجمنِ ترقّیٔ اُردوٗ (ہند) دہلی سے شائع کیا

انشا کے کچھ نئے حالات اور غیر مطبوعہ کلام

(جناب عبدالباری صاحب آسی لکھنوی)

اوائل ۱۹۴۵ء میں اتفاق سے مجھے کلیاتِ انشا کے بالاستیعاب دیکھنے کا اتفاق ہوا اور اس وقت کئی قلمی نسخے بھی جمع ہوگئے۔ جن کے دیکھنے سے پتا چلا کہ انشا کا بعض جزوِ کلام چھپنے سے باقی رہ گیا اور اس میں اس قسم کی ضروری چیزیں بھی ہیں جن کو ضرور چھپنا چاہیے تھا۔ بڑی کاوش اور محنت سے میں نے اُس کو جمع کیا اسی دوران میں مرزا فرحت بیگ صاحب کی ایک کتاب (انشا) بھی ایک کتب فروش کے یہاں دیکھی۔ اور اس اشتیاق میں کہ انشا کے سوانح حیات کے متعلق اس میں جدید تحقیقات سے کچھ اضافہ کیا ہوگا فوراً قیمت دے کر خرید لی۔ مگر کیا کہوں کتنی مایوسی ہوئی اُس وقت جب یہ معلوم ہوا کہ مرزا صاحب نے آزاد مرحوم کے بیان سے ایک قدم بھی باہر نہیں رکھا۔ اور پھر لطف یہ کہ تذکرۂ 'گلِ رعنا' سے مدد لے کر ساتھ ہی ساتھ آزاد کے بیان پر اعتراضات بھی کرتے گئے ہیں۔ بہرحال اس کتاب کے دیکھنے سے مجھے اتنا فائدہ ضرور پہنچ گیا کہ پہلے یہ ارادہ تھا کہ انشا کا غیر مطبوعہ کلام ہی "اردو" میں بھیج کر شائع کرا دیا جائے اور کچھ حالات نہ لکھے جائیں۔ اب اب یہ خیال ہوا کہ انشا کے بارے میں مولانا آزاد وغیرہ کی تحقیق کے ماورا جو اضافہ ہوا ہو اس کو بھی اسی میں شامل کر دیا جائے۔ اور یقین ہے کہ اس وقت تک یہ معلومات منظرِ عام پر نہیں آئی ہیں۔ اور شاید یہ پہلی سطر ہوگی جو 'آبِ حیات' کے راستے سے علاحدہ جا رہی ہے۔

انشا کے دادا کسی تذکرہ نویس نے یہ نہیں لکھا کہ انشا کے بزرگ نجفِ اشرف یا کشمیر سے آئے تو کب آئے؟ انشا کے بزرگوں ہی کو لیا جائے تو خود اِن کے والد پر بھی اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ مگر اب یہ ابہام باقی نہیں ہے بلکہ معلوم ہوگیا کہ انشا کے دادا شاہ نوراللہ ہندستان ہی میں پیدا ہوئے جو جعفری النسب تھے۔ یہ ایک تارک الدنیا بزرگ تھے، اور حصولِ دُنیا کے لیے سعی و کوشش کرنا اپنے آئین کے خلاف سمجھتے تھے۔ بہرحال تذکرۂ مخزن الغرائب[1] کی روایت یہ ہے تو از روے درایت یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ا... کہ

---

[1] تذکرۂ مخزن الغرائب شیخ احمد علی، جو اب تک غیر مطبوعہ ہے اور کتب خانۂ رام پور میں ہے --- دیکھا گیا ہے

تک ہندستان میں رہے ہوں گے اور عجب نہیں ہو کہ اِن کے دادا کی ہندستان ہی کے کسی خاندان میں شادی بھی ہوئی ہو۔

انشا کے والد اور ان کی خصوصیات

انشا کے والد بزرگ وار کا نام حکیم میر ماشاراللہ خاں بتایا گیا ہو اور کہا گیا ہو کہ وہ شاعر تھے، مصدر ان کا تخلص تھا، دو ایک شعر بھی اُن کے نام سے تذکروں میں ملتے ہیں۔ مگر ان کے متعلق یہ بیان سراسر تشنہ اور ناکافی ہو۔ وہ بہت بڑے حاذق طبیبوں میں تھے۔ اور مخبر الدولہ ان کا خطاب تھا۔ علومِ متعارفہ میں اُن کو بہت کافی دست گاہ تھی۔ طالب علم، نہایت خوش مزاج تھے۔ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ مگر با ایں ہمہ نہایت دلیر، عالی حوصلہ، بلند ہمت اور مردِ میدان تھے۔ اور اتنے معرکوں میں شریک ہوے تھے کہ اِن کے تمام بدن پر زخموں کے نشان تھے۔ جاں دہی اور جاں ستانی ان کی نظروں میں ایک کھیل تھی۔

سخی اور باذل ایسے تھے کہ تذکرہ 'مخزن الغرائب' کا مصنف لکھتا ہو کہ حاتم کا نام اُن کے مقابلے پر نہیں لیا جا سکتا۔

عابد اور شب بیدار ایسے تھے کہ ہمیشہ زمین پر سوتے تھے اور بوریاے عبادت پر کروٹیں لیتے لیتے صبح کر دیتے تھے۔ قناعت اور استغنا کا یہ عالم تھا کہ مرغ پلاؤ اور نانِ جویں کا اُن کی نگاہوں میں ایک درجہ تھا۔

وہ شاعر تھے اور شاعر بھی ایسے ویسے نہیں۔ ماہرِ فن اور کامل۔ سخن گوئی کے ساتھ سخن سنجی میں بھی یگانۂ آفاق تھے۔ بدیہہ گوئی کا بڑا ذوق تھا۔ میر حسن نے لکھا ہو "ہر کہ پیش ایشان کلام خود بہ خواند درجواب آں بدیہہ گوئی را آمادہ می شوند"۔

مولانا آزاد نے لکھا ہو کہ میر ماشاراللہ خاں دربارِ شاہی میں طبیب تھے اور زمرۂ امرا میں داخل تھے۔ ہم کو اس روایت کے صحیح ماننے میں یوں تامل ہو کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ نہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہو کہ وہ سلطنتِ چغتائیہ کے ضعف کی وجہ سے مرشد آباد گئے۔ اس لیے کہ سلطنت کا حقیقی ضعف غلام قادر کی دست درازی اور بنگال کے تینوں صوبوں کے نکلنے اور صوبہ الہ آباد کے منیر الدولہ کو تفویض کرنے اور اُن کے انتقال کے بعد شجاع الدولہ کے الہ آباد پر قابض ہونے سے شروع ہوا اور یہ سب باتیں بعد میں واقع ہوئیں۔ آزاد نے تو یہی کہا

تھا، مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے اپنی کسی خاص تحقیقات کی بنا پر ۹ رجادی الاوّل ۱۱۶۹ھ سے ۱۰ رشوال ۱۱۷۰ھ تک درباریوں میں منسلک ہونے کی تاریخ بھی مقرر کردی ہو۔ اس سے انکار نہیں کہ وہ مرشد آباد گئے۔ انشا وہیں پیدا ہوئے وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ صدرا تک عربی پڑھی اور پھر علمِ طب حاصل کیا۔ جس میں کامل مہارت بہم پہنچائی اور ماہر طبیب بن گئے۔ مگر اپنے پیشے کی طرف اُن کی توجہ نہ ہوئی بلکہ طبیعت کے جوش کا سیلاب شاعری کی طرف بہہ نکلا اور اپنے والد کو کلام دکھانے لگے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے لکھا ہو کہ یہ میر سوز کے شاگرد ہوئے مگر تھوڑے ہی دنوں بعد یہ اُستاد سے بگڑ بیٹھے یہ صحیح نہیں۔ اُن کو شاید میر حسن کے اس فقرے سے دھوکہ ہوا ہو جو انشا کے کلام کے بارے میں انھوں نے لکھا ہو کہ اُن کی شاعری میر سوز کے رنگ سے ملتی ہو اس کے سوا اور کوئی ثبوت نہیں۔ اسی طرح نسّاخ کا یہ فقرہ بھی قابلِ اعتبار نہیں کہ مشہور ہو کچھ روزوں میاں مصحفی سے اصلاح لے کر منحرف ہو کے ہجو لکھی تھی۔ کیوں کہ اُنھوں نے صرف ایک سنی سنائی مشہور بات لکھ دی ہو۔ اور کچھ نہیں۔ اس خیال کی سب سے زبردست تردید اس بات سے ہوتی ہو کہ انشا تقریباً ۱۶ برس کی عمر تک مرشد آباد میں رہے اور وہاں سے جب یہ اپنے والد کے ساتھ واپس ہوئے تو ان کا دیوان تیار ہو چکا تھا۔ پھر وہاں مصحفی اور میر سوز کا کہاں وجود تھا۔ دوسرے یہ کہ اگر یہ واقعہ کچھ بھی صحیح ہوتا تو مصحفی تو کم از کم اس کا کہیں اشارہ کرتے۔ اس کا تفصیلی ذکر آگے چل کر ہم لکھیں گے۔ سردست یہ کہہ کر خاموش ہوتے ہیں کہ یہ صرف اپنے والد ہی کے شاگرد تھے اور کسی کو شاعری میں انھوں نے اپنا اُستاد اور مشیر نہیں بنایا۔

قصہ مختصر حکیم میر ماشاء اللہ خاں اپنی پوری شان و شوکت اور کافی امارت کے ساتھ مدتوں مرشد آباد میں رہے اور بہ قول صاحبِ مخزن الغرائب' نواب قاسم علی خاں کے زمانے میں ان کو مرشد آباد چھوڑنا پڑا جس کے بعد وہ نواب شجاع الدّولہ کے یہاں آکر ملازم ہوئے۔ اور انشا بھی اُن کے ساتھ تھے جن کا حال مفصّل لکھا جائے گا۔ اس وقت صرف اتنا کہنا ہو کہ حکیم صاحب موصوف نواب شجاع الدّولہ کی حین حیات تک فیض آباد میں دربار وزیر الممالک شجاع الدّولہ میں منسلک رہے۔ اُس کے بعد نواب آصف الدّولہ کا زمانہ آیا جو ابتدا میں نہایت ہی خراب رہا اور حکیم صاحب نے اس اشراف گردی کو کبھی پسند نہ کیا یہاں تک کہ وہ ترکِ فیض آباد کر کے پہلے امیر الامرا ذوالفقار نجف خاں کے لشکر میں رہے اور پھر انھی کے ساتھ بندیل کھنڈ وغیرہ ہوتے ہوئے دہلی آئے اور یہاں مرزا محمد بیگ

ہمدانی کے ساتھ رہے اور سیکڑوں مردانہ اور دلیرانہ کام کیے۔ اور غالباً اُسی وقت شاہی دربار میں بہ حیثیت طبیب خدمت و احترام کے ساتھ بسر کرتے رہے۔ مگر دہلی میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی سلطنت چراغِ سحری کا منظر پیش کر رہی تھی۔ نادر شاہ کی لوٹ احمد شاہ ابدالی کے حملوں کو دلّی والے ابھی بھولے نہیں تھے کہ شاہ عالم کی رہی سہی وقعت کو غلام قادر نے برباد کر دیا۔ اور دلّی کا بادشاہ واقعی ایک تکیے دار بن کے رہ گیا۔ حکیم صاحب کا ایسا وہم گیر ایا کہ انھوں نے پھر دہلی کو خیرباد کہا اور فرخ آباد چلے گئے۔ ان کا تموّل مرشدآباد کی واپسی ہی پر رو بہ زوال ہو چکا تھا۔ مگر پھر بھی دہلی آئے تو اتنی سقیم حالت نہ تھی۔ مرشدآباد کی حالت کو دیکھتے ہوئے دلّی میں اقبال زندگی تھی و دلّی کے مقابلے میں فرخ آباد کے قیام کا زمانہ اور بھی قابلِ افسوس تھا، جہاں یہ نواب مظفر جنگ کی سرکار سے وابستہ تھے یہاں اُن کو شاید کوئی بڑی آمدنی نہ تھی۔ غرض کہ حکیم ماشاءاللہ خاں آخر وقت پھر مرشدآباد ہی میں رہے اور یہیں انتقال کیا اور یہیں مدفون ہوئے۔ اور بہ قول صاحبِ مخزن الغرائبؔ یہیں اُن کا مزار ہے۔

سید انشا کے حالات

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انشا کی ولادت مرشدآباد میں ہوئی اور وہیں یہ سولہ برس کی عمر تک رہے۔ مگر ان کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ زیادہ تر ان کی ظرافت ان کی ہزالی اور مسخرگی ہی پر لکھا گیا ہے باقی خیریت۔ مگر جن لوگوں نے ان کو دیکھا ہم ان لوگوں کو شہادت میں پیش کرتے ہوئے ان کے عادات و اخلاق وغیرہ پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

وہ نہایت حسین اور خوب صورت تھے۔ میر حسن نے "از خوبانِ جہاں و از خوش فکرانِ زماں" لکھ کر ان کی خوب صورتی کو خوش گوئی پر مقدم کیا ہے۔ خود انشا نے بھی مرزا مظہر جان جاں کی ملاقات کو جاتے ہوئے الفاظ میں اپنی تصویر کھینچی ہے جو ان کے حُسنِ خداداد کے مناسب حال ہے۔ لکھتے ہیں کہ "خط را تراش دادہ و جامۂ ململ ڈھاکہ پوشیدہ دستارِ شربتی چند خشو بر سر گزاشتم۔ و دیگر لباس ہم ازیں قبیل۔ و از سلاح کٹار بسیار خوبے بہ کمر زدہ بودم"۔ اس کے علاوہ کسی اور نے بھی ان کا یہ شعر سُن کر کہ ؎

گر نازنیں کے کہنے سے مانا بُرا ہو کچھ میری طرف کو دیکھیے میں نازنیں سہی

کہا تھا کہ دریں چہ شک

رنگ گورا، قد درمیانہ۔ اکثر صافہ باندھتے تھے اور شملے کو گلے میں لپیٹ لیتے تھے۔ یہ وضع یہ بانک پن اور جوانی کا عالم۔ آخر کس کو اچھا نہ معلوم ہوتا ہوگا۔ میر علاء الدولہ نے اپنے "تذکرۃ الشعرا" (غیر مطبوعہ) میں لکھا ہے "جوان وجیہ بہ دل نزدیک تراست۔ با مولف تذکرہ فقیر اشرف علی خاں آشناست۔"

ظریف مزاج بھی ایسے کہ بقول شوق رام پوری مصنف و مولف "تذکرہ تکملۃ الشعرا" چار ابرو تک کا صفایا کراتے تھے اور آزاد فقیروں کی طرح باتیں کرتے تھے۔ منسوڑ اتنے کہ راہ چلتوں کو چھیڑتے۔ اگر وہ کچھ کہتا تو یہ اور چھیڑتے اور اُسے غصہ دِلا دِلا کر جی بھر کر گالیاں کھاتے۔ چناں چہ مخزن الغرائب شیخ احمد علی کی یہ عبارت اس کی گواہ ہے:

"بندہ نیازے در خدمتش دارم۔ او نیز شفقت بہ حالِ من از روز ملاقات تا امروز مبدل نمی دارد۔ در عالم آشنا پرستی بے نظیر زمانہ۔ و در شعر ہندی موجد طرز تازہ و یگانہ است۔ آدمی کہ در صحبت او رود غم ہائے زمانہ فراموش می کند۔ نقل ہائے عجیب و قصہ ہائے غریب یاد دارد و از پیش طبیعت خود نیز می تراشد۔ لطیفہ ہائے او اگر شمار کردہ آید کتابے جداگانہ مرتب می تواں کرد۔ در بزم خود را کم تر از یک طفل نامرد حساب مے کند۔ برائے ہر کس نوائے بر می آورد اگر گاہے بہ خاطرش می گزرد با آدم راہ رو بیگانہ صورتِ ظرافت سر می دہد دریں صورت اگر طرف ثانی سکوت کرد خیر و اگر شروع دشنام نمود می خندد و او را برسر غضب می آرد با آدم کم مرتبہ ایں معاملہ دارد۔"

جب یہ حالت ظرافت اور شگفتہ مزاجی کی تھی تو پھر کیا امید کی جا سکتی ہے کہ ایسا آدمی دلیر اور شجاع بھی ہو۔ مگر نہیں وہ بڑے زبردست شہ سوار تھے۔ تیر اندازی اور شمشیر زنی کے ماہر تھے۔ کبھی کسی سے دبتے نہ تھے۔ اور ہفت ہزاری سے بھی اپنے خلافِ مزاج بات نہیں سُن سکتے تھے۔ ایک مرتبہ نواب مرزا قاسم علی خاں خلف نواب سالار جنگ سے کسی شعر پر بگڑ گئے اور حضورِ عالی کے سامنے ذلیل کر کے چھوڑا۔ ایک بار جو نگر میں اسمٰعیل بیگ محمد بیگ ہمدانی کے بھتیجے سے ایسے بگڑے کہ کٹار کھینچ کر اس پر ٹوٹ پڑے اور جو کچھ منہ میں آیا کہہ ڈالا۔ حالاں کہ اسمٰعیل بیگ وہ شخص تھا کہ اُس وقت کے بڑے بڑے نام ور دلاور اور مشہور لڑنے والے اس کے سامنے کان پکڑتے تھے۔ خدا نے خیر کی کہ اُس روز ان کی جان بچ گئی ورنہ معاملے نے اتنا طول کھینچا تھا کہ جان جانے میں کوئی کسر نہیں تھی۔

یہ سب کچھ تھا مگر ذرا کینہ پرور اور دل میں بات رکھنے والے اور ابن الوقت ضرور تھے۔ خوشامد دل میں

بیٹھ جاتی وہ فطری اور خلقی ہوکر رہ جاتی تھی پھر ممکن نہ تھا کہ دِل سے نکل جاتی ۔ سید انشا نے اپنے پدر بزرگوار کی معیت میں جب مرشد آباد کو الوداع کہا تو اُسی دربار میں یہ بھی آئے جہاں کہ وہ وارد ہوئے تھے ۔یعنی یہ بھی نواب شجاع الدولہ کے مصاحب ہوئے ۔ اس وقت ان کی عمر سولہ برس کی تھی ۔علومِ رسمیہ سے باخبر تھے اور آدابِ مصاحبت سے کما حقہٗ واقف تھے ۔ اُس وقت اِن کا دیوان تمام ہوچکا تھا ۔چناں چہ تذکرہ مخزن الغرائب' کی یہ عبارت اس کا ثبوت ہے ۔" چوں بہ شانزدہ سال رسید بہ حضور نواب وزیر الممالک شجاع الدولہ داخلِ جلسا شد. دراں وقت دیوانِ ہندی بہ طورِ خود و بہ طرز نوے بے استاد ردیف وار تمام نمودہ بود و پارہ از اشعارِ عربی و فارسی ہم بر اوراق ثبت داشت ۔"

عام تذکرہ نویس اس بنا پر کہ اُن کے دیوان میں کئی زبانیں پائی جاتی ہیں، کہتے ہیں کہ وہ کئی زبانیں مثلاً عربی ، افغانی، فارسی، اُردو، پنجابی ، مارواڑی وغیرہ جانتے تھے ۔ اور انھی زبانوں میں شعر بھی کہتے تھے ۔ مگر میر ولی اللہ نے 'تاریخ فرخ آباد' میں لکھا ہے کہ سعادت علی خاں کی مسند نشینیٔ وزارت کے وقت انشا نے چونتیس[۳۴] زبانوں میں قصیدہ کہا ۔جب شجاع الدولہ کا انتقال ہوا تو یہ اپنے والد کے ساتھ دہلی آئے ۔اور شاہ عالم کی مصاحبت میں بسر کرنے لگے ۔جب حکیم میر ماشاءاللہ خاں دربارِ دہلی کا رنگ بگڑتا دیکھ کر فرخ آباد چلے گئے تو غالباً سید انشا دہلی میں رہے اور صرف اپنے والد کی زیارت کے لیے دو چار مرتبہ فرخ آباد گئے ۔

دہلی میں شعرا سے جو معرکے پیش آئے اور جو ہنگامے ہوئے اُن کا چوں کہ 'آبِ حیات' وغیرہ میں ذکر آچکا ہے اس لیے ہم ان کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتے ۔ ہاں یہ کہنا ہے کہ جب دلّی کی حالت بالکل خراب ہوگئی اور وہاں کے اکابر و شرفا جا بہ جا منتشر ہوگئے تو یہ بھی لکھنؤ چلے آئے ۔اور یہاں آکر شہزادہ سلیمان شکوہ کے ہاں ندیموں اور مصاحبوں میں ملازم ہوگئے ۔ مگر چند روز اُن کے یہاں رہ کر بہ وجہ اپنی نازک مزاجی کے اُن سے بھی خفا ہوگئے اور پھر میاں الماس علی خاں کے مصاحب ہوئے ۔اس کے بعد سعادت علی خاں کی رفاقت میں آئے یہاں جو واقعات اور مناقشات مصحفی وغیرہ سے ہوئے اُن کا تھوڑے سے تغیّر کے ساتھ تذکروں میں ذکر آچکا ہے ۔لیکن 'تذکرۂ معرکۂ خوش زیبا' (غیر مطبوعہ) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام ہنگامہ خود شاہ زادۂ سلیمان شکوہ کے اشارے سے اٹھا تھا ۔ وہ زمانہ نواب آصف الدولہ کا تھا ۔جب یہ ہنگامہ ہوا تو نواب موصوف شکار کے لیے

گئے ہوئے تھے اسی لیے مصحفی نے اپنے شاگردوں کو منتقمانہ کارروائی سے روک دیا تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہو کہ جب آصف الدولہ واپس لکھنؤ ہوئے اور ان کو اس ہنگامے کا علم ہوا تو انھوں نے انشا کو شہر بدر ہونے کا حکم دے دیا۔ چناں چہ حکیم مولوی عبدالحی صاحب نے اپنے 'تذکرۂ گلِ رعنا' میں اس واقعے کو یوں لکھا ہو اور انھوں نے یہ قصہ 'تذکرۂ خازن الشعرا' میرزن جان الہ آبادی سے اقتباس کیا ہو جس کی عبارت یہ ہو:۔ "ہنگامے کہ فی مابین میر (انشا) ومیاں مصحفی مناقشہ واقع شدہ و نوبت ہجو یک دیگر کشید۔ وزیرالممالک میر (انشا) را رخصت انصراف داد و ایشان بہ حیدر آباد رفتند۔ از اثنائے راہ عریضہ بہ خدمت جدِّ امجد (شاہ اجمل) ارسال نمودند و دراں یک بیت ہم بود ؎ یونھی بے شغل ہمارا کوئی دل رہتا ہو ؛ ایک قاتل اُسے ہر حال میں بل رہتا ہو حضرت بہ جوابش تحریر فرمودند ؎ خوش باش دلت چرا خراشد۔ انشاء اللہ خیر باشد۔ وچیزے از اعمال مجرب جسب طلبِ میر نیز ارسال فرمودند۔ بعد عرصۂ قلیلے نواب وزیر میر را بہ لکھنؤ طلب فرمود۔ میر بہ لکھنؤ رسید و خطِ شکرگزاری بہ حضرت جدِّ مرحوم نوشت۔ ہنگام جمع ایں ترجمہ آں خط باوجود تلاش بسیار بہ دست نیامد"۔ یہ روایت کچھ زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہو۔ مگر چوں کہ ایک حد تک انشا کے حالات میں اضافہ کرنے والی ہو اس لیے لکھ دی گئی۔

سعادت علی کے ساتھ انشا کی زندگی جن رنگ رلیوں میں گزری، اس کے لیے 'آبِ حیات' کا دیکھنا ضروری ہو۔ ہم کو صرف یہ کہنا ہو کہ اپنے جوان بیٹے کے انتقال کے ملال اور سعادت علی خاں کی سخت گیریوں کی وجہ سے انشا آخر میں دیوانے ہوگئے تھے۔ یہی 'آبِ حیات' کے مصنف کا خیال ہو مگر ہم کو اس کے اعادے کی ضرورت یوں ہوئی کہ مولفِ 'گلِ رعنا' نے اُن کی دیوانگی کے قصّے کو آزاد کا بنایا ہوا افسانہ سمجھا ہو اور 'حیاتِ دبیر' کے مولف مرزا اوج کا یہ فقرہ دیکھ کر کہ سید انشا نہ مجنوں ہوئے نہ مخبوط' اُن کو پورا یقین ہوگیا ہو کہ وہ آخر عمر میں مجنوں نہیں ہوئے تھے۔ مگر ایسا نہیں ہو آزاد کی تحقیق صحیح ثابت ہوتی ہو۔ اور اس کا ثبوت یہ ہو کہ احمد علی یکتا نے اپنی کتاب دستورالفصاحت میں انشا کے بیان میں لکھا ہو۔" آخر آخر مجنوں شدہ چند سال گزشتہ بودند کہ بہماں مرض درگزشت"۔

انشا کی عمر کے متعلق مطبوعہ تذکروں میں کوئی ذکر نہیں آیا۔ مگر احمد علی یکتا نے اس کو بھی صاف کردیا ہو اور بتایا ہو کہ ان کی عمر ساٹھ برس سے متجاوز تھی کہ دُنیائے فانی کے تمام خرخشوں سے نجات پا گئے۔ سالِ وفات

۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۸ء تھا۔ بسنت سنگھ نشاط نے جو ان کی تاریخ وفات لکھی ہو وہ تعمیے کے طور پر ہو جس سے سنہ ہجری ۱۲۳۳ھ نکلتی ہو۔ بلوم ہارٹ اور صاحبِ طبقات الشعرا، کو دھوکا ہوا ہو کہ انھوں نے تاریخِ وفات ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۵ء لکھ دی ہو۔

انشا کی عادت تھی کہ وہ ہر جگہ اپنی بات کو بالا رکھنا چاہتے تھے اور اپنے علم و کمال کے زعم میں کسی کو اپنا مدِمقابل نہ جانتے تھے۔ اور اس بات کا اُن کی بہت سی چیزوں سے پتا چلتا ہو۔ مگر مولفِ 'مخزن الغرائب' نے یہ لکھ کر مجھ کو سخت حیرت میں ڈال دیا ہو کہ وہ قتیل کو اپنے سے بہتر جانتے تھے اور اُن سے دبتے تھے۔ عاشقی نے 'نشترِ عشق' میں ایک واقعہ بھی قتیل کے ذیل میں ایسا ہی نقل کیا ہو۔ وہ لکھتے ہیں کہ "روزے سعادت یار خاں رنگیں ہنگامِ معاودت از لکھنؤ برائے دیدن راقم تشریف آورد، و عندالاذکار مرزائے موصوف (قتیل) قسمیہ بیان مے فرمود کہ نوبتے انشاءاللہ خاں مرحوم کہ از یارانِ مرزائے موصوف بودو باخود ہا مزاج و خوش طبعی ہم می شد در دو سہ روز بہ خوض و تامّل بسیار دو سہ فقرۂ نثرِ بے نقط تلاش نمودہ رقعۂ بہ مرزا قتیل نوشت۔ صبح آں چوں باخود ہا ملاقات گردید آں مرحوم از راہِ اختلاط با مرزا گفت کہ دیدی چہ قسم رقعہ نوشتم و چہ فقرہ ہائے معنی یاب بے نقط بہم رسانیدم۔ حالا مقدور تو نیست کہ درجواب آں دم زنی و بہ پاسخ آں برنگاری ایشاں فی الفور قلم برداشتند و تفسیرِ بے نقط سورہ ہائے قرانی کہ بہ آں مغفور از بر بود و می خواند در عرصۂ یک نیم پاس بہ نہایت روانی و سلاست بہتر از عبارت سواطع الالہام بہ ضبطِ تحریر در آوردند" یہ روایت کتنی ہی معتبر اور راوی کیسا ہی ثقہ سہی۔ مگر مجھے کسی طرح اوّل تو یہی یقین نہیں آتا کہ انشا کسی چیز میں قتیل سے کم تھے۔ اور قتیل کی عربی ایسی تھی کہ وہ سواطع الالہام سے بھی اچھی عبارت لکھ لیتے تھے اور انشا منھ دیکھ کر رہ جاتے تھے۔ دُوسرے دو دلچسپ ہیں جن میں انھوں نے قتیل کو وہ کھری کھری سُنائی ہیں جنھیں دیکھ کر یقین آجاتا ہو کہ قتیل کسی صورت میں انشا کے مدِمقابل نہ تھے۔ میرے پاس 'کلیاتِ انشا' کا ایک نسخہ ۱۲۴۰ھ یا ۱۲۴۸ھ کا لکھا ہوا موجود ہو جو لکھنؤ میں لکھا گیا۔ اور اس حساب سے وہ انشا کے انتقال سے سات برس یا زائد از زائد پندرہ برس بعد کا ہو۔ اور اس کو جس شخص نے خریدا تھا اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ عبارت پہلے صفحے پر موجود ہو کہ "ایں کتاب بہ قیمت دہ رُپے خریدا شد چرا کہ ہنوز رائج نیست" اُسی دیوان کے دُوسرے ورق پر یہ واقعہ لکھا ہو جو انشا کے بیان پر مبنی ہو؛

یک روز بعد نماز بہ تلاوتِ کلام مجید مشغول بودم۔ ودراں روز مرزا قتیل ہم در خانۂ من مہمان بود چوں کہ تلاوت کردہ بودم لفظِ مَعَنَا (یعنی بہ فتح عین) خواندم مرزا قتیل لفظِ معنا شنیدہ گفت کہ مَعْنَا (یعنی بہ سکونِ عین) باشد خوب باشد کہ در قاعدۂ عربی معناست۔ فوراً کبت گفتم۔ کبت

کہے جو کہ قتیل صحیح ہے وہ کہ وہ کھتری ہے اور گدھے کی ہے دُم
کہے وہ جو خدا مَعَنَا سو غلط نہ طریقِ رشاد کو تجیے گُم
مَعَ ہو جو مضاف تو عین کو جزم اجی کیوں کہ بھلا ہو کہو مجھے تُم
تو مثالیں غلط ہوں سب مَعَہٗ مَعَنَا مَعَ مَن مَعَنَا مَعَکُم

اسی طرح ہائے ہوّز اور حائے حُطّی کا جھگڑا بھی دیکھیے اور خیال فرمائیے کہ زرا سی بات پر مرزا قتیل کو کتنا عاجز کیا ہے۔ یہ ایک منظوم خط ہے جو ہم کو اُسی قلمی کلّیات سے دست یاب ہوا جس کا پہلے ذِکر کیا جاچکا ہے ۔

امینا مشفقا بندہ نوازا		لِمَ حَرَّتَنِی فَولا لَقتیلا
وہ خط لکھا کہ بس پڑھتے ہی میرا		ہوا غصّے کے مارے رنگ نیلا
کہ یعنی چست اور چالاک ہے تو		نظر آیا ولیکن سخت ڈھیلا
تجھے کہتی تھی دُنیا قاف معنی		تو کیوں کر بن گیا مجنوں کا ٹیلا
وہ چھو منتر تھا تجھ کو یاد جس سے		بہت سے اژدہوں کو تو نے کیلا
مقابل وصل کے تھا ہجر مشہور		جھٹ اس کو علم کے چاقو سے چھیلا
بہت سی اور ڈھب کی پخت و پز کا		دیا تھا جھونک چولھے میں پتیلا
بلا تحقیق لفظِ ہجر میں کل		لیا کیوں حائے حُطّی کا وسیلا
جواب اس شبہے کا تو مجھ سے سُن لے		نہ کالا بن نہ نیلا ہو نہ پیلا
وہ ہجراؔ ہے جو ہجورا کے ہم راہ		سو ہے حُطّی ہی ہاں مرزا قتیلا

ولے جو ان قومی کے ہی آخر وہ مجبوراً ہی ہوز سے حلیلا
نہ چٹکی دل میں لے واصبر علیٰ ما یقولون آیہ ہی تیرا دلیلا
زرا تو سورۂ مزمل میں تو دیکھ ہی بالفتح وہاں ھجرا جمیلا
یہی تو فتح کا باعث ہوا ہی مجھے کیوں کر کرے گا تو ذلیلا
بھلا آتو سہی میں بھی پڑھوں گا یہی آیت ومهّلهم قلیلا
جواب اس کا جو کچھ خاطر میں گزرے تو بسم اللہ حاضر کر ابھی لا
پھر او شاخِ نبات انکھل سے دیکھ اُٹھا دیوانِ حافظ تو ابھی لا
شب وصل است وطی شد نامۂ ہجر پڑھے گا یہاں ہر اک گل سے رنگیلا
سلامٌ هِیَ حتّیٰ مطلع الفجر یہی مصراع ہی اس کا سجیلا
ہو الغالب ہی انشاءاللہ انشا ترا کیوں اشک سے دامن ہو گیلا

انشا کو ہمیشہ جدت طرازی کا ذوق رہا۔ یہی سبب ہی کہ ان کا دیوان آج ہم کو دوسرے شعرا کے دیوانوں سے بالکل علاحدہ نظر آتا ہی۔ پھر جس طرح وہ اپنی روش اور اپنے طرزِ کلام میں اختراع اور ایجاد سے کام لیا کرتے تھے اسی طرح نئی نئی بحروں کے نکالنے کی اُن کو ایک دُھن تھی۔ اس کی پروا نہ کرتے تھے کہ وہ قابلِ قبول ہی یا نہیں، دُنیا اس کو پسند کرسکتی ہی یا نہیں۔ اُنھیں اپنے کام سے کام تھا۔ چناں چہ ایک بحر کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:-

مطلع ایجادِ تازہ کہ ہر مصرع سی و شش فعلن دارد۔ در بحرِ طویل ایں است ؎

دل و دیدہ میں آیا مقام کیا کہ مرا ہی جہاں میں نام کیا
یہ اُنھوں نے تو زور ہی کام کیا مجھے عشق میں شہرۂ عام کیا
مری روح و جسد میں خرام کیا مجھے لائقِ نطق کلام کیا
مجھے قیدیٔ دانہ و دام کیا مجھے روحِ قدس نے سلام کیا
مجھے فوجِ ملک نے امام کیا

جو شرابِ طہور کی جلوہ گری | خُمِ لمعۂ نورِ ظہور میں تھی
کہ قصورِ سرور میں حور نے لی | ہوئی جس سے کہ کشتِ امید ہری
وہی ساقیٔ بزم حضور نے دی | بہ علیِ ولیِ وصیِ نبی
مجھے منبع گردشِ جام کیا | مجھے بانیٔ شربِ مدام کیا
مجھے انشا اب ان نے غلام کیا

اسی طرح ایک اور بحر ایجاد کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ایں بحر لیست مُسمّٰی بہ سکران کثیرۃ الارکان کہ پنجاہ و پنج فعلن دارد

بہ شکوہِ معقرِ عرشِ بریں | بہ لوامع قدس و مکان و مکیں
بہ تقرّب قدرتِ روح امیں | بہ ترفعِ پایۂ سدرہ نشیں
بہ خشوع و خضوعِ گروہ یقیں | بہ مراتب جملۂ گوشہ گزیں
بہ بروج و کواکب و ماہِ مبیں | بہ صوامعِ زینت اہلِ زمیں
بہ تلمّع صورت مہر جبیں | بہ تلالوٗ خاتم و تاج و نگیں
بہ محمدِ مالک شرع متیں | بہ علیِ ولی ہزبر عریں
بہ طفیل شفیعۂ روزِ جزا
بہ خصالِ حمیدۂ ذاتِ حسن | بہ حسینِ شہیدِ غریبِ وطن
بہ رؤسِ فتادہ جدا ز بدن | بہ جروحِ شگفتہ بہ رنگِ چمن
بہ مُفوضِ خاک بدونِ کفن | بہ عبادتِ عابدِ پا بہ رسن
بہ تبحّرِ باقرِ سرّ و علن | بہ محامدِ صادقِ اہلِ سخن
بہ مودّتِ کاظمِ رنج و محن | بہ کرامتِ ثامنِ ضامنِ من
بہ تقی و نقی و سمی و حسن | بہ محمد مہدیٔ فخرِ زمن
ہمہ عقدۂ بندۂ خود بہ کشا

انشا کی چند غیر مطبوعہ غزلیں

اگر نہ مجھ سے تو آکر لپٹ گیا ہوتا
تو رات تجھ سے مزاجی ہی پھٹ گیا ہوتا

کہے ہے خندۂ قل قل تبسم گل دیکھ
ہنسی کے مارے مرا دم اُلٹ گیا ہوتا

ہزار حیف بلا چاندنی میں ہم سے وہ ماہ
وگرنہ رات کو سب ڈول پٹ گیا ہوتا

دلِ رمیدہ لگاوٹ نے تیری قہر کیا
جفائے یار سے تو کاش ہٹ گیا ہوتا

بہ شدت آپ سے انشا خفا ہوا تھا رات
تم اُس کو گر نہ مناتے چپٹ گیا ہوتا

ہو یہ گھر کھوج مٹے چاہ نصیبِ اعدا
کرے اس دُکھڑے کو اللہ نصیبِ اعدا

ایک دل خستہ یہ رستے میں کھڑا کہتا تھا
مرضِ عشق نہ ہو آہ نصیبِ اعدا

حیف تم چاند سا مکھڑا نہ دکھاؤ ہم کو
اور یوں ہو یہ شبِ ماہ نصیبِ اعدا

میں کہا حق کرے اب تم بھی کسی کو چاہو
لگے فرمانے کہ اِی واہ نصیبِ اعدا

دال نے عین ہو رے واو زبر رو ہو ارے
سخت یہ درد ہے جاں کاہ نصیبِ اعدا

خاک منھ میں ترے اس منھ کو لگے آگ مجھے
نہ جھنکاوے یہ خدا راہ نصیبِ اعدا

کوستا ہے مجھے چل دور یہ بدفال نہ بول
میرے بیری مرے بدخواہ نصیبِ اعدا

خوبی خلط کی ہے دیوانہ نہ ہو منھ کو سنبھال
میں کروں غیر کی پرواہ نصیبِ اعدا

عشق صاحب کو مبارک رہے انشاءاللہ
عشق اور بندۂ درگاہ نصیبِ اعدا

اکڑ کے پنجوں کے بل یہ چلنا نہ کشتہ کیوں کر ہوں اس ادا کا
سجا سجایا کسا کسایا یہ دھج تو دیکھو غضب خدا کا

بڑوں ہے وہم و قیاس سے بھی کروں جو تعریف اس صنم کی
جوانِ رعنا بہ حُسن و خوبی پری کا عالم غرض گدا کا

نگہ یہ ظلم و کرشمہ آفت قیامت اُس پر یہ قامت اُس کی
ملاحت ایسی بلا کہ توبہ یہ عالم اپنے ہے دل رُبا کا

بہ رنگِ گُل کے بھلا میں کیوں کر کروں نہ جیب شکیب ٹکڑے
کنار میں اس کو تنگ کھینچے ہوا یہ مقدور اب ہوا کا

گھٹا یہ کالی گلوں کی یہ پُرخروشِ رعد اور برق ایسا پلا نہ بھر بھر کے جام ساقی سمجھ نہ اندازِ فلک ہوا کا
شبِ اندھیریوں کا تری تصوّر خیال میں مجھ کو اس قدر تھا کہ بوئے نرگس سے پُر ہوا تک کنارِ دامن مری قبا کا
جو شخص طالب حسینؑ کا ہو تصدّق اس کے نہ کس طرح ہوں
غلام و فدوی ہوں جی سے انشا شہید میدانِ کربلا کا

بُتِ کافرِ مسیحا دم فرنگی ملّت اور ترسا نصارا کر تو مجھ مومن کو یا مجھ پاس بے ترس آ
وہ طفلِ اشک کے منھ چڑھ تجھے کہتا ہوں ای ناصح کہ ہو یہ شوخ ناداں ناقباحت فہم ابتر سا
شعاعِ آفتابِ روزِ محشر سے سکھالیں گے اگر دامانِ رندانِ سُبوکش کچھ ہوا ترسا
لگا تیرِ نگہ سینے میں ایسا ایک ای قاتل کہ لوٹے دِل ہمارا نیم بسمل ہو کبوتر سا
تری خاطر حرم سے آ ہو راکبِ کلیسا کا
قسم عیسیٰ ابنِ مریم کی تجھے انشا کو مت ترسا

جونہیں کعبے سے فقیروں نے اٹھایا بسترا جھٹ درِ بیت الصنم پر جا بچھایا بسترا
کیا تعیّن ہم کو منزل کا کہ ہیں آزاد لوگ دِن جہاں آخر ہوا ایں وہاں بچھایا بسترا
منکا ٹھنکا سیلی تاگا ہوگیا بھسمنت سب آہ کی دھونی سے سب اپنا جلایا بسترا
بہرِ تعویذ اُس پری رو کو لگا لایا فقیر یعنی اس تقریب سے اپنا دکھایا بسترا
بال گو پالوں سے اکثر اپنے بھی ای جبرئیل سدرہ کے سایے تلے جاکر بچھایا بسترا
مرشد اللہ سب مراقب ہو یہ روئے کل کہ صبح بالکوں نے دھوپ میں اُن کا سکھایا بسترا
دشت میں اپنے جو آیا قیس وحشت نے کہا چل بے بے وحدت پرے کیوں یہاں تو لایا بسترا
اُن قلندر مشربوں کا وقت خوش انشا جنھیں
خاکِ صحرائے قناعت پر خوش آیا بسترا

دِل کے نالوں سے جگر دُکھنے لگا یاں تلک روئے کہ سر دُکھنے لگا
دُور تھی از بس کہ راہِ انتظار تھک کے ہر پائے نظر دُکھنے لگا

روتے روتے چشم کا ہر گوشہ یاں تجھ بن اے نورِ بصر دُکھنے لگا
درد یہ ہے ہاتھ گر رکھا اُدھر وھاں سے تب سرکا اِدھر دُکھنے لگا
مت کراہ انشا نہ کر افشائے راز
دل کو دُکھنے دے اگر دُکھنے لگا

اس کے بعد ہم انشا کی مثنوی مُرغ نامہ لکھتے ہیں جس کے صِرف اوّل کے ۴۲ شعر مطبوعہ نول کشور کے نسخے میں پائے جاتے ہیں باقی مثنوی ندارد ہے۔ حالاں کہ انشا کی تمام مثنویوں میں سب سے زیادہ یہی کارآمد ہے۔ کیوں کہ یہ ایک فن کے متعلق ہے۔ اور خاص کر اُس زمانے میں جب کہ لکھنؤ کی گلی گلی اور کوچہ کوچہ مرغ بازی کی جولاں گاہ بنا ہوا تھا۔ اور شریف سے شریف اور وضیع سے وضیع لوگ بھی مُرغ دربغل نظر آتے تھے جس کی بے چارے میر صاحب تاب نہ لاسکے اور مجبوراً ایک مثنوی ہجو میں کہہ ڈالی۔

انشا کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو خود بھی مُرغ بازی کا بڑا شوق تھا۔ لیکن انھوں نے یہ مثنوی مُرغ بازی کے فن پر مرزا قاسم علی برادر وزیر الممالک کے حکم اور فرمائش سے لکھی۔ ان کے ہاں ایک شخص خلیفہ بابو تھے وہ بتاتے گئے اور انشا نظم کرتے گئے۔ بابو صاحب اس فن کے ماہرِ کامل تھے۔ لہٰذا یہ قواعد نہایت ہی مستند ہیں۔ چوں کہ شاہ زادہ سلیمان شکوہ اور خود نواب آصف الدولہ کو بھی مُرغ بازی کا شوق تھا اس لیے بمصداق النّاس علیٰ دینِ ملوکھم تمام لوگ اس میں بتلا تھے۔ اور چوں کہ ہزاروں روپے کی بازیاں بدی جاتی تھیں اس واسطے اُس میں بے ایمانی، جھگڑے فساد ہوتے اور قتل تک نوبت پہنچتی تھی اس لیے ضرور تھا کہ اس کے قواعد مقرر ہوں۔ چناں چہ سب سے پہلے انشا نے اس پر قلم اُٹھایا اور یہ مثنوی لکھی:

(مثنوی مرغ نامہ انشا)

حمد ہے فرض اس کی وقتِ سحر جس نے کاٹے ہیں مرغِ روح کے پر
کردیا ہے اُسے جسد میں بند کہ وہ یک چند وھاں رہے خورسند
مُرغ زرّینِ آفتابِ فلک نسر طائر سے لے کے تا بہ فلک

اور سکانِ عالمِ لاہوت — یاد میں جس کی ہیں سبھی مبہوت
کُنہ میں جس کی ذہن کا طاؤس — خلق کرتا ہی طائرِ افسوس
کیا کہوں وہ بڑی کھلاڑی ہی — اُس سے غافل ہی وہ اناڑی ہی
کرکے بن مُرغ روح کا ڈھانچا — جس نے ڈھانپا سپہر کا کھانچا
حکم سے جس کے اس زمانے میں — یعنی دُنیا کے مُرغ خانے میں
رات دن ماکیانِ اوج سپہر — روز دیتی ہیں ایک بیضۂ مہر
نیند کو چھوڑ صبح ہی نزدیک — بانگ ہوتی ہی جوں صباح الدیک
دیکھ تو کیا سرِ ذِر کا ہی وقت — طرفہ نور ظہور کا ہی وقت
محوِ ذکرِ خدا ہیں جُملہ طیوُر — آدمی ہو کے تو کرے ہی قصوُر
سُن نصیحت مری بسمعِ قبول — تو بھی کچھ یادِ حق میں ہو مشغول
وقت سی مُرغ کرکے یہ معلوم — قاف پر بولتا ہی یا قیوم
اُٹھ کر وقتِ نماز جاتا ہی — وقتِ راز و نیاز جاتا ہی
مُرغ جو جانور ہی دیوے اذان — اور سویا کرے تو ای انسان

نعت

کر ثنائے رسولِ راہ نما — جس کے نعلین کا ہی سایہ ہُما
صلوٰۃ اس پہ بھیجے ہی جادید — ہی جو اک آسماں پہ مرغِ سفید
گر حمایت کریں نہ اس کی آل — نہ جیں مرغِ عقل کے پر و بال

مدح شاہ زادۂ سلیمان شکوہ

بس کہ شاہِ جہاں قمر تمثال — وہ سلیماں شکوہِ باتمثال
مالکِ ملک و صاحبِ دیہیم — وارثِ تاج و تخت ہفت اقلیم
بادشاہ زادۂ ہمایوں فر — فخرِ تیمور و بابر و اکبر

مدح نواب آصف الدولہ

اور جناب وزیر آصف جاہ — جس کی اختر سے ہی زیادہ سپاہ
آصف الدولہ اعظم الوزرا — جس کے ادنا غلام ہیں امرا
لڑنے بھڑنے کا ذوق رکھتے ہیں — مُرغ بازی کا شوق رکھتے ہیں
کیوں اولوالعزم کو نہ بھاوے رزم — اُس کی تقلیب میں ہی صورتِ عزم

صفتِ مرغ و مُرغ بازی

شغل ہی جن کو ترک تازی کا — کھیل ہی اُن کو مُرغ بازی کا
گوشِ دل سے یہ سُن لے میری بات — اِن میں ہیں چند انبیا کے صفات
صبح خیزی ہی اور شجاعت ہی — اور ہمت ہی اور غیرت ہی
کیوں انھوں کا نہ جنگ پر ہو مزاج — صرف اس قوم کو ہی تاج کی لاج

در حالِ مرغ بازیٔ خود

اب مجھے بھی یہ شوق ہی اس کا — کہ سمجھتا ہوں مُرغ کو عنقا
قصد پالی کا جب کہ کرتا ہوں — کیا ہی ڈگ لمبی لمبی دھرتا ہوں
داب اپنی بغل میں اک مُرغا — چلتا رپ رپ قدم ہوں میں زرغا
چمنستاں میں دیکھ تاجِ خروس — چاہتا ہوں کہ لیجے اس کو بھی چوس
مثلِ فولاد مُرغ ہیں اپنے — داد بے داد مُرغ ہیں اپنے
پہلوانوں کی ہیں انھوں میں صفات — پتنگِ آہن گراں ہی اُن کی لات
ہی جو ہٹّا وہ سامنے ہوتا — بیٹا رستم کا زال کا پوتا
بڑھ مُنہا سا جو ایک ہی لاکھا — خونِ مرغاں کرے ہی وہ چاکھا
اور زردا جو ایک ہی پٹّھا — اُس کا پالی میں ہی بندھا لٹّھا
جو ہی ڈھونکڑ وہ ایک ہی آفت — کیا کہوں اس کی جُرأت و قوّت

چاہے گر چونچ سے تو وہ سنڈا　　توڑ ڈالے سپہر کا انڈا
ہیں غرض خوب خوب عالی مُرغ　　ہے بجا اُن کو کہیے سی مُرغ

درسبب تالیفِ کتاب

تاکہ اس کھیل پیچ چیند نہ ہو　　اس کے لکھتا ہوں میں قواعد کو
ہیں جو اِس علم میں بڑے اُستاد　　اُن کو اللہ رکھے خرم و شاد
معدنِ علم و مخزنِ اخلاق　　مجھ پہ مخصوص رکھتے ہیں اشفاق
کیوں نہ ہوں روشناس عالم کے　　ہیں وہ بھائی وزیرِ اعظم کے
واقعی اُن کا ہے بلند مقام　　مرزا قاسم علی[۱] ہے ان کا نام
رہے اُن پر وزیر کا سایا　　ہے اُنھوں نے مجھے یہ فرمایا
مرغ کا کھیل ہو اگر منظور　　مُرغ بازی کا سیکھ لے دستور
جنھیں اس فن میں خوب قابو تھا　　نام ان کا خلیفہ بابو تھا
مُرغ بازی میں سب سے فائق تھے　　یعنی اس فن میں وہ محقق تھے
تھے انھی قبلہ گاہ کے وہ فیق　　اُن سے ہم سیکھتے تھے اس کا طریق
قاعدے جو خلیفہ مسطور　　سامنے اپنے کرتے تھے مذکور
اور جو بات کرتے تھے ظاہر　　اُن سے کرتے ہیں ہم تجھے ماہر
الغرض ان سے جو سُنی تقریر　　مَیں نے منظوم اُسے کیا تحریر
اب وہ کہتا ہوں میں قواعد کُل　　تا نہ دے بیٹھے کوئی آکر جُل

قاعدہ

مُرغ بازوں کی ہے یہی بانی　　مثلاً ہو چکے ہوں دس پانی
گیارھویں پانی اپنا دے رومال　　اگلے نے پھر لڑایا ہو فی الحال

۱؎ قاسم علی خاں نواب سالار جنگ کے بیٹے اور بہو بیگم صاحبہ کے برادر زادے تھے۔ ۱۲

اور وہ جو حریف ہو غالب — جس کے باقی ہوں پانی اب صاحب
مُرغ کا کانٹا دیکھ لے موٹا[۱] — تو غرض اُس نے بس اُسے لوٹا
بازی دینی پڑی اُسے لاریب — شدّت اگلا کرے تو ہی یہ عیب
جس کے باقی ہوں پانی اودل دار — اُن نے گر کچھ کیا تو پھر مختار
باندھ لے کانٹے ٹانک لیوے پلک — ہی یہ جاری سلف سے آج تلک

قاعدہ

جوڑ مرغاں کا تب بندھے ہی اچھی — جب کہ دونوں طرف کی ہی مرضی
چاہیے یونہیں ڈالنا ڈنکا — جس سے راون کی کانپ اُٹھے لنکا
نہیں کوئی کرے جو ڈنکے بعد — تو وہاں یونہیں گرجے جیسے رعد
لیجیے بازی اس سے ہو کے حریف — اس میں یکساں ہیں سب توی و ضعیف
اور جو دونوں طرف کی مرضی ہو — کہ نہیں اب لڑائی جانے دو
تو نہ اس کو خطر نہ اس کو ظفر — ترک شدّت ہی اس گھڑی بہتر

قاعدہ

ہی یہی کانٹے باندھنے کا طور — اس کو تو اپنے دل میں کر لے غور
دونوں مرغوں کے کانٹوں کی انیاں — کیجے سوہن سے خوب سی یکساں
اور نہی جو ہوں انکی والے (کذا) اُن کو بس لے کے جھٹ رگڑ ڈالے
ایک کپڑے کی چار پٹی پھاڑ — مُرغ بازوں کے کھیل کو لے تاڑ
وہ تو اپنے کے واسطے لے لے — وہ اُسی میں سے دوسرے کو لے
دھجّیاں آٹھ آٹھ تہ کر کر — باندھ مضبوط کانٹوں کے اوپر
انیاں کانٹوں کے ہوں تھوں کے بیچ — کچھ نہ رہ جائے اُن میں اونچ اور نیچ
پر نہ ڈورا انی کے اوپر آئے — کہیں ایسا نہ ہو اناڑی کہائے

تھنوں؟

---

[۱] محاورہ "چھوٹا" ہی اور قافیہ بھی یہی چاہتا ہی۔ "اردو"

قاعدہ

کل مقرر ہیں اس میں پانی دس　　　اس کے آگے جو ہو کسی کو ہوس
تو وہ رومال دے کے پانی اک اُدُ　　　چھوڑ سکتا ہی مُرغ کو فی الفور
یوں لڑانے کو ہو لڑا سکتا　　　مُرغ کو پھر اُٹھا نہیں سکتا
گر اُٹھا دے تو ہارے پھر بازی　　　کچھ نہیں کام آتی دم سازی

قاعدہ

لڑنے میں مُرغ کے اگر رومال　　　کوئی لیوے بھگا تو پھر فی الحال
ایک پانی وہ ہار جاوے وہیں　　　پر جو دونوں کی ہو خوشی تو نہیں
چپکے سے تر کرے جو وقتِ مصاف　　　وہ بھی اک پانی ہار جاوے صاف
کرے رومال کو چھپا کے جو تر　　　اور قسم کھا کے جاوے صاف مُکر
نہیں کچھ چاہیے وہاں تکرار　　　یہی تدبیر ہی کہ ہو لاچار
دونوں رومالوں کو بلا کے عیاں　　　سب کے آگے نچوڑ ڈالے وہاں

قاعدہ

طبع کو شر پہ تو نہ کر مرغوب　　　مرغ پیشہ ہی ہیں لڑاتے خوب
کھینچ تا شر کرے نہ کوئی شریر　　　آدھی کر کے مفاصلے سے لکیر
ایک اپنی طرف اور ایک اُدھر　　　خیر سے تاکہ دیکھیں جملہ بشر
کیوں قضایا میں ہاتھ منھ ٹوٹیں　　　مُرغ دونوں پکڑ لیں پر چھوٹیں

قاعدہ

غیر کے مُرغ کی گئی سو چشم　　　تو تجھے وہاں نہیں ہی لازم خشم
دوسرے شخص کے نہ دِل کو توڑ　　　ایک کا کی بچا کے مُرغ کو چھوڑ

قاعدہ

ایک کا آدھا بازو آیا ہو گر   دوسرے جانور کی گردن پر

ہے حریف ایک ہاتھ کا مختار   کہ جو چاہے تو لیوے بازو اتار

اور جو دونوں لگاوے اپنے ہاتھ   ہار پالی کی پھر ہے اس کے ساتھ

قاعدہ

سارے بازو جو مرغ کی گردن   ڈھانپ لیوے تو وہاں یہ ہے قدغن

کہ نہ چھیڑے کوئی نہ ہاتھ لگائے   اور جو چھیڑے تو ہار پالی جائے

قاعدہ

آگیا ہووے منھ میں مرغ کے گر   تو الگ کھینچ لیوے چپکے سے پر

شرط ہے احتیاط اس میں ولے   دوسرے مرغ کو نہ ہاتھ لگے

قاعدہ

گر شرارت سے مرغ باز نے ہاتھ   مارا ہو مرغ کو تو اس کے ساتھ

اس کی پالی سے کھینچیے باہر   اور کہیے کہ دور گیدی خر

قاعدہ

مرغ دونوں جو کرتے جنگ و جدال   حد پہ پالی کی پہنچے ہوں فی الحال

مارتا لات مرغ کو گو ہو   چونچ سے اپنی پکڑے اس کو ہو

کھیل کی بات ہے یہی لاریب   وہاں اٹھا لینا کچھ نہیں ہے عیب

نہ اٹھے حد سے تو ہے پالی کی ہار   وقنا ربنا عذاب النار

قاعدہ

ہے وہ مختار جس کے مرغ کی دم   لگی پالی کی حد سے ای مردم

نہ اٹھاوے وہ یا کہ لیوے اٹھا   ہار جیت اس میں کچھ نہیں اصلا

مُرغ جس کا طرف ہو پالی کے　　وہ اُٹھا دے تو پانی بس ہارے
پالی باہر سے کوئی شخص جھپٹ　　لے اٹھا مُرغ کو تو بس جھٹ پٹ
غیر دو پانی ہارے وہ بے شک　　اس میں کرنی عبث کو ہو بک بک

قاعدہ

کب چھڑاتے ہیں چشم مرغ سے خاک　　عین کرنے میں ہو جنھیں ادراک
اور پر کا نہیں مضائقہ پر　　رکھتے جائز ہیں اس کو اہلِ ہنر

قاعدہ

مرغ کا لڑنے میں جو ٹوٹا خار　　ہوگیا ہووے سب تہوں کے پار
آدمی غیر کا جتا دیوے　　تہوں کا ٹوٹنا بتا دیوے
کھول کر کانٹے دیکھ لیوے یہ بھید　　سب تہوں کے جو وار پار ہوں چھید
تو تو البتہ پانی ہارے دو　　ورنہ پھر اُلٹی ہار ہو اس کو
کانٹے کھلوائے غیر سے لیکن　　اس میں بہتر ہو رات ہووے کہ دن
اور اک تہ بھی رہ گیا ہو اگر　　تو نہیں ٹوٹا خار اے دل بر
کانٹے پھر کھول باندھنے یونہیں　　جس سے اگلے کے دل کو ہو تسکیں

قاعدہ

گاہ باشد اگر یہ شبہ ہوا　　یعنی ٹوٹا ہو کانٹا مرغے کا
دونوں راضی ہوں دھاں تو خلطے کی راہ　　کچھ نہیں ہو مضائقہ باللہ
کیوں عبث قصہ مُفت کا باندھے　　پھر نئے سر سے کھول کر باندھے

قاعدہ

اور اگر مُرغ کو لگے کاری　　اُس کو میداں سے جھٹ بطراری
دوسرا لے اٹھا تو وہیں پھر　　پانی ہارے یہ بات ہو ظاہر

جانور حد پہ جا پڑے جو پھڑک — تو اُسے جلد جاٹ لے نہ دھڑک
جھٹ بھڑا دیجیے اس سے چونچ سے چونچ — اور کہیے کہ بھائی تو بھی پونچ
اس میں پالی کی اُس کو ہار نہیں — اور تکرار زینہار نہیں
کاری کھائی اگر اٹھا لیوے — حد سے پالی کی اور لگا دیوے

قاعدہ

بیٹھ پالی ہی میں کہے جو وہ یوں — پھر اُسے پھونک کر لگاتا ہوں
دیجیے اُس کو مہلت آدھ گھڑی — کہ مصیبت غریب پر ہی پڑی
ہی وہ مہلت کی قدر کا مختار — اس میں شایاں نہیں ہی کچھ تکرار
چاہیے آٹے کی گولیاں توڑے — چاہیے مُرغے کو سامنے چھوڑے
اس کے پہلے جو مرغے کو دے چھوڑ — تاکہ گولی دے گونڈے آٹے سے توڑ
تو ہی معلوم نزد اہل تمیز — پالی بے شبہ پھر وہ ہارے عزیز
اس کی بے اطلاع مرغ اگر — اگلاے جائے پالی کے باہر
سن لے پھر میرے اے رفیق شفیق — ہار پالی کی ہی اُسے تحقیق
گیارھویں پالی کرکے دم سازی — مُرغ اپنا چھوڑے سومے بازی

قاعدہ

لڑتے لڑتے جو مُرغ مرجاوے — چاہیے دوسرا نہ گھبراوے
کردے ٹکھٹی پہ اُس کو وہیں کھڑا — اور ٹک جی کو اپنے کرلے کڑا
دوسرا اُن کا والا لات جڑے — تو یہ بازی کے دینے پر نہ اڑے
دھکے اور لات کی نہ ٹھیرے تو — پھر برابر رہے وہاں دونو
نہ ہوئی جیت ہار کچھ مطلق — مٹ گئی ہم دگر جو تھی نق نق

قاعدہ

چاہیے یہ کہ مُرغ باز سوائے — کوئی پالی میں اے عزیز نہ جائے

یا وہ دو مُرغ باز جاویں اور — جو کہ کانٹوں کے دیکھ لیویں طور
یا جو پالی کے رنگ کو تاڑیں — بہم اس طور جنگ کو تاڑیں

قاعدہ

رات ہو جائے اس میں تو مجبور — وہاں ناچار ہے یہ بات ضرور
مشعلیں گرد و پیش دِکھلاویں — چار مشعلچی پالی میں جاویں
رکھیں ایسا ہی مشعلوں کو جانچ — کہ نہ مرغوں کو پہنچے مطلق آنچ
نہ لگے مُرغوں کو کہیں مشعل — کہ مبادا کچھ اور آوے خلل
یعنی آپس میں ہووے دت دبکہ — اور برپا ہو مفت کی بک بک
اور ترکیب مجھ کو ہے سوجھی — آکے حاضر ہوں آٹھ مشعلچی
چار تو ہوویں چار کونوں پر — اور ہوں چار پالی کے اندر
مُرغ لگنے میں اور بھاگنے میں — سب کو لازم ہے دُور سے دیکھیں
بیچ پالی کے اُس گھڑی آنا — عیب رکھتے ہیں جو کہ ہیں دانا
گو بڑا آدمی ہو یا سردار — چاہیے اُس سے کرنی یہ تکرار
کھیل سے یہ بعید ہے حضرت — یہ ہوئی آپ سے بُری حرکت
دوسری بار یونہیں ہو تو غرض — دیں رُپے پانچ پھر وہ اس کی عوض
کوئی اس بات سے جو ہو باہر — کھیل کا اُس سے ترک ہے بہتر

قاعدہ

نہ کڑکیے بسانِ رعد و برق — چاہیے رکھیے مرتبے کا فرق
با ادب بات کھیل کی کہیے — اور آتی نہ ہو تو چُپ رہیے
بولنا مُرغ باز کا بے جا — کسی سردار سے نہیں اچھا
اور بولے تو جس کا ہے نوکر — اُس کو لازم ہے ہو خفا اُس پر

چاہیے اُس کو دیوے ایسی سزا — کہ وہ اس بات کا اُٹھاوے مزا
اُس کا آقا کرے نہ گر تنبیہ — تو نہایت ہے کھیل میں یہ کریہ
چاہیے حاضروں کی صف کی صف — ہو سب اس مرد آدمی کی طرف
تاک اُس کے مزاج کا گھر گھاٹ — کھیل سے اُس کے لیجے دل کو اُچاٹ

قاعدہ

اور لازم ہے اک جُدا ہو مکاں — مُرغ آ کر کے سینکے جاویں جہاں
چونچ جبڑے جہاں کہ باندھ سکیں — چاہیے سو مُرغ باز اپنی رکھیں
رکھیں گودی میں اپنے مرغوں کو ڈھانک — تاکہ پلکوں کو لیویں اُن کی ٹانک
یا دوا میں کچھ اُن کو دیویں کھلا — مطلق ان چیزوں کا نہیں ہے گلا
بلکہ سُرمہ دیں اُس کی آنکھوں میں ڈال — جس طرح اپنی لیویں سنبھال
لیک کانوں کی کچھ دوا مَلنا — ہے قیامت ہی یہ نکل چلنا
اس میں ہوتی کُڈھب ہے گفت و شنید — کھیل کی راہ ہے یہ بات بعید
مُرغ کا باؤ ٹوٹ جاوے تو — کیا خلل ہے بمیٹ لے اس کو
ہو لہو مُرغ کا اگر جاری — تو دوا ملیے ہو کے ناچاری
کچھ نہیں ہے مضائقہ اس کا — پر جو چاہے کہ ڈورا یا کپڑا
لا کے باندھے یہ بات ہے ممنوع — عذر ہرگز نہیں ہے وھاں مسموع

قاعدہ

جوڑ اگر ایک ہووے یا دو ہوں — تین ہوں چار پانچ ہوں جو ہوں
تا بہ حدّے کہ ہوں بندھے چھ جوڑ — تو ہی پالی میں ہرتے پھرتے چھوڑ
پانچ پانی تک ایک ایک کے بعد — آیا جایا کریں بہ ساعت سعد
فرق دو دو گھڑی ہو پانی کا — مقتضا ہے یہ قدردانی کا

ہر کھلاڑی کو طور یہ بھاتا
ایک آتا ہو ایک ہو جاتا

چھٹے پانی سے تین تین گھڑی
چاہیے دیر کیوں کہ پھر ہو کھڑی

قاعدہ

یہی اُستاد نے کہی ہو بات
جب گھڑی پانچ رہ گئی ہو رات

دونوں مُرغوں کو صاحبِ تیمار
ہیں پھر اُس آن فاعلِ مختار

شوق سے مُرغوں کو سُلا رکھیں
دو گھڑی دن تلک جُدا رکھیں

اس سے آگے جو اور بھی ہو دیر
تو وہ عائد ہو ہار پانی کی پھیر

اور اگر ہو اجازتِ طرفین
تو گھڑی چار پانچ کیجیے چین

یہی دستور ہو یہی معمول
دونوں راضی ہوں جو کہیں سو قبول

ہم دگر کی نہ ہو رضامندی
جس میں وہ بات ہو خرخندی

قاعدہ

ڈنکا جب پڑ چکا ہو مُرغے پر
دوسرا چاہے لوٹے باندھے پر

چھیلنے بیٹھے اپنے مُرغ کے خار
تو پھر البتہ کیجیے تکرار

شرط کرلی ہو پہلے سے تو سند
نامناسب ہو آگے جد و کد

قاعدہ

ہووے جو کوئی مُرغ بازی پر
اُس پہ لازم ہو باندھنی یہ کمر

دو بُڑی سے بدے نہ بازی زیاد
اس میں گو وہ خفا ہو یا کہ ہو شاد

ہو نہایت بُڑی وہ تین بدے
فائدہ کیا کہ ملکِ چین بدے

اس سے آگے بدے تو ہو تفضیح
نہیں رکھتے اسی کی بازی صحیح

جتنے کا مُرغ باز ہو نوکر
دھیان رکھے وہ اپنی آمد پر

یا کہ اُس کا نہیں اگر چاہا
بہ دیا اُس نے آدھا دوماہا

اور اس سے زیادہ جھوٹ ہو بات — آٹھویں روز کی ہو تکی لات
بازی جب تک نہ آوے آٹھواں دِن — پھر لڑائی حرام ہو اُس بِن

قاعدہ

ہو گنہ گار تو سہی انصاف — کیجیے ایک بار جُرم معاف
پھر جو تقصیر ہووے بارِ دگر — کرے غصّہ وہ جس کا ہو نوکر
اور سردار اُس کا دیوے جو ٹال — سب کو لازم ہو دیویں اس کو نکال
کریں باہر اُسے حویلی سے — کہ وہ بدتر ہو بیچے تیلی سے

قاعدہ

پچھلے کانوں بھی مُرغ لڑتے ہیں — لاتیں کھا کھا بہم بپھرتے ہیں
دمچیوں کا نہیں ہو کچھ مذکور — اور سب کچھ ہو ویسا ہی دستور
اُس کی بھی ہو اسی طرح کی ریت — ہو اسی ڈھب کی ہار ویسی ہی جیت
چاہیے جتنی لیجے بازی بد — ہو جُوا منھ کا بات ہو یہ سَند

ہم کو یہ مثنوی اسی قدر دست یاب ہوئی۔ مگر شُبہ ہوتا ہو کہ پھر بھی شاید خلتمے کے کچھ شعر رہ گئے ہوں۔ بہرصورت یہ ایک نایاب چیز تھی جو نذرِ ناظرین کردی گئی۔

سیّد انشا کی بابت تمام تذکرہ نویسوں کا خیال ہو کہ وہ سخت ہاجی تھے۔ ذراسی بات پر اپنے حریف کے ایسا پیچھے پڑتے تھے کہ اُس غریب کو اپنی جان چھُڑانا بھاری ہوجاتی تھی۔ یہی اُن کے دیوان سے بھی ثبوت مِلتا ہو مگر ہم اس وقت ایک نئی ہجو پیش کرتے ہیں جس کے نو بند ہیں مگر چوں کہ کئی بند نامہذب ہیں اس لیے ایسے بند جو دائرۂ تہذیب میں ہیں ان کو انتخاب کیا جاتا ہو۔ افسوس ہو کہ اب یہ قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ کس پر برس پڑے ہیں اور کس بے چارے کو ہدفِ ملامت بنایا ہو بظاہر کوئی گوّیا معلوم ہوتا ہو۔

خصوصاً جس کی ماں سارنگی اور بابا تنبورا ہو
وہ جھنڈو کیوں نہ پھر جس بات میں دیکھو ادھورا ہو — غنیمت ہو تناری ری ہی میں اپنی جو پورا ہو

بھلا کیا آدمیت جانے مجہول النسب ایسا
مٹھو سا پن یہ ہو جس میں نسب ایسا حسب ایسا

یہ بھونڈا پن نہ جس پر آنکھ ہرگز خوک و سگ ڈالے　　یہ کاٹھی جوں مسافر کے گلے میں پھانسی ٹھگ ڈالے
توارہ یہ بڑے ساکھو سے ہو دیں جوں الگ ڈالے　　تنڈیا یہ کہ اک فیروز شہ کی لاٹ ہگ ڈالے

عجب گوبر گنیش اس کی وہ شکلِ پر کدورت ہے
معاذ اللہ اک ماہی مراتب کی سی صورت ہے

نجیب ایسا نہ ہو دنیا کے کیوں کر کارخانے میں　　مکرر ہو گیا ہے جمع[1] اجتیں اس گھرانے میں
ہوئی ہے صرف سب اوقات وھاں گانے بجانے میں　　غرض کچھ ذات اس کی مغتنم ہے اس زمانے میں

سلیقہ بات کا یہ کچھ زباں جب اپنی کھولے ہے
تو اپنے والدِ مرحوم کو محروم بولے ہے

گھمنڈاں دومڑوں کا یہ نہایت مجھ کو بھاتا ہے　　جو کہتے ہیں کہ ہم کو بادشاہوں ساتھ ناتا ہے
جب اس کو دیکھتا ہوں کیا کہوں کیا یاد آتا ہے　　اصالت دیکھیو اس کی کہ اک پردے میں گاتا ہے

نہ سرگم گانے پر لازم ہو اس کو شرط کیوں بدنی
کہا ہے اس کو بھوپت خاں نے سارے گلے کی بدنی

مگر سا سر شکم کچھ سوس سے بھی اور بدتر ہے　　شرائیں مار آسا ہر غضب مانند اژدر ہے
پتھورا کے محل جو ترا . . . نفاخ صرصر ہے　　وہ چھچھی[2] جیسی کچھوی ناک مینڈک منھ چھچھندر ہے

تو لَد پائے بڑکنی[3] سے دل بادل جھاوا
تو اس کو بھی نہ کہہ سکیے کہ ہے اس شخص کا باوا

---

[1] یہ مصرع صحیح نہیں معلوم ہوتا اسی لیے سمجھ میں نہیں آیا۔ ۱۲۔　　[2] جھجھی

[3] بڑکنی ایک ہتھنی کا نام مر دل بادل ایک ہاتھی کا نام تھا جو زمانۂ آصف الدولہ میں تھے۔ صحیح مصرع غالباً یوں ہوگا:
تو لَد پائے بڑکنی سے گر دل بادلا جھاوا

تراشا ہے یہ بھینسا سر عجائب صنع آذر نے | بجا ہے اُس کے دروازے پہ گینڈے آکے دیں دھرنے
لگے ہے دو قدم چلنے میں اُلٹے سانس یوں بھرنے | پڑے گرمی کے مارے ہنہناتے جیسے ہوں ارنے

قیامت نوعِ انسانی میں اُلٹا قسم ہے اس کا
بنی ازرم مساق بلیغ[1] اسمہٗ ہے اس کا

کبھی ہاروت بیٹھا ہے کبھی ماروت کی صورت | نہ لگا کھاوے اُس سے دیو کی اور بھوت کی صورت
عرق سے اُس کے ٹپکے ہے سُور کی موت کی صورت | عیاں ہے اُس کی اس بک بک سے برجِ حوت کی صورت

کہا جن نے اُسے ہے یہ ملک لندھور کا بیٹا
خدا بخشے گنہ اُس کے غرض ہے وہ بہت اچھا

کوئی اور شخص ہے اور اس سے یہ غلطی ہوئی ہے کہ اُس نے سید انشا کے متعلق کہیں کچھ کہہ دیا ہے۔ انشا سخت برہم ہوئے ہیں اور ایک ہجو کہہ ڈالی ہے۔ اُس کو بھی پورا نقل نہیں کیا جاسکتا چند بند پیش کیے جاسکتے ہیں ؎

می نہد گوش کسے بر سخنِ غیبت گو | ہست ابلیس نہاں در بدنِ غیبت گو
منبعِ خبث بود جملہ تنِ غیبت گو | باید انداخت . . . در دہنِ غیبت گو

پف ردہ . . . من و . . . زنِ غیبت گو

ناسزا گفتنش از حدِ حساب افزون است | جملہ آفاق بہ عندیہ او مابون است
ایں چہ تخمے است نہ دانم کہ حقیقت چوں ست | زاں جماعت کہ قلوب ہمہ شاں پرخون است

ہمہ آمادہ بہ گردن زدنِ غیبت گو

تا شباں گاہ برآید بہ سبویش شاشم | گام آہستہ زنم بر سر و ریش شاشم
واکنم ہر دو لبش را و بہ مویش شاشم | آں چناں گرم براں ریش و گلویش شاشم

کہ چکد شاشہ فرد از دہنِ غیبت گو

[1] یہ مصرع صاف نہیں پڑھا گیا اصل کے مطابق لکھا گیا ہے۔ ۱۲۔

ہمارے خیال میں مصرع شاید یوں ہے۔ "بنی آزرم مساق بلیغ اسم ہے اس کا" جس کے اعداد سے ابن مرزا قاسم علی نام نکل آتا ہے۔ (م۔ ر۔ د)

مُردہ شوئیست کہ در دہر کسے ثانی نیست   قبح جوئیست کہ در دہر کسے ثانی نیست
یاوہ گوئیست کہ در دہر کسے ثانی نیست   زشت روئیست کہ در دہر کسے ثانی نیست
دیدۂ آں گلہ و بیرہن غیبت گو

اژدہائے است کہ آتش بہ زند عالم را   بلع سازد ز دم خویش بنی آدم را
می کشد تشنہ شدہ جملۂ آب یم را   نہ گزارد بہ جہاں شائبۂ شبنم را
ظاہر است ایں ہمہ اژدم زدن غیبت گو

ہمہ گویند پر افسردۂ ای قرم ساق   بہرہ از مسخرگی بردۂ ای قرم ساق
مال دریوزہ گری خوردۂ ای قرم ساق   نام جد و پدر آوردۂ ای قرم ساق
لعنت اللہ بریں زیستنِ غیبت گو

دشمنِ دینِ محمدؐ بود آں نا انصاف   سخن معجزہ می گوید و می خندد صاف
در شریعت نگرد از نظر استخفاف   طعنہ بر سبع مثانی زند و سورۂ قاف
ایں خیالات بود بیخ کنِ غیبت گو

با حسینؓ ابنِ علیؓ بغض و عداوت دارد   صد دلائل پئے انکار شہادت دارد
بنگر ایں کس چہ قدر ہا کہ شقاوت دارد   طعن و تشنیع بر اولادِ رسالت دارد
کردۂ غور بہ چشمک زدنِ غیبت گو

عرق آلودہ چو بابخت نگوں می آید   ارز بانش ہمہ خوف . . . د . . ل می آید
آں سیہ رو چہ بہ گوئم کہ چوں می آید   مادہ خوکے است کہ از آب بروں می آید
ایں چنیں است بلے آمدنِ غیبت گو

دوسری ہجو

بہ تحقیق یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ ہجو کس کی لکھی گئی اور سید انشا معمول سے زیادہ کس پر مہربان ہوگئے ہیں مگر نظم میں ضیا کا نام آیا ہو اور یہ بھی معلوم ہوا ہو کہ جس کی ہجو لکھی ہو وہ شخص مذہب امامیہ ہی رکھتا تھا اس لیے

خیال ہوتا ہی کہ یہ شاید میر ضیا ہوں گے۔ یہ دہلوی الاصل تھے مگر عظیم آباد میں جا رہے تھے۔ ۱۱۹۶ھ تک زندہ تھے بعض کے نزدیک ۱۱۹۴ھ میں انتقال کیا۔ بہ ہر حال یہ ایک خیال ہی اور مجھے اس پر کوئی وثوق نہیں ہی۔ مگر ہجو کے بعض بند لکھتا ہوں۔ ؎

ملعوں دروغ بلع کند تا ہمین رید 	شکلش چناں ترش کہ ہمہ صاف کین رید
گر انگبیں خورد ہمہ سر کنگبین رید 	زانساں کہ از ممر مری ایں لعین رید
کے شپرک ز راہ دہن ایں چنین رید

خفاش ہرچہ بد برش آید بہ دام او 	سرگشتہ کور موش برائے سلام او
چلپاسہ چوں کنیزک و حر با غلام او 	تعفین مُردگان نرود از مشام او
نکہت اگرچہ صد چمنِ یاسمین رید

خوش می کند شراب عداوت سبو سبو 	ذوالاحترام را نہ کند ہیچ آبرو
نامش برند ہم چو معاویہ کو بہ کو 	از خرقہ تشیع پوچش حذر کہ او
شمر و سنان ابنِ انس را سنین رید

تذلیلِ اوست جملۂ امراض را علاج 	پیداست بہرِ لاعنِ او سور و ابتہاج
قوّت ہمی فزاید و خشنیتِ مزاج 	خاقاں چو لعن کردن او را دہد رواج
صد مشک نافہ آہوے صحرائے چین رید

ہاما چگونہ می سزدش کرد انحراف 	باید بہ ایں جریمہ دو صد عجز و اعتراف
ہاں ای ضیا بہ کوش بہ خود ایں قدر ملاف 	طبع بلند ماست بلے ہم چو کوہ قاف
سی مُرغ کلکِ ما ہمہ تاج و نگین رید

زیں نعرہ می رسد بہ فلک صدمۂ عظیم 	مُخِ دماغِ چرخ برآید ز خوف و بیم
سازیم از لکد کرۂ خاک را دو نیم 	آلودہ با بلاغم احشا و خون و ریم
آں ہر دو شاخ سرزدہ گاو زمین رید

در روده اش سحاب تواند بسر برد   برقِ جہاں بہ دام ز گورش شرر برد
بوے عفونتش نفسِ خوک و خر بَرد   انشا ثواب گلشن ہجوش اگر برد
گاؤ نسیمِ صبح گر عنبرین رسید

انشا کو طلسمات اور شعبدوں کا بھی بڑا شوق تھا۔ اُن کے دیوان میں یہ چیزیں کثرت کے ساتھ موجود ہیں لہٰذا ایک طلسم غیر مطبوعہ نقل کرکے ہم اپنے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں ؎

وہ گھڑا جو کہ ہو مجھولا سا   آٹھ دس سیر جس میں پانی ہو
اُس کو چھلکا کے آبخورہ ایک   رکھ دو اور گرد اس کے لیوا دو
تو گھڑا بھی وہ پھر اُٹھ آئے گا   جو اُٹھا لیجیے آبخورے کو
ہے یہ حاضر طلسم انشا پاس
جب اسے چاہو آپ کر دیکھو

بمبئی کی اُردو صحافت!

(از جناب رئیس احمد صاحب جعفری، ایڈیٹر روزنامہ انقلاب بمبئی)

بمبئی کی اُردو صحافت ۱۸۹۹ء تک [1]

اُردو صحافت کا اگر نگاہِ غور سے مطالعہ کیا جائے، تو اس عجیب اور حیرت انگیز حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ گو صوبۂ بمبئی کو یہ فخر حاصل نہیں ہے کہ وہ اُردو داں حلقوں میں شمار ہو، پھر بھی، اُردو صحافت کی تعمیر اور تشکیل میں اس کا نمایاں حصہ ہے۔

شمالی ہند اُردو کا وطن ہے، کلکتہ کا فورٹ ولیم کالج اُردو کی تربیت گاہ ہے، بنگال اور بہار میں ربط ہے، بہار اور صوبے جات متحدہ میں وابستگی ہے، صوبے جات متحدہ اور دلی میں مماثلت ہے، دلی اور پنجاب ایک ہیں، پھر اگر ان سب مقامات میں اُردو زبان کو فروغ حاصل ہوا تو مایۂ حیرت نہیں، حیرت اگر ہو سکتی ہے تو اس پر کہ بمبئی جیسے دور دراز مقام پر، جہاں پہلے سے گجراتی کا سکہ چل رہا تھا، اور مرہٹی کی عمل داری تھی، اور انگریزی کی سلطانی قائم ہو چکی تھی ——— اُردو زبان کو فروغ حاصل ہوا۔

یہ صحیح ہے کہ یہاں کی اُردو صحافت بالعموم شمالی ہند کے ادیبوں اور اخبار نویسوں کے ہاتھوں پھلی پھولی، پروان چڑھی۔ لیکن کیا اس امر واقعہ سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ بمبئی کے عوام میں، اور خواص میں، اُردو زبان کو اپنانے اور مقبول بنانے کا جذبہ پہلے سے موجود تھا؟ اگر یہ نہ ہوتا تو یہاں سے اُردو اخبارات کیوں کر نکلتے؟ کس طرح کامیابی حاصل کرتے؟ اب سے ۷۰، ۸۰ سال پہلے کی صحافت کا آج کی صحافت سے، اس

---

[1] بمبئی میں پہلی اُردو کانفرنس ۲۳-۲۴-۲۵ فروری ۱۹۴۵ء کو بابائے اُردو مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو (ہند) کی زیر صدارت منعقد ہوئی تھی یہ مقالہ اسی کانفرنس کے لیے لکھا گیا۔

زمانے کی دشواریوں کا آج کی سہولتوں سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ آج معمولی سے معمولی اخبار بھی سرکاری نیم سرکاری، تجارتی اور فلمی اشتہارات گراں تر نرخوں پر حاصل کرسکتا اور کرتا ہے۔ اُس زمانے کے اخبارات، اشتہارات سے بالکل محروم تھے، ان کا مدارِ حیات تمام تر خریداروں پر تھا اور ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ بنیاد آج کی بنیاد سے زیادہ مضبوط تھی۔

پون صدی پہلے کے اخبارات

سرِ دست یہ کہنا مشکل ہے کہ بمبئی میں سب سے پہلا اُردو اخبار کون تھا؟ لیکن سنہ ۱۸۶۷ء سے باقاعدہ سلسلہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ جب حکومتِ ہند نے رجسٹری کتب و اخبارات کا قانون نافذ کیا تھا، اس سال بمبئی سے اُردو کے تین اخبار نکلتے تھے۔

(۱) 'کشف الاخبار'

(۲) 'برقِ خاطف'

(۳) 'لطیف الاخبار'

سنہ ۱۸۸۰ء میں 'عندلیبِ ہند' ایک اخبار جاری ہوا یہ پہلے ہفتہ وار تھا، پھر ہفتے میں تین بار ہوگیا' اسی سال ایک اور اخبار 'جہاں نما' جاری ہوا، یہ اُردو اور فارسی میں شائع ہوتا تھا۔ سنہ ۱۸۸۲ء میں دو اخبارات جاری ہوئے۔

(۱) 'ارمغان'

(۲) 'خیر خواہِ اسلام'

سنہ ۱۸۸۳ء میں حسبِ ذیل اخبارات جاری ہوئے:۔

(۱) 'الطاف'

(۲) 'منظہر'

(۳) 'شوکتِ اسلام'

(۴) 'دیدۂ اسلام'

(۵) "خادمِ ہند"

(۶) "ملیٹری السٹریٹر"

۱۸۸۵ء میں اخبار "ارمغانِ ہند" کا اضافہ ہوا، ۱۸۸۶ء میں ایک نیا اخبار "شوکتِ ہند" اشاعت پذیر ہوا۔ ۱۸۹۰ء میں "جوہر" جاری ہوا، ۱۸۹۱ء میں "مخبر" اور ۱۸۹۳ء میں حسب ذیل اخبارات جاری ہوئے:۔

(۱) روزنامہ "وکیلِ اسلام"

(۲) "انڈیا گزٹ" ہفتہ وار

(۳) "عالم افروز" ہفتہ وار

۱۸۹۴ء میں کچھ اور نئے اخبارات جاری ہوئے:۔

(۱) "معین الملک"

(۲) "زبان"

(۳) "مسلم ہیرالڈ"

۱۸۹۵ء میں یہ نئے اخبارات نکلے:۔

(۱) "بشیر الملک" ہفتہ وار

(۲) "آئینۂ ہند" ماہ وار

(۳) "مرآۃ الاخبار"

۱۸۹۶ء میں دو نئے اخبارات نکلے:۔

(۱) "بمبئی پنچ بہادر"

(۲) "سفیر"

۱۸۹۷ء میں کئی نئے اخبارات جاری ہوئے:۔

(۱) "ابوالفیض" ہفتہ وار

(۲) "نیرِ اسلام" "

(۳) ''آزاد پنچ'' ہفتہ وار

(۴) دجنٹلمس آف دی پیس' ہفتہ وار

(۵) ''مقبولِ عالم'' ہفتہ وار

(۶) ''منصفِ دکن'' ''

(۷) ''سلطان الاخبار'' روزنامہ

کچھ اور پُرانے اخبارات!

میں عرض کرچکا ہوں، بمبئی کی اُردو صحافت کے آغاز کی صحیح تاریخ فی الوقت نہیں بیان کی جاسکتی۔ اس سلسلے میں گراں قدر معلومات حاصل ہوسکتے ہیں، آیندہ مزید تحقیق و تفتیش کی جائے، تو پوری جامعیت کے ساتھ ایک مکمل تاریخ بھی مرتب ہوسکتی ہے۔

اوپر کی سطروں میں اخبارات کی جو فہرست میں نے پیش کی ہے، یہ اُس وقت سے شروع ہوتی ہے جب ۱۸۶۷ء میں حکومتِ ہند نے رجسٹری کتب و اخبارات کا قانون نافذ کیا تھا، مذکورہ فہرست حکومت بمبئی کے محکمۂ تراجم مشرقیہ کے شعبۂ اُردو کے انچارج مسٹر ہمتی کی دیدہ ریزی کا نتیجہ ہے، لیکن بمبئی کی اُردو صحافت کا یہ نقطۂ آغاز نہیں ہے۔ مزید تحقیق اور تجسس کے بعد اس سے پہلے کے بھی کچھ اجزا دستیاب ہوسکتے ہیں۔ اب میں انھیں پیش کرتا ہوں۔

مشہور فرانسیسی مستشرق موسیو گارساں دتاسی کی کتاب ''ہندستانی ادب از ۱۸۵۰ء تا ۱۸۶۹ء'' کا ترجمہ انجمن ترقی اُردو (ہند) کی طرف سے شائع ہوچکا ہے۔

گارساں دتاسی اگرچہ پکا عیسائی تھا، اور اسے ہندستانی لٹریچر سے بالعموم اور ہندستانی یا اُردو زبان سے بالخصوص بہت دل چسپی تھی۔ کیوں کہ ہندستان میں تبلیغ عیسائیت کی رفتار پر وہ باقاعدہ نظر رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی یہ دل چسپی مورخانہ حیثیت سے آج ہمارے لیے بڑے کام کی چیز ثابت ہورہی ہے۔

گارساں دتاسی نے اپنے پانچویں خطبے میں جو ۵ دسمبر ۱۸۵۵ء کو پڑھا گیا، اردو پریس کی تدریجی ترقی پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ بمبئی کا ذکر وہ اس طرح کرتا ہے:-

"بمبئی میں تین یا چار ہندستانی اخبار ہیں! ان چار میں سے صرف دو کے نام معلوم ہو سکے :-

(۱) بمبئی کا ہرکارہ

(۲) تازہ بہار

۱۸۵۹ء کے خطبے میں گارساں دتاسی نے بمبئی کے دو اخبارات کا ذکر کیا ہے :-

(۱) راست گفتار

(۲) بامداد (یہ عیسائیوں کا مذہبی پرچہ تھا)

۱۸۶۵ء کے خطبے میں دتاسی نے صرف ایک اخبار کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :-

"سورت میں جہاں ... کوئی اردو کا اخبار شائع نہیں ہوا تھا، مئی ۱۸۶۰ء سے باقاعدہ ایک اردو ہفتہ وار جاری ہے ... زبان نہایت فصیح ہے اس اخبار کا نام منظور الاخبار ہے!"

"کشف الاخبار" ... میں عرض کر آیا ہوں کہ حکومتِ ہند کے قانون کے بموجب اس کی رجسٹری ۱۸۶۵ء میں ہوئی تھی، اب ... دتاسی کے ایک خطبے سے اس کی تاریخِ آغاز بھی معلوم ہوگئی۔

۱۸۶۲ء کے خطبے میں ... دتاسی "کشف الاخبار" کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے :-

"بمبئی سے کشف الاخبار ... سے نکلنا شروع ہوا ہے یہ ہفتہ وار ہے، اور ہر بدھ کو شائع ہوتا ہے، اور چھوٹی تقطیع کے ... صفحوں پر مشتمل ہے۔ لکھنؤ کے منشی امان علی اس کے ایڈیٹر ہیں۔ ہر نمبر کے شروع میں ایک چھوٹی سی ... ہیں اس نمبر کا پورا پروگرام لکھا ہوتا ہے!"

چند اور نام

گارساں دتاسی کے خطبات اور حکومتِ بمبئی کے محکمۂ تراجم مشرقیہ کی فہرست سے اخبارات کے ناموں کا ایک خاکہ پچھلے صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے، با ایں ہمہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ فہرست بھی مکمل ہے۔ خوش قسمتی سے مذکورہ فہرست میں سے متعدد اخبارات کے فائل مجھے دستیاب ہو گئے۔ ان فائلوں کے مطالعے سے، معاصرانہ نوک جھونک، آپس کی چھیڑ چھاڑ یا تنقید و تبصرے کے ضمن میں بھی بعض اخبارات کے نام معلوم ہوئے، ان کی مختصر فہرست یہ ہے :-

(۱) "تحفہ" غالباً ۱۸۹۴ء
(۲) "درافشاں" " ۱۸۹۴ء
(۳) "نجم الاخبار" " ۱۸۹۴ء
(۴) "آئینۂ ہند" " ۱۸۹۵ء
(۵) "قاسم الاخبار" " ۱۸۹۶ء
(۶) "مسلم" " ۱۸۹۶ء
(۷) "گل زارِ سخن" " ۱۸۹۳ء

مذکورہ اخبارات کی اشاعت اور حیثیت

اُوپر کی سطروں میں جن اخبارات کا ذِکر ہوا، ان میں سے چند پر مختصر تبصرہ مع نمونہ تحریر میں آگے چل کر پیش کروں گا، لیکن عام تعارف کی غرض سے یہاں اتنا لکھنا مناسب ہو کہ یہ اخبارات بالعموم کتابی سائز پر نکلتے تھے، خواہ روزانہ ہوں یا ہفتہ وار، زیادہ سے زیادہ ضخامت ۱۶ صفحات پر ہوتی تھی اور کم سے کم ۴ صفحات۔ اشاعت بالعموم ایک سو سے لے کر پانچ سو تک محدود ہوتی تھی۔ کتابت ناقص، کاغذ خراب، چھپائی باصرہ شکن۔

خبریں بہت کم ہوتی تھیں، اور جو کچھ ہوتی تھیں وہ احوال اور اخبار سے زیادہ عجائب، وغرائب پر مشتمل ہوتی تھیں، یا ذاتی نوک جھونک ہوتی تھی، اندازِ کلام بسا اوقات سوقیانہ ہوتا تھا، معاشرتی اور سماجی خبریں بھی شائع کی جاتی تھیں۔ سیاسی خبروں پر بالخصوص ان کی تفصیلی نوعیت پر بہت کم لکھا جاتا تھا۔

خلیفۃ المسلمین سے والہانہ عقیدت، رُوس سے للّٰہی دُشمنی، برطانیہ کی مداخلت، یونان کی سرکشی، اور سرتابی، ریاست ہائے بلقان کی شورش، ترکوں کی بہادری اور شجاعت، ایران اور رُوس کی مخاصمت۔ ان مسائل پر، حمیتِ دینی اور غیرتِ مذہبی، اور جوشِ ملی کا نہایت دلیری سے یہ اخبارات مظاہرہ کرتے تھے، لیکن سیاسیات ہند پر، مسلمانانِ ہند کی کس مپرسی پر، حکومتِ انگلشیہ کی داخلی پالیسی پر گفتگو کرنے سے دامن بچاتے تھے۔

روزانہ اخبارات میں بھی خبریں بہت کم ہوتی تھیں، مضامین زیادہ ہوتے تھے۔ مضامین کے لیے یہ ضروری نہیں تھا، کہ وہ سیاسی ہوں، علمی، اقتصادی، روحانی، طبّی، مذہبی، سماجی، معاشرتی، غرض ہر قسم کے مضامین ہوتے تھے۔ مقامیات پر ذاتی نوک جھونک کے علاوہ بہت کم توجّہ کی جاتی تھی۔

بعض اخبارات پر تبصرے

انجمنِ اسلام اسکول (بمبئی) کی لائبریری میں، بمبئی کے بعض نہایت قدیم اخبارات و رسائل کے کچھ فائل موجود ہیں۔ خوش قسمتی سے مجھے ان کے مطالعے کا موقع ملا۔ ان میں سے کچھ اخبارات پر میں تبصرہ کرنا چاہتا ہوں، تاکہ عہدِ ماضی کے اخبارات اور بمبئی کی صحافتِ اُردو کی ایک جھلک آپ کے سامنے آجائے۔

حدیقۃ الاخبار

میرے سامنے اس وقت ”حدیقۃ الاخبار“ مورخہ یکم اپریل ۱۸۷۴ء کا ایک پرچہ ہے۔ اسی سال یہ پرچہ اشاعت پذیر ہوا ہے، پہلے صفحے پر بطرزِ مثنوی ایک نظم ہے، دوسرے پر خبریں ہیں۔

یکساں خبروں کی ایک سُرخی ہے اس ضمن کی دوسری خبریں ”ولہ“ کے ماتحت دی گئی ہیں، خبروں میں اظہارِ رائے اور رقّتِ قلب کے نقوش بھی موجود ہیں، انشاپردازی اور عبارت آرائی کا جوہر بھی ہے ایک خبر کا عنوان ہے ”مرگِ شوق!“ عبارت یہ ہے:-

> ”مورخہ ۲۶ ماہِ مارچ ۱۸۷۴ء کی صاحبِ ٹائمس آف انڈیا یہ واردات اپنے صحیفۂ سامی میں رقم کرتے ہیں، کہ ایک پارسی کوسنے میں کود کر ہم آغوشِ بحرِ فنا ہوا۔ بعد تحقیقات کے اہالیانِ جیوری نے فتوا دیا کہ متوفّی مذکور خود بہ خود ہم کنارِ قلزم قضا ہوا ولہ شیخ ابراہیم و محمد تار داؤد ساسون کی گودی میں کچھ کام میں مشغول تھے۔ قضائے کار ان کو یکایک سخت ضرب لگی، زخمی ہوئے، فوراً ان کو جمشید جی جی جی کے دارالشفا میں لے گئے۔ ــــــــــــــــ“

”پاداشِ تقصیر“ کے عنوان کے ماتحت متعدد خبریں درج ہیں، تین ملاحظہ ہوں:-

”صاحبِ ٹائمس آف انڈیا کے ۲۸ مارچ کے صحیفۂ سامی سے واضح ہوا۔ کہ ایک کم سن لڑکی کھڑکی میں سے گر گئی، جس سے اس کے سینے میں ضربِ شدید پہنچی۔ حضرت حکیم علی الاطلاق جلد شفا بخشے! ولہ دو لڑکے ہندو زاد کم سن قریب دیر کے ایک لوہے کی پتّی سے بازی کر رہے تھے۔ قضائے کار پتّی ان کے

ہاتھوں سے چھوٹ گئی، اور ان کو بھی ضرب لگی۔ حدیقۃ الاخبار ہم اپنے بھائی ہم وطنوں کو تاکید کرتے ہیں، اس قدر تغافل نہ کریں حتی المقدور غافل نہ رہیں۔ ولہ ماہ مارچ کی ۲۵ تاریخ کو یہ انکشاف ہوا کہ ہرمزجی پسٹن جی پریس میں کچھ کام کر رہا تھا قضائے کار ایک لوہے کا ٹکڑا اس کے ہاتھ پر گر گیا اور اس سے اس کو نہایت صدمہ پہنچا، اسی دم اس کو استخواں ساز کے پاس لے گئے۔!"

یہ خبریں بھی ہیں اور ایڈیٹوریل نوٹس بھی، خبر کے ساتھ حکیم علی الاطلاق سے دعا بھی ہے ہم وطن بھائیوں کو نصیحت بھی ہے۔

اس سلسلے میں چند خاص باتیں قابلِ غور ہیں:۔

(۱) انگریزی اخبارات کو "حدیقۃ الاخبار" کی اصطلاح میں معاصر کے نام سے یاد نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے نام کے پہلے "صاحب" کا لفظ ایزاد کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً "صاحب ٹائمس آف انڈیا" "صاحب پانیر" وغیرہ۔

(۲) کنواں کو، کوا، لکھا گیا ہے۔

(۳) فتویٰ کے بجائے فتوا، اِملا کی یہ وہ اصلاح ہے، جسے انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) جاری کرنا چاہتی ہے، مثلاً اعلیٰ کے بجائے اعلا۔

(۴) ہسپتال کے لیے دارالشفا استعمال ہوا ہے۔

(۵) مندر کو دیر سے یاد کیا ہے۔

(۶) کھیل کود کے بجائے بازی لکھا ہے۔

(۷) "بون سٹر" (BONE SETTAR) کا بہترین ترجمہ "استخوان ساز" کیا ہے۔

۱۲ مئی ۱۸۷۴ء کے حدیقۃ الاخبار میں، ایک بڑی دلچسپ خبر شائع ہوئی جو درج ذیل ہے:۔

"گوالیار کے مہاراجہ نے زمانۂ پیشین میں ایک عورت ہندو خوب صورت پری رو بطور داشتہ کے رکھی تھی اور اس کے دو لڑکے بھی پیدا ہوئے تھے جو فی الحال نوجوانی کو پہنچے ہیں۔ تھوڑے دن کا عرصہ ہوا کہ مہاراجہ اور اس عورت کے درمیان بے اتفاقی واقع ہوئی اور بسبب نااتفاقی کے وہ عورت مہاراجہ کو چھوڑ کے شہر لکھنؤ میں قیام پذیر ہوئی، اور وہاں مسلمان ہو گئے ایک مسلمان کے ساتھ نکاح کیا اتفاقاً ان دنوں میں بطور

سیر کے مہاراجہ کا لکھنؤ میں گزر ہوا ، اور وہاں یہ بات اس کی سماعت میں آئی کہ میری داشتہ یہاں آئی ہو اور مسلمان ہو کے کسی مسلمان کے ساتھ اس نے نکاح کیا ہو، مہاراجہ کو از سرِ نو عشق پیدا ہوا غلبۂ شوق میں دیدار کا تمنا ہوا ، عقلِ سلیم پابہ زنجیر ہوئی ۔ آرزومند زلفِ شکیں گلوگیر ہوئی ، آتش رخسارِ شمع رو نے رشکِ پروانہ بنادیا ، دل شیدا کو ، کہ مدت تک اس لیلیٰ عذار کے ساتھ رہا مانندِ مجنوں کے دیوانہ بنادیا آخر اس کے گھر جانے کا ارادہ کیا ہرچند مصاحب مانع ہوئے کہ جانا آپ کا اس کوچے کی طرف باعثِ درد و خجلت بلکہ موجب ہتکِ عزت ہو، کسی کا کہنا نہ مانا بلکہ کوئے جاناں میں جانے کو جان سے عزیز جانا قصہ کوتاہ چند سپاہی ساتھ لے کر اس گھر کے قریب پہنچے اور عورت کو بہ جبر گھر سے نکال کر اس مقصد میں تھے کہ اپنے گھر لے جاویں ، اہالیانِ پولیس کو خبر ہوئی ، انھوں نے زنِ مذکورہ کو چھڑایا اور مہاراجہ صاحب کو وہاں سے مکان تک پہنچایا جب کمشنر پولیس مسٹر نیویری صاحب کو خبر ہوئی تب صاحب مذکور نے لکھنؤ سے کوچ کرنے کا حکم دیا ، دوسرے دن مہاراجہ صاحب اسپیشل ٹرین میں سوار ہوکر لکھنؤ سے سدھارے ، خلافِ عقل و تدبیر بازی ہارے ——— "

اس عبارت کی ایک خصوصیت یہ ہو کہ ساری خبر میں کوئی نیا پیراگراف استعمال نہیں ہوا ہو۔ یہ بھی اندازہ ہوتا ہو کہ خبریں کس طرح فصاحت و بلاغت کے دریا میں غوطہ دے کر شائع کی جاتی تھیں۔

یہ اخبار رائل سائز کے چار صفحوں پر نکلتا تھا ؛ خبروں کا کام اداریے سے اور اداریے کا کام خبروں سے لیا جاتا تھا ۔

'مخبرِ سرور'

یہ اخبار بھی چار صفحات پر شائع ہوتا تھا ، ملکی خبریں بہت کم ہوتی تھیں ۔ عالمِ اسلام کی بالعموم اور دولتِ عثمانیہ اور خلیفۃ المسلمین کی خبریں بہت ہوتی تھیں ۔

۹ نومبر ۱۸۷۶ء کا پرچہ میرے سامنے ہو نمونتاً اداریہ درج کیا جاتا ہو :۔

" کلکتہ کی رہنے والی ایک ضعیفہ ، نیک اطوار نے جب سُنا کہ کلکتہ میں مجروحین و یتیم و بیوگان شہدائے عساکرِ سلطانی کے واسطے رُپیہ جمع ہوتا ہو ، اور سلطان خلد اللہ ملکہٗ کی فوج کفار نمک حرام سے برسرِ مقابلہ ہو ، تو فوراً اُٹھی اور اپنے ہاتھ کے کنگن طلائی جو اس نیک ذات نے اپنے کفن کے خرچ کو رکھ چھوڑے تھے لے جاکر انجمنِ عام کلکتہ کے نذر کیے اور بولی کہ یہ رُپیہ میں نے راہِ خدا میں عساکرِ سلطان کے مجروحین وغیرہ کو دیا ۔

ازاں جملہ ایک دوسری عورت بھی آئی اور ایک ہزار روپیہ لاکر اہالیانِ انجمن کو تسلیم کیا۔

آفریں صد آفریں ان نیک بخت عورات کی ہمتِ مردانہ کو سچی دل سوزی اسی کا نام ہی۔ کلکتہ میں بیس ہزار اور بڑودہ میں پانچ ہزار روپیہ چندے کا جمع ہوا۔"

خبریں اس اخبار میں بھی کم ہوتی تھیں مضامین زیادہ، لیکن اس اخبار کی خبروں اور مضمونوں میں عبارت آرائی کم ہوتی تھی، عموماً زبان صاف اور سادہ استعمال کی جاتی تھی۔

'عندلیب ہند'

یہ اخبار ——— 'حدیقۃ الاخبار' اور 'مخبر سرور' کے مقابلے میں زیادہ مکمل اخبار تھا، ضخامت بارہ صفحات کی تھی، خبریں بھی کافی ہوتی تھیں، تجارتی اشتہارات کی بھی کثرت تھی، واقعات اور مسائل پر اڈیٹوریل بھی لکھا جاتا تھا، پالیسی مرنجاں مرنج تھی۔

ا۔ اپریل ۱۸۸۱ء کے پرچے میں نئے زارِ روس کی تخت نشینی پر ایک اداریہ لکھا گیا ہی، جس سے اخبار کی پالیسی، اسلوبِ نگارش، اندازِ غور و فکر پر روشنی پڑتی ہی۔ افتتاحیہ یہ ہی:۔

"شاہِ روس ابھی نوجوان بادشاہ ہی جس کے دل میں مدتوں سے منصوبے گٹھ رہے ہیں، جن کی تعمیل سے وہ بوجہ مزاحمتِ پدری قاصر تھا اب ضرور انتظامِ باغیاں سے فارغ ہوکر بروئے کار آئیں گے۔ اور بعض سلطنتوں میں کھڑ بھڑ مچائیں گے۔ کس لیے کہ یہ قاعدۂ مستمرہ ہی کہ ہر بادشاہ جب نیا نیا تختِ حکومت پر جلوہ گر ہوتا ہی تو وہ خواہ مخواہ اپنی نام آوری اور عالی ہمتی جتانے کے واسطے کچھ نہ کچھ کارروائی کیا ہی کرتا ہی مثلاً جب شاہ نکلس نے بعد معرکۂ سیاستی پول قضا کی اور زارِ مرحوم اپنے باپ کے جانشین ہوئے تو انھوں نے یومِ تخت نشینی سے تا روزِ مرگ کیسے کیسے ہاتھ پانو پھیلائے، اب زارِ حال بھی بقولیکہ ع

ہر چہ پدر نہ تواند پسر تمام کند

اولوالعزمی کے جوہر دکھائیں گے اور جو خیالات کہ پیش نہادِ خاطر ہیں وہ قوت سے فعل میں لائیں گے۔"

اس اخبار کی ایک خصوصیت یہ بھی کہ اس میں تجارتی، اور موسمی خبریں بھی شائع کی جاتی تھیں۔ عبارت عام فہم اور رواں ہوتی تھی، روس اور ممالکِ اسلامیہ کی آویزش، ترکی اور فرانس کی چپقلش اور دوسرے بین الاقوامی معاملات و مسائل پر نسبتاً آزادی سے یہ اخبار بحث و گفتگو کرتا تھا۔

خیر خواہِ اسلام

یہ اخبار آٹھ صفحات پر شائع ہوتا تھا، اس میں کافی خبریں ہوتی تھیں، لیکن غیر اہم، جتنی غیر اہم اتنی ہی مفصل بھی۔ بعض دل چسپ خبریں بھی شائع ہوتی تھیں مثلاً ۲۵ مارچ ۱۸۸۷ء کے پرچے میں ایک خبر شائع ہوئی ہے:-

"پورٹ بلیر کا موسم نہایت عمدہ معلوم ہوتا ہے کیوں کہ وہاں کے لوگوں کی عمر زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ جوبلی کے دن جو قیدی رہا ہوئے، تھے اُن میں کئی باشندے حیدرآباد کے ہیں، جو قریب سو برس کے گزرے کہ علتِ ڈکیتی میں حبسِ دوام کے لیے قید ہوے تھے، اور اب وہ رہا ہوے ہیں۔"

اس خبر کے عجیب پہلو یہ ہیں کہ

(۱) ڈکیتی کے الزام میں اس زمانے میں حبس دوام کی سزا ہوتی تھی۔

(۲) حبسِ دوام کے قیدی سو سو برس تک جیل میں رکھے جاتے تھے۔

(۳) عمریں کم و بیش سوا سو برس کی ہوتی ہوں گی۔

اس اخبار میں اداریہ شاذ و نادر ہوتا تھا۔ مراسلات کی کثرت ہوتی تھی۔ طبی اور روحانی اور مذہبی مضامین بھی اس میں شائع ہوتے تھے۔

۸ جنوری ۱۸۸۸ء کے پرچے میں انجمنِ اسلام احمد آباد کا وہ سپاس نامہ شائع ہوا ہے جو "حضور فیض گنجور نواب گورنر صاحب بہادر بمبئی بہ القابہ ادام اللہ شوکتہٗ" کے حضور میں پیش کیا گیا تھا۔

خاص بات یہ ہے کہ گورنر کو یہ سپاس نامہ فارسی زبان میں دیا گیا تھا۔

'مخبر'

یہ بھی ہفتہ وار شائع ہوتا تھا، اس میں مُلکی اور غیر مُلکی خبریں کم ہوتی تھیں مقامی یعنی بمبئی کی خبریں زیادہ سے زیادہ ہوتی تھیں یہ ضروری نہیں تھا کہ ہر پرچے میں اداریہ ہو، اور جس پرچے میں اداریہ ہو تو اس کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ اس کا کوئی عنوان بھی ہو۔

اس اخبار کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں مضامینِ خاص، مراسلات، منظومات وغیرہ کی

بھرمار نہیں ہوتی تھی۔

۱۰ر اکتوبر ۱۸۹۱ء کے پرچے میں ایڈیٹر نے لیورپول کی مجوزہ مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں ایک پُرزور افتتاحیہ لکھ کر مسلمانوں کو توجہ دلائی ہی کہ وہ مسٹر عبداللہ کوئیلم کی ضروری امداد کریں، تاکہ یہ مسجد جلد از جلد تعمیر ہوسکے۔

'عالم افروز'

یہ ہفتے میں تین بار شائع ہوتا تھا، یہ انجمن امامیہ کا آرگن تھا اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ ریاستی ہند کے واقعات پر بھی تبصرے کرتا تھا۔

اس اخبار میں بھی خبروں سے اداریے کا اور اداریے سے خبروں کا کام لیا جاتا تھا۔

یہ شیعہ اخبار تھا، لیکن "سنی شیعہ" تنازعات کا علم بردار نہیں تھا، مُلکی اور غیر مُلکی سیاسیات میں ایک مسلمان کی حیثیت سے رائے دیتا تھا، البتہ نواب محسن الملک سے بہت خفا تھا ان کے خلاف اس اخبار کی زہرچکانیاں شائستگی اور تہذیب کے حدود سے بھی گزر گئی تھیں۔

اس اخبار میں تجارتی اشتہارات کافی ہوتے تھے، جس سے اندازہ ہوتا ہی کہ اس کی اشاعت معقول تھی۔

۲۰ر دسمبر ۱۸۹۳ء کا پرچہ میرے سامنے ہی، اس میں والیانِ ریاست کے سفر و سیر اور گل گشتِ فرنگ پر بڑے سخت الفاظ میں لے دے کی ہی یہ اخبار اس کا سخت مخالف تھا کہ والیانِ ملک اپنی رعایا کی گاڑھی کمائی سیرِ فرنگ میں برباد کریں، مہاراجہ بڑودہ کے متعلق لکھتا ہی:۔

"سُنا جاتا ہی کہ اس مرتبہ مہاراجہ صاحب بڑودہ دو برس تک ولایت میں رہیں گے، ۲۵ لاکھ رُپے سالانہ کا تخمینہ ہوا ہی۔ غرض کہ ولایت کی سیر میں ۵۰ لاکھ رپے پانی پھر جائے گا۔"

نواب صاحب رام پور کے بارے میں لکھتا ہی:۔

"آج کل آپ انگلستان کے دیہات میں مقیم ہیں جہاں آپ شیروں اور خرگوشوں کا شکار کرتے والے ہیں، ہمارے نزدیک اپنے ملک میں اگر یہ شکار کھیلتے تو بہت کم خرچ ہوتا!"

اپنے اداریوں میں بڑی سوجھ بوجھ کی باتیں یہ لکھتا تھا۔ اُس زمانے میں ہندستان کے لوگ بڑے

شوق سے بیرسٹری پاس کرنے انگلستان جایا کرتے تھے، یہ اخبار اس قسم کے مسافروں کو مخاطب کرکے لکھتا ہے :-

"بیرسٹر تو ہمارے ملک میں بہتیرے ہیں، ہندستان کو تو اس وقت ضرورت ایسے لوگوں کی ہے، جو یورپ کی صنعت وحرفت میں کامل دست گاہ رکھتے ہوں!"

اس اخبار میں لطیفے بھی درج ہوا کرتے تھے ایک لطیفہ ملاحظہ ہو :-

"کسی جلسے میں ایک جرمن صاحب شیخی بگھار رہے تھے کہ جرمنی زبان سب سے قدیم اور پاک ہے۔ چناں چہ بہشت میں حضرت آدم یہی بولتے تھے ایک ظریف مجمع میں بیٹھے ہوئے تھے یہ بات کاٹ کر بولے، جب ہی بہشت سے نکالے گئے تھے!"

ملکہ وکٹوریہ کی بیوگی کے بعد ایک خبر اس اخبار میں شائع ہوئی تھی جو شاید آج بھی دل چسپی سے خالی نہ ہو :-

"حضور ملکہ معظمہ نے اپنے شوہر عالی قدر پرنس البرٹ آں جہانی کے مرقد کے بائیں طرف اپنی آرام گاہ تیار کروا رکھی ہے پرنس البرٹ کا پتلا اس قبر کی داہنی طرف جنگی لباس زیب بر کیے ہوئے قائم کیا گیا ہے اور ایک گوشے میں پر پھیلائے فرشتوں کی تصاویر کندہ ہیں، حضور ممدوحہ نے جو کتبہ اپنی آخری آرام گاہ کے قریب نصب کرایا ہے اس کی عبارت کا ترجمہ یہ ہے۔ میرے پیارے خوش رہیے، آپ کی بہبودی ہو آخر کار میں بھی آپ سے دائمی محبت میں آسائشِ دائمی کے لیے آؤں گی اور خداوند عیسیٰ مسیح کے ساتھ جن کا جلالِ ابدی اور بے زوال ہے، میں اور آپ باہم جاکر ملیں گے!"

"محمڈن ہیرالڈ"

چھوٹے سائز کا آٹھ صفحوں پر شائع ہوتا تھا۔ ایک صفحہ انگریزی میں شائع ہوتا تھا، خبریں کم ہوتی تھیں، مختلف معاملات ومسائل پر چھوٹے چھوٹے نوٹ ہر ہفتے دیے جاتے تھے۔

طرزِ نگارش اور اس زمانے میں بمبئی کی مالی حالت کا سرسری جائزہ لگانے کے لیے ۱۳ جنوری ۱۸۹۳ء کا یہ اداریہ ملاحظہ ہو :-

"سرکاری رپوٹ سے معلوم ہوا کہ بمبئی پریسیڈنسی کی کل آمدنی سالِ گزشتہ میں چار لاکھ پانچ ہزار تھی

۱/۲ ۲ لاکھ سے زیادہ رُوپیہ سوداگروں سے وصول ہوا، اہلِ پیشہ سے ۴۸۸۳، اُڈپی، دُکان داروں سے ۴۴۵۰۰، کارخانوں سے ۲۵۱۵، مالکانِ جائداد سے ۸۹۴، باربرداری والوں سے ۹۵۴۰، ملازمت پیشہ سے، ۱۱۴۰۳، کمپنیوں سے ۱۸۰۹۲، سودی کاغذ سے ۲۲۶۹ --- !"

آج کی سرکاری آمدنی کو ۱۸۹۳ء کی آمدنی سے کوئی نسبت ہے؟

'مسلم ہیرالڈ'

یہ روزانہ اخبار تھا، کتابی سائز کے آٹھ صفحوں پر شائع ہوتا تھا ایک صفحے میں دو کالم ہوتے تھے۔

اس روزانہ اخبار کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ پہلے صفحے پر "خبروں کا چمن" عنوان کے ماتحت بھانت بھانت کی خبریں غایت درجہ اختصار کے ساتھ یعنی ایک ایک دو دو سطروں میں دی جاتی تھیں، باقی سات صفحے مقالات، ادارات، مراسلات، منقولات، مضامین خاص، تجربات خصوصی، غزلیات نقد و تبصرہ وغیرہ کے لیے وقف تھے۔

۲۷ جولائی ۱۸۹۴ء کے اخبار میں ایک خبر شائع ہوئی ہے:۔

"نارتھ ویسٹرن ریلوے کمپنی اپنی اوّل درجے کی تمام گاڑیوں میں وہ آلہ نصب کر رہے ہیں جس کے ذریعے سے مسافر لوگ ٹرین کی چلنے کی حالت میں ریل روکنے کی استدعا کر کے اس کو روک سکتے ہیں!"

معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک یہ جدت ان، ڈبلو، آر ہی تک محدود تھی، دوسری ریلوں میں گاڑی روکنے کی زنجیر نہیں لگائی گئی تھی، کیوں کہ چند روز ماقبل کی ایک اشاعت میں اس اخبار نے ریلوے کے مسافروں کے لیے کچھ ہدایتیں شائع کی ہیں، ان میں ایک یہ تھی کہ اگر کسی وجہ سے چلتی ہوئی گاڑی رُکوانی ہو، تو اُس کی ترکیب یہ ہے کہ سُرخ یا سفید رومال گاڑی کی کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر اُس وقت تک ہلاتے رہو جب تک گارڈ نہ دیکھ لے وہ یہ منظر دیکھتے ہی گاڑی روک لے گا۔

اس اخبار میں ایک جدت یہ بھی ہوتی، کہ پہلے صفحے پر اندر کے تمام مضامین کی فہرست بھی دے دی جاتی تھی۔

'بشیر الملک'

یہ ہفتہ دار اخبار تھا، رائل سائز کے چار صفحوں پر نکلا کرتا تھا ریاستی معاملات پر بھی تنقید کرتا

تھا یہ تنقید کہیں کہیں تخویفِ مجرمانہ کی صورت بھی اختیار کرلیتی تھی ۔
خبریں نہ ہونے کے برابر ، مضامین بہت طول طویل ، اندازِ بیان سلجھا ہوا عبارت نہ مقفاۃ نہ رنگین سادہ ، صاف ، عام فہم ۔
بعض پرچے اداریے کے بغیر شائع ہوتے تھے ، کبھی کبھی ایک کالم نقد و تبصرے کا بھی بڑھا دیا جاتا تھا اس اخبار کے چند پرچے (اگست ۱۸۹۴ء) میرے سامنے ہیں ۔

'کشف الحقائق'

یہ سولہ صفحے کا ایک ماہوار رسالہ تھا ، یہ دینِ مسیحی کا مبلغ تھا ، زیادہ تر مذہبی مقالات شائع ہوتے تھے ، جن میں اسلام کے عقائد پر جرح کرنے کی ، اور دینِ مسیحی کو دُنیا کا برحق دین ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی تھی ۔ مضامین روکھے پھیکے ہوتے تھے :

'آئینۂ ہند'

ہفتہ وار اخبار تھا برطانی ہند اور ریاستی ہند کے معاملات اور مسائل پر سیر حاصل بحثیں کیا کرتا تھا ، اس پرچے میں خبروں کے خلاصے بھی شائع ہوتے تھے یہ اخبار والیانِ ریاست کی معزولی اور ریاستوں کے معاملات میں حکومت کی مداخلت کا مخالف تھا اور اس سلسلے میں برابر حکومت پر نکتہ چینی کرتا رہتا تھا ۔
کاغذ نہایت خراب ، کتابت اور طباعت اس سے بدتر ، کئی برس تک یہ اخبار جاری رہا ۱۸۹۵ء سے لے کر ۱۸۹۸ء تک کے پرچے میری نظر سے گُزرے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنا ایک حلقہ بنا لیا تھا اس میں اس کی کافی قدر تھی ، ضخامت وہی چار صفحے ، کبھی کبھی ضمیمہ مستزاد !

'انڈیا گزٹ'

ہفتے میں ایک بار شائع ہوتا تھا ، ضخامت ۴ صفحے ، ایک صفحہ خبروں کے لیے وقف تھا ، باقی تین صفحوں میں مضامین اور مراسلات شائع ہوتے تھے ۔ چھوٹے چھوٹے ادارتی نوٹ بھی مختلف معاملات اور مسائل پر شائع ہوتے رہتے تھے ۔
اس اخبار میں ایک خاص خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کبھی کبھی کارٹون بھی شائع ہوتے تھے ،

خبروں میں کوئی تنوع نہیں ہوتا تھا ، زیادہ تر منقول ہوتی تھیں اور کچھ سُنی سنائی ، زبان صاف اور سادہ استعمال کی جاتی تھی ۔

ملکی معاملات پر یہ سوچ سمجھ کر اظہار رائے کرتا تھا ، کانگریس کا مخالف تھا ، لیکن کانگریسی رہنماؤں کے باہمی اختلاف (سنہ ۱۸۹۵ء) نے جب یہ نوبت پہنچادی ، کہ معاملہ پولیس تک پہنچ گیا ، اور اینگلو انڈین اخبارات نے کانگریس والوں کا مذاق اُڑانا شروع کیا تو اس سے ضبط نہ ہوسکا ، اس نے لکھا :۔

"اینگلو انڈین اخبارات کے ہاں گھی کے چراغ جل رہے ہیں کہ نیشنل کانگرس کے ممبروں میں پھوٹ پڑگئی ہے اور جب یہ نااتفاقی اس درجے تک پہنچ گئی ہے کہ پولیس میں دوپٹا رہائی کی نوبت آئی تو مخالفوں کو کیوں نہ خوشی ہو ، گو مسلمانوں کو کانگرس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے ، لیکن اہلِ ہنود کے اغراض میں خلل واقع ہوتا ہوا دیکھ کر انھیں بھی افسوس ہوتا ہے ! ــــــــ"

اس اخبار کے سنہ ۱۸۹۵ء سے لے کر سنہ ۱۸۹۷ء تک کا فائل میری نظر سے گزرا ہے اس میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ ایک کالم "لوکل" کے عنوان سے مقامیات کے لیے مخصوص تھا ۔

'بمبئی پنچ بہادر'

ہفتے وار اخبار تھا ، فکاہی اور ظریفانہ مضامین پر مشتمل ہوتا تھا ، خبریں بھی ظریفانہ رنگ میں چھاپی جاتی تھیں ، جن میں ضلع جگت اور رعایتِ لفظی کا خیال خاص طور سے رکھا جاتا تھا ۔ پہلے اس کے ایڈیٹر کوئی صاحب عبدالصمد تھے ، پھر عبدالحمید فرخ نے اس کی عنانِ ادارت سنبھال لی ۔ یہ مرحوم سیّد جالب ایڈیٹر 'ہمدرد' اور 'ہمدم' کے بھائی تھے ۔

۱۳ مئی سنہ ۱۸۹۶ء کے پرچے میں ایک خبر شائع ہوئی ہے ملاحظہ ہو :۔

"زارِ روس ہندستان کے سبز باغ دیکھ کر خار کھائے بیٹھا ہے ، اس غم میں زار ہوگیا مگر اس کے مزرعۂ دل میں اس گل زار کی کشتِ ہوس ہری بھری ہے سب راستوں سے ہار گیا تو ہرات کی راہ کو منزلِ مقصود کا راستہ سمجھا ، چناں چہ زمینی آنتوں (ریلوے لائن) کی لین ڈوری ڈال دی ہے !"

یہ تو خبر کا نمونہ ہوا ، اب ذرا اداریے کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو ۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ سوڈان میں شورش ہو رہی

ہے اور برطانوی حکومت اپنی کارروائیاں جاری رکھے ہوئے ہے، "سوڈانی گڑبڑ" کے عنوان سے یہ اخبار لکھتا ہے :۔

"سوڈان میں گڑبڑ مچنے والی ہے، اس لیے ٹڈی دل فوج ہندستان سے روانہ کردی گئی ہے۔
ہم کو اس بات کی بڑی ادھیڑبن لگی ہوئی تھی کہ سیہ نصیب کالے آدمیوں کو ہر جگہ سب سے پہلے کیوں بھیجا جاتا ہے؟ مدت مدید کے بعد یہ عقدہ کشا ہوا کہ اگر ناز پروردہ گوروں کو لڑائی میں بھیجا جائے تو وہاں کی سختیوں اور گرمی کی شدت سے ان کا رنگ بھی سیاہ بھونڈا ہوکر چہرے ولایتی بوٹ بن جائیں۔ پھر کالے، گوروں میں تمیز ہی کیا رہے؟ کالی رعایا کو گورمنٹ نے گوروں کا کفارہ سمجھ رکھا ہے، عقبیٰ کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے گناہوں کا کفارہ بن گئے۔ دھڑلے سے جو چاہیں کریں گویا دین کے تمام مزے اللہ نے انھی کے لیے بنائے ہیں، اب رہا دنیاوی کفارہ، اس کے لیے یہ کالی بھیڑیں (ہندستانی) موجود ہی ہیں۔ مثل ہے گھر کی مُرغی دال برابر جب چاہا گردن مروڑی اور ڈکار گئے۔"

۲ر اگست ۱۸۹۶ء کے پرچے میں کریٹ کی شورش پر ایک اداریہ لکھا گیا :۔

"یہ اور شگوفہ کھلا ہے کہ یہ لوگ بھی عیسائی ہیں اس لیے ہماری گورمنٹ کا بہت بڑا حق ہے کہ بغاوت کرنے میں ان کی مدد کرے مگر ایسا نہ ہو کہ ہماری گورمنٹ انجن چھوڑ گھسیٹن میں پڑ جائے کیوں کہ سوڈانیوں کا نمونہ دیکھ ہی لیا کہ ایسی قلیل تعداد حبشیوں کی جماعت نے ہماری طرف کے بڑے بڑے بہادروں کا منھ پھیر دیا۔ خفت مٹانے کے لیے خواہ کچھ ہی مشہور کردیا جائے مگر ؎

ای ۔ اغ دل جانتا ہے کسی کا!

پتلونیں ڈھیلی ہوگئیں بڑے بڑے صاحب بہادر سوچ رہے ہیں کہ کس مصیبت میں آپھنسے کہ دانہ پانی تک بند ہوگیا ہے۔ جب اس ناشایستہ فوج نے ہماری شایستہ فوج کے چھکے چھڑا دیے تو ترک بھائی جنگ شائستگی کے پُتلے ہیں، لڑائی کے لیے اُدھار کھائے بیٹھے ہیں، گورمنٹ ذرا سوچ سمجھ کے دست اندازی کرے تو بہتر ہے۔"

اس اخبار میں ظریفانہ شاعری کے نمونے بھی شائع ہوتے رہتے تھے بمبئی کی خاص الخاص عوام پسند زبان میں ایک غزل شائع ہوتی ہے۔ ضرور سنیے ؎

چہاکٹ جو ہوکے اوٹے یہ تیرے پڑیلا ہوں
(پڑا)

دو باٹلی سے آج زیادہ پٹیلا ہوں
(بوتل)

مجرا جوشن کے نوٹ بیں اس کو دکھیلا ہوں
دیتا

کس وٹ کے ساتھ بوسے لپٹ کے لٹیلا ہوں
شان

چل چال آج حال مرا پوچھتا ہے کیا

جانی ترے فراق میں مرکر جئیلا ہوں
جیا

آتے نہیں اوالی موالی اٹھانے کو

دارو بیں آج پی کے گٹر میں پڑیلا ہوں
نالی — پڑا

کبھی تو دیکھ لیں گے وہ باڑی سے جھانک کر
احاطہ

میں جھاڑ کی طرح سے سڑک پر گڑیلا ہوں
گڑا ہوا

چندی بزار چار بجے روز شوق سے

کھاتا میں خوب ناند سے بھونلی تلیلا ہوں
مچھلی — تلی ہوئی

بے ڈیرٹے کے کام نکلتا ہے اس لیے
کوڑی پیسہ

رانڈاں یہ جانتی ہیں کہ میں سرفریلا ہوں
رنڈیاں — سرپھرا ہوا

جو کام چاہتے ہو وہ لیتے ہو مجھ سے تم

بالا نکٹ کا ہاتھ تمھارے لگیلا ہوں
لڑکا مفت کا — لگا

اردو محاورے کے ہوں کس طرح اپنے شعر
لوفر میں ممبئی میں تو پیدا ہویلا ہوں
ہوا

پنچیانہ رنگ میں یہ اخبار، دوسرے کی بالعموم اور ہم رنگ معاصرین کی بالخصوص پگڑیاں اُچھالنے میں بڑا دلیر تھا۔ ایسے مواقع پر انداز تحریر ضرورت سے زیادہ سوقیانہ اور عامیانہ ہوجایا کرتا تھا۔

'مظلوم دکن'

یہ بھی ہفتے وار اخبار تھا، بمبئی سے شائع ہوتا تھا، اور سیاسیاتِ حیدرآباد دکن کے لیے مخصوص تھا۔ معلوم ہوتا ہے اس کے ایڈیٹر صاحب کو ریاست حیدرآباد سے، اس کے عہدے داروں سے، اس کے وزیروں اور امیروں سے، اس کے فرماں روا سے سخت دُشمنی تھی۔ ایسے تیز تند، ناشائستہ اور عریاں توہین آمیز اور اشتعال انگیز مضامین یہ اخبار شائع کرتا تھا کہ حیرت ہوتی ہے یہ زندہ کیوں کر رہا؟ آج کہ آزادیٔ تحریر و تقریر نسبتاً پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ حاصل ہے اس قسم کے مضامین اگر کوئی اخبار شائع کرے تو وہ ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔

اس اخبار نے بڑی دیدہ دلیری سے حضورِ نظام پر یہ الزام لگایا کہ وہ درپردہ روس سے سازباز کیے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ نظامِ دکن کی ذاتی مصروفیات پر بھی سخت الفاظ میں نکتہ چینی کی۔ نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک پر نہایت مکروہ الزامات عائد کیے۔ ۱۰ر اگست ۱۸۹۶ء کے پرچے میں اس نے خاص طور پر حیدرآباد کی حکومت کو ہدفِ مطاعن بنایا ہے۔

اس بے باک گوئی اور آزاد نویسی کے باوجود حیرت ہے کہ حکومتِ دکن یا حکومت بمبئی نے اس کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا۔ اس اخبار سے اس سلسلے میں جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے:۔

"دیکھنے والے حیران ہیں کہ قیصرِ ہند اور ایک اخبارچی دونوں برابر خم ٹھونک رہے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ دُنیا میں اس سے زیادہ بہادر کوئی نہیں ہے جو پبلک کے لیے اپنے آپ کو خطرے میں ڈالے۔"

(مظلوم دکن ۱۰ر اگست ۱۸۹۶ء)

اس اخبار کی بے باکی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس نے سرورق پر "ضوابطِ اخبار" کے عنوان سے چند ضابطے درج کیے ہیں، جن میں سے پہلا ضابطہ یہ ہے:۔

"نامہ نگاروں کو عام اجازت ہے کہ جو چاہیں، وہ لکھیں، ذمے دار ہم ہیں!"

اس اخبار کی ضخامت آٹھ صفحات تھی، کاغذ خراب، کتابت طباعت معمولی۔

'سفیر'

یہ اخبار ہفتے میں دو بار نکلتا تھا، کافی عرصے تک جاری رہا۔ دو سال کی جلدیں (۱۸۹۶ء، ۱۸۹۷ء) میری نظر سے گزریں۔ یہ پرچہ بہت سنجیدہ مضامین شائع کرتا تھا۔ ذاتی مناقشات سے اخبار کے کالم بھرنے کا عادی نہیں تھا۔ ملکی، ملی، مذہبی معاملات پر نہایت جچی تلی رائے ظاہر کرتا تھا۔

اس کی ضخامت ۴ صفحات تھی لیکن ان چار صفحات کا نہایت مناسب استعمال کیا جاتا تھا۔ خبریں بھی اس زمانے کے عام معیار کے مطابق اچھی خاصی دی جاتی تھیں، مضامین بھی خاصے ہوتے تھے، اداریے میں اہم معاملات پر نہایت ثقاہت اور سنجیدگی سے اظہارِ رائے کیا جاتا تھا۔

'سلطان الاخبار'

یہ روزانہ اخبار تھا، کتابی سائز پر شائع ہوتا تھا۔ ایک صفحے میں دو کالم ہوتے تھے ۸ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔

زیادہ سے زیادہ دو کالم خبروں کے لیے وقف تھے۔ باقی ۶ صفحات مضامینِ خاص، مراسلات، رزمیہ، منظومات اور مقالاتِ ادارت کے لیے وقف تھے۔ ترکی حکومت اور خلیفۃ المسلمین سے اس اخبار کو بھی والہانہ شیفتگی تھی۔

یونان کی سرکوبی کے لیے جب ترکی فوجیں البانیہ اور اناطولیہ سے نکلیں اور کام یاب و کام راں ہوکر آگے بڑھنے لگیں، تو ۷ر جولائی ۱۸۹۷ء کے اخبار میں اس نے ایک اداریہ "ترکی فوج" کے عنوان سے لکھا، اس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو ؎

یہ ترکانِ طرّار کی فوج ہے　　　کہ شیرانِ خوں خوار کی فوج ہے
بلا ہے قیامت ہے آفت ہے یہ　　　کہ اعمالِ دشمن کی شامت ہے یہ
زمیں اس کے آگے سمٹ جائے گی　　　بلندی پہاڑوں کی گھٹ جائے گی
بھلا اس سے انساں لڑے کیا مجال　　　اگر جن بھی آئیں تو ہوں پایمال

ترکوں کی تلوار صاعقہ بار نے پلک جھپکتے یونانیوں کے خرمنِ ہستی کو خاک سیاہ کرکے ہوا میں اُڑا دیا۔ اٹلی انگلستان کا اور انگلستان حیرت سے فرانس کا منھ تکتا ہے، انگلش پارلیمنٹ کے ممبر گھبرائے ہوئے یونانیوں کی طرح ایک دوسرے کا منھ نوچ رہے ہیں۔

رچرڈ شیردل کے ہم وطنوں میں کسی نے جامِ شہادت نوش نہیں فرمایا، باوجودے کہ انگریزی اخبار کہتے ہیں کہ یہ جواں مرد ہر لڑائی میں سب سے چار قدم آگے رہتے ہیں مگر شجاعانِ انگلستان کو زد سے بچنے کا ایسا ڈھب یاد ہے کہ سینکڑوں بہادروں میں سے صرف چھ نے چرکا کھایا ہے۔ خدا نہ کرے کہ کوئی ڈاکٹر ان خراشوں کا امتحان کرنے لگے، ورنہ قلعی کھل جائے گی۔ کیوں کہ ترکوں کے لگائے ہوے گھاؤ اور ہی طرح کے ہوتے ہیں، ان شیروں کے شمشیروں کے زخم میں ٹانکا نہیں لگتا، چلو یہ کیا تھوڑا ہے کہ ان سینہ زوروں سے پیچھا چھڑا کر صحیح سلامت انگلینڈ میں پہنچ گئے۔ زندگی رہی تو سوڈان کے وحشیوں یا سرحد کے پٹھانوں یا برہما کے نامرادوں سے لڑ بھڑ کر بیس بیس تمغے لٹکالیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ دغابازی اور جعل سازی دوسری بات ہے ورنہ فرنگی اور ترکوں کا مقابلہ لاحول ——— یورپ کی شجاع ترین قوم کے شجاع ترین زمانے کا شجاع ترین جرنیل (نپولین) آج سے سو برس پہلے کہہ گیا ہے کہ ترکوں کی تلوار فرنگیوں کی سنگینوں سے کہیں زیادہ غارت گر ہے! ترک ——— ! محاوراتِ فرنگ میں "تلوریے" کو کہتے ہیں 'REGULAR TURK' یورپین شمشیرزن کی انتہائی تعریف ہے!"

اس اداریے سے اس اخبار کی جرأت، حق گوئی اور اصابت رائے کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر بھی عبدالحمید فرخ تھے۔

'جسٹس آف دی پیس'

یہ بھی ہفتے وار اخبار تھا، سائز بڑا تھا، ایک صفحے میں چار کالم ہوتے تھے۔ دو تین کالم خبروں کے لیے وقف تھے، باقی صرف مضامین اور مقالات، ادارت کے لیے۔

یکم نومبر ۱۸۹۶ء کے پرچے میں مشہور ترک دشمن اور اسلام آزار یورپین مدبر گلیڈ اسٹون پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ایک شذرے میں لکھا ہے :-

"گلیڈ اسٹون کے لیے ہر طرف سے یہ آواز بلند ہو رہی ہے کہ وہ کاروبارِ سلطنت میں شریک ہو جائے۔ مگر ایک ایسے بڈھے کو سلطنت کے جنجال میں دھکیلنا بہت بڑا ظلم ہوگا۔ جب یہ سلطنت کے جھمیلوں میں پھنسے گا

تو ہمارے سلطان المعظم کی شان میں نئی گالیاں کون تراشے گا؟ خدا جانے لوگ اسے سلطنت کے کاروبار میں کیوں گھسیٹ رہے ہیں؟ کسی کو لارڈ بیکنس فیلڈ کی یہ پیشین گوئی بھی یاد ہی کہ انگلستان کو جو سب سے بڑا صدمہ پہنچائے گا' وہ پیرِ نابالغ یہی بڈھا گلیڈ اسٹون ہی!"

'مقبول عالم'

یہ ہفتے وار اخبار تھا، چھوٹے سائز کے چار صفحوں پر شائع ہوتا تھا۔ حسب معمول خبریں کم ہوتی تھیں مضامین پر زیادہ توجہ کی جاتی تھی۔ ۱۸۹۷ء کی جلد اس وقت پیشِ نظر ہی، لیکن کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں ہی۔

'گل زارِ سخن'

بمبئی کے جرائد و صحائف کا ذکر ختم ہوا لیکن یہ باب ختم کرنے سے پہلے میں ایک رسالے کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں، اس کا نام 'گل زارِ سخن' تھا، یہ ایک ماہ وار گُل دستہ تھا۔ ہر مہینے ایک طرح دے دی جاتی تھی، اس پر شعرائے ہند طبع آزمائی کرتے تھے، وہی مجموعۂ افکار "گل زارِ سخن" کے نام سے ہر مہینے شائع ہوتا تھا، اس میں صرف غزلیں شائع ہوتی تھیں، مضامین اور مقالات کی اس میں بہت کم گنجایش تھی۔

معلوم ہوتا ہی اس گل دستے نے خاصا ادبی وقار حاصل کرلیا تھا، اس لیے کہ اس کے مشاعروں میں ہندستان کے چوٹی کے شعرا بھی شریک نظر آتے ہیں، مثلاً جلال لکھنوی، داغ دہلوی وغیرہ۔

یہ بیس صفحات پر شائع ہوتا تھا۔ ایک آدھ صفحہ اشتہار وغیرہ کے لیے بھی وقف ہوتا تھا۔ جنوری ۱۸۹۳ء کی طرح تھی ؎

ہمیں دل سے پسند اپنے خریداروں کی باتیں ہیں

اچھی اچھی غزلیں شائع ہوئی ہیں، بالخصوص جلال اور داغ کی غزلیں تو بے نیازِ ستایش ہیں۔ لیکن اس مشاعرے میں بمبئی کا کوئی شاعر نظر نہیں آتا۔ گورکھ پور، آگرہ، برہان پور وغیرہ کے شعرا شریکِ بزم ہیں۔

بمبئی کی اُردو صحافت کا نیا اور شان دار دَور

سنہ ۱۹۰۱ء سے سنہ ۱۹۲۰ء تک بمبئی میں متعدد اُردو اخبارات نکلے، لیکن ان کی فہرست طوالت سے خالی نہیں، ان کے فائل بھی سامنے نہیں ہیں، اس لیے صحت اور جامعیت کے ساتھ رائے زنی نہیں کی جاسکتی۔

لہٰذا اس نئے دَور کا آغاز سنہ ۱۹۲۰ء سے کیا جاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ تحریکِ خلافت شباب پر تھی، علی برادران مسلم ہندستان کے نہ صرف مسلم ہندستان کے بلکہ سارے ہندستان کے ہیرو بنے ہوئے تھے۔ مولانا شوکت علی مرحوم و مغفور نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز بمبئی کو بنایا۔ جمعیتِ مرکزیہ خلافت کا صدر دفتر یہیں قائم کیا۔ اس طرح بمبئی مسلمانانِ ہند کی سیاسیات اور عملی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ یہاں علمائے کرام آتے تھے اور وعظ کہتے تھے، رہنمایانِ عظام تشریف فرما ہوتے تھے اور تقریریں کرتے تھے، خطبائے عصر جلوہ افروز ہوتے تھے اور آتش بیانی اور شعلہ مقالی سے دِلوں کو گرماتے تھے، جلوس نکلتے تھے، جلسے ہوتے تھے، کانفرنسیں منعقد ہوتی تھیں۔ تحریکِ خلافت کی اہمیت سے مسلمانانِ بمبئی اور مسلمانانِ ہند کو روشناس کرنے کے لیے جمعیتِ خلافت کو ایک آرگن کی ضرورت تھی، چناں چہ پہلے ہفتے وار 'خلافتِ عثمانیہ' اور بعد میں روزنامۂ 'خلافت' کے نام سے ایک بلند پایہ اخبار کی اشاعت شروع کردی گئی۔ غرض تقریروں سے، جلسوں سے، کانفرنسوں سے اور اخبارِ 'خلافت' کے اجرا سے بمبئی میں اُردو کی نشو و نما کو غیر ارادی طور پر بہت زیادہ مدد ملی۔

مولانا شوکت علی کی سیاسی خدمات سے قطع نظر، ان کی ایک یہ زبردست خدمت بھی کبھی فراموش نہیں ہوسکتی، کہ صوبۂ بمبئی میں ان کے قیام، جمعیتِ خلافت کے استحکام اور اخبار 'خلافت' کے اجرا سے اُردو زبان کو پھلنے پھولنے اور پروان چڑھنے کا نادر موقع ملا۔ اُردو کے خادم مولانا شوکت علی کی اس اہم خدمت کو کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔

بمبئی میں 'خلافت' سے پہلے کی اُردو صحافت، عالمِ طفلی میں زندگی بسر کررہی تھی، 'خلافت' کے اجرا کے بعد بمبئی والوں کو یہ معلوم ہوا، کہ اُردو زبان میں ایک بلند پایہ اخبار بھی نکل سکتا ہے۔ 'خلافت' بمبئی کا

سب سے پہلا اُردو اخبار ہے، جس نے نہایت بہترین سیاسی لٹریچر پیش کیا۔ اور مجلسِ خلافت بمبئی کا وہ پہلا ادارہ ہے جس نے بہت سی کتابیں اُردو کی چھاپیں اور شائع کیں۔

اُردو صحافت کے لیے سب سے پہلے 'خلافت' ہی نے میدان ہموار کیا، فضا پیدا کی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ اور اخبارات بھی شائع ہونے لگے۔ اب حالت یہ ہے کہ ایک درجن کے قریب روزانہ اور پچاس کے قریب ہفتے وار اخبارات بمبئی سے نکل رہے ہیں۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ بمبئی کے اُردو اخبارات نے سب سے پہلے ہندستان کی مسلم اُردو صحافت میں انقلاب انگیز اقدام کیا۔ اب بھی دہلی، لکھنؤ، لاہور وغیرہ کے متعدد مقتدر مسلم روزنامے ایسے ہیں، جو ہر روز مقامی انگریزی اخبارات سے باسی خبریں ترجمہ کرتے ہیں، یا ریڈیو کی سُنی سُنائی خبروں کو اپنے الفاظ میں لکھ دیتے ہیں۔ لیکن یہاں کے تقریباً تمام اُردو روزنامے رائٹر اور ایسوسی ایٹڈ پریس کی مفصّل نیوز سروس لیتے ہیں اور ٹیلی پرنٹر بھی استعمال کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے رائٹر اور ایسوسی ایٹڈ پریس کو سارے ہندستان کے مُسلم پریس سے اتنی آمدنی نہیں ہوتی ہوگی جتنی صرف بمبئی سے ہوتی ہے۔

اس انقلاب انگیز اقدام کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں کے اخبارات خبروں کے اعتبار سے 'ٹائمز آف انڈیا' اور دُوسرے بلند پایہ انگریزی، مرہٹی اور گجراتی اخبارات سے ہرگز فرومایہ نہیں ہیں۔ اس اقدام کا دُوسرا نتیجہ یہ ہے کہ اخبارات کی اشاعت پر بہت اچھا اثر پڑا ہے۔ ان کی حیثیت اور عظمت مسلّم ہوگئی ہے۔ چناں چہ مناسب نرخوں پر اُنھیں اشتہارات بھی بہت کافی ملنے لگے ہیں، اور اس طرح ان کی مالی حالت پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط اور مستحکم ہوگئی ہے۔

اس وقت بمبئی سے حسبِ ذیل روزنامے نکلتے ہیں:۔

(۱) روزنامۂ 'خلافت'	(۵) روزنامۂ 'اجمل'
(۲) روزنامۂ 'انقلاب'	(۶) " 'ہندستان'
(۳) روزنامۂ 'اقبال'	(۷) " 'مسلم'
(۴) " 'ہلال'	(۸) " 'الہلال'

(۹) روزنامہ ”معاشرت“ (۱۱) روزنامہ ”بیدار“

(۱۰) ” ”الکمال“

ان میں سے آخرالذکر چار اخبارات کے علاوہ سب رائٹر اور ایسوسی ایٹڈ پریس کی سروس لیتے ہیں۔

ہفتے وار اخبارات کم وبیش ۵۰ نکلتے ہیں۔ جس طرح یہاں کے روزنامے، شمالی ہند کے روزناموں کا مقابلہ اپنی خوبیٔ تحریر، فراہمیٔ اخبار اور معیارِ صحافت کے اعتبار سے کرسکتے ہیں یہاں کے ہفتے وار اخبارات شمالی ہند کے ہفتہ واروں کے مقابلے میں نسبتاً پست ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہو کہ اخبارات ضرورت سے زیادہ نکل رہے ہیں۔

ان اخبارات میں سب سے پہلا درجہ ”قومی جنگ“ کا ہو۔ یہ ہندُستانی کمیونسٹ پارٹی کا اُردو ترجمان ہو۔ یہ اخبار اپنے مقالات، ترتیب، زبان وبیان اور معیار کے لحاظ سے ہندُستان کے بہترین اخبارات کا ہم پلہ ہو۔

دوسرے ہفتے وار اخبارات زیادہ تر ادبی یا فلمی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں

(۱) ”صداقت“ (۶) ”جمہور“

(۲) ”مصوّر“ (۷) ”سروش“

(۳) ”نظام“ (۸) ”ظفر“

(۴) ”اجمل ویکلی“ (۹) ”حشر“

(۵) ”ہندُستان ویکلی“ (۱۰) ”ناخدا“

خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

مذکورہ اخبارات کے مالک یا مدیر بیرونِ بمبئی کے ہیں۔ ”ناخدا“ کے مالک و مدیر خاص بمبئی کے ہیں، یہ اخبار کوکنی قوم کا آرگن ہو۔ اسی طرح ”اجمل“ ڈیلی کے مالک و مدیر حارث صاحب بھی کوکنی ہیں۔ ان کا اخبار بھی اُردو کی بڑی خدمت کر رہا ہو۔

بمبئی سے کئی ماہ نامے بھی شائع ہوتے ہیں:۔

(۱) ”صبحِ امید“ (۲) ”تنویر“

(۳) 'تمثیل' (۵) 'ایشیا'

(۴) 'ہندستان'

ان میں سے 'تمثیل' تو خالص فلمی پرچہ ہے۔ باقی پرچے علمی ادبی ہیں، اور بلند معیار کے حامل ہیں۔ 'صبح امید' کے مالک و مدیر مسٹر عبدالحمید بوبیرے بھی کوکنی ہیں۔ انھوں نے یہ رسالہ نکال کر اپنی قوم میں اُردو زبان کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ 'تنویر' کی مدیرہ ایک خاتون، محترمہ اصغری بیگم ہیں، یہ پرچہ بھی بلند معیار کا حامل ہے۔ جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری جیسے شاعر و ادیب اس کے قلمی معاونین میں شامل ہیں۔ 'ایشیا' مشہور شاعر ساغر نظامی کا پرچہ ہے۔ پہلے میرٹھ سے نکلتا تھا، پھر پونہ سے اس کی اشاعت شروع ہوئی؛ اب بمبئی سے نکل رہا ہے۔

غرض ماضی کی روشنی میں اگر حال کا اندازہ لگایا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ بمبئی کی اُردو صحافت اس وقت پنجاب اور یوپی کی اُردو صحافت سے ہرگز پیچھے نہیں ہے، ممکن ہے دو قدم آگے ہو۔ یہاں اُردو زبان جڑ پکڑ چکی ہے اور اگر اسی رفتار سے یہاں اُردو کی خدمت کا سلسلہ جاری رہا، تو بلا تامل کہا جاسکتا ہے کہ دلی، لاہور، لکھنؤ کی طرح بمبئی بھی اُردو زبان کا مرکز تسلیم کرلیا جائے گا۔ بنگال اور مدراس میں اُردو اب تک اجنبی ہے، لیکن بمبئی نے اسے اپنا لیا۔

بمبئی میں اُردو صحافت کے عہد بہ عہد کے عروج و ارتقا پر اگر ایک نظر ڈالی جائے، اس کے ماضی سے حال کا مقابلہ کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہاں اُردو صحافت کا مستقبل نہایت خوش گوار اور خوش آیند ہے۔

اس وقت جنگ کی دشواریوں کے باعث اخبارات کے اجرا اور اشاعت پر گوناگوں پابندیاں عائد ہیں۔ لیکن جب یہ جنگ ختم ہوگی، اور یہ پابندیاں دور ہوں گی، تو یقیناً ایک نئے اور شان دار دور کا آغاز ہوگا جس کی ہلکی سی جھلک موجودہ اُردو صحافت کی ترقیوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

یقیناً وہ دور جلد آئے گا، جب یہاں کے اخبارات کا معیار اور زیادہ بلند ہوجائے گا، جب یہاں کے رسائل کی خدمت کا دائرہ کچھ اور زیادہ وسیع ہوجائے گا، خدا کرے وہ دور جلد شروع ہو!۔

مولانا شاہ نیاز احمد صاحبؒ بہ حیثیت شاعر

(جناب خلیق احمد صاحب نظامی ایم اے)

مولانا شاہ نیاز احمد صاحبؒ اٹھارویں صدی کے نہایت عظیم المرتبت بزرگ تھے۔ علم و فضل میں یگانۂ عصر تھے۔ زہد و اتقا کا دُور دُور شہرہ تھا۔ بریلی میں اُن کی خانقاہ تھی۔ ہزاروں عقیدت مندوں کا وہاں ہجوم لگا رہتا تھا۔ تشنگانِ معرفت اپنی روحانی پیاس بجھانے کے لیے دُور دُور سے اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ غلام سرور کا بیان ہے:-

"خلق بے شمار بہ حلقۂ ارادت وی درآمد و مردماں از اقالیم دُور و دراز یعنی از کابل و قندھار و شیراز و بدخشاں بہ خدمتِ بابرکت وی حاضر آمدہ مستفید و مستفیض شدند"

خود شاہ صاحبؒ کا عالم یہ تھا کہ عشقِ حقیقی کے نشے میں چُور رہتے تھے۔ دردِ عشق ان کا سرمایۂ حیات تھا۔ یہ آگ ہر وقت اُن کے سینے میں سلگتی تھی۔ کبھی کبھی اُس کے شرارے شعر کی صورت میں نمودار ہوتے تھے۔ وہ شعر بہت کم کہتے تھے لیکن جب کبھی کہتے تھے، اپنا دِل نکال کر رکھ دیتے تھے۔ اس کے لفظ لفظ سے اثر ٹپکتا تھا۔ اُن کا شعر اعماقِ روح سے نکلتا اور سُننے والے کے دِل کی گہرائیوں میں اُتر جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کا کلام اس زمانے کے صوفیا میں بہت مقبول ہوا۔ صاحبِ 'خزینۃ الاصفیا' نے لکھا ہے:-

"حضرت شاہ دِل آگاہ بہ شعر رغبت تمام داشت۔ و اشعارِ آب دار متضمن حقائق و معارف گفتے۔ چناں چہ دیوان نیاز کہ از تصانیف آں حضرت است بسیار مرغوب و مطبوع طبع جماعتِ اصفیا است"

اس مضمون میں اُن کے اُردو دیوان پر ایک نظر ڈالنی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات ضرور ملحوظِ خاطر رکھنی چاہیے کہ شاہ صاحب کا اصل موضوع عشقِ حقیقی ہے۔ ایک فن کار کی حیثیت سے اُن کے کلام پر تنقید کرنا اُصولی غلطی ہوگی۔ حالاں کہ یہ حقیقت ہے کہ اس اعتبار سے بھی شاہ صاحب کسی سے پیچھے نہیں۔

مختصر حالات | شاہ نیاز احمد صاحب ۱۱۴۲ھ میں بہ مقام سرہند پیدا ہوئے۔ والدِ ماجد حاجی حکیم

شاہ رحمت صاحب کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اُٹھ گیا تھا۔ آپ کی والدۂ ماجدہ نے آپ کی پرورش کی اور تعلیم و تربیت کا نہایت عمدہ انتظام کیا۔ جب سرہند کی تعلیم سے فارغ ہوئے تو دہلی میں مولانا شاہ فخرالدین صاحب کی خدمتِ بابرکت میں علومِ ظاہری کی تکمیل کے لیے حاضر ہوئے۔ شاہ نیاز احمد صاحب نہایت ذکی اور ذہین انسان تھے۔ ۱۷ سال کی عمر میں معقول و منقول، فروع و اصول، حدیث و تفسیر میں کمال حاصل کرلیا۔ علومِ ظاہری سے فراغت ہوئی تو شاہ فخرالدین صاحب دہلوی کے دستِ مبارک پر بیعت کرلی اور علومِ باطنی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۹ سال تھی۔ آپ کی لیاقت، استعداد اور سعیٔ پیہم سے پیر بہت متاثر ہوئے اور اپنا خلیفۂ راستیں مقرر کیا۔ بریلی میں اقامت کی ہدایت فرمائی۔ بریلی پہنچ کر شاہ نیاز احمد صاحب نے اپنی خانقاہ قائم کی، جو بہت جلد، بہ قول غلام سرور "معدنِ فیوضِ ربانی" اور "مطلعِ انوارِ سبحانی" بن گئی۔ جگہ جگہ سے لوگ آپ کی صحبت سے فیض حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اٹھارویں صدی میں چشتیہ نظامیہ سلسلے کو ہندستان میں جو کچھ فروغ ہوا، وہ مولانا شاہ فخرالدین صاحب دہلوی کے دو مریدوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ شاہ نور محمد صاحب نے پنجاب میں اور شاہ نیاز احمد صاحب نے یوپی میں اپنے سلسلے کو خوب پروان چڑھایا۔ شاہ نیاز احمد صاحب نے سنہ ۱۲۵۰ھ میں بہ مقامِ بریلی وصال فرمایا۔

بہ حیثیت شاعر شاہ صاحبؒ کو سوز و گداز سے بھری ہوئی طبیعت ودیعت کی گئی تھی۔ عشق ان کے خمیر میں تھا۔ جذباتِ عشق و محبت کبھی کبھی شعر کی صورت اختیار کرلیتے تھے۔ شاہ صاحبؒ شعر بہت کم کہتے تھے۔ اسی وجہ سے اُن کے اُردو اور فارسی دونوں دیوان بہت مختصر ہیں لیکن جو کچھ بھی ہے، وہ اپنی جامعیت اور افادیت میں کم نہیں۔ اُن کی فکرِ رسا نے تصوّف کے نہایت باریک نکات کو انتہائی حُسن اور دل کشی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اُن کے کلام میں آورد نہیں۔ وہ قلبی واردات کو نہایت خوبی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ سوز و گداز، درد، علوِ معانی کے علاوہ نفاست، سلاست اور روانی اُن کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ حضرتِ نیاز نے فکر رسا پائی تھی۔ اور اس پر خود حضرتِ نیاز کو ناز تھا۔ اکثر اشعار میں اُس کا ذکر کرتے ہیں ؎

رکھتے ہیں نیاز یہ اہلِ دِل ترے شعر سُننے کا اشتیاق
غزل ایک دوسری اور کہ تجھے حق نے فکرِ رسا دیا

ایک دوسرے شعر میں کہتے ہیں ؎

ہوں میں نیاز مند جناب امیر کا اس واسطے میں صاحبِ فکرِ رسا ہوا

ایک جگہ اپنی فصیح البیانی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ؎

بھلا اک غزل اور بھی ایسی کہیو تجھے میں فصیح البیاں دیکھتا ہوں

سلاست اور روانی سلاست اور روانی حضرتِ نیاز کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ وہ نہایت بلند خیالات کو انتہائی سادگی، نفاست اور دِل کشی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ اس سادگی میں ادبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ اُن کے یہاں آمد ہی آمد ہے، آورد کا نام نہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں

؎ رواں آنکھوں سے ہے سیلاب گُل گوں الٰہی چشم ہے یا چشمۂ خوں

؎ ایک تو ہی نہیں میں بھی ہوں اُن آنکھوں کا مارا
اے اہلِ نظر نرگسِ بیمار سے کہہ دو

؎ کروں کیا بیان میں ہم نشیں اثر اُس کے لطفِ نگاہ کا
کہ تعینات کی قید سے مجھے ایک دم میں چھڑا دیا

؎ فرشِ زمیں ہے خاک نشینوں کا بسترا بے خان ومانِ عشق کا تکیہ ہے خشت و سنگ

؎ مجھ سے مریض کو طبیب ہاتھ تو اپنا مت لگا اس کو خدا پہ چھوڑ دے بہرِ خدا جو ہو سو ہو

؎ غمِ جُدائی کو ہم جانے یا خدا جانے بلاکشوں پہ جو گزری تری بلا جانے

بعض چھوٹی بحر کی غزلیں اپنی روانی، سادگی اور شگفتگی میں بے نظیر ہیں ؎

ستارے نہیں یہ شبِ تار کے شرارے ہیں آہِ شرربار کے
مبارک رہے تجھ کو واعظ بہشت میاں ہم تو طالب ہیں دیدار کے
جو دیکھے تجھے بُلبُل اے رشکِ گُل نہ پھٹکے کبھی گرد گُلزار کے

صفائی ترے سلکِ دنداں کی دیکھ ہوے غرقِ دریا گہر ہار کے
عجب کیا جو تشریف لاؤ اِدھر عیادت کو آتے ہیں بیمار کے
کہاں فصلِ گل ہو کہاں وہ بہار چلو بل کے روویں گلے خار کے
غزل اور ایسی ہی کہیو نیازؔ
کہ مشتاق ہیں تیرے اشعار کے

۲۔ تاثیر عشقِ حقیقی شاہ صاحبؒ کی رگ رگ میں سمایا ہوا ہو۔ اس لیے ہر لفظ جو اُن کی زبان سے نکلتا ہو، گرمی اور تاثیر میں ڈوبا ہوا ہوتا ہو۔

؎ مجھے بے خودی یہ تو نے بھلی چاشنی چکھائی کسی آرزو کی دِل میں نہیں اب رہی سمائی
؎ نہ مقامِ گفتگو ہو نہ محلِ جستجو ہو نہ وہاں حواس پہنچیں نہ خرد کو ہو رسائی
نہ مکیں ہو نہ مکاں ہو نہ زمیں ہو نہ زماں ہو دلِ بے نوا نے میرے جہاں چھاؤنی ہو چھائی
نہ وصال ہو نہ ہجراں نہ سرور ہو نہ غم ہو جسے کہیے خوابِ غفلت سو وہ نیند ہم کو آئی

۳۔ مبلغِ علم حضرتِ نیازؔ بڑے پایے کے عالم تھے۔ اُن کے اشعار سے تبحرِ علمی کا پتا چلتا ہو۔ فلسفہ، منطق وغیرہ میں کافی مہارت تھی۔ اس کی اصطلاحات اشعار میں استعمال کرتے ہیں :-

؎ سمندِ ناز کی جب باگ اُس نے دی ٹک چھوڑ وہیں ٹھٹک رہے برہانِ سُلمی منہ موڑ
؎ جو خطِ جوہری ممکن نہیں حکیم کنے تو اوس کی دیکھ کمر کیا کرے گا توڑ اور جوڑ
؎ ترے آئینۂ رُخ کا صفا دیکھ تحیّر میں ہو اشراقِ افلاطون
؎ کیا طرفہ اجتماعِ نقیضین ہو حکیم آنکھوں کے وہ لڑانے میں رکھتا ہو صلح و جنگ

بعض اشعار میں آیاتِ قرآنی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً ؎

نکتہ اَینَمَا سے واقف ہو چہرۂ یار جا بہ جا دیکھا

۴۔ مشکل زمین میں اشعار حضرت نیاز کو زبان پر بڑی قدرت ہو۔ وہ نہایت سنگلاخ زمین میں

بہت بے تکلف شعر کہتے ہیں۔ اور کمال یہ ہے کہ ان اشعار میں بھی آورد کا شبہ نہیں ہوتا۔ ایک غزل کا مطلع ہے ؎

لشکرِ غم آپڑا اقلیمِ دل پر ٹوٹ ٹوٹ یہاں ندائے الاماں تھی واں صدائے لوٹ لوٹ

اس زمین میں تقریباً ۲۸ شعر کہے ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

چشمِ بد سے دُور رہیو کیا ہی آب و تاب ہے ہوں گی یہ آنکھیں بنائی موتیوں سے کوٹ کوٹ

دیکھ میرا خونِ اشک اس نے کہا شب مجھ کو دیکھ تیری آنکھوں میں گئی میری حنا سب چھوٹ چھوٹ

ایک دوسری غزل کا مطلع ہے ؎

وسیان اپنے کو نہ خاک نہ افلاک سے باندھے عرفان اگر چاہے دلِ پاک سے باندھے

اس غزل کا ایک بہت رواں اور پُرتاثیر شعر ہے ؎

اس چرخ سے کیا رکھیے بھلا چشمِ نکوئی جو بیر پس از مرگ بھی ہے خاک سے باندھے

۵۔ محاورات و روزمرہ بعض اشعار میں روزمرہ اور محاورات نہایت صفائی اور سلاست سے باندھتے ہیں۔ روزمرہ کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

سینے میں قلزم کو لے قطرے کا قطرہ رہا بل بے سمائی تری اُف رے سمندر کے چور

ادھر کی نہیں جانتے رسم و راہ ؎ میاں ہم تو باشندے ہیں پار کے

۶۔ متروکات وغیرہ نیازؔ صاحب بعض جگہ وہ الفاظ و محاورات لکھتے ہیں جن کا استعمال اب متروک ہے۔ مثلاً "ٹک"، "کنے" وغیرہ۔

شاہ صاحب کی چند لغزشیں یہ ہیں :۔

"جنگ نہ ہوتا" ——— جنگ مذکّر استعمال نہیں ہوتا۔

"ہاتھوں کے مور اُڑنا" ——— صحیح محاورہ "ہاتھوں کے توتے اُڑنا" ہے۔

۶ جب دل میں کھنچا نیازؔ کے تجھ حسن کا نقشہ ——— "تیرے حسن کا" ہونا چاہیے۔

۶ زرا چھپ نگاہ رقیب سے بڑی اس گلی میں تھی مری خاک ——— "ذرا چھپ کر" ہونا چاہیے۔

شاہ صاحب "دیکھنے والو" کے لیے "دیکھنے ہارو"، "مٹی کی جگہ "ماٹی" اور "کدھر" کو "کیدھر" لکھتے ہیں۔

۷۔عشق و معرفت شاہ نیاز احمد صاحب صوفی تھے۔ عشقِ الٰہی اُن کے خمیر میں تھا۔ وہ عشق کے بندے تھے۔ عشق کی دُنیا میں رہتے تھے۔ عارفِ رومؒ کی طرح اُن کے قلب کی دھڑکنوں میں یہ آواز پوشیدہ تھی ؎

شادباش ای عشق خوش سودائے ما ای طبیبِ جملہ علت ہائے ما

عشق کے اُن پر اتنے احسان ہیں کہ کہتے ہیں ؎

کہاں تک کہوں لطف و احسانِ عشق کہ جوں جوں گھٹا میں بڑھایا مجھے
یہاں تک دیا مجھ کو حسنِ عروج کہ بندے سے مولا بنایا مجھے

عشق کی دُنیا میں پہنچ کر وہ عقل و ہوش کو الوداع کہتے ہیں ؎

جونہیں آمدِ آمدِ عشق کا مجھے دِل نے مژدہ سُنادیا خرد و حواس و شکیب نے وہیں کوس کوچ بجادیا

ایک دوسرا شعر ہی ؎

جب بردیہ دِل حضرتِ عشق آن پکارے گوشے ہوئی عقل اور ہوے اوسان کنارے

جب شاہ فخر الدین صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ؎

جبھی جا کے مکتبِ عشق میں سبقِ مقامِ فنا لیا جو کچھ لکھا پڑھا تھا نیاز نے سو وہ صاف دل سے بھلادیا

علومِ ظاہری کو خیرباد کہہ کر وہ اس شان سے عشق کے میدان میں قدم رکھتے ہیں ؎

عشق کے میدان میں آصورتِ انسان بنا عاشقِ مولا ہوا چاند کا جیسے چکور

جذباتِ عشق اُن کے سینے میں متلاطم ہوتے ہیں۔ بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں ؎

جوش زن ہی عشق کی مو اب خُمِ دل میں نیاز گہ اُبل کر وہ گرے گہ خُم سے نکلے پھوٹ پھوٹ

ایک جگہ کہتے ہیں ؎

کیا جوش میں ہی اب مُےِ وحدت خمِ دل میں اُبلے ہی پڑی رومی و عطار سے کہ دو

آتشِ عشق اُن کے سینے کو جلا دیتی ہے ؎

کہیں عاشق نیاز کی صورت سینہ بریاں و دِل جلا دیکھا

طوفان اشک اُمنڈتا ہے۔ بے اختیار نیاز کے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھتے ہیں ؎

یا الٰہی زورقِ گردوں سنبھال بے طرح اُمڈا ہے یہ طوفانِ اشک

ایک لمحہ رُکتا ہے۔ سوچتا ہے کہ اشکوں نے حقیقتاً اُس کی یاوری کی ہے ؎

ڈوب چکے تھے ہم تو اے یارو ابھی گر نہ ہوتا اس گھڑی احسانِ اشک

عشق نے شاہ صاحب کی شاعری میں ایک درد، سوز اور گرمی پیدا کردی ہے۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ محسوس بھی کرتے ہیں اس لیے اس کی آتش انگیزی بھی بے پناہ ہوتی ہے۔

۸۔ وحدت الوجود مختصر طور پر وحدت الوجود کا نظریہ یہ ہے۔ خدا کے سوا کوئی چیز کائنات میں موجود ہی نہیں۔ یا یہ کہ جو کچھ موجود ہے سب خدا ہی ہے۔ اسی کو ہمہ اوست کہتے ہیں۔ اہلِ ظاہر کے نزدیک خدا سلسلۂ کائنات سے بالکل الگ ایک جداگانہ ذات ہے۔ صوفیا کے نزدیک خدا سلسلۂ کائنات سے الگ نہیں ؎

باوحدتِ حق زکثرتِ خلق چہ باک صد جائے اگر گرہ زنی رشتہ یکیست

دھاگے میں جو گرہیں لگادی جاتی ہیں اُن کا وجود اگرچہ دھاگے سے متمائز نظر آتا ہے لیکن فی الواقع دھاگے کے سوا، گرہ کوئی زائد چیز نہیں۔ صرف صورت بدل گئی ہے۔

اٹھارویں صدی میں شاہ نیاز احمد صاحب نے اس نظریے کو بہت پھیلایا۔ انھوں نے اکثر اشعار اسی عقیدے کی تشریح میں لکھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وحدت الوجود ہی ان کا اصلی موضوع ہے اور اسی سے اُن کا کلام لبریز ہے۔

اس سلسلے کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

وحدت کے ہیں یہ جلوے نقش و نگار کثرت گر سترِ معرفت کو پاوے شعور تیرا
معمور ہو رہا ہے عالم میں نور تیرا از ماہ تا بہ ماہی سب ہے ظہور تیرا

؎ عالم کہے جس کو جہاں یعنی جہانِ جسم و جاں — شامل ہیں سب اُس ذات کی جس کو کہے سنسار ایک
بے امتیازِ بیش و کم دانے میں ہیں یہ سب بہم — بیخ و درخت و شاخ و گُل انبوہِ برگ و بار ایک
طوطی موجب دستاں سرا سو سو طرح سے دے نوا — ہردم نئی بولے صدا اور ہو وہاں منقار ایک

؎ نیرنگیوں سے یار کی حیراں نہ ہوجیو — ہر رنگ میں اُسی کو نمودار دیکھنا

؎ جسے ذاتِ بے رنگ و بے چوں کہیں ہیں — بہ ہر رنگ جلوہ کُناں دیکھتا ہوں

؎ صورتِ گُل میں کِھل کِھلا کے ہنسا — شکلِ بلبل میں چہچہا دیکھا
شمع ہوکر کے اور پروانہ — آپ میں آپ کو جلا دیکھا
کرکے دعوا کہیں انا الحق کا — بر سرِ دار وہ کھینچا دیکھا

کائنات اُن کے نزدیک ایک بحرِ رواں ہی — مسلسل اور متواتر —

؎ اگر کوئی جانے جہاں غیرِ حق ہی — سو میں اُس کو دھوکا گماں دیکھتا ہوں
یہ جو کچھ کہ پیدا ہی سب عینِ حق ہی — کہ اک بحرِ ہستی رواں دیکھتا ہوں

؎ ازل سے لے کے ابد تک وہی جو ہی سو ہی — بہ رنگِ بحرِ رواں جس میں ہی نہ توڑ نہ جوڑ

اسی مسئلے کو ریاضی سے بھی ثابت کرتے ہیں۔ جو رشتہ ایک (مبتدا ء الاعداد) اور دوسرے اعداد میں ہی وہی رشتہ خدا اور کائنات کے درمیان ہی —

؎ تعینات کے نقطوں سے ہی کثیر احد — وہی ہی ایک یہ دس سو ہزار لاکھ کروڑ

؎ ہیں دیدۂ بینا میں ہم سارے کم و بسیار ایک — کثرت نمایاں اتنی ہو جتنا کرے تکرار ایک

۹۔ وحدتِ ادیان

شاہ نیاز احمد صاحب وحدتِ ادیان کے قائل تھے۔ اُن کی حرّیتِ فکر و ضمیر کا یہ عالم ہی۔ کہتے ہیں —

؎ یہ سب ادیان و ملل ہیں شاخ ہائے یک درخت — ایک جڑ سے ہیں یہ نکلی ڈالیاں سب پھوٹ پھوٹ

؎ صنم کو پوجے برہمن حرم کو مانے شیخ — یہ دونوں ایک ہیں مانوں کسے کسے دوں چھوڑ

؎ گر بادۂ توحید پئیں اہلِ مشارب — ہفتاد و دو ملت کی ہو تکرار فراموش

ے جو رب الحرم ہو صنم بھی وہی ہو حرم دیر میں ایکساں دیکھتا ہوں
اسے برہمن اور اُسے شیخ مانے یہ آپس کا جھگڑا یہاں دیکھتا ہوں

۱۰- تراجم شاہ صاحب نے فارسی اشعار سے تراجم بھی بکثرت کیے ہیں۔ بعض جگہ تو وہ فارسی شعر کا صاف ترجمہ کر دیتے ہیں۔ اور بعض جگہ ایسا معلوم ہوتا ہو کہ فارسی شعر ذہن میں رکھ کر شعر کہا ہو۔ بعض غزلوں کے خیالات اور زمین فارسی اشعار سے لی گئی ہو۔ مثلاً "جو ہو سو ہو" والی غزل حافظ کی مشہور غزل "ہرچہ بادا باد" کا اثر معلوم ہوتی ہو۔ ایک دوسری غزل جس کا مطلع یہ ہو ے

سرزمینِ چشت کی آب و ہوا کچھ اور ہو دین و دنیا سے نرالا اور ہی کچھ طور ہو

احمد جامؒ کی مشہور غزل ے

عاشقانِ خواجگانِ چشت را از قدم تا سر نشانے دیگر است

کے طرز پر لکھی گئی ہو۔

چند اشعار جو فارسی اشعار کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں ملاحظہ ہوں ـــــــ

ے اسرارِ حقیقت کے خبردار جو ہوتے ہفتاد دو ملت میں کبھی جنگ نہ ہوتا

حافظ کا شعر ہو ے

جنگِ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

ے کافرِ عشق ہوں میں بندۂ اسلام نہیں بُت پرستی کے سوا اور مجھے کام نہیں

خسرو کا شعر ہو ے

کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست

ع کل دورۂ مجنوں تھا نیازؔ آج ہو اپنا

مشہور مصرع ہو۔ ع دورِ مجنوں گزشت و نوبتِ ما است

ع پوچھو نہ مجھ خراب سے اصلاحِ کار تم

حافظ کا مصرع ہو۔ ع صلاحِ کار کجا و من خراب کجا

مریضِ عشق کا درماں عبث کرے ہی تو ۔ دوا ہماری ارسطو بھلا تو کیا جانے

معلوم ہوتا ہو کہ خسرو کا شعر سامنے تھا ؎

از سرِ بالینِ من برخیز ای ناداں طبیب ۔ دردمندِ عشق را دارو بہ جز دیدار نیست

خاتمہ حقیقت یہ ہو کہ شاہ نیاز احمد صاحب اٹھارویں صدی میں سلسلۂ نظامیہ کے نہایت صاحب کمال، وسیع مشرب، صاحبِ دِل اور صاحبِ ذوق بزرگ تھے ۔ علم وفضل میں یکتائے عصر تھے۔ عشقِ حقیقی میں ہر وقت ڈوبے رہتے تھے ۔ اُن کے اشعار انھی جذباتِ عشق کے آئینہ دار ہوتے تھے۔ ان کے مزار پر جائیے تو آج بھی یہ آواز فضا میں سُنائی دے گی ؎

طمعِ فاتحہ از خلق نہ داریم نیاز ۔ عشقم اندر پسِ من فاتحہ خوانم باقی ست

اِمرأالقیس

(از جناب عبدالرحمان صاحب مستقیمی الاصلاحی)

نام و نسب اصلی نام جندح ہے۔ اِمرؤالقیس، الملک الضلیل اور ذوالقروح لقب ہے۔ ابوالحارث، ابووہب اور ابوزید کنیت ہے۔ باپ کی طرف سے نسب نامہ یہ ہے حجر بن حارث بن عمرو بن حجر۔ یہ لوگ مشہور شاہانِ کندہ سے ہیں۔ ماں کی طرف سے نسب نامہ حسبِ ذیل ہے:۔ فاطمہ بنتِ ربیعہ بن حارث بن زہیر تغلبی۔ یہ ربیعہ زہیر تغلبی کے دونوں بیٹے کلیب اور مہلہل کی بہن ہے۔

علمائے انساب اس نسب نامے پر متفق نہیں ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا نام جندح نہیں امرأالقیس ہے، کسی کے نزدیک اس کا نام صرف قیس ہے کوئی کہتا ہے کہ اس کے باپ کا نام عمرو ہے اور حجر غلط ہے اور اس کی ماں کا نام فاطمہ نہیں بلکہ "تملک" ہے، پھر امرأالقیس کے کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی اس لیے اس کی کنیت کا ثبوت نہیں ملتا۔ بعضوں نے کہا ہے کہ وہ لڑکیوں کو زندہ درگور کردیا کرتا تھا لہٰذا اس کے کوئی اولاد باقی نہ رہی۔ بعض لوگ کہتے ہیں اس کے ایک لڑکی تھی جس کا نام ہندہ تھا مگر کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اس کی بہن تھی لیکن قرائن سے اس قول کی تائید نہیں ہوتی۔ بہرحال علمائے ادب کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ اختلافات اس بات کی دلیل ہیں کہ اس شاعر کا سرے سے وجود ہی غلط ہے۔ اس کے تمام قصّے فرضی اور اس کے اشعار سب کے سب بعد والوں کی ایجاد ہیں اور اس کے متعلق تمام کی تمام روایتیں موضوع اور بے بنیاد ہیں اس لیے اس کی تمام داستان ایک افسانے سے زیادہ نہیں۔

لیکن یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتی کہ صرف ان اختلافات کی بنا پر ہم اس کے وجود ہی سے انکار کردیں۔ اگر اس کے تمام واقعات صرف افسانہ ہی ہوتے تو پھر علمائے انساب کو اس قدر اختلافات کی ضرورت کیا تھی لہذا یہ اختلافات ہی دراصل اس کے وجود کی سب سے بڑی دلیل ہیں۔

تاریخ میں اکثر واقعات ایسے ملیں گے جن کے ساتھ حقیقت اور صداقت کا توازن بہت کم قائم رہ سکا

ہے جو واقعہ دنیا میں جس قدر زیادہ مقبول و مشہور ہوتا ہے اسی قدر افسانہ سرائی اسے اپنے حصارِ تخیل میں لے لیتی ہے لیکن پھر بھی بعض واقعات ایسے ملیں گے جن کے وجود کو بعد کی تحقیقات نے روشنی میں کھڑا کر دیا ہے اور دنیا ان کے وجود کے ماننے پر مجبور ہوگئی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ حضرت ابوہریرہؓ ایک جلیل القدر صحابی ہیں لیکن زمانۂ اسلام اور اس کے پہلے خود ان کے اور ان کے والد کے نام میں بے شمار اختلافات ہیں چنانچہ بیسؔ نام ان کے اور پندرہ نام ان کے والد کے بتائے جاتے ہیں۔ پھر کیا ہم محض اس بنا پر ان کے وجود سے انکار کر دیں۔ اسی طرح یونان کے مشہور شاعر ہومر کے بارے میں بے شمار اختلافات ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہومر اس کا لقب ہے لیکن اس کے معنی اور اس کے ملقب ہونے کے اسباب میں مختلف اقوال ہیں۔

ماحول

قبل اس کے ہم امراءالقیس کی زندگی اور شعر و شاعری پر بحث کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کے وطنی قومی ماحول اور ان عوامل سے بحث کریں جو اس کی زندگی اور شاعری پر اثر انداز ہوئیں حقیقت یہ ہے کہ انسان پر اس کے ماحول اور ملکی آب و ہوا کا بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ ناممکن ہے کہ ایک حساس طبیعت کے اندر اس کے گہرے نقوش نہ پڑیں۔ پھر ایک شاعر کا دماغ تو اس سے ضرور ہی متاثر ہوتا ہے وہ حقیقت میں جو کچھ کہتا ہے اس کی زبان نہیں بلکہ اس زمانے اور ملک کی زبان ہوتی ہے جس میں وہ اور اس کے خیالات و جذبات پل کر جوان ہوتے ہیں اس لیے جب اس کی شاعری کا مطالعہ کرنا ہو تو لازم ہے کہ اس کے سارے ماحول کا مطالعہ کیا جائے۔

نجد نجد وسط عرب حجاز اور یمن کے درمیان میں واقع ہے اس کی مغربی سطح ۵۰۰۰ قدم اور مشرقی سطح ۲۵۰۰ قدم اونچی ہے۔ اکثر حصے ریتیلی زمین کے ہیں اور کچھ برفانی ہیں۔ پہاڑی سلسلے بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں جن میں قبیلۂ طے کے دو مشہور پہاڑ اجاؔ اور سلمیٰؔ ہیں۔ وہاں بہت سی ندیاں بھی بہتی رہتی ہیں جو سال کے اکثر ایام میں سرزمین نجد کو سیراب کرتی ہیں۔ سب سے بڑی وادی رمہؔ ہے جو قریب قریب تمام نجد میں پھیلی ہوئی ہے۔

نجد میں خالص عربی زبان اور بدوی اشعار ملیں گے جس میں عجمیت کا ذرا بھی شائبہ نہیں۔ ظہورِ اسلام کے بعد جب عجمیوں سے اختلاط شروع ہوا تو نجد ہی وہ جگہ ہو جہاں کی زبان بہت حد تک محفوظ رہی جبلِ عکاظ پر بسنے والوں کی زبان تو چوتھی صدی کے اخیر تک خالص رہی۔

نجد کے شمال میں اجا اور سلما کے پہاڑوں میں طی کا خاندان پایا جاتا تھا اور نجد کے بلند خطوں میں بکر و تغلب کی آبادیاں تھیں۔ وادیٔ رمہ کے شمال میں عنترہ اور اسی کا خاندان آباد تھا اور نجد کے مغربی حصے میں ہوازن اور سلیم کے قبائل بستے تھے۔

علماے لغت نے جن افصح القبائل کا ذکر کیا ہو ان میں سے قیس، تمیم، اسد اور ہوازن کی بعض شاخیں ہیں جنھیں "علیاءِ ہوازن" کہتے ہیں۔ انھی کے متعلق ابوزید کا قول ہو کہ "افصح النّاس ہوازن کی دو شاخیں اوپر اور نیچے بسنے والی ہیں۔ نیچے کے بسنے والوں میں خاندانِ سعد بن بکر، جشم بن بکر اور نصر بن معاویہ ثقیف ہیں اور بلند حصے میں بسنے والے اہلِ مدینہ اور ان کے اطراف و جوانب کے عرب ہیں لیکن یہ اہلِ سافل کی سی فصاحت نہیں رکھتے تھے"۔

جس طرح نجد کے قبائل میں افصح النّاس پائے جاتے ہیں اسی طرح کچھ ایسے قبائل بھی ہیں جو خالص عرب اور جن کا وطن خالص بلادِ عرب میں شمار کیا جاتا ہو۔ ان میں بعض قبیلے "جمرات" کے نام سے مشہور ہیں۔ ان لوگوں کو جمرات اس لیے کہا جاتا ہو کہ انھوں نے اس بات پر اتّفاق کیا تھا کہ ان کا کوئی فرد کسی غیر قبیلے میں شامل نہ ہوگا اور نہ کسی غیر کو وہ اپنے میں شامل کریں گے۔ اس قسم کے چار خاندان تھے بنو نمیم بن عامر بن صعصعہ، اولادِ حارث بن کعب، اولادِ ضبہ اور اولاد عبس بن بغیض۔

کندہ خاندانِ کندہ نجد میں حکومت کرتا تھا اور اس کے بادشاہ امراءالقیس کے آباد اجداد تھے۔ علماے انساب کہتے ہیں کہ خاندانِ کندہ جنوبی عرب کے قحطانی لوگوں سے تعلق رکھتا تھا۔ مورخین اس بارے میں مختلف الرّاے ہیں کہ کندہ کا جنوب سے نجد کی طرف ہجرت کرنے کا سبب کیا ہو؟ چناں چہ بہتوں کی راے ہو کہ یہ قبیلہ جنوب کی طرف بحرین میں آباد تھا۔ پھر وہاں سے ہجرت کر کے حضرموت میں آیا یہاں ان کی تعداد تقریباً تین ہزار تھی۔ یہیں حضرموت کے ایک شہر کندہ میں مقیم ہو گئے اور اسی لیے پھر وہ اسی

شہر کے نام سے موسوم رہے۔ کچھ دنوں کے بعد وہاں سے مہرہ کے ایک قصبے دمون میں آباد ہوئے۔ یہ تمام آبادیاں ان کے بھائی حمیریوں کے زیرِ حکومت تھیں۔ حمیریوں نے اس خاندان کے رؤسا اور با اثر لوگوں کو امورِ سلطنت میں داخل کیا۔ جب حسّان بن تبع حمیری کا زمانہ آیا تو کندیوں کی حیثیت میں چار چاند لگ گئے۔ ان کا سردار حجر بن عمرو تھا جو حسّان کا بھائی ہوتا تھا چوں کہ یہ جنگ اور فتوحات میں حسّان کا مددگار تھا اس لیے حسّان نے ان مقامات اور قبائلِ معد بن عدنان پر اسے حاکم بنا دیا۔ اور اس طرح خاندانِ کندہ میں ایک بادشاہ کا وجود ہوا۔

جب حجر بن عمر کا انتقال ہوا تو اس کی جگہ اس کے بیٹے عمر بن حجر نے لی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا حارث حاکم ہوا جس کے زمانے میں یمن پر حبشہ کا تسلط ہوگیا اور حمیری حکومت ختم ہوگئی نیز کندہ سے بھی حمیریوں کی سیادت کا خاتمہ ہوگیا۔ اب حارث مستقل طور پر اپنی آبائی حکومت کا مالک بنا۔ عراق میں آلِ منذر کی حکومت تھی جس سے حارث کی ہمیشہ ٹکر رہا کرتی تھی اس وقت وہاں کا فرماں روا منذر بن سما تھا جو قباذ کے زیرِ حکومت مقرر ہوا تھا۔

اسی زمانے میں مزدکی مذہب کا ظہور ہوا جو اشتراکیت کے بہت کچھ مشابہ تھا۔ ایران کے بادشاہ قباذ نے اس مذہب کو قبول کیا اور منذر بن ما رالسماء کو بھی اس مذہب کے اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ اس نے یہ مشورہ ٹھکرا دیا اس پر قباذ برافروختہ ہوگیا اور اسے معزول کرکے اس کی جگہ حارث کو حاکم بنا دیا۔ اس سے حارث کی عظمت میں اور اضافہ ہوگیا۔

مزدکیت کے ظہور کو ابھی زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ قباذ فوت اور اس کی جگہ نوشیرواں بادشاہ ہوگیا۔ زمامِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اس نے مزدکیت کا خاتمہ کر دیا۔ اسی کے ساتھ حارث کو معزول اور منذر بن السما کو پھر حاکم بنا دیا۔

حارث کا ایک لڑکا بنی اسد پر حکومت کرتا تھا۔ اس کے کئی لڑکے تھے جن میں بڑا لڑکا نافع اور چھوٹا ہمارا شاعر امراء القیس ہے۔

یہ کندی حکومت امراء القیس کے زمانے تک اصل قحطانی اور بدوی حکومت تھی۔ جس میں شہریت د

حضارت کے وہ آثار نہ تھے جو آلِ منذر اور آلِ غسان کی حکومتوں میں تھے لیکن یہ بدویت چند ہی دنوں میں ختم ہوگئی۔ پہلے ان کا مذہب حمیری مذہب تھا مگر حیرہ کی حکومت ملتے ہی مزدکیت کو اختیار کرلیا۔ جب حیرہ کی حکومت ہاتھ سے نکل گئی تو وہ پھر اپنے پُرانے حمیری ماحول کی طرف لوٹے اور دوبارہ اپنا قدیمی مذہب اختیار کرلیا۔

مہلہل امرا القیس کا ایک ماموں مہلہل تھا جس کا نام عدی ہے وہ شاعر اور بہادر تھا مہلہل لقب اس لیے پڑا کہ یہ پہلا شاعر ہے جس نے طول طویل قصائد کہے اس کے پہلے چھوٹے چھوٹے قطعات اور متفرق اشعار کہے جاتے تھے۔

امامِ ادب جاحظ کتاب الحیوان میں لکھتے ہیں "حقیقی شعر کی عمر بہت کم ہے سب سے پہلے جس نے شعر کہا اور شاعری کا راستہ صاف کیا وہ امرا القیس اور مہلہل ابن ربیعہ ہیں۔"

لیکن فرزدق کہتا ہے۔ ومھلھل الشعراء ذاک الاول۔ مہلہل سب سے پہلا شعر کہنے والا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مہلہل بن ربیعہ کو آدم الشعرا کسی طرح نہیں کہا جاسکتا۔ کیوں کہ اس زمانے کی عربی شاعری اس قدر کمال کو پہنچی ہوئی معلوم ہوتی ہے کہ یہ کسی طرح بھی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ کہ یہ اسی صدی کی ساختہ و پرداختہ ہے ایک مصری فاضل سلیمان البستانی اپنی کتاب "الیاذہ" کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"مہلہل، شنفری، تابط شرا اور دیگر شعرا جو چھٹی صدی عیسوی کے اوائل میں شمار کیے جاتے ہیں اس قدر فصیح و بلیغ اشعار کہتے ہیں کہ شعراے عرب کے مقدمۃ الجیش قرار نہیں دیے جاسکتے۔" ص ۱۰۸ و ۱۱۲

لیکن جب کہ اشعارِ جاہلیت کی تدوین باقاعدہ طور پر آٹھویں صدی عیسوی میں ہوئی اس وقت صرف دو ڈھائی سو برس پہلے یعنی ۵۰۰ء صدی عیسوی کے بعد کا کلام راویوں کا یاد تھا۔ اس حیثیت سے عربی ادب کی ابتدا ۵۰۰ء سے قائم کی جاسکتی ہے اور اس صورت میں البتہ مہلہل کو ہم عربی شاعری کا آدم الشعرا کہہ سکتے ہیں کیوں کہ اس کے پہلے کسی شاعر کا کلام ہم تک نہیں پہنچا۔

اس کے متعلق جہاں تک ہمیں معلوم ہے بہت آزاد خیال اور رند مشرب آدمی تھا وہ مذہبی قید و بند سے قطعی آزاد اور شرابی تھا وہ جو کچھ کرتا علانیہ کرتا۔ اپنے بھائی کلیب کی زندگی میں برابر قبیلوں کی عورتوں سے

چھیڑ چھاڑ کرنا، عیش ونشاط، شراب وکباب اور مختلف کیفیاتِ زندگی کے ترانے گاتا اور اپنے اشعار کے ذریعے اپنی دلی کیفیات کا اظہار کرتا۔ جنگِ بسوس کے چھڑ جانے سے اس کی حالت میں تھوڑا بہت تغیر ہوگیا اور اس طرح دونوں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ جنگ کے بعد حارث اور اس کا لڑکا شرجیل بکر کے بادشاہ بن بیٹھے اور اس کا دوسرا لڑکا سلمہ تغلب کا حاکم بن گیا۔ اس طرح اس حکومت نے ان دونوں کے تعلقات پھر استوار کر دیے۔

بہرحال امراؤالقیس نے ایک بدوی حکومت کے زیرِ سایہ تربیت پائی جو تمدن وثقافت اور تعلیم وتعلم سے قطعاً ناآشنا تھی۔ اس کا سرمایہ صرف وہ اشعار تھے جن میں عشق ومحبت کی داستانیں بیان کی گئی تھیں۔ اس نے تمام طرف سے توجہ ہٹا کر اسی کو اپنی زندگی کا مطمحِ نظر قرار دیا اور صرف شاعری اور عیاشی کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔ اس کے سامنے جو شاعری تھی وہ دراصل اسی قسم کی تھی جس میں ہر قسم کے جذبات کو علانیہ بیان کیا جاتا تھا چناں چہ امراؤالقیس نے بھی اسی کو اپنا مددگار بنایا اور اس طرح ہر قسم کی بےباکیوں نے اس کے کلام میں جگہ حاصل کر لی۔

امراؤالقیس کا باپ بھی ایک جابر بادشاہ تھا جس نے کبھی رعیت کی اصلاح کی طرف توجہ نہ دی۔ خراج کی آمدنیوں کو عیش وعشرت اور شہوت رانیوں میں صرف کیا کرتا۔ کلیب بھی کچھ کم متکبر نہ تھا اور مہلہل تو اپنے خاندان سے الگ ہوکر زندگی کے لطف اٹھا رہا تھا۔ اور اس کی شاعری عیش وطرب سے معمور شاعری تھی۔ انھی ماحول نے امراؤالقیس کے دماغ میں ہر قسم کی آزادی پیدا کر دی۔ چناں چہ وہ بھی اپنے ماموں مہلہل کے نقشِ قدم پر چلنے لگا۔ اور تمام چیزوں میں اس نے بھی عیش وعشرت کو ترجیح دی۔ اپنے کلام میں حسنِ نسائی کی خوبیاں گنتا۔ ان کے جمال کے وصف میں جدتیں پیدا کرتا۔ کبھی عنیزہ سے محبت کی چھیڑ چھاڑ کرتا ہے تو کبھی امّ حویرث اور امّ رباب کی ہوس رانیوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ کبھی دارِ جلجل کی نہایت شہوت پرستانہ ساعت کو یاد کرتا ہے تو کبھی اپنی معشوقہ کے لیے اپنے اونٹ کی پرلطف قربانی کا حال بیان کرتا ہے۔ کبھی پینے بیٹھتا ہے تو شعر کے جادو سے شراب میں کیف ورنگ بھر دیتا ہے اور کبھی شکار کی طرف نکل جاتا ہے تو گھوڑے اور آلاتِ صید کی تعریف میں فصاحت وبلاغت کے دریا بہا دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب اس نے اپنے

ماموں مہلہل سے میراث پائی تھی۔

معاصرین امراالقیس فطرۃً شاعر اور شوخ مزاج تھا لیکن ماحول اور خاص کر اس کے عزیز و اقارب اور معاصرین نے اسے اور زیادہ شوخ اور رندِ خراباتی بنا دیا۔ وہ اپنے معاصرین میں جن شاعروں سے زیادہ متاثر ہوا ہے اس میں ایک تو مہلہل ہی ہے اور دوسرا شاعر ابوداؤد لایادی ہے۔ ابنِ رشیق نے لکھا ہے کہ امراالقیس اپنی شاعری میں ہمیشہ اس سے سہارا لیتا تھا اور برابر اس کے اشعار کی روایت کرتا تھا چناں چہ بعض لوگوں نے امراالقیس کو ابوداؤد کا راوی بتایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ابوداؤد گھوڑے کی وصافی میں یدِطولا رکھتا تھا اور امراالقیس کا اکثر کلام اس کے کلام سے متاثر ہوا ہے۔

یوں تو وہ اپنے معاصرین میں اور دوسروں سے بھی کچھ نہ کچھ متاثر ہوا ہے لیکن مہلہل اور ابوداؤد اس کے مربّی اور معلّم کی حیثیت رکھتے ہیں اور انھی دونوں شاعروں کے رنگ اس کے کلام میں اکثر جگہ نمایاں ہیں۔ اس کے معاصرین میں سے عبید بن ابرص بھی ہے جو بنی اسد کا شاعر اور اس کے باپ کا ندیم ہے۔ توأم یشکری۔ علقمۃ الفحل اور عمرو بن قمیئہ بھی اس کے معاصرین میں بڑا پایہ رکھتے ہیں لیکن ان میں زیادہ جس کے کلام نے اس پر اثر ڈالا وہ عبید بن ابرص ہے۔ چناں چہ اسلوب و معانی میں بعض جگہ ان دونوں کے اشعار متفق ہو جاتے ہیں۔

حالاتِ زندگی

امراالقیس کے آباد اجداد کا تعلق خاندانِ کندہ سے تھا یہ لوگ نجد میں قبائلِ معد بن عدنان پر حکومت کرتے تھے۔ اس کا زمانہ اسلام سے چالیس سال پہلے بتایا جاتا ہے۔ شروع زندگی کے حالات کا پتا نہیں اور نہ اس کے سنِ پیدایش کے متعلق قطعی طور پر کہا جا سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک تحقیقات و جستجو کے بعد اس کے حالات فراہم ہو سکے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی زندگی ابتدائے سنِ شعور ہی سے آوارگی اور لاپروائی کی طرف مائل تھی پھر ماحول اور اس کے والدین کی ناعاقبت اندیشانہ روِش سمندِ نازہ پہ ایک اور تازیانہ ثابت ہوئی۔ چناں چہ جب اس نے شباب کے ہیجان انگیز میدان میں قدم رکھا تو پھر اس کا دماغ ہر قسم کی قیدو بند سے آزاد ہو گیا۔ دراصل صحیفۂ زندگی کا یہی ایک ورق ہے جو اغراض و مقاصد، سود و زیاں اور نفع و نقصان کے نقوش

سے معرّا ہوتا ہی اس لیے سچ پوچھیے تو جذبات کے اظہار اور شاعری کا زمانہ بھی یہی ہی چناں چہ امراءالقیس صہبائے شباب کی سرمستیوں میں اپنے والد اور معاملاتِ حکومت و سیادت سے کنارہ کش ہوگیا اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگا۔ اور اپنی تمام تر توجہ لہو و لعب، مجلسِ شراب و سرود، عورتوں کے حسن و عشق، سیر و شکار کی طرف مبذول کردی۔

قاعدے کے مطابق اس کے پاس اربابِ عیش و نشاط کا جمگھٹا ہونے لگا اور عرب کے اوباشوں کو ایک سردار بھی مل گیا۔ عیاشوں اور بدمعاشوں نے اس کی رفاقت اختیار کرلی۔ پھر کیا تھا قبائل کی لوٹ اور غارت گری شروع کردی۔ شراب پینے، شعر گانے اور بدمستی میں ہر قسم کی ناشایستہ حرکات کے مرتکب ہونے لگے۔ ان میں سے بعض شاعر بھی تھے جو اپنے اشعار امراءالقیس کی جانب منسوب کرتے۔ لیکن نقادانِ سخن نے ان اشعار کا پتا چلالیا ہی اور انھیں الگ کرکے بتلا بھی دیا ہی۔ لیکن خود امراءالقیس نے بہت سی ان کی خصوصیات کو اختیار کیا جس سے اس کے بعض طبعی رجحانات کو صدمہ بھی پہنچا ہی۔

ابنِ کلبی کا بیان ہی کہ اس کے والد نے شعرگوئی کی وجہ سے اس کو گھر سے نکال دیا تھا اور اس سے نہ ملنے کی قسم کھالی تھی لیکن ابنِ رشیق نے لکھا ہی کہ اس کے والد نے اس کو عشرت پسندی، مغازلہ اور نائونوشی کی وجہ سے الگ کردیا تھا کیوں کہ یہ چیزیں اصحابِ حکومت کے لیے کسی طرح زیبا نہ تھیں۔ شعرگوئی کی وجہ سے الگ کرنے کا کوئی سبب نہ تھا کیوں کہ شاعری وہاں کے شرفا کے نزدیک کوئی معیوب چیز نہ تھی۔ چناں چہ سلمہ، معدی کرب، مہلہل، حجر سب کے سب شاعر تھے۔

ایک روایت ہی کہ اس کے باپ نے اسے صرف اس بنا پر الگ کردیا کہ امراءالقیس نے کسی عورت یا پڑوسن کے بارے میں تشبیب کی تھی یا شرجیل کی بیٹی عنیزہ کے متعلق اظہارِ خیال کیا تھا یہ بھی کہا گیا ہی کہ اس نے ان دونوں کے بارے میں اس وقت تشبیب کہی جب اس کے باپ نے اس کو نکال دیا اور وہ ان دونوں کے قبیلے میں جاکر مل گیا۔ تاریخ کے صفحات میں یہ بھی مرقوم ہی کہ اس کے باپ نے اس کو قتل کرنے کا حکم دے دیا تھا اور اپنے ایک غلام سے کہا کہ اس کو کہیں لے جاکر اس کی دونوں آنکھیں نکال ڈالو۔ چناں چہ غلام اسے لے بھی گیا مگر معاً اسے خیال آیا کہ جب اس کے باپ کا غصہ ٹھنڈا ہوگا تو یقیناً اسے اس واقعے

سے قلق ہوگا۔ وہ گیا اور کسی جانور کی آنکھیں نکال کر اس کے سامنے لایا، اور امرءُالقیس کو کہیں چھپا دیا۔ جب باپ نے وہ آنکھیں دیکھیں تو غمگین ہوا۔ اس کے بعد غلام امراالقیس کو لایا تو باپ بہت خوش ہوا اور اسے شعرگوئی سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ کچھ دنوں تک وہ ضبط کیے رہا۔ مگر پھر جذبات اُمڈے اور ایک قصیدہ کہا جس کا مطلع ہی۔؎

الا عم صباحا ایها الطلل البالی

تو اس کا باپ پھر خفا ہوا اور اسے دوبارہ گھر سے نکال دیا۔

لیکن یہ تمام روایتیں فرضی ہیں اور ان کی حیثیت افسانے سے زیادہ نہیں۔ البتہ مذکورہ بالا بیانوں میں سے اگر کوئی بات قابلِ قبول ہو تو صرف اتنا ہی کہ امراالقیس اپنے باپ کے نکالنے سے پہلے لہو و لعب میں اتنا منہمک نہ تھا۔ چناں چہ اس کا وہ کلام پڑھیے جس کو اس نے اپنے باپ سے جُدا ہونے کے قبل کہا تھا۔

؎ فلو انما اسعیٰ لادنیٰ معیشۃ　　کفانی ولم اطلب قلیل من المال

اگر تھوڑی معیشت کے لیے کوشش کروں تو میرے لیے وہ کافی ہوگی لیکن تھوڑے مال کے لیے میں جستجو نہیں کرتا۔

ولکنما اسعیٰ لمجد مؤثل　　وقد یدرک المجد المؤثل امثالی

لیکن میں تو ایک پائے دار شرف کے لیے کوشش کرتا ہوں اور میرے جیسے انسان شرف حاصل کرلیتے ہیں۔

وما المرء مادامت حشاشۃ نفسہ　　بمدرک اطراف الخطوب ولا آلی

انسان جب تک زندہ رہتا ہی اپنے مقصد کے حصول کے لیے کسی کوشش سے باز نہیں رہتا اور نہ ناامید ہوتا ہی۔

ظاہر ہی کہ اس کا باپ اس کے بڑے بھائیوں کو اس پر ترجیح دیتا تھا اس لیے اِمراالقیس نے ان سے علاحدگی اختیار کرلی۔ اور اپنے دِل کو لہو و لعب سے تسلّی دینے لگا۔ جب اس کو اپنے باپ کے قتل کی خبر پہنچی تو کہا "جب مَیں چھوٹا تھا تو مجھے ضائع کردیا اور جب بڑا ہُوا تو اپنے خون کا بار مجھ پر ڈال دیا" اس سے معلوم ہُوا کہ اِمراالقیس کے خراب ہونے کا سبب خود اس کا باپ ہی وہ نہیں۔

وہ شہروں اور وادیوں کی خاک چھانتا موضع دمون میں پہنچا تھا، وہیں پر اپنے باپ کے قتل ہونے کی خبر سُنی۔ جس وقت اسے یہ خبر ملی وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کھیل رہا تھا، اس کے دوستوں نے کھیل بند کردیا

پھر امراؤالقیس نے قسم کھائی کہ وہ جب تک اپنے باپ کا قصاص نہ لے گا، تیل اور خوش بو استعمال نہ کرے گا۔ اور نہ کسی کھیل سے دِل چسپی لے گا نہ کسی عورت سے تعلق رکھے گا اور نہ کبھی غسل کرے گا۔ نہ شراب پیئے گا اور نہ کبھی گوشت کھائے گا۔ اس نے وہ رات بڑی بے چینی سے گزاری۔ کبھی دشمنوں کے بارے میں ہجو اور غصّے کا اظہار کرتا اور کبھی اپنی مصیبتوں کی داستان کہتا۔ کبھی رات کی درازی کی شکایت کرتا تو کبھی ماضی کی یاد میں آنسو بہاتا۔

باپ کا بدلہ لینے کے لیے اور مُلک کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے وہ ایک فوج تیار کرنے لگا۔ جب بنی اسد کو اس کی خبر پہنچی تو انھوں نے چند آدمیوں کو وفد کی شکل میں اس کے پاس بھیجا جس میں خاص کر عبید ابنِ ابرص اور قبیصہ ابنِ نعیم بھی تھے۔ جس وقت یہ لوگ اس کے پاس پہنچے وہ چھپ گیا اور تین روز تک برآمد نہ ہوا پھر سیاہ قبا اور عمامہ پہن کران کے سامنے آیا۔ (عرب سیاہ عمامہ کسی بڑی مصیبت کے وقت پہنا کرتے تھے) قبیصہ اسے دیکھتے ہی فوراً آگے بڑھا اور کہنے لگا :۔

"یقیناً تم بلند مرتبہ اور ذی مرتبت آدمی ہو۔ زمانے کے انقلابات اور حوادثِ روزگار سے خوب واقف ہو اس کے لیے تمھیں کسی واعظ کی ضرورت نہیں۔ تمھارے اندر خاندانی شرافت اور منصبِ سیادت ہو شریف النسل انسان لغزشوں کو معاف کردیا کرتا ہو جو کچھ غلطیاں سرزد ہوئیں وہ دراصل ایک بہت بڑے سانحے کی پیش خیمہ تھیں ناممکن ہو اس کی مصیبتوں سے نزار دیمن اور کندہ کا کوئی فرد محفوظ رہے۔ تمھارا باپ ایک بادشاہ شخص تھا۔ اگر مقتول کا فدیہ لیا جائے تو ہمارے سوار فدیہ دینے میں کسی قسم کا پس و پیش نہیں کرسکتے۔ لیکن وہ ایک ایسی ہستی تھی جس کا بدلہ یہ ادنا چیزیں نہیں ہوسکتیں۔ اس لیے حالات کے پیشِ نظر تین شرائط میں سے ایک کو اختیار کرلو۔ اور وہ شرائط یہ ہیں :۔

(۱) بنی اسد کے سب سے شریف اور بڑے آدمی کو چُن لو جس کو ہم تمھیں سونپ دیں گے۔ وہ پوری قوم کا کفارہ ہوگا۔

(۲) یا فدیہ لینا قبول کرو اور جتنے چاہو اونٹ لے لو۔

(۳) ورنہ اس جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ جس کی ہیبت سے حاملات کے حمل ساقط، اور جس کے بوجھ سے پُشت خم ہوجائیں۔ اور اپنی تمام چیزوں کو جنگ کے جھنڈوں پر قربان کردیں"

اس بات کو سُن کر امراؤالقیس آب دیدہ ہوگیا اور کہا کہ عرب اس سے اچھی طرح واقف ہیں کہ خوں بہا میں مجھ

کا کوئی ہمسر نہیں اور میں فدیے میں اونٹ وغیرہ لے کر ہمیشہ کے لیے لوگوں کے طعنے کا داغ اپنے اوپر نہیں لگا سکتا۔ لہٰذا تیسری شرط کے سوا اور کچھ نہیں۔

چناں چہ اس نے اِدھر اُدھر جاکر قبیلوں سے بنی اسد کے خلاف مدد مانگنی شروع کی۔ اس کے ماموں بکر و تغلب نے ایک لشکرِ گراں سے اس کی مدد کی۔ اس نے جاکر بنی اسد پر حملہ کردیا، بنواسد بھاگ کھڑے ہوئے۔ تو ان کا پیچھا کیا۔ جب اس کی فوج پیاس کی شدّت سے پریشان ہورہی تھی اور بنواسد ایک چشمے پر خیمہ زن تھے کہ یہ ناگاہ ان پر فوج لے کر ٹوٹ پڑا خوب لڑائی ہوئی دونوں طرف کے سپاہی ہلاک اور زخمی ہوئے۔ جب رات ہوئی تو پھر بنواسد بھاگ نکلے عوامرا القیس نے ان کا پیچھا کرنا چاہا مگر بکر و تغلب کے لوگوں نے لڑنے سے انکار کردیا اور کہا کہ اب تمھارے باپ کا بدلہ ادا ہوگیا ان کے پیچھے پڑنے کی کیا ضرورت؟ یہ کہہ کر وہ لوگ واپس لوٹ گئے۔ امرا القیس وہاں سے مرثد بن ذی جدن کے پاس گیا۔ مرثد نے اپنے پانسو آدمی اس کی طرف سے لڑنے کے لیے دیے اور کچھ عرب بھی اس کے ساتھ ہوگئے۔ ان کو لے کر بنواسد پر پھر اس نے چڑھائی کردی اور کام یاب ہوگیا۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان سخت عداوت پڑگئی اور جنگ کا سلسلہ بہت دنوں کا جاری رہا۔

اِدھر منذر بن ماء السما نے جو شاہانِ کندہ کا ازلی دُشمن تھا امرا القیس کو اس حالت میں دیکھ کر اسے ہزیمت دینے کی ٹھان لی اور کسریٰ انوشرواں سے ایک جرّار فوج لے کر اس کی تلاش میں نکلا۔ حمیریوں نے جب یہ حالت دیکھی تو امرا القیس کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ عرب حلیفِ فارس اور آلِ منذر کے مقابلے میں اس کی مدد نہیں کریں گے تو وہ ان کے سیاسی حریف روم اور آلِ غسّان کی طرف متوجّہ ہوا۔ چناں چہ اس سلسلے میں وہ پہلے سموَل بن عادیا کے پاس گیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ حارث بن ابی شمر غسانی کے نام ایک خط لکھ دے کہ وہ اس کی قیصرِ روم سے ملاقات کرادے۔ اس نے منظور کرلیا اور امرا القیس وہیں اپنا تمام سامان رکھ کر اور اس خط کو لے کر روانہ ہوا حارث کے پاس پہنچا تو اس کی بڑی عزت ہوئی اور اس نے امرا القیس قیصرِ روم "پوستینانس" کے پاس عمرو بن قمیئہ اور جابر ضبی التغلبی کے ساتھ روانہ کردیا امرا القیس جب قیصر کے پاس پہنچا تو قیصر نے بہت آؤ بھگت کی اور اپنے یہاں مہمان ٹھیرایا۔ اس کے بعد قیصر نے

امرار لقیس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا اور کیا کیا سلوک کیے، اس بارے میں مورّخینِ عرب مشکوک نظر آتے ہیں انھوں نے بیان کیا ہو کہ قیصر نے ایک بھاری فوج سے اس کی مدد کی جس میں امرائے روم کے بہت سے نوجوان بھی تھے ۔ اِدھر امرؤالقیس کے آنے کے بعد ہی بنی اسد نے اپنے ایک آدمی طمّاح نامی کو قیصر کے پاس روانہ کردیا۔ تاکہ وہ قیصر اور اس کے درمیان اختلاف و رنجش کی خلیج حائل کردے چناں چہ جس وقت امرار لقیس فوج لے کر چلا تو اس نے امرار لقیس کے خلاف قیصر کے حضور میں زہر اُگلنا شروع کردیا ۔ یہاں تک کہ اس نے یہ بھی کہا کہ امرار لقیس ایک آوارہ اور گم راہ شخص ہو حتّٰی کہ یہاں سے فوج لے کر روانہ ہوا تو آپ کی صاحب زادی سے پیام سلام شروع کردیے اور اس کے متعلق کچھ عاشقانہ اشعار بھی کہے ہیں جو سارے عرب میں مشہور ہو چکے ہیں اس سے آپ کی اور آپ کی صاحب زادی دونوں کی بڑی رُسوائی ہوگی ۔ قیصر نے جب یہ باتیں سُنیں تو وہ جی ہی جی میں پریشان ہوا اور اس غصّے میں اس نے ایک ذرہ تیار کروائی جو زہر میں بُجھی ہوئی تھی پھر اُسے امرؤالقیس کے پاس بھیج دیا۔ جس کو امرار لقیس نے عین گرمی کے دنوں میں پہن لیا پھر کیا تھا تمام زہر اس کے جسم میں سرایت کرگیا اور جسم کٹ کٹ کر گرنے لگا۔ یہ دیکھ کر جابر بن ضبی نے ایک سواری تیار کی اور اس پر سوار کرکے "انقرہ" میں پہنچایا جہاں اس کا کام تمام ہوگیا۔ پھر وہ وہیں پر دفن کردیا گیا۔

رومی مورّخین مثلاً "نونوز" اور "برکوب" کا بیان ہو کہ امرار لقیس نے (وہ لوگ اس کو صرف قیس کہتے ہیں) قیصر کے پاس جانے سے پیش تر خط و کتابت کی تھی جس میں منذر و فارس کے مقابلے میں اپنے لیے مدد مانگی تھی پھر اس کے پاس گیا تو وہ عزّت سے پیش آیا اور مدد دینے کا وعدہ کیا پھر اس کو فلسطین کا انتظام سپرد کردیا وہاں سے وہ جارہا تھا کہ انقرہ پہنچتے پہنچتے اس کو "ذات القروح" کی بیماری ہوگئی اور اسی مرض میں مرگیا اور انقرہ میں دفن ہوا۔

اس میں شک نہیں کہ رومی مورّخین کی رائیں اس بارے میں زیادہ قابلِ قبول ہیں کیوں کہ یہ واقعہ روم کا ہو اور وہاں کا مورّخ غیروں سے زیادہ واقفیت رکھتا ہو پھر عرب ذات القروح کی بیماری سے بالکل آشنا نہ تھے جب امرار لقیس اس بیماری میں مبتلا ہوا تو ان کے لیے یہ ضرور اچنبھے کی بات تھی ۔ یہی وجہ ہو

کہ انھوں نے اس کی موت کا عجیب وغریب قصّہ گھڑ دیا ہو چناں چہ یہ لوگوں کی خاصیت بھی ہو کہ جب کوئی انوکھی چیز سمجھ میں نہیں آتی ہو تو اس کے لیے ایک علّت تلاش کرلیتے ہیں۔ حالاں کہ بیان کیا جاتا ہو کہ جب قیصر کو اس کی موت کی خبر پہنچی تو اس نے حکم دیا کہ اس کا ایک پُتلا بناکر قبر پر نصب کردیا جائے چناں چہ یہ تمثال مامون الرشید کے زمانے تک موجود تھی۔ اور جب وہ رومیوں سے لڑنے گئے تو اس تمثال کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

یہ واقعہ بھی رومی مورّخین کی تائید کرتا ہو کہ قیصر اور امراءالقیس کے تعلقات موت تک خوش گوار رہے لیکن سوال پیدا ہوتا ہو کہ کیا فلسطین کی سیادت یا فلسطین کے بعض قبائل پر حکومت مل جانے سے اس نے اپنی آبائی حکومت کا خیال چھوڑ دیا اور اپنے باپ کا خوں بہا لینا بھول گیا۔ جس کے لیے وہ اتنے جتن سے قیصر کی خدمت میں گیا تھا؟ اس سوال سے ضرور ہمیں تھوڑا سا شک پیدا ہوتا ہو مگر ہم کہ سکتے ہیں کہ وہ اس اقتدار سے خوش نہ تھا اور اگرچہ اس نے عدمِ رضا کا قیصر سے اظہار نہیں کیا مگر اپنی ناکامیابی سے بہت مغموم تھا اور اسی رنج سے راستے میں اس کی روح پرواز کرگئی۔

زمانۂ حال کے بعض مصری ادیبوں کا خیال ہو کہ اگر امراءالقیس قسطنطنیہ قیصر کے پاس گیا تھا تو اس کے اشعار میں ضرور کچھ نہ کچھ اس بہترین شہر کا ذِکر ہوتا، یا اس کے کلام میں کم سے کم سفر کے متعلق کچھ واقعات ہی درج ہوتے۔ جس سے اس واقعے کی تائید ہوتی۔ لیکن ان کے لیے صرف اتنا ہی بس ہو کہ روم کے مورّخین نے اس سفر کا ذِکر کیا ہو۔ اور اس کی تائید موجودہ دَور کے مغربی مورّخین کے یہاں بھی ملتی ہو۔ چناں چہ نکلسن اپنی کتاب "تاریخ ادبِ عربی" میں لکھتے ہیں:۔

"امراءالقیس کا باپ حجر بنی اسد پر حکومت کرتا تھا جب وہ قسطنطنیہ گیا تو شہنشاہ یوستنیانوس نے اس کی بڑی عزّت کی۔ اس لیے کہ وہ چاہتا تھا کہ کندہ کی حکومت کی تائید کرکے فارس کے پہلو میں کانٹا چبھادے۔ اسی لیے اس کو فلسطین کا امیر بنایا۔ وہاں سے وہ جارہا تھا کہ ناگاہ راستے میں موت آگئی۔ اور اس طرح اس کے بارے میں کچھ اظہارِ خیال نہ کرسکا اور پھر وہ اتنا کم ظرف بھی نہ تھا کہ فلسطین کی حکومت پر خوش ہوتا اور اس کے لیے شعر کہتا پھر بھی اس سفر کی یادگار اس کے ان اشعار سے واضح ہوجاتی ہو۔

تذکرت ھنداً و انرابھا　　فاصبحت ازمعت منھا صدودا
و نادمت قیصر فی ملکہ　　فاوجھنی و رکبت البریدا

ان تمام واقعات سے یہی مترشح ہوتا ہو کہ باپ کی وفات کے بعد امراءالقیس کی حالت پہلے جیسی نہ رہی اور وہ خوں بہا کی خاطر خوں ریزی پر تُل گیا اور اس بات کو نظر انداز کردیا کہ اس کے باپ کا قتل ظلم و جبر کے سبب ہوا اس نے کشت و خون کے ذریعے ملک واپس لینے کی خواہش کی۔ حالاں کہ اس کو چاہیے تھا کہ جب بنی اسد کا وفد اس کے پاس آیا تھا تو اسی وقت ان کی شرائط کے مطابق صلح کرلیتا۔ لیکن وہ شبابی جذبات پر قابو نہ پاکر بدلہ لینے کے لیے آمادہ ہوگیا جس کا انجام تباہی ہوا۔ بہرحال امراءالقیس کے اس زمانے کے اشعار بہترین ہیں کیوں کہ جب اس کے اعوان و انصار اور یاروں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تو یک بہ یک اس کی آنکھوں کے پردے اُٹھ گئے اور وہ اس غم میں اپنے تجربات اور حکمت کی باتیں بیان کرنے لگا۔

سالِ وفات عام مورخین کا خیال ہو کہ امراءالقیس چھٹی صدی عیسوی میں گزرا ہو۔ بعض اس کو پانچویں صدی سے پہلے بتلاتے ہیں لیکن اگر اس کا باپ ۵۲۹ء میں قتل ہوا ہو تو زیادہ ارجح روایت یہ ہوگی کہ وہ سنہ ۵۰۰ء میں پیدا ہوا چناں چہ رینان فرانسیسی کا بھی یہی بیان ہو بعض روایت میں یہ بھی ہو کہ وہ ۵۲۵ء میں پیدا ہوا اور ۵۶۵ء میں وفات پائی۔ ایک روایت میں ہو ۵۴۵ء میں مرا ہو لیکن ہمارے لیے کوئی خاص سن متعین کرنا ناممکن ہو کیوں کہ اس زمانے کی طرح اس وقت سن کا التزام نہیں کیا جاتا تھا

قومیت اور مذہب انسان کی زندگی پر دین و مذہب کا ایک گہرا اثر پڑتا ہو اس کے اخلاق و معاشرت خیال و عمل پر مذہب کا رنگ جھلکتا ہو۔ اب تک جہاں ہم نے امراءالقیس کے زندگی کے واقعات پر تبصرہ کیا مناسب ہو کہ اس کے عقائد اور مذہب کے متعلق بھی عرض کردیں تاکہ آیندہ کلام پر نظر ڈالتے وقت یہ امور پیشِ نظر رہیں۔

سب سے پہلے اس کے جدِ اکبر حارث نے جب منذر بن ماءالسماء نے مزدکیت کے اختیار کرنے سے انکار کردیا تو اس نئے مذہب کو اختیار کرکے حکومت کا وارث بن گیا اور قباذ نے اس کے صلے میں حیرہ کی حکومت عطا کی پھر "النّاس علیٰ دینِ ملوکھم" کے مصداق کندیوں کا بھی اسی مذہب پر عمل ہوگیا۔ اس سے یہ بھی

معلوم ہوتا ہی کہ کندیوں کا مذہب کے بارے میں کوئی مستقل اور پائے دار نظریہ نہ تھا۔ چناں چہ جب قباذ مرگیا اور اس کی جگہ پر انوشیرواں بادشاہ ہوا اور حارث کو اس نے حیرہ سے معزول کر دیا تو پھر انھوں نے اپنا مذہب تبدیل کرلیا۔

ان حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہی کہ اس کا قبیلہ مصالح اور اغراض کے ماتحت مذہب کا پرستار تھا ان کے نزدیک عرب میں نہ تو کوئی بُت قابلِ احترام تھا نہ مزدکیت قابلِ ستایش اور نہ مجوسیت کوئی اہمیت رکھتی تھی اور نہ وہ نصرانیت ہی سے کچھ مانوس تھے۔ اسی ماحول سے امراء القیس کا بھی متاثر ہونا ضروری ہی اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے لامذہبیت میں پرورش پائی۔ زمانۂ شباب میں اس نے شہوات و لذات کی پرستش کی اور اپنے نزدیک دُنیا کی تمام چیزوں کو مباح کرلیا۔ اسی لیے بعض علما کو شبہہ ہوا ہی کہ وہ مزدکیت کا پیرو تھا۔ اور اس کی آڑ میں اپنے خاندان والوں کی طرح اپنا مقصد پورا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہی کیوں کہ مزدکیت میں مال و آبرو وغیرہ تو ضرور مباح ہی لیکن قتل و خوں ریزی ان کے نزدیک کسی طرح جائز نہیں ہی۔ امراء القیس کا عمل اس کے برعکس ہی۔ کیوں کہ جب بنو اسد اس کے باپ کے بدلے میں ایک شخص کو دے رہے تھے تو وہ اس پر راضی نہ ہوا۔ پھر جب وہ بنی اسد سے لڑنے کے لیے نکلا تو ایک بُت ذوالخلصہ نامی کی طرف سے اس کا گزر ہوا جہاں پر عرب لوگ تیروں کے ذریعے فال نکالا کرتے تھے۔ امراء القیس نے بھی فال نکالی تو موافق نہ نکلی، دوبارہ سہ بارہ تیر ڈالے لیکن ہر دفعہ جواب نفی میں نکلا جس سے اسے طیش آگیا تیروں کو بُت کے منھ پر پھینک دیا اور اسے بہت سخت و سست بھی کہا۔ اور گالی دے کر وہاں سے چلا گیا۔ اس سے بھی یہی پتا چلتا ہی کہ امراء القیس کا کوئی خاص عقیدہ نہ تھا وہ صرف مصلحت پرست تھا۔ جیسا موقع ہوتا اپنے مقصد کے مدِنظر اس مذہب کا تھوڑی دیر کے لیے حامی بن جاتا۔ اور جب اس کا مقصد پورا ہوجاتا تو فوراً اس سے کنارہ کشی اختیار کرلیتا اس معاملے میں اس کے نزدیک عرب کی بُت پرستی اور دوسرے تمام مذاہب یکساں تھے۔

اس کا نام امراء القیس (قیس) بُت کے نام پر اس لیے نہیں پڑا کہ وہ اس کا معتقد تھا۔ بلکہ ایک محبوب انسان ہونے کی وجہ سے اِس نام سے موسوم ہوگیا۔ آج بھی کتنے ملحدین ہیں جن کا نام علی، حسین وغیرہ ہوگا۔

صرف نام کی وجہ سے امراءالقیس کے عقیدے پر فتوا نہیں لگایا جاسکتا۔

بعضوں نے امراءالقیس کو نصرانی شعرا میں شمار کیا ہے ان کا خیال ہے کہ اس کے آبا نے اس مذہب کو حیرہ میں قبول کیا تھا۔ لیکن اصل یہ ہے کہ حیرہ پر ان کا قبضہ تو مزدکیت کے سبب حاصل ہوا وہ جب تک حیرہ میں رہے کسی دوسرے مذہب سے بالکل ناآشنا تھے۔ البتہ امراءالقیس کی ایک چچی ہندہ بنت حارث اور بعض دوسری رشتے دار عورتیں نصرانی تھیں۔ اس سے اس کا نصرانی ہونا لازم نہیں آتا۔ اس لیے کہ اس خاندان کے لوگ اس عورت کے گھر سے بہت دور دیہات میں رہتے تھے اور وہ "حیرہ" میں جاکر اس وقت نصرانی ہوئی جب کہ اس کی شادی منذر بن ماءالسما سے ہوئی۔ لیکن امراءالقیس کا نصرانی ہونا بعید بھی نہیں ہے کیوں کہ جس وقت عربوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ قیصر کے پاس مدد کے لیے گیا تو شاید اس نے سوچا ہو کہ جس طرح اس کے آبا و اجداد مذہب کی آڑ میں شکار کھیلتے رہے اسی طرح وہ بھی مصلحتاً عیسائی ہوجائے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس کی موت کے بعد قیصر نے اس کی بڑی عزت کی۔ اور ایک تمثال اس کی قبر پر نصب کرادی۔

امراءالقیس کے اشعار میں بعض جگہ "اللہ" کا بھی نام آیا ہے مگر وہ اس طرح پر کہ اس کے عقیدے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ چناں چہ وہ کہتا ہے ؎

فقالت سباك الله انك فاضحی　　　　الست تری السمار والناس احوالی
فقلت یمین الله ابرح قاعداً　　　　ولو قطعوا رأسی لدیك واوصالی
حلفت لها بالله حلفة فاجر　　　　لناموا فما ان من حدیث ولا صالی
والله انجح ما طلبت به　　　　والبر خیر حقیبة الرحل

آخری شعر سے واقعی مذہبیت کا پتا چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی خداترس آدمی کا شعر ہے چناں چہ بعض لوگوں کا خیال بھی ہے کہ اس کا یہ شعر کبھی نہیں ہوسکتا بلکہ کسی دوسرے کا ہے اور غلط طور پر اس کی جانب منسوب ہوگیا ہے۔ اس قسم کی باتیں امراءالقیس جیسے آوارہ منش اور رندانِ قدح خوار کی زبان سے ادا نہیں ہوسکتیں۔ اس بارے میں محققین کی یہ رائے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کہ اس قسم کے جتنے اشعار اس کے دیوان میں ملیں گے سب کے سب ہنسی دل لگی کے طور پر لکھے گئے ہیں۔

اصلی زبان جس عربی زبان میں امراءالقیس کا کلام موجود ہی وہ عدنانی زبان ہی کیوں کہ اس کا قبیلہ کندہ بھی، عدنانی ہی اس لیے اس کا کلام اگر عدنانی زبان کے مطابق ہو تو کوئی تعجب نہیں۔ لیکن جمہور علمائے انساب کا خیال ہی کہ وہ قحطانی ہی تو اس صورت میں ماننا پڑے گا کہ قبیلہ کندہ نجد کی طرف چلا گیا ہوگا اور عدنانیوں پر اس نے حکومت کی ہوگی۔ غالباً یہ زمانہ حسّان بن تبع کا زمانہ ہی جو پانچویں صدی کے اوائل میں تھا (۴۲۰-۴۲۵) اور یہ خاندان پورے پانچویں صدی میں یا چھٹی صدی کے اوائل تک یعنی امراءالقیس کے ظہور تک رہا اس زمانے میں یمن پر حبشہ کا قبضہ ہوگیا اور حمیر کی حکومت وہاں سے ختم ہوگئی، اس کے ساتھ ساتھ کندہ کے تعلقات اس سے منقطع ہوگئے تو وہ شمال کی طرف چلے گئے اور ان کے تعلقات عدنانیوں سے استوار ہوتے گئے۔ پھر ان کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں مختلف قبیلوں پر قائم ہوتی رہیں۔ انھی چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں ایک حجر کی بھی حکومت تھی جو بنی اسد پر حکمران تھے۔ اس طرح علمائے انساب کے نزدیک امراءالقیس کے کندی قحطانی خاندان کی زبان عدنانی ہوگئی۔

ان تمام دلائل کے علاوہ ایک اور دلیل بھی ہی جس سے معلوم ہوتا ہی کہ امراءالقیس کا عدنانی زبان سے متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ امراءالقیس کی ماں فاطمہ تغلبی تھی جو عدنانی ہی ظاہر ہی ماں کا اثر اولاد پر بہت زیادہ پڑتا ہی۔ خصوصاً زبان اور عادات و اخلاق پر تو بہت گہرے نقوش مرتسم ہوتے ہیں۔ پھر امراءالقیس جن دو شاعروں کی صحبت سے فیض یاب ہُوا وہ عدنانی ہیں۔ اور اس کے باپ کا شاعر "عبید ابنِ ابرص" بھی عدنانی ہی جس نے امراءالقیس کے کلام پر انھی دونوں شاعروں کی طرح اثر ڈالا ہی مختصر یہ کہ یہی وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر یہ قحطانی شاعر عدنانیوں کی صف میں نظر آرہا ہی۔

بعض مستشرقین نے ان تمام عوامل سے قطع نظر کرکے کہ دیا ہی کہ یہ تمام اشعار جو عدنانی زبان میں ہیں اور امراءالقیس کی طرف منسوب ہیں غلط ہیں اس لیے کہ وہ قحطانی تھا ہم اس بارے میں انھیں معذور سمجھتے ہیں حقیقت یہ ہی کہ انھیں واقعات کا صحیح علم نہیں اور ان کی نظریں حقیقت رس نہیں ہیں پھر ان ادیبوں کی عقل پر حیرت ہی جو کہتے ہیں کہ یہ اشعار اس کی طرف غلط منسوب ہیں اگر یہی ان کے نزدیک معیارِ تحقیق و نظر ہی تو پھر اس طرح سے ایک ہزار برس کے بعد کہا جاسکتا ہی کہ "احمد شوقی بک" کے تمام اشعار منسوب الیہ

ہیں۔ کیوں کہ وہ عربی نہیں ہیں اور ان کے اشعار کی زبان عربی ہو۔

عدنانی زبان کے مختلف لہجے تھے اور امراءالقیس کا کلام بھی اس کے قبیلے کے لہجے سے مختلف ہو تو پھر سوال پیدا ہوتا ہو کہ عربی میں شعر اختلافِ لہجات سے پہلے آیا یا اس کے بعد؟ اس مشکل سوال کے جواب میں یہی کہا جاسکتا ہو کہ عربی زبان کا اختلافِ لہجات سے پہلے ایک مدت دراز تک بغیر شعر و ادب کے رہنا غیر معقول سی بات ہو۔ سچ پوچھیے تو اختلافِ لہجات سے پہلے ادب اور شعر موجود تھے اور جو لوگ اس زمانے کے قریب گزرے ہیں وہ سب کے سب اسی طرز پر شعر کہا کرتے تھے۔ وہ جدت بھی اگر پیدا کرتے تھے تو وہ فقط لفظی ہوتی تھی۔ اس زمانے میں ادب کی ایک متفقہ زبان تھی۔ مگر معدودے چند افراد ایسے بھی تھے جو اس شاہ راہ سے ہٹ کر گفتگو کرتے تھے۔ پھر جب خفیف سا لہجہ تبدیل ہوا تو اس وقت بھی اس کی کوئی اہمیت نہ تھی اور وہ سب کے سب ایک دوسرے کی زبان اور لہجے سے بہ خوبی آشنا تھے۔ آج بھی ہم کو بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جو عربی میں قدامت کا نشان ہیں اور ان سے ان شعرا کا بھی پتا چلتا ہو جو اسلام سے پہلے گزرے۔ تاریخ میں بھی ان کے نام زندہ ہیں اگر ان کے اشعار دست یاب نہ ہوتے تو وہ کبھی کے فراموش کردیے گئے ہوتے۔ ان غیر معروف شعرا میں ایک "ابنِ خزام" ہو جس کا ذکر امراءالقیس نے اپنے شعر میں کیا ہو ؎

عوجا علی الطلل المحیل لاننا		نبکی الدیار کما بکی ابن خزام

علامہ سیوطیؒ اپنی کتاب "المزہر" میں لکھتے ہیں:۔

"ابنِ خزام کے متعلق صرف اتنا معلوم ہو کہ وہ قبیلۂ طے کا فرد ہو اس کے علاوہ اس کے اشعار کا پتا نہیں اور نہ اس کے علاوہ کہیں اس کا ذکر ملتا ہو"

زہیر بن سلمیٰ کہتا ہو ؎

ما ارانا نقول الا معارا		او معاداً عن لفظنا مکرورا

اس شعر میں زہیر اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہو کہ اس کے معاصرین کے کلام شعرائے قدیم کے کلام سے مستعار ہیں عنترہ بن شداد العبسی کہتا ہو ؎

ھل غادر الشعراء من متردم ام ھل عرفت الدار بعد توھم

اس شعر میں وہ کہتا ہے کہ اگرچہ قدما نے کچھ نہیں چھوڑا ہے مگر پھر بھی وہ نیا شعر پیدا کرسکتا ہے۔

کلام کی تدوین

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عرب چوں کہ اُمّی و ناخواندہ تھے اس لیے اسلام سے پہلے وہ قدیم شعرا کے کلام مدوّن نہ کرسکے لیکن یہ خیال صحیح نہیں بلکہ ان کی نظر سے شعرائے جاہلیت کے کلام نہیں گزرے ہیں ورنہ معلوم ہوتا کہ کلامِ عرب کے نہ مدوّن ہونے کے خاص اسباب ہیں۔ اور شاید انھی اسباب کے ماتحت اسلام کے دوسو برس بعد ان کا کلام صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوسکا۔

یوں تو ان کی کتابت کا حال آلِ منذر کے وقت سے معلوم ہوچکا ہے لیکن پھر بھی اس بارے میں ان کے کلام سے پتا چلتا ہے کہ وہ لکھنے پڑھنے کے فن سے بالکل ناآشنا نہ تھے البتہ وہ تحریر و کتابت کو بہت معیوب سمجھتے تھے اور وہ فطرۃً ہر چیز کو زبانی یاد رکھنے کی کوشش کرتے تھے چناں چہ حدیثوں سے بھی اس کی تائید ملتی ہے:-

”مذھب العرب انّھم کانوا مطبوعین علی الحفظ مخصوصین بذالک“

اصل یہ ہے کہ عرب کا بدّو کتابوں کے طومار کو دیکھ کر مذاق اُڑاتا تھا ان کا یہ عام چلتا ہوا فقرہ تھا ”حرف فی تامورك خیر من عشرۃ فی کتبك“ دل میں ایک حرف کا محفوظ رکھنا کتابوں کی دس باتوں سے بہتر ہے۔ عرب کا مشہور شاعر کہتا ہے ؎

لیس بعلم ما حوی القمطرا ما العلم الّا ما حوی الصدرا

علم وہ نہیں ہے جو کتابوں میں درج ہے۔ نہیں ہے علم لیکن صرف وہی جو سینے میں محفوظ ہو۔

دُوسرا کہتا ہے ؎

استودع العلم قرطاساً فضیعہٗ وبئس مستودع العلم القراطیس

جس نے علم کو کاغذ کے سپرد کیا اس نے اسے ضائع کیا علم کے بدترین مدفن کاغذ ہیں۔

تیسرے کا شعر ہے ؎

علمی معی حیث ما یممت احملہٗ بطنی وعاء لہ لا بطن صندوق

میرا علم میرے ساتھ ہے جہاں جاتا ہوں اسے اٹھائے لیے جاتا ہوں میرا باطن اس علم کا برتن ہے نہ کہ شکمِ صندوق۔

ان کنتُ فی البیت کان العلم فیہ معی اذا کنتُ فی السوق کان العلم فی السوق

اگر گھر میں رہتا ہوں تو علم میرے ساتھ رہتا ہے جب بازار میں ہوتا ہوں تو میرا علم بھی بازار میں ہوتا ہے۔

ان اشعار سے عربوں کے خاص رجحان کا پتا چلتا ہے اور لکھنے اور کتابت کے متعلّق ان کا نقطۂ نظر اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے۔ اس خاص مذاق کا نتیجہ تھا کہ قدرتی طور پر ان کو اپنے حافظے پر بھروسا کرنا پڑتا تھا ظاہر ہے کہ انسان اپنی جس قوّت کو زیادہ استعمال کرتا ہے اس میں جِلا پیدا ہوجاتی ہے۔ مختلف اقوام کی مختلف چیزوں کے ساتھ خاص مناسبت کی غالباً یہی وجہ ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ "انّ العرب قد خصّت بالحفظ" عرب قوّتِ حافظہ میں خاص امتیاز رکھتے تھے۔ ان کے قوّتِ حافظہ کے حیرت انگیز واقعات کتابوں میں بھرے پڑے ہیں۔ لیکن کتابی قوموں کے لیے ان کا باور کرنا دشوار ہے۔ بہ ہر حال کلامِ عرب کی تدوین عہدِ عباسی سے شروع ہوئی اور اس عہد کے علما نے خاص طور پر اس کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ ان میں سے بعض ثقہ علما مثلاً ابوعمرو بن علا، اصمعی، خالد بن کلثوم اور محمد بن حبیب نے امراءالقیس کا کلام بھی جمع کیا۔ ان کے بعد ابوسعید السکری، ابوالعباس احول، ابن سکیت وغیرہ اس کے اشعار کی روایتوں کو اکٹھا کرتے رہے ان کے علاوہ اور بہت سے ثقات جیسے ابوعبیدہ اور ابوعمرو الشیبانی اور معضل الضبی نے نے ان اشعار کی روایتوں کی کاٹ چھانٹ کی اور بہت سے اشعار کا اضافہ کیا۔ سب سے زیادہ ثقہ روایت ابوحاتم السجستانی کی ہے، جس کو وہ اصمعی سے روایت کرتے ہیں بہتر ہوگا ان رواۃ کے متعلّق ائمۂ جرح تعدیل کی رائے معلوم کرلی جائے۔

(۱) ابوعمرو بن علا —— ان کا نام قراءِ سبعہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ عربی ادب، قرآن اور شعر کے زبردست عالم تھے۔ اتنی کتابیں تصنیف کیں جن کا انبار ان کے کمرے کی چھت تک اونچا جاتا تھا۔ انھوں نے روایات میں بہت محنت سے کام لیا تھا اور جب قرآن کے متعلّق ان پر کوئی الزام نہیں تو

شعر میں کیسے ہوسکتا ہے۔ ان کی وفات ۱۵۴ھ میں ہوئی ۔

(۲) اصمعی ——— نام عبدالملک بن قریب ہے۔ نحو، لغت، تاریخ میں ان کا ثقہ ہونا مسلّم ہے۔ ربیع بن سلیمان نے امام شافعی سے سُنا وہ کہا کرتے تھے کہ "اصمعی جیسی عبارت سے کوئی عرب فوقیت نہیں لے گیا۔" مامون نے بہت چاہا کہ اصمعی اس کے پاس چلے آئیں مگر وہ نہ آئے۔ اکثر مشکل مسائل مامون ان کے پاس بھیجا کرتا۔ قرآن و سنّت کی تفسیر میں اصمعی بہت احتیاط سے کام لیتے تھے۔ جب کوئی قرآن و سنّت کی باتیں پوچھتا تو وہ کہتے کہ عرب اس کے معنی یہ بیان کرتے ہیں اور میں اس سے زیادہ کتاب و سنّت کے بارے میں اور نہیں جانتا۔ ان کی وفات ۲۱۶ھ میں ہوئی ۔

(۳) ابوعبیدہ ——— نام معمر بن مثنّٰی ہے حافظ کہتے ہیں کہ تمام علوم میں اس سے زیادہ کوئی ماہر نہیں۔ اس کی سب سے زیادہ معلومات 'غریب اشعار'، 'اخبارِ عرب' اور 'ایامِ عرب' میں ہے۔ ابوعبیدہ' اصمعی اور ابوزید انصاری تینوں ایک ہی زمانے میں آئمۂ ادب تھے۔ مگر تینوں میں جامعیت ابوعبیدہ کے اندر تھی۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ابوزید نحو کا سب سے بڑا عالم تھا۔ علی بن مدینی بیان کرتے ہیں کہ ابوعبیدہ عرب کے متعلق جو کچھ بیان کرتے ہیں بالکل صحیح بیان کرتے ہیں ان کی وفات ۲۰۹ھ میں ہوئی ۔

(۴) ابوحاتم سجستانی ——— نام سہل بن محمّد ہے یہ کثیر الرّوایت تھے لغت اور شعر سے خوب واقف تھے اور عروض بھی بہت اچھا جانتے تھے۔ لغت میں ان کی بہت سی تالیفات ہیں۔ ان کے بیانات بہت صحیح ہیں۔ کتابوں پر بہت عبور تھا۔ مشکل سے مشکل مسائل حل کرتے تھے۔ اور نہایت دقیق النظر تھے ان کی وفات ۲۵۵ھ میں ہوئی ۔

اکثر وہ کتابیں جن میں امراءالقیس کے اشعار جمع کیے گئے ہیں یا ان کی شرح کی گئی ہے ان کا دارو مدار انھی علما کی روایتوں پر ہے۔ ان میں سے خاص کر حاتم اصمعی سے جو روایت کرتے ہیں وہ حسبِ ذیل ہے۔

(۱) "شرح دیوانِ امراءالقیس" ——— وزیر ابی بکر عاصم بن ایوب بطلیموسی النحوی متوفی ۴۹۱ھ کی ہے۔ یہ کتاب بار بار شائع ہوچکی ہے۔ گو اس کتاب میں کہیں یہ ذکر نہیں کہ یہ روایت کس سے لی گئی ہے مگر جہاں تک

پتا چلتا ہو کہ ابوحاتم کی روایتیں ہیں البتہ صرف دو قصیدے ایسے ہیں جن کے متعلق نہیں کہا جاسکتا کہ یہ روایت کس کی ہو۔

(۲) "دواوین الشعرا الستۃ الجاہلین" ـــــ یعنی امراءالقیس، علقمہ، زہیر، نابغہ، طرفہ، عنترہ کے کلام اس کتاب میں جمع کیے گئے ہیں۔ اس کا ایک نسخہ مغربی مطبع کا چھپا ہوا مکتبۂ ملکیہ مصریہ میں موجود ہو۔ جس کے اندر اشعار کی شرح بھی موجود ہو۔ اس کتاب کی ابتدا امراءالقیس کے شعر سے ہوتی ہو۔ کل اٹھائیس[۲۸] قصائد بروایت حاتم جمع کیے گئے ہیں۔ اس کے پہلے اور آخری قصیدے کے علاوہ تمام قصیدوں کی شرح وزیر ابوبکر نے کی ہو۔ اور آخر میں لکھا ہو" حاتم کا بیان ہو کہ جن قصائد کی اصمعی نے تصحیح کردی ان سے یہ الگ ہو اور اس کے بہت سے اشعار اس کے مصاحبوں کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں " ہم کچھ ایسے چیدہ اور منتخب قصائد پیش کرتے ہیں جن پر ابوحاتم کی نظر نہیں پڑی ہو اصمعی ان کو ربیعہ بن حشم کا قصیدہ بتاتے ہیں مثلاً

(۱) احار بن عمر کانی خمر (۲) الانعم صباحا ایہا الربع فانطق (۳) امن ذکر سلمی اذ نانک تنوص

(۴) حی الحمول بجانب العزل (۵) تطاول لیلک بالاثمد (۶) جزعت ولم اجزع من البین مجزعا

اس دیوان کے ایک قصیدے (اعنی علی برق اراہ ومیض) کے متعلق کہا جاتا ہو کہ یہ ابوداؤد کا ہو چنانچہ یہ حاتم کی روایت ہو تین اور بھی قصیدے ہیں جن کو وزیر ابی بکر نے حاتم سے روایت کی ہو، مختلف فیہ ہیں۔

ان قصائد کی طرف ایک اور مقطع کا اضافہ کیا جاتا ہو ؎ ـــــ "الا لا تکن ابل فمعزی"

وزیر ابوبکر نے اپنی شرح میں لکھا ہو کہ اصمعی کے نزدیک یہ امراءالقیس کا مقطع نہیں بلکہ ان کا قیاس حطئیہ کی طرف ہو۔ قصیدۂ "خلیلی مرابی علی ام جندب" کے متعلق عام طور پر خیال ہو کہ وہ امراءالقیس کا نہیں ہو۔

(۳) "عقد الثمین فی دواوین شعراء الستۃ الجاہلین" ـــــ نابغہ، عنترہ، طرفہ، زہیر، علقمہ اور امراءالقیس کے کلام اس کے اندر ہیں۔ اس کا مولف ۱۲۸۳ھ میں پیدا ہوا۔ موسیو ولیم ابن الورد بروسی نے اس کی تصحیح اور تزئین کے بعد شائع کیا ہو۔ ان قصائد میں ولیم نے کچھ بھی زیادتی نہیں کی ہو۔ صرف

ان قصائد کو حروفِ ابجد کے قاعدے پر ترتیب دے دیا ہے۔ نیز اس میں اصمعی، ابو عمرو بن علا، معضل اور ابوسعید السکری کی روایات جمع کردی ہیں اور تمام شعرا کے قصائد کی شانِ نزول کی ایک ایک فہرست بھی مرتب کردی ہے۔ البتہ روایات کے ضمن میں کچھ قصائد اور مقطعے ذکر کردیے ہیں اور ان اشعار کے متعلق حاشیہ چڑھادیا ہے جو ان شعرا کی طرف منسوب ہیں۔ منسوب شدہ قصائد کے مطلع حسبِ ذیل ہیں:-

(۱) قالت الخنساء لما جئتها (۲) اجارتنا ان الخطوب تنوب (۳) أذکرت نفسك مالن یعودا

(۴) لمن طلل بین الجلایة والجبل (۵) طرقتك هند بعد طول تجنب (۶) الم یحزنك ان الدهر غول

(۷) الحرب اول ما تکون فتیته

(۴) "شرح دیوان شعر الستة الجاهلین" —— اس کا ایک نسخہ مکتبۂ ملکیہ مصریہ میں موجود ہے مگر اس میں مولف کا نام نہیں ہے صرف یہ لکھا ہے کہ تالیف کرکے سیف الدولہ ابوالولید اسماعیل بن معتضد باللہ کو ہدیۃً پیش کیا گیا۔ احمد بن عبد بن المختار کے خط میں مغربی مطبع میں چھپا ہوا ہے۔ اس کے مولف نے اصمعی کی روایت پر زیادہ اعتماد کیا ہے۔ پھر منتخب قصائد کا ذکر کیا ہے جن کی روایت اصمعی کے علاوہ اوروں سے لی ہے لیکن اس نے اصمعی کے تمام قصائد کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ اس کا مقصد چیدہ قصیدوں کا جمع کرنا تھا۔

(۵) "نزهة ذوی الکیس وتحفة الادباء فی قصائد امرء القیس اشعر الشعرا" —— اس کا ایک نسخہ مکتبۂ ملکیہ مصریہ میں موجود ہے اور ۱۸۲۳ء میں دارالطباعۃ السلطانیہ میں چھپی ہے۔ اس کے ساتھ ایک مقدمہ اور قصیدوں کا ترجمہ بھی ہے۔ فرانسیسی زبان میں بعض ملاحظات بھی درج ہیں اس کا مولف زیادہ تر ابوالحجاج بن سلیمان سے روایت کرتا ہے اس نے ابو حاتم کی روایت سے معلقہ کو حذف کردیا ہے۔

(۶) "دیوان امرءالقیس" —— اس کی روایتیں ابوسہل خربنداذ بن شینکی ہیں جو ابوالحسن علی بن عبداللہ بن سنان الطوسی اور ابونصر احمد بن حاتم کی جو اصمعی اور ابوعمرو الشیبانی سے روایت کرتے ہیں اور انھی لوگوں کی روایت کے مطابق اس کے قصیدے کی شرحیں بھی ہیں۔ اس کتاب کا ایک نسخہ عثمانی خط میں مکتبۂ ملکیہ مصریہ میں موجود ہے۔

کتاب کی ابتدا ابوالحسن علی طوسی کی روایت سے شروع ہوتی ہے اور ابونصر کا ذکر صرف ایک یا دو شعر میں

آیا ہے۔ اس دیوان میں وہ تمام قصائد اور مقطعے بھی ہیں جن کو ابو حاتم نے اصمعی سے روایت کی ہے اور ان منسوب الیہ قصائد اور مقطعات کا بھی ذکر ہے۔

(۷) " دیوانِ امرؤالقیس " ـــــ اس کی روایتیں ابوسہل ماخربنداد کی ہیں جو ابوجعفر کوفی اور ابوعمر اصطخری سے روایت کرتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے ان تمام روایات کو ابوجعفر احمد بن حسن کوفی کو شیراز میں سُنایا پھر ابوعمر حفص بن عمر العبدی اصطخری کو سُنایا اور ابوجعفر کا بیان ہے کہ انھوں نے ابوہشمی اور اصمعی کے بعض اصحاب کو بھی پڑھ کر سُنایا۔ ابوعمر کا بیان ہے کہ انھوں نے ابوعبیدہ حسن عبدی اور ابومسعود سلمہ بن عبد کو سنایا اس کتاب میں بہت سے منسوب الیہ قصائد بھی درج کیے گئے ہیں۔

(۸) " دیوانِ امرارلقیس " ـــــ اس میں شیخ محمد محمود کی شرح بھی شامل ہے اور اس میں وہ اشعار بھی جمع کیے گئے ہیں جو دیوانِ شعراستہ میں بالکل ہی نہیں ہیں۔ اس میں ایک قصیدہ ایسا بھی آیا ہے جس کو سہل نے حاتم کی روایت سے چھوڑ دیا تھا اس کا مطلع ہے ع (منعت اللیث من اکل بن حجر) مگر اس کو منسوب الیہ شمار کیا ہے۔

اب اگر ہم ان تمام قصائد کا شمار کرنا چاہیں جو مختلف روایات سے امرارلقیس کے تسلیم کیے گئے ہیں تو ان کی تعداد سَو سے زائد ہوتی ہے حالاں کہ محققین کا بیان ہے کہ امرارلقیس بہت کم گو شاعر تھا اور زیادہ سے زیادہ اس کے کل بیسؔ قصائد اور قطعات ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ قصائد جن کو سہل بن ابوسہل خربنداد نے بیان کیا ہے ان کا غیر مشہور اور مضطرب ہونا یقینی ہے۔

ابن ندیم اپنی کتاب میں علی بن عبداللہ طوسی اور احمد بن حاتم کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں یہ لوگ ان کے نزدیک ان لوگوں میں نہیں ہیں جنھوں نے کلامِ امرارلقیس کی تدوین میں کوئی حصّہ لیا ہو۔

اس سلسلے میں اگر ہم اس مجموعے کا کچھ ذکر کریں تو بے محل نہ ہوگا جس میں نامور شعرائے جاہلیت کے سات قصائد ہیں۔ اور سب سے پہلا قصیدہ امرارلقیس کا ہے۔ ع

قفا نبك من ذكرى حبيب و منزل

مورخین کا خیال ہے کہ یہ تعداد میں بہت زیادہ تھے البتہ تدوین کے زمانے تک گھٹتے گھٹتے ان کی تعداد صرف سات رہ گئی۔ یہ معلقات حماد راویہ نے ۱۵۶ھ (عہدِ عباسیہ) میں جمع کیے تھے اور چوں کہ یہ بہترین انتخاب تھا لہٰذا کل قصائد مقبول ہوئے۔

عام طور سے مشہور ہے کہ یہ قصائد خانۂ کعبہ میں لٹکائے گئے تھے اس وجہ سے معلقات کے نام سے مشہور ہوئے لیکن زمانۂ حال کے محققین کا خیال ہے کہ یہ وجہِ تسمیہ بالکل سطحی ہے ان کے نزدیک معلقہ کا مادّہ اشتقاق علق ہے جس کے معنی شئ نفیس اور قیمتی کے ہیں اور چوں کہ ان قصائد کے اشعار جواہرات کے ہم پلہ مانے جاتے تھے اس لیے معلقہ کہلائے۔ جس کی تائید دوسرے نام السموط (موتی کی لڑیاں) سے ہوتی ہے اور چوں کہ یہ قصائد بڑے ہیں اس لیے ان کو "سبع الطّوال" بھی کہتے ہیں۔ ابنِ رشیق کا خیال ہے کہ معلّقات کو "مذہبات" بھی کہتے تھے کیوں کہ یہ قصائد قباطی (مصر کا ریشمی کپڑا) پر سونے کے پانی سے لکھ کر حرمِ کعبہ میں لٹکائے جاتے تھے۔ مختصر یہ کہ عرب اس کو الہامی کلام تصوّر کرتے تھے اور جس طرح سینکڑوں خداؤں کو سجدہ کرتے تھے اسی طرح یہ معلّقات بھی برسوں مسجودِ خلائق رہے۔ ان قصائد کا ترجمہ یورپ کی متعدّد زبانوں میں ہو چکا ہے اور امراء القیس کے عاشقانہ کلام خاص طور پر پسند کیے گئے ہیں۔

عہدِ اسلام میں بصرہ اور کوفہ کے علما نے عہدِ جاہلیت کے کلام کو مختلف حیثیتوں سے جمع کیا بعض نے صرف ایک شاعر کا دیوان مرتّب کیا تو بعض نے کلیّات ترتیب دیے جن شعرا کے دیوان مرتّب ہوئے وہ حسبِ ذیل ہیں:-

امراء القیس، نابغہ، زہیر، عنترہ، طرفہ، علقمہ، عروہ، لبید، حاتم، ردس بن حجر، حادرہ، خنسا۔

یہ دیوان مصر، بیروت اور یورپ میں چھپ گئے ہیں۔ ان کے علاوہ دیوانِ مختارات شعرائے عرب مرتبہ ابن الشجری اور ہذلئین کے مجموعے جداگانہ ہیں۔ مفضل ضبی نے شاہ زادوں کی تعلیم کے لیے خلیفہ منصور عباسی کے حکم سے ۱۲۸ نظموں کا مجموعہ مرتّب کیا تھا جو "مفضلیات" کے نام سے یورپ نے شائع کیا ہے۔ اسی ذیل میں حماسہ ابو تمام اور حماسہ بحتری کے کلیات بھی ہیں۔ ایام العرب میں حرب واحس اور حربِ سوس کی رزمیہ نظمیں الگ ہیں بعض ادیبوں نے "جمہرات" کے نام سے مختلف شعرا کا کلام جمع کیا ہے چناں چہ ان میں جمہرہ ابو زید انصاری بہت

مشہور ہیں۔ ان میں تقریباً پچاس شاعروں کے کلام سے ایک ایک قصیدہ لے کر ایک مجموعہ مرتب کیا ہے پھر خاص اوصاف کے لحاظ سے ہر حصّے کا جُداگانہ نام رکھا ہے چناں چہ عہدِ جاہلیت کے وہ سات کلیات یہ ہیں :۔

(۱) معلقات (۲) مجمہرات، (۳) منتقیات، (۴) مذہبات، (۵) مراثی، (۶) مشوبات، (۷) ملحمات۔

یہ مجموعہ تقریباً ۳۹۱ھ میں مرتب کیا گیا اور اس کا نام "جمہرہ اشعار العرب" رکھا۔

محققینِ یورپ کی تحقیقات کے مطابق اس میں جس قدر کلام ہے وہ ۵۰۰ء سے ۶۲۲ء تک کا ہے۔ اور اسی زمانے کو وہ عہدِ جاہلیت سے تعبیر کرتے ہیں کیوں کہ ۶۲۲ء سے اسلام کا آغاز ہوتا ہے اس کے بعد کا کلام زیادہ تر کتبِ ادب، تاریخوں اور تذکروں میں پھیلا ہوا ہے۔

کلامِ جاہلیت کی تدوین جس طریقے سے عمل میں آئی اس سے بہتر طریقہ کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا حقیقت یہ ہے کہ عہدِ عباسیہ کے علماے ادب کا اتنا بڑا کارنامہ ہے جس پر عربی ادب جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔ لیکن افسوس کہ بعض مستشرقین جیسے پروفیسر مارگیولیتھ اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا خیال ہے کہ یہ تمام کے تمام مجموعے بالکل فرضی ہیں اور یہ کلام بعد والوں کی ایجاد ہیں۔ یہ خیال تاریخ اور اصولِ تنقید کے سراسر منافی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کسی قدر تغیّر اور تبدیلی ضرور ہوئی ہے اور کلامِ جاہلیت میں عہدِ اسلام کے قریب کا زمانہ بھی شامل ہو گیا ہے لیکن جملہ امثال اپنی اصلی حالت پر قائم ہیں اور ان میں مطلق تغیّر نہیں ہوا ہے۔

"استفادات"

اس مقالے میں جن کتابوں سے مدد لی گئی وہ حسبِ ذیل ہیں :۔

۱۔ کتاب الآغانی مصنفہ ابوالفرج اصفہانی
۲۔ کتاب الشعر " محمد بن سلام
۳۔ مقدمۂ ابنِ خلدون
۴۔ تاریخ یعقوبی
۵۔ تاریخ ادبِ عربی پروفیسر نکلسن
۶۔ الیاذہ سلیمان البتانی
۷۔ تاریخ الخضری
۸۔ کتاب الحیوان جاحظ
۹۔ کتاب العمدہ ابن رشیق
۱۰۔ کتاب الشعر والشعراء ابنِ قتیبہ
۱۱۔ جمہرہ انصاری
۱۲۔ تاریخ دول العرب محمد طلعت حرب
۱۳۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ جرجی زیدان
۱۴۔ تاریخ علم الادب عند الافرنج والعرب ڈکٹر ہیوگو
(۱۵) شعر الجاہلی ڈاکٹر طٰہٰ حسین
(۱۶) مقدمہ دیوان امراء القیس استاذ حسن السندوبی
(۱۷) مقالات مجلہ المقتطف وغیرہ۔

مومن کی شاعری پر ایک نظر

(جناب خواجہ احمد صاحب فاروقی ایم اے)

مومن کی شاعری کا پس منظر

سیاسی حالات مومن خاں مومن دہلوی ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا ماحول کئی اعتبار سے اہم ہے۔ اِس وقت سلطنتِ دہلی کی شمع جھلملا رہی تھی، اور انگریزی تسلط کی بنیادیں مضبوط ہوچکی تھیں۔ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی فوجیں فاتحانہ پرچم کے ساتھ دلی تک پہنچ گئیں اور انگریزوں نے ضعیف العمر شاہ عالم کو جو مرہٹوں کے زیرِ اثر تھا، اپنے قبضے میں کرلیا۔ سرجی ارجن گاؤں کے صلح نامے کی رُو سے سندھیا نے دوآب کا سارا علاقہ معہ آگرہ اور دہلی کے انگریزوں کے سپرد کردیا۔ وہ تیموری جاہ و جلال جس کے آگے ایک زمانے میں شانِ عجم اور شوکتِ رُوم حقیر معلوم ہوتی تھی، نیست و نابود ہوگیا۔ اور مغلوں کی حکومت سمٹ کر قلعے کی چہار دیواری تک رہ گئی شاہ عالم کے بعد ۱۸۰۶ء میں اکبر شاہِ ثانی مسندِ حکومت پر متمکن ہوا۔ ۱۸۲۷ء میں اس کے مرنے کے بعد بہادر شاہ ظفر جو دُودمانِ تیموریہ کا آخری چشم و چراغ تھا، تختِ نشین ہوا۔ اس کی حکومت کی بساط ۱۸۵۷ء کی رستخیز میں درہم و برہم ہوگئی۔

اِس وقت تاحدِ نظر برطانوی اقتدار کا پرچم لہراتا ہوا نظر آتا تھا۔ ہمارا سیاسی، اخلاقی اور رُوحانی تنزل انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ قوائے عمل شل ہوچکے تھے۔ اور شعلۂ حیات سرد ہورہا تھا۔ دستبردِ زمانہ سے اگر کوئی چیز رہ گئی تھی تو صرف اوہام کا تار و پود۔ لوگ مذہب کو دِل و جان سے مانتے تو تھے لیکن اس کی اصلی رُوح ختم ہوچکی تھی۔ Stoddard نے جو کچھ اٹھارویں صدی کی اسلامی دُنیا کے متعلق لکھا ہے، وہ انیسویں صدی کے ہندستان کے متعلق زیادہ صحیح ہے:-

مذہبی اور اخلاقی حالات "اٹھارویں صدی عیسویں میں اسلامی دنیا کے ضعف و انحطاط کی انتہا ہوچکی تھی کبھی

جگہ اور کسی گوشے میں بھی صحت اور حیات کے آثار نظر نہیں آتے تھے ۔ ہر طرف جمود اور زوال کے بادل چھائے ہوئے تھے ۔ یہی حال مسلمانوں کے عادات و خصائل اور آداب و اخلاق کا تھا ۔ عربی کلچر کے نقوش مٹتے جاتے تھے ۔ امرا "مے و رامش و رنگ و بو" کی دنیا میں مست و خراب تھے ۔ عوام وحشیانہ پستی اور گمراہی میں پڑے ہوئے تھے ۔ تعلیم مُردہ ہو چکی تھی ۔ چند درس گاہیں جو اس ہولناک زوال میں باقی تھیں، وہ بے توجہی و بے پائی کی وجہ سے دم توڑ رہی تھیں ۔ امرا و رؤسا آزاد اور بے عناں تھے ۔ اس نظامِ مراتب کے نیچے جمہور دبے جا رہے تھے ۔ دیہاتی اور شہریوں میں محنت کے محرکات مفقود تھے ۔ تجارت اور زراعت دونوں سد رمق کے لیے کی جاتی تھیں ——— مذہب بھی دوسری چیزوں کی طرح زوال پذیر تھا ۔ محمد عربی (ص) کی پاک بازانہ توحید پر سفیہانہ توہم پرستی اور پُر اسرار تصوف کی تہیں جم گئی تھیں ۔ مسجدیں ویران اور سنسان پڑی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ عوام تعویذ اور گنڈے پر پورا اعتقاد رکھتے تھے ۔ فقیر اور درویش ہر طرف اپنا اثر جمائے ہوئے تھے ۔ لوگ بزرگوں کی زیارتوں پر جاتے تھے، اور ان کی پرستش بارگاہ ایزدی کے شفیع اور ولی کے طور پر کی جاتی تھی ۔ ان کا خیال تھا کہ خدا ایسا برتر ہے کہ اس کی طاعات بلاواسطہ ادا ہو ہی نہیں سکتیں ۔ احکامات قرانی کو نظر انداز کیا جاتا تھا اور اکثر ان کے خلاف بھی قدم اٹھایا جاتا تھا ۔ شراب اور افیون کا استعمال عام تھا ۔ زناکاری کا زور تھا اور ذلیل ترین اعمالِ قبیحہ کھلم کھلا بے حیائی کے ساتھ کیے جاتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کی اصلی روح ختم ہو گئی ہے اور صرف بے معنی رسمیات اور بتذل [illegible] لوگ توہم پرستی اور رسم پرستی کو اصلِ مذہب سمجھ کر اسی کے گرویدہ تھے ۔" [1]

Dr. Herklot نے "اسلام اِن انڈیا" (۱۸۳۷ء) میں ان رسموں اور تہواروں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے ۔ جو پیر بندہ نواز گیسو دراز زندہ شاہ مدار اور پیر دستگیر کے سلسلے میں منعقد ہوتے تھے ۔ وہ ایک مقام پر لکھتا ہے :-

"مسلمانوں میں ملکی اور غیر ملکی عناصر کے ملنے سے بہت سی ایسی رسمیں پیدا ہو گئی ہیں جو اسلام کی روح کے منافی ہیں ۔ سحر اور جادو سے متعلق بہت سی باتیں جو ان کی معاشرت کا جزو بن گئی ہیں، اسی قبیل کی ہیں ۔ مسلمان جاٹ اور راجپوتوں میں شادی ولادت و وفات کی اکثر رسمیں ہندوانہ ہیں ۔ وہ بعض اوقات وراثت میں ہندوؤں کے اصول کی پابندی کرتے ہیں اور مصیبت میں مقامی ہندو دیوتاؤں سے مدد مانگتے ہیں ۔ شمالی

---

[1] World of Islam pp 20-21

مغربی صوبے اور بلوچستان میں بھی جہاں ہندی اثرات بہت کم ہیں، مظاہر پرستی نظر آتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پیر کو اختیاراتِ کلی حاصل ہیں، وہ مصیبت کو دور کرسکتا ہے، بیمار کو اچھا کرسکتا ہے، اولاد بہم پہنچاسکتا ہے اور مُردے کی عاقبت سنوار سکتا ہے۔" [۱]

مذہبی اور اخلاقی حالت کا اس سے زیادہ دردناک منظر "سیرتِ سید احمد شہید" کے مولف نے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہوں صفحات ۲۲ تا ۳۰۔ یہاں صرف ایک مختصر سا اقتباس پیش کیا جاتا ہے:۔

"سنت و شریعت بے معنی الفاظ تھے، جو صرف کتابوں میں رہ گئے تھے۔۔۔۔۔۔۔ ہر بدعت، بدعتِ حسنہ تھی۔ بہت سے حرام، حلال ہوگئے تھے، اور بہت سے حلال، حرام۔ شعائر اُٹھ رہے تھے۔۔۔۔۔ قرآن و حدیث کے بہت سے احکام منسوخ ہوگئے تھے مثلاً بیوہ کا نکاح اور تقسیم میراث شرفاے اسلام کی نئی شریعت میں مستحب و فرض سے حرام و متروک ہوگئے تھے۔۔۔۔۔ قرآن ایک چیستاں تھی جس کو کوئی سمجھ نہیں سکتا تھا نہ اس میں غور کرنے کی ضرورت تھی۔ نہ اس پر عمل کرنے کا سوال تھا۔۔۔۔۔ مسلمانوں سے فاتح اور زندہ قوموں کے خصائص رخصت ہورہے تھے۔ اس درخت کو گھن لگ گیا تھا۔ امرا و متوسطین سے لے کر غربا تک عیاشی عام تھی اور ہر ایک نشے میں سرشار تھا" [۲]

پنجاب میں مسلمانوں کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی۔ سکھ انتقام سے بھرے ہوئے تھے۔ اذان بند کردی گئی تھی اور بہت سی مسجدیں ویران پڑی تھیں۔ بادشاہی مسجد، فوجی گودام میں تبدیل ہوگئی تھی [۳] موتی مسجد کا نام موتی مندر رکھ دیا گیا تھا۔ سنہری مسجد پر بھی سکھوں کا قبضہ تھا۔ اس کا تمام فرش گوبر سے لپا ہوا تھا۔ امرتسر میں ایک مسجد بھی مسلمانوں کے پاس نہیں تھی۔ کوئی شخص آزادی سے نماز نہیں پڑھ سکتا تھا۔ [۴]

اصلاحی تحریک

ٹھیک اسی زمانے میں مولوی سید احمد بریلویؒ نے اپنی مذہبی اور اصلاحی تحریک شروع کی۔ انھوں نے شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ عبدالقادرؒ سے تعلیم پائی تھی اور کثرت سے لوگ اُن کے مرید و معتقد تھے۔ انھوں نے بلادِ اسلامی میں اپنے خیالات کی اشاعت کی اور ہندستان میں بھی بڑے جوش و خروش کے ساتھ اپنی تحریک کو پھیلایا۔ ۱۸۲۸ء میں انھوں نے مولوی اسماعیل دہلویؒ (صاحبِ تقویت الایمان)

---

[۱] Islam in India. P. 8
[۲] سیرتِ سید احمد شہید ص ۲۸، ۳۰۔
[۳] تاریخ لاہور (لطیف) ص ۱۱۵۔
[۴] The Punjab a Hundred Years ago (Garrett) P. 27.

کے ہم راہ سکھوں کے خلاف اعلانِ جہاد کیا اور ۱۸۳۱ء میں دونوں جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

مولوی سید احمد بریلویؒ کی مذہبی تحریک جس کو سرسیدؔ نے لوتھر کی تحریک سے مشابہ قرار دیا ہے، رفتہ رفتہ انگریزوں کے لیے بھی خطرے کا باعث بن گئی تھی۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر (W.W. HUNTER) نے اپنی کتاب (‘OUR INDIAN MUSALMANS’) میں اس کی وضاحت کی ہے اور لکھا ہے کہ وہابی مبلّغین اُس آبادی کو جو اپنے آئینۂ ماضی میں مسلسل غلامی کو نہیں دیکھ سکتی، برابر حکومت کے خلاف برانگیختہ کرتے رہتے ہیں۔

مومن پر ماحول کا اثر مومن نوجوانی ہی میں مولوی سید احمد بریلویؒ کے مرید ہوگئے تھے اس لیے تقلید و بدعت سے سخت نفرت کرتے تھے، ایک رباعی میں فرماتے ہیں ؎

یہ کچھ رہِ سنّت نہ طریقِ توحید — پھر کیا ہے سنو ذرّ سب کی یکساں توحید
ہم سمجھے ہیں معناے حقیقی یعنی — حیواں ہیں حقیقت میں یہ اہلِ تقلید

مذہبیت ان کی غزلوں میں بھی یہ صلابتِ دین اور عصبیّت موجود ہے ؎

مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم — لے نام آرزو کا تو دِل کو نکال لیں

ایک اور جگہ اپنے مذہبی خیالات بڑے جوش سے بیان کیے ہیں ؎

اربابِ حدیث کا میں فرماں بر ہوں — تقلید کے منکروں کا سر دفتر ہوں
مقبول روایتِ ائمہ نہ قیاس — یعنی کہ فقط مطیعِ پیغمبر ہوں

مومن کو مولوی سید احمد بریلویؒ سے دلی عقیدت اور محبت تھی۔ ایک مثنوی میں لکھتے ہیں:۔

وہ خضرِ طریقِ رسولِ خدا — کہ جو پیرو اس کا ہے سو پیشوا
وہ نورِ مجسّم وہ ظلِّ الٰہ — کہ سایے سے جس کے خجل مہر و ماہ
زہے سید احمدؒ قبولِ خدا — سرِ امتحانِ رسولِ خدا

مومن مولوی سیّد احمد بریلویؒ کو "مہدیٔ دوراں" سمجھتے تھے ؎

گلابِ ناب سے دھوتا ہوں مغزِ اندیشہ — کہ فکرِ مدحتِ سبطِ قسیمِ کوثر ہے
وہ کون امامِ جہان و جہانیاں احمدؒ — کہ محض مقتدیٔ سنّتِ پیمبر ہے

دہ شاہِ مملکت ایماں کہ جس کا سالِ خروج
"امام برحق مہدئ نشاں علی فر" ہی
۱۲۴۲ ہجری

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں ؎

شوقِ بزمِ احمد و ذوقِ شہادت ہی مجھے
جلد مومن لے پہنچ اس "مہدئ دوراں" تلک

غیر ملکی حکومت سے نفرت مومن کی یہ مذہبیت جب بلند سطح پر پہنچ جاتی ہی تو وہ غیر ملکی حکومت سے نفرت اور بیزاری کا سبب بن جاتی ہی - ان کی وارستگئ مزاج اور مولوی سید احمد بریلوی اور مولوی اسماعیل دہلوی کی صحبت کا مقتضا بھی یہی تھا - انھوں نے ایک قصیدہ عرفی کے طرز میں لکھا ہی۔ اس میں فرماتے ہیں ؎

ایں عیسویاں بلب رسانند
جانِ من و جانِ آفرینش

تا چند بہ خوابِ ناز باشی
فارغ ز فغانِ آفرینش

مومن شدہ ہم زبانِ عرفی
از بہرِ امانِ آفرینش

برخیز کہ شورِ کفر برخاست
ای فتنہ نشانِ آفرینش

مومن کی آسودہ حالی اور مذہبیت نے اُن کے اندر خودداری اور استغنا کی شان پیدا کر دی تھی اُن کے یہاں نہ ذوق کی سی لابہ گری ہی اور نہ غالب کا سا "تا خدا باشد بہادر شاہ باد" والا اندازِ بیان ، نہ انگریز حکام کی ثنا گستری اور چاپلوسی - اس کے برخلاف وہ مثنوی جہادیہ میں لکھتے ہیں ؎

جو داخل سپاہِ خدا میں ہوا
فدا جی سے راہِ خدا میں ہوا

حبیبِ حبیبِ خداوند ہی
خداوند اس سے رضامند ہی

امامِ زمانہ کی یاری کرو
خدا کے لیے جاں نثاری کرو

آخر میں دعا کرتے ہیں ؎

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب
یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

الٰہی اگرچہ مَیں ہوں تیرہ کار
پہ تیرے کرم کا ہوں امیدوار

تو اپنی عنایت سے توفیق دے عروج شہید اور صدیق دے

اسی مضمون کو ایک رباعی میں بیان کیا ہے ؎

مومن تمھیں کچھ بھی ہے جو پاسِ ایماں ہے معرکۂ جہاد چل دیجیے وہاں

انصاف کرو، خدا سے رکھتے ہو عزیز وہ جاں جسے کرتے تھے بتوں پر قرباں

ان مضامین کو دیکھ کر اگر مومن کو مسلمانانِ ہند کا پہلا قومی شاعر کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہوگا۔

مومن کی سیرت مومن عربی میں شاہ عبدالقادرؒ کے شاگرد تھے اور شاہ عبدالعزیزؒ کی مجالسِ وعظ کے حاشیہ نشین۔ وہ مولوی سید احمدؒ کے مرید تھے اور مولوی اسماعیلؒ کے ہم سبق۔ ان کی شادی دہلی کے نام ور خاندانِ ارشاد و ہدایت یعنی خواجہ دردؒ کے گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس لیے خوشامد و تملّق ان میں نام کو بھی نہیں تھا۔ خودداری اور استغنا کی شان نمایاں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے حمد و نعت و منقبت کے سوا کسی امیر یا رئیس کی تعریف نہیں کی۔ بعض لوگوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ امرا و رؤسا تو درکنار وہ اساتذۂ سلف کی تعریف کرنا اور سُننا پسند نہیں کرتے تھے۔ قصیدے کو انھوں نے ہمیشہ "کار ہوس پیشگاں" سمجھا۔ فارسی دیوان میں لکھتے ہیں ؎

بادشاہا بہ ایں متاعِ قلیل مدح چوں از منے چرا خواہی

دیگراں دیگر اند و من دیگر ہرچہ از بوم از ہما خواہی

مومن نے شاعری اور طبابت کو کبھی ذریعۂ معاش نہیں بنایا۔ ٹامسن صاحب نے اسیؔ روپے کی پروفیسری دینا چاہی، انھوں نے انکار کردیا۔ ریاست کپورتھلہ نے ۳۵۰ روپے پر بُلانا چاہا، نہ گئے۔

اُنیسویں صدی کی معاشرت بھی عجیب تھی۔ وہ مومن جو "ہجرِ پردہ نشیں" میں مرتا ہے، جو "شبِ وصلِ غیر" کاٹنے پر آمادہ ہے اور جو "کوچۂ رقیب" میں بھی سر کے بل جانے کے لیے تیار ہے، وہی مومن یہ دُعا کرتا ہے ؎

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں مری جاں فدا ہو تری راہ میں

اس زمانے میں ہماری زندگی خانوں میں بٹی ہوئی تھی۔ رندی و مذہبیت ایک ساتھ چلتی تھیں۔ ان میں اتنا تضاد نہیں تھا جتنا آج نظر آتا ہے۔ زندگی عشقِ مجازی سے شروع ہوتی تھی اور بعض صورتوں میں وہ عشقِ حقیقی کا زینہ بن جاتی تھی۔ مومن حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے، نجبائے کشمیر سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا گھرانا بادشاہی طبیبوں اور شہر کے معزز لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ مومن نے اس زمانے کے طریق کے مطابق عربی و فارسی میں مہارت تامہ پیدا کی۔ جوانی ہی میں مرید ہوگئے۔ فنِ طب اپنے باپ اور چچا سے حاصل کیا۔ شاعری، علمِ نجوم، شطرنج، تاریخ گوئی میں کمال پیدا کیا۔ لیکن اسی کے ساتھ دادِ عیش بھی خوب دی اور جوانی کا زمانہ ہوس ناکی میں گزارا۔ وہ نہایت خوب صورت، جامہ زیب، خوش گلو، خوش وضع اور عاشق مزاج آدمی تھے۔ دلّی ان کی جولان گاہ تھی۔ جب جوانی کی ہوس ناکی ختم ہوگئی تو انھوں نے تمام بُری باتوں سے توبہ کرلی اور نماز روزے کے پابند ہوگئے۔

اسلوب ان سب باتوں نے مومن کے اسلوب کی تعمیر میں مدد دی ہے۔ ان کے یہاں دو طرز بہت نمایاں ہیں: ایک پیچیدہ ہے دوسرا سادہ اور دونوں اُن کے اصلی اور حقیقی رنگ ہیں۔ پیچیدگیٔ کلام کا سبب مومن کی بڑھی ہوئی علمیت ہے۔ لیکن غالباً اصلی وجہ جدت طرازی اور انفرادیت ہے۔ وہ روشِ عام سے الگ رہنا چاہتے تھے ممکن ہے اس کا نفسیاتی سبب عشق کی پردہ داری بھی ہو۔ اس کے علاوہ مومن کی شاعری نے جس ماحول میں آنکھ کھولی، اس میں بھی دو ذہنیتیں بنتی ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ ایک طرف خیالات و واردات اور معنویت پر زور دیا جارہا تھا۔ دوسری طرف زبان، رعایتِ لفظی اور خارجی پہلو پر۔ غالب اور آتش کے یہاں پہلا طرز نمایاں ہے اور ذوق، نصیر اور ناسخ کے یہاں دوسرا۔ مومن کے یہاں یہ دونوں رجحانات پائے جاتے ہیں۔ کہیں آکر مل گئے ہیں اور کہیں الگ الگ ہیں۔ لیکن ان کی استادی اور انفرادیت ہر جگہ نمایاں ہے۔

مومن نے چند روز شاہ نصیر (ناسخ دہلی) کو اپنا کلام دکھلایا تھا اور جب ناسخ کا دیوان دہلی پہنچا تو اس کا تتبع بھی کرنے کی کوشش کی اور اس قسم کے اشعار کہے ؎

لے اُڑی لاشہ ہوا لاغر زبس تن ہوگیا ذرّۂ ریگِ بیاباں اپنا مدفن ہوگیا

لیکن بعد میں ان کی جدت پسند طبیعت نے ایک علاحدہ رنگ اختیار کرلیا جس میں رشک آمیز سوز، داخلیت اور خارجیت کا لطیف امتزاج، تخیل کی وسعت اور بیان کی لطافت بہ درجۂ اتم موجود ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔

مومن کی خصوصیات (۱) مومن کے یہاں نکتہ یابی اور نازک خیالی کا کمال نظر آتا ہے۔ بات میں بات پیدا کرنا اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے مثلاً ؎

دیکھ اپنا حالِ زار منجّم ہوا رقیب　　تھا سازگار طالعِ ناساز دیکھنا

(یعنی منجّم نے نجوم کے ذریعے عاشق کی محرومی اور بدبختی کا پتا لگا لیا۔ اور اس کی ناکام یابی سے اپنی کام یابی کی توقعات پیدا کرلیں۔ اس طرح منجّم عاشق کا رقیب بن گیا اور عاشق کا بختِ ناساز، منجّم کے حق میں سازگار ثابت ہوا)

یا ؎　پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے　　اس کا نہ دیکھنا نگۂ التفات ہے

یا ؎　تھا مقدّر میں اس سے کم ملنا　　کیوں ملاقات گاہ گاہ نہ کی

یہ اصل میں فغانی و شفائی کا طرز ہے، جسے عرفی و نظیری نے ترقی دی اور کلیم و بے دل نے انتہا کو پہنچا دیا۔ مومن کو فارسی سے طبعی مناسبت تھی۔ ان کی اُستادی کی بنیاد بھی ایک حد تک اسی دست گاہِ فارسی پر قائم ہے اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ان کا یہ طرز فارسی پسندی کا لازمی نتیجہ ہے۔

(۲) فارسی ہی کے اثر سے مومن کے یہاں ایسی لطیف ترکیبیں پائی جاتی ہیں، جو شعر کی جان ہیں مثلاً ؎

بدنام میرے گریۂ رسوا سے ہو چکے　　اب عذر کیا رہا نگہِ بے حجاب میں

مطلب کی جستجو نے یہ کیا حال کردیا　　حسرت بھی اب نہیں دلِ ناکام یاب میں

گریۂ رسوا اور دلِ ناکام یاب کی ترکیبوں نے ان اشعار کی معنویت اور تاثیر کو دوبالا کردیا ہے۔ ایسے ہی ؎

غیر سے سرگوشیاں کرلیجیے پھر ہم بھی کچھ　　آرزوہاے دلِ رشک آشنا کہنے کو ہیں

یا ؎　امتحاں کے لیے جفا کب تک　　التفاتِ ستم نما کب تک

یا ؎　کثرتِ سجدہ سے وہ نقشِ قدم　　کہیں پامال سر نہ ہوجائے

التفاتِ ستم نما، اور پامال سر کی تراکیب نے بہت وسیع مفہوم کی گنجایش پیدا کردی ہے۔

غرض، آرزوہاے دلِ رشک آشنا، چشمِ ستارہ بار، آہوے نیم خواب، شکوۂ زخم ریز اور اسی قسم کی بیسیوں استوار اور خوش نما ترکیبوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کی طبیعت فارسی مذاق سے بہ خوبی آشنا تھی اور یہ مرصّع کاری اسی کا فیضان ہے۔

(۳) مومن نفسیاتی اُمور کو سامنے رکھ کر شاعری کرتا ہی۔ بعض جگہ اسی وجہ سے فطریت اور درد و اثر کی فراوانی نظر آتی ہی۔ محبوب کو فکرِ جور سے باز رکھنا چاہتا ہی تو کہتا ہی ؎

دن رات فکرِ جور میں یوں رنج اُٹھانا کب تلک　　میں بھی ذرا آرام لوں، تم بھی ذرا آرام لو

میں بھی "ذرا آرام لوں" کا ٹکڑا محض گمانِ بد رفع کرنے کے لیے ہی یہی وجہ ہی کہ اس جزو نے استدعائے عاشق کا نفسیاتی اثر بڑھا دیا ہی۔

بعض وقت مومن اپنا مطلب اس نفسیاتی طریقے سے ادا کرتا ہی کہ بہ ظاہر اپنا فائدہ نہیں معلوم ہوتا۔ مخاطب خود اپنا فائدہ تصور کرتا ہی مثلاً ؎

منظور ہی تو وصل سے بہتر ستم نہیں　　اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

وہ بدخو ہی اب تو میرا نہیں　　عبث دوستی تم کو دشمن سے ہی

ہی دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا　　جادو بھرا ہوا ہی تمھاری نگاہ میں

پروفیسر ضیا احمد بدایونی نے اس طرز کا نام "مکرِ شاعرانہ" رکھا ہی لیکن یہ حقیقتاً نفسیاتی اسلوب ہی جو معشوقِ عاشق پیشہ کے لیے نہایت موثر ہی۔ اس میں عاشقانہ عجز اور بلند فتادگی کچھ اس طرح شامل ہی کہ بت سنگدل بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مومن نے شعور و وجدان سے بھی کام لیا ہی اور دُنیائے شعر و نفسیات میں ان دونوں چیزوں کو جو اہمیت حاصل ہی وہ ظاہر ہی مثلاً ؎

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہی جی　　آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

کیا دل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا　　کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

ہو نہ بے تاب ادا تمھاری آج		کچھ تو کہتی ہو بے قراری آج

(۴) مومن کی شاعری میں "کوچہ گردی کی بو" آتی ہو۔ اس کا معشوق "جنسِ کم ارز" سے تعلق رکھتا ہو۔ لیکن اس کے باوجود اس کی وقوعہ گوئی اور معاملہ بندی جرأت و انشا سے بلند ہو۔ اس نے اسلوب کی ندرت اور پاکیزگی سے اپنے کلام پر ابتذال اور عریانی کا دھبّا نہیں آنے دیا۔ ؎

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں		سارے گلے تمام ہوے اِک جواب میں

چینِ جبیں کو دیکھ کے دِل بستہ تر ہُوا		کیسی کشودِ کار، کشادِ نقاب میں

یارب وصالِ یار میں کیوں کر ہو زندگی		نکلی ہی جان جاتی ہو ہر ہر ادا کے ساتھ

(۵) اسی سلسلے میں ایک بات اور قابلِ لحاظ ہو۔ مومن کا معشوق ضرور بازاری ہو لیکن اس کا عشق بازاری نہیں ہو۔ اُس کے عشق میں خودداری ہو اور فدادگی میں بلندی۔ وہ کوئی ایسا مطالبہ نہیں کرتا جو عاشقی و محبوبی کے خلاف ہو یا حُسن وعشق کے مرتبے سے گرا ہوا ہو۔ مثلاً ؎

تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خوابِ ناز میں		ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شبِ دراز میں

جانے دے چارہ گر شبِ ہجراں میں مت بُلا		وہ کیوں شریک ہو مرے حالِ تباہ میں

مرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ		تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

مومن اپنے محبوب کو ملزم نہیں ٹھیراتا ؎

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہو		اس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہو

اگر وہ اپنی محرومی اور حرماں نصیبی کا ذِکر کرتا ہو تو عشق کی پوری نیاز آگینی کے ساتھ ؎

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کرکے		تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

مر چک کہیں کہ تو غمِ ہجراں سے چھوٹ جائے کہتے تو ہیں بھلے کی وہ لیکن بُری طرح

(۶) مومن کا معشوق جنسِ لطیف سے تعلق رکھتا ہے۔ اس قسم کے اشارے جابجا اُن کے کلام میں ملتے ہیں ؎

ہجرِ پردہ نشیں میں مرتے ہیں زندگی پردہ در نہ ہو جائے

لیکن تمام کلام "عشقِ حلال کا مرقع" نہیں ہے۔ اس قسم کے اشعار بھی ملتے ہیں ؎

دلِ مومن آتش کدہ کیوں بنے لگاوٹ یہ طفلِ برہمن سے ہے

لیکن یہ ان کا عام رنگ نہیں ہے۔

(۷) مومن کی شاعری کا محور جذبۂ رشک اور ذکرِ غیر ہے لیکن اس نے جرأت اور انشا کی طرح کوئی بات خلافِ تہذیب نہیں لکھی اور کسی جگہ بھی فتادگئ عشق کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

مومن کی شاعری میں جذبۂ رشک کی فراوانی کی نفسیاتی وجہ اس کی غیرت وحمیت ہے۔ مثلاً

غیر کے ہم راہ وہ آتا ہے میں حیران ہوں کس کے استقبال کو جی تن سے میرا جائے ہے

یہ جذبۂ رقابت، بے حمیتی نہیں بلکہ عینِ غیرت وحمیت ہے ؎

ہے نگاہِ لطف دشمن پر تو بندہ جائے ہے یہ ستم اے بے مروت کس سے دیکھا جائے ہے

یہ رشک بھی ملاحظہ ہو جس نے نامہ بر کو راہ بر بنا دیا ہے۔ ؎

رشکِ پیغام عناں کشِ دل ہے نامہ بر راہ بر نہ ہو جائے

مومن کے اس بدنام شعر میں ؎

لے شبِ وصل غیر بھی کاٹی تو مجھے آزمائے گا کب تک

اظہارِ کرب کے ساتھ، الفاظ میں جو روک تھام ہے وہ تعریف سے مستغنی ہے۔

(۸) مومن توجیہِ خوب کرتا ہے۔ شبِ فراق میں مرنے کی خواہش بالکل فطری بات ہے لیکن وہ کہتا ہے ؎

شبِ فراق میں بھی زندگی پہ مرتا ہوں کہ گو خوشی نہیں ملنے کی پر ملال تو ہے

میں جانتا ہوں نعش پہ آنے کا مدعا آسودگی پسند تری شوخیاں نہیں

ایسے ہی تجاہلِ عارفانہ کی مثالیں اس کے یہاں کثرت سے ملیں گی ؎

تارے آنکھیں جھپک رہے تھے | تھا بام پہ کون جلوہ گر رات

اِس تجاہل سے محبوب کے رُخِ روشن میں مبالغہ منظور ہے۔

(۹) مومن کو جمعِ تضاد میں کمال حاصل ہے ؎

ہم جان فدا کرتے گر وعدہ وفا ہوتا | مرنا ہی مقدر تھا وہ آتے تو کیا ہوتا

آخر امید ہی سے چارۂ حرماں ہوگا | مرگ کی آس پہ جینا شبِ ہجراں ہوگا

مومن لفظی ہیر پھیر سے تخئیل کے لیے نئی راہیں کھول دیتا ہے ؎

کیوں غش ہوئے دیکھ آئینے کو | کہتے تھے کہ تاب لائیں گے ہم

آئینہ زنگِ غم نے توڑا | کیوں کر اسے منھ دکھائیں گے ہم

(۱۱) مومن کے یہاں محذوفات غالب سے زیادہ ہیں۔ بعض اوقات وہ بات کو پیچ سے بیان کرتے ہیں، لیکن اس میں بڑی لطافت پوشیدہ ہوتی ہے۔ چند الفاظ میں ایک وسیع مضمون کو حُسن و خوبی کے ساتھ بیان کردینا مومن کی سب سے بڑی خصوصیت ہے مثلاً ؎

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دِل کیسا نکل آیا | مَیں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

رشکِ دشمن بہانہ تھا، سچ ہے | مَیں نے ہی تم سے بے وفائی کی

وہ مسلّمات کو سمجھنے والے پر چھوڑ دیتے ہیں اور صرف ضروری ٹکڑوں کا اظہار کردیتے ہیں مثلاً ؎

تھی نوحہ زنی دِل کے جنازے پہ ضروری | شاید کہ وہ گھبرا کے سرِ بام نکلتا

ذکرِ اغیار سے ہوا معلوم | حرفِ ناصح بُرا نہیں ہوتا

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے | صیّاد کی نگاہ سوے آشیاں نہیں

(۱۲) مومن کے کلام میں صحتِ بیانی بہ درجۂ اتم موجود ہے ؎

کیا گُل کھِلے گا دیکھیے ہے فصلِ گُل تو دُور | اور سوے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

کیا دِل کو لے گیا کوئی بےگانہ آشنا
کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

کچھ کچھ درست ضد سے تری ہو چلے ہیں وہ
یک چند اور کج روی اے آسماں نہ چھوڑ

مَیں بھی کچھ خوش نہیں وفا کرکے
تُم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

تُم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دُوسرا نہیں ہوتا

(۱۳) مومن کو جذبات اور واردات بیان کرنے میں امتیاز حاصل ہے

نہ ربط اس سے نہ یاری آسماں سے
جفا بہرِ عدوٗ لاؤں کہاں سے
وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

یارب وصالِ یار میں کیوں کر ہو زندگی
نکلی ہی جان جاتی ہو ہر ہر ادا کے ساتھ

اُلٹے وہ شکوے کہتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوے
ورنہ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا

(۱۴) مومن کے کلام میں شوخیٔ ادا کی بھی مثالیں ملتی ہیں

چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی
ناصح یہ بندِ غم نہیں، قیدِ حیات ہے
بات ناصح سے کہتے ڈرتا ہوں
کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے
ہم حال کہہ جائیں گے سُنیے کہ نہ سُنیے
اتنا ہی تو یاں صحبتِ ناصح کا اثر ہے
لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شبِ فراق
ناصح ہی کو لے آؤ گر افسانہ خواں نہیں

(۱۵) مومن کے آرٹ کا کمال طنز نگاری میں نظر آتا ہے۔ اس کے طنز کا نشتر براہِ راست رگِ جان پر اثر کرتا ہے ؎

رحم فلک اور مرے حال پر　　　　تو نے کرم اے ستم آرا کیا

کیا پسند آئی اپنی جور کشی　　　　چرخ کے انتخاب نے مارا

خنجر تو نہ توڑ سخت جانی　　　　پھر کس کو گلے لگائیں گے ہم

(۱۶) مومن جب دقت اور پیچیدگی کو چھوڑ کر سہلِ ممتنع پر آجاتا ہے تو سادگی، روانی اور سوز و اثر کا دریا بہا دیتا ہے ؎

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو　　　　عذر کچھ چاہیے ستانے کو

صبحِ عشرت ہے وہ نہ شامِ وصال　　　　ہائے کیا ہو گیا زمانے کو

برق کا آسمان پر ہے دماغ　　　　پھونک کر میرے آشیانے کو

یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں ؎

اثر اس کو زرا نہیں ہوتا　　　　رنج راحت فزا نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے　　　　ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں　　　　سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

حالِ دل یار کو لکھوں کیوں کر　　　　ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا　　　　دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

رحم فلک اور مرے حال پر　　　　تو نے کرم اے ستم آرا کیا

---

(۱۷) نیاز فتح پوری نے لکھا ہو کہ "رنگِ تغزّل میں مومن کا کلام اس غیر تغزلانہ چیز سے بالکل پاک ہو جس کو تصوّف یا عشقِ حقیقی سے موسوم کیا جاتا ہو۔" پروفیسر ضیار احمد کا بھی تقریباً یہی خیال ہو۔ انھوں نے لکھا ہو کہ "مومن نے فلسفے یا مابعدالطبیعیات کی وادیوں میں قدم نہیں رکھا۔" ہمارا خیال ہو کہ مومن کے یہاں تصوّف، فلسفے اور اخلاق کے مضامین ہیں لیکن کم۔ زیادہ تر اسی مادّی عشق کے تجربات اور واردات بیان کیے ہیں۔ اِس اعتبار سے کہا جاسکتا ہو کہ مومن کا کلام صحیح رنگِ تغزّل کا حامل ہو اور اس نے غزل کے "ابتدائی" مفہوم کو سامنے رکھا ہو اور رازگفتن بہ معشوق کا حق ادا کردیا ہو۔ وہ خود کہتا ہو ؎

مومن بہشت و عشقِ حقیقی تمھیں نصیب ہم کو تو رنج ہو جو غمِ جاوداں نہ ہو

(۱۸) مومن کی بعض غزلوں میں واسوخت کا رنگ غالب ہو ؎

اب اور سے لَو لگائیں گے ہم جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم
بُت خانۂ چین ہو گو ترا گھر مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

(۱۹) مومن نے اپنے تخلّص سے ہر جگہ فائدہ اُٹھایا ہو ؎

جنّت میں بھی مومن نہ ملا ہائے بتوں سے جورِ اجلِ تفرقہ پرداز تو دیکھو
نام عشقِ بتاں نہ لو مومن کیجیے بس خدا خدا صاحب
مومن تم اور عشقِ بُتاں اِی پیر و مرشد خیر ہو یہ ذکر اور منھ آپ کا، صاحب خدا کا نام لو

معائبِ مومن

(۱) مومن نے بعض جگہ صحتِ زبان کا خیال نہیں رکھا ہو۔ اس کا اصلی سبب ان کی بے پروائی ہو، ناواقفیت نہیں۔

(۲) بعض اشعار میں تعقیدِ لفظی و معنوی ہو مثلاً ؎

جوں نکہتِ گُل جنبش ہو جی کا نکل جانا اِی بادِ صبا میری کروٹ تو بدل جانا

پہلے مصرع کے دو ٹکڑے ہوسکتے ہیں۔ شانِ اُستادی یہ ہو کہ دونوں ٹکڑوں کے الفاظ الگ الگ رہیں۔ لیکن اس

شعر میں "جنبش" پہلے ٹکڑے کے ساتھ چلا جاتا ہے۔ حالاں کہ اس کا تعلق دوسرے ٹکڑے یعنی "ہے مجھ کو گُل جانا" سے ہے۔ کبھی جملے کا ایک ٹکڑا ایک مصرع میں اور دوسرا ٹکڑا دوسرے مصرع میں لاتے ہیں۔ مثلاً ؎

پردۂ چشم کی تقصیر کہ حائل نہ ہوا   بے حجابی کا گلہ کیجے تو کہتا ہے ترے

(۳) تلمیحاتِ بعیدہ کی کثرت ہے مثلاً اس شعر میں ؎

مومن غضب ہے آتشِ لذّت فزائے داغ   جلتا ہوں اہلِ نار کی تبدیلِ جلد سے

بدلناهم جلوداً غیرها کی طرف اشارہ ہے۔

(۴) غزل ان کی بڑھی ہوئی علمیت کا بوجھ برداشت نہیں کرسکتی۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

رجعتِ قہقہریٔ شمس و قمر آخر شب   صبح دم آنے کو تھا وہ کہ گواہی دے ہے

ڈبوئے گی مری چشم ستارہ بار مجھے   قرانِ انجم سیارہ بُرجِ آبی میں

(۵) بعض جگہ محذوفات کی زیادتی اور مسلّمات سے انحراف کی وجہ سے پیچیدگی اور مُعمائیت پیدا ہوگئی ہے۔

(۶) مومن کی دنیا تنگ ہے اور اس کا میدان محدود۔ جو کمال دکھلایا ہے وہ "تنگ نائے غزل" میں اور اس کے بھی چند مضامین خاص طور پر لیے ہیں۔

مومن کا اثر شعرائے مابعد پر

مومن نے شعرائے مابعد پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ زبانِ لکھنؤ میں رنگِ دہلی کی نمود جو کچھ نظر آتی ہے وہ ایک معنی کر مومن ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اُن کے مقلدین میں شیفتہ، حالی، نسیم، تسلیم، تسکین اور حسرت موہانی کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔

شیفتہ کے اکثر اشعار طرزِ مومن میں ہیں ؎

سخت جاں ہیں کب نہ تھا اور نازنیں تو کب نہ تھا   یاں سبک حرفِ ملامت، واں گراں عرضِ نیاز

غم نہ کھایا تھا کہ سم یاد آیا   کب ہمیں حاجتِ پرہیز پڑی

اس سے میں شکوے کی جا شکرِ ستم کر آیا کیا کروں تھا مرے دل میں سو زباں پر آیا
میرے آنے سے تم اٹھ جاتے ہو بزمِ دشمن میں نہ آؤں کیوں کر

شیفتہ کے کلام میں بھی مومن کی سی ہم وار اور خوش گوار ترکیبیں پائی جاتی ہیں مثلاً: اشکِ گل ریز، خراشِ ناخنِ غم، مطربِ جادو ترانہ، ظنِ نیم ستم، دلِ شورش ادا، مستیٔ نیم خام، شوقِ غلط کار، توبۂ ژولیدہ۔

حالی نے بالواسطہ مومن سے استفادہ کیا ہے۔ خود فرماتے ہیں ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

حسرت موہانی نے جا بجا پیرویٔ مومن کا ذکر کیا ہے ؎

حسرت یہ وہ غزل ہے جسے سن کے سب کہیں مومن سے اپنے رنگ کو تو نے ملا دیا

طرزِ مومن پہ مرحبا حسرت تری رنگیں نگاریاں نہ گئیں

حسرت کی شاعری میں نفسیاتی واقفیت اور حسن و عشق کے گوناگوں پہلو ملتے ہیں۔ ان کا سرچشمہ بھی ایک معنی میں مومن ہی کا کلام ہے۔ پچھلے بیس سال کے اندر ہزاروں نئی ترکیبیں وضع کی گئیں جو شاعرانِ نو کی جدتِ پنہاں کی غمازی کرتی ہیں۔ اس کی مثالیں بھی مومن اسکول میں زیادہ ملیں گی۔ حسرت کا کلام اس کا شاہدِ عادل ہے ؎

سرگرمِ ناز آپ کی شانِ جفا ہے کیا باقی ستم کا اور ابھی حوصلہ ہے کیا
اک برقِ مضطرب ہے کہ اک سحرِ بے قرار کچھ پوچھیے نہ وہ نگہِ فتنہ زا ہے کیا

مومن کے فکر و تخیل نے اردو غزل کو بے حد متاثر کیا ہے۔ اس کی شاعری اور زندگی میں ایک لطیف ہم آہنگی ہے اسی لیے اس کی مہذب غزلیت آج بھی لطف دیتی ہے اور شاعرانِ عصرِ حاضر کے لیے شمعِ راہ بھی ہوتی ہے۔ مومن کی غزل بے جان نہیں ہے، اس میں زندگی تازگی اور ندرت ہے۔

تبصرے

ادبیات

نادراتِ شاہی (مرتبہ مولوی امتیاز علی خاں عرشی صاحب ناظم کتاب خانہ ریاست رام پور)

یہ شاہ عالم بادشاہ کے اُردو فارسی، ہندی اور پنجابی اشعار کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ کتاب خانۂ ریاست رام پور میں ہے جو نواب خلد آشیاں کے عہد میں نواب مرزا خاں داغ مرحوم کی معرفت خریدا گیا تھا۔ مولوی امتیاز علی خاں صاحب عرشی ناظم کتاب خانے نے بڑے سلیقے سے اسے مرتب کیا ہے اور شروع میں ایک مبسوط دیباچہ لکھا ہے جس میں شاہ عالم بادشاہ کے حالات اور اُن کے کلام پر تبصرہ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کا نام "نادراتِ شاہی" خود بادشاہ نے تجویز کیا تھا۔

اس مجموعے میں اُردو کی کلہم ۴۷ غزلیں ہیں اور ہر غزل میں پانچ شعر ہیں۔ شاہ عالم بہت پُرگو تھے۔ یہ ان کے کلام کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ عرشی صاحب نے اُس اُردو دیوان کا بھی ذکر کیا ہے جو ڈاکٹر اشپرنگر کی فہرست میں درج ہے۔ جس میں ۲۴۴ صفحے تھے اور ہر صفحے میں آٹھ سطریں تھیں اور اب نایاب ہے۔ نیز بہار ریسرچ سوسائٹی، برٹش میوزیم لندن اور میونخ لائبریری کے نسخوں کا ذکر ہے یہ سب بہت مختصر نسخے ہیں۔ تعجب ہے کہ کتب خانۂ آصفیہ (حیدرآباد دکن) کے نسخے کا مطلق ذکر نہیں کیا گیا حالاں کہ بادشاہ کے کلام کا بہت ضخیم کلیات ہے اور خوش خط لکھا ہوا ہے۔

ان ۴۷ غزلوں کے بعد متفرق ہندی کلام ہے۔ ہر صفحے میں دو دو تین تین شعر ہیں۔ سارا کلام اُردو ہندی دونوں رسمِ خط میں ہے۔ فارسی کی صرف دو غزلیں پانچ پانچ شعر کی اور چھ مختلف شعر ہیں۔

کلام معمولی ہے۔ کتاب بہت اچھے نسخ ٹائپ میں چھپی ہے۔ آخر میں اختلافِ الفاظ اور اشاریہ کے دو ضمیمے بھی ہیں۔

ادبی مقالات | بقلم جناب بشیر علی صاحب صدّیقی، ایم اے، معلّم گورمنٹ ہائی اسکول، ہاتھرس۔ شائع کردہ: شاہ اینڈ کمپنی، وصی روڈ، آگرہ۔ درسی کتب کی تقطیع، ۱۶۴ صفحات پر مجلّد، منقّش گردپوش کے ساتھ شائع کی گئی ہو۔ کاغذ، لکھائی چھپائی معمولی۔ قیمت ۱۲؍

اصل میں یہ اُن مضامین کا مجموعہ ہو جو صدّیقی صاحب نے مختلف ادبی عنوانات پر تحریر کیے اور وقتاً فوقتاً اُردوٗ رسائل میں چھپے تھے۔ شروع میں آل احمد صاحب سرور اُستاد مسلم یونی ورسٹی کا تعارف شامل ہو جس میں ہمارے تنقیدی ادب پر ایک متین و مختصر تبصرہ کیا گیا ہو۔

اقبال، حالی، سودا، نذیر احمد اور مولانا احسن مارہروی پر صدّیقی صاحب کے مضامین کافی دلچسپ اور طلبہ کے لیے ضرور مفید ہوں گے۔ تذکرۂ آبِ حیات، اُردوٗ کی ابتدا اور ہندی اُردوٗ کے تفصیے پر بھی الگ الگ مقالات ہیں مگر مضمون کی وسعت کے اعتبار سے یہ کسی قدر تشنہ رہ گئے ہیں۔ حال آں کہ فاضل مولّف نے اقبال کے تصوّرِ شیطان پر خاصی موشگافی اور جزئیات نگاری کی ہو جس سے گمان ہوتا ہو کہ شاید وہ اسے رند مزاج شاعروں کے تفنّن اور آزاد مشرب صوفیوں کی خیال آرائی کی بجائے واقعی کوئی سنجیدہ موضوع سمجھتے ہیں۔

'اُردوٗ مزاح نگاری' کے مقالے میں لائق مولّف نے رشید احمد صاحب صدّیقی کو (جو غالباً مولّف کے اُستاد ہیں) خراجِ تحسین کے ساتھ یہ سرٹیفکیٹ بھی دے دیا ہو کہ وہ ایک ناکام یاب پروفسر ہوں تو ہوں ایک کام یاب مزاح نگار ضرور ہیں! (ص ۶۵)

فاضل مقالہ نگار حالی کے معتقدین یا متبعین میں شامل ہیں جس کی سرور صاحب نے بھی اپنے تعارف میں تصدیق کی ہو۔ مگر یہ دیکھ کر ہمیں سخت حیرت ہوئی کہ ایک مضمون میں جہاں حالی کی "برکھائت" کو انھوں نے اُردوٗ کی ایک یادگار نظم قرار دیا ہو وہاں اس کے مقابلے میں نظیر اکبرآبادی اور ایک زمانۂ حال کے شاعر کے بعض چوپولے نقل کرکے 'برکھائت' کے برابر بلکہ بہتر ہونے کا اشارہ کرتے ہیں! 'برکھائت'، حالی کی نہایت سلیس و شیریں بیانیہ نظم ہو۔ پہلی مرتبہ لاہور کے مشاعرے میں پڑھی گئی تو کہا جاتا ہو کہ اُن کے بعض نامی حریف بھی خود اپنی نئی شاعری سے بیزار نظر آنے لگے تھے۔ اُسے نظیر کی

برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہی اوس

یا حالی کی کسی ایسی نظم سے ٹکرانا کہ جس کے ہر بند سے آورد اور فکر کی بے ربطی اور افلاس ٹپکتا ہی[1] کمال بے دردی یا بدمذاقی سمجھا جائے تو ہمیں ذرا بھی تعجب نہ ہوگا۔

کتاب کے آخر میں ایک مضمون جدید انگریزی شاعری پر، شامل ہی اور اس میں بعض انگریزی نظموں کے ترجمے بھی دیے گئے ہیں۔

لائق مولف کا ایک دل چسپ تسامح یہ نظر آیا کہ جنوری ۱۹۴۱ء کے ایک مضمون میں اصرار کرتے ہیں کہ حضرت مرزا مظہر جانِ جاں رحمۃ اللہ علیہ کو جان جاناں لکھنا درست نہیں مگر ایک آیندہ مضمون میں جس پر اکتوبر ۱۹۴۱ء کی تاریخ درج ہی خود بھی جا بجا جانِ جاناں ہی تحریر فرماتے ہیں (ص ۱۱۴، ۱۱۵)۔ کتاب میں اقتباسات اور دوسروں کے اقوال کو بھی احتیاط کے ساتھ واوین میں یا علاحدہ نمایاں نہیں کیا گیا ہی جس سے بعض اوقات غلط فہمی پیدا ہوتی ہی۔

مجموعی طور پر یہ مجموعہ اربابِ شوق اور خصوصاً اُردو ادب کے طلبہ کے پڑھنے کے لائق ہی۔ (س)

تصحیح کتاب "تعلیم کے نئے اصول" پر رسالہ 'اُردو' بابت جولائی ۱۹۴۵ء میں تبصرہ شائع ہوا ہی۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ کتاب کی قیمت درج نہیں۔ اب جناب مولف تحریر فرماتے ہیں کہ قیمت عہ، مقدمۂ کتاب کے بعد کے صفحے پر درج ہی۔ ملنے کا پتا: سردار صاحب ماسٹر جگت سنگھ، اڈیٹر 'رہنمائے تعلیم'، لاہور، ہی۔ یہ دونوں باتیں تبصرہ نگار صاحب کی نظر سے نہیں گزریں۔ اب اس کی صحت کر دی جائے۔

---

[1] اس نظم کا، جس کے مقابلے میں فاضل مقالہ نگار کو "حالی کے یہاں ایک قسم کا پھیکا پن یا بے نمکینی" محسوس ہوئی، ایک بند نمونے کے طور پر نقل کیا جاتا ہی ؎

بھر دیے پانی نے جل تھل ندیاں بہنے لگیں — چھوڑ کر شانوں پہ زلفیں مسکرائے نازنیں
آج ہی غرقِ سفیدی سُرخ تھی کل جو زمیں — سرد پانی چوس کر ذرّوں نے آنکھیں بند کیں
جھوم کر برسی ہو کیا برسات کی پہلی گھٹا

پریم چند

از مدن گوپال ۔ ناشر: دی بُک ایوڈ، سرکلر روڈ، لاہور ۔ قیمت: تین رُپے آٹھ آنے ۔

مدن گوپال صاحب نے اُردو کے مشہور افسانہ نگار اور ناول نویس منشی پریم چند پر یہ مختصر سی کتاب انگریزی زبان میں لکھی ہو ۔ جو چھوٹے سائز کے ایک سو اکتیس صفحات پر پھیلی ہوئی ہو ۔

اس کتاب میں انھوں نے سب سے پہلے پریم چند کے حالاتِ زندگی بیان کیے ہیں ۔ اور اس کے تمام نشیب و فراز کو آنکھوں کے سامنے بےنقاب کردیا ہو ۔ اس کے بعد انھوں نے پریم چند کے ماحول پر روشنی ڈالی ہو اور جن سماجی حالات سے وہ متاثر ہوے ہیں، ان کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہو جس سے پریم چند کی شخصیت اور ان کے فن کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہو ۔ اور آخر میں انھوں نے ان کی ناول نویسی اور افسانہ نگاری کا تنقیدی جائزہ لیا ہو ۔ جس سے پتا چلتا ہو کہ مدن گوپال صاحب نے منشی پریم چند کا مطالعہ کرنے میں بڑی محنت کی ہو ۔ چناں چہ ان کے آرٹ اور زندگی، دونوں کے اسرار و رموز ان پر پوری طرح کھل گئے ہیں ۔

ناولوں پر جہاں انھوں نے تنقیدی نظر ڈالی ہو، اس میں ایک بات البتہ کھٹکتی ہو اور وہ یہ کہ انھوں نے پریم چند کے فن کا مقابلہ ڈکنس، ٹالسٹائے، گورکی، ہارڈی اور ہکسلے وغیرہ سے کیا ہو ۔ جو ایسا کچھ زیادہ مناسب نہیں معلوم ہوا ۔ زیادہ اچھی بات تو یہ ہوتی کہ مدن گوپال صاحب اس کی بجائے ان ناول نگاروں کے اثرات کا تذکرہ کرتے، جو پریم چند نے شعوری یا غیر شعوری طور پر قبول کیے ۔

بہر حال یہ کتاب پڑھنے کے قابل ہو اور چوں کہ وہ ہندستان کے ایک بڑے ادیب کو انگریزی دانوں سے روشناس کرتی ہو، اس لیے اس کا وجود کچھ اور بھی زیادہ اہمیت کا مالک ہوجاتا ہو ۔ (ع ۔ ی)

ادب اور زندگی

از مجنوں گورکھ پوری ۔ ناشر: کتاب خانۂ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ ۔ قیمت دو رُپے

اُردو کے مشہور افسانہ نگار اور نقاد جناب مجنوں گورکھ پوری کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہو جس کو کتاب خانۂ دانش محل لکھنؤ نے شائع کیا ہو ۔ اور اگرچہ یہ دوسرا ایڈیشن ہو لیکن بعض حیثیتوں سے پہلے ایڈیشن سے زیادہ اہمیت رکھتا ہو ۔ کیوں کہ اوّل تو اس میں کئی نئے مضامین کا اضافہ ہو اور دوسرے اس کو کارکنانِ دانش محل نے چوں کہ نہایت اہتمام سے شائع کیا ہو اس لیے اس کی صوری حیثیت بھی پہلے ایڈیشن سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہو ۔ " ادب اور زندگی " کے اس ایڈیشن میں جو مضامین بڑھائے گئے ہیں ان میں

"نیا ادب کیا ہے"، "اردو مختصر افسانے میں جدید میلانات" اور "نظیر اکبرآبادی" (ضمیمہ) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

"نیا ادب کیا ہے؟" —— ہمارے نئے ادبی رجحانات، ان کی اہمیت اور ضرورت پر ایک مختصر مگر نہایت ہی مدلّل، جامع اور سیر حاصل تبصرہ ہے۔ اس مضمون میں مجنوں صاحب نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ ہمارے جدید ادب میں ترقی پسندی اور غیر ترقی پسندی کا جھگڑا دو ایسے طبقوں اور جماعتوں کا جھگڑا ہے، جو زندگی کو دو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں اور زندگی کے متعلق جن کا نقطۂ نظر ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہے۔ ان میں سے ایک زندگی کو جامد اور غیر متحرک سمجھتا ہے اور اگر ایسا نہیں سمجھتا تو اس کو جامد اور غیر متحرک بنانے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ دوسرے کا خیال ہے کہ زندگی ہر دم جوان اور پیہم رواں دواں ہے جس کی وجہ سے اس کے ہر شعبے میں تغیر کی حکم رانی ازبس ضروری ہے۔ چناں چہ زندگی کی کروٹوں کے ساتھ ساتھ ادب بھی کروٹیں بدل رہا ہے۔ اور ترقی پسندی بھی اسی طرح کی ایک کروٹ ہے۔ ہر دور کا ادب اپنے اپنے وقت کی سماجی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ چناں چہ آج کے ادب کا بھی یہی حال ہے کہ اس کے دامن میں وقت کے نہایت ہی اہم سماجی مسائل آ گئے ہیں۔ سرمایہ و محنت کی کش مکش، ایک نئی دنیا کا قیام، طبقاتی تقسیم اور اس کی بے اعتدالیاں، تمدنی اور سماجی نظام میں انقلاب کی ضرورت، دولت کی مساوی تقسیم، جنسی ناہمواری —— یہ اور اسی طرح کے اور مسائل ترقی پسند ادب کے خاص موضوعات ہیں۔ کیوں کہ آج خود انسانیت ان کی طرف زیادہ توجہ کر رہی ہے۔ وہ ان کو جلد سے جلد حل کرنا چاہتی ہے تاکہ زندگی کو پھلنے پھولنے کا موقع مل سکے۔ اور وہ سکون و مسرت اور امن و شانتی سے ہم کنار ہو ——

لیکن مجنوں صاحب سارے نئے ادب کو ترقی پسند ادب خیال نہیں کرتے۔ ان کو اس کا ایک حصہ ناقص بھی نظر آتا ہے جس میں آیندہ تعمیر کا کوئی جز نہیں۔ ان کے خیال میں "ترقی پسند ادب کے لیے ضروری ہے کہ وہ سنجیدہ وقیع، امید افزا اور حوصلہ انگیز ہو۔ اس میں اگر تصوف اور تجرد کی گنجایش نہیں تو کلبیت *Cynicisam* اور چڑچڑاہٹ کا بھی گزر نہیں ہے۔ انقلابیت یا اشتراکیت کا تخئیلی معیار یہ ہے کہ کام کرنے والے میں ایک دھن ہو اور اس کے ماتھے پر شکن نہ ہو۔ اس کے اندر تھوڑی سی سخت دلی کی ضرورت ہے ورنہ اس کی انقلابیت جذباتی انقلابیت ہو کر رہ جائے گی جو ایک قسم کی خلوبیت *Defeatisam* ہے" —— غرض یہ کہ وہ ترقی پسند ادب کی کمزوریوں کو کمزوریاں اور خامیوں کو خامیاں کہنے سے ہچکچاتے نہیں بلکہ وہ ترقی پسندی کے تخریبی رجحانات کو ختم کرنا بھی

اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں جتنا کہ وہ تعمیری رجحانات کے وجود کو ضروری جانتے ہیں۔ ان کو ترقی پسند ادب کے ماضی سے کنارہ کشی بھی منظور نہیں برخلاف اس کے ان کی نظر میں ماضی کی بڑی اہمیت ہی۔ ان کے افعال میں ماضی سے قطع تعلق کرکے کوئی بڑا ادبی کارنامہ پیش کیا ہی نہیں جاسکتا کیوں کہ جدید ادب کی جڑیں بہرحال ماضی ہی میں پیوست ہیں جن کو ایک دوسرے سے علاحدہ کرنا گویا اس کی فطری نشو و نما کا گلا گھونٹ دینا ہی۔ وہ ترقی پسند ادیبوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ ہمیں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ "ماضی یک قلم حرفِ غلط ہی اور اسلاف کے اکتسابات ہمارے کسی کام کے نہیں - دھوکا ہی۔ روایات یعنی ماضی کے اکتسابات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ہم کو انھی کو لےکر آگے بڑھنا ہی ورنہ تاریخی تسلسل باقی نہیں رہے گا۔" ان کے نزدیک روایات نہایت زبردست سماجی قوتیں ہیں مگر وہ جامد اور غیر متحرک ہیں۔ جس میں وہ حرکت پیدا کرکے ان کو انقلاب اور ترقی کی قوتوں میں تبدیل کردینا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ وہ رجعت اور انحطاط کے اسباب نہ بن جائیں ـــــ غرض یہ کہ نئے ادب اور ترقی پسند ادب پر ان کے خیالات نہایت ہی سلجھے ہوے ہیں۔ جن کو پیش کرکے انھوں نے ترقی پسند ادب کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کو دور کردیا ہی۔

مجنوں صاحب نے "اردو مختصر افسانے میں جدید میلانات" پر جو مضمون لکھا ہی۔ وہ بھی اگرچہ مختصر ہی لیکن جامعیت رکھتا ہی۔ چوں کہ یہ کئی سال ادھر لکھا گیا ہی اس لیے اس میں ان رجحانات اور میلانات کا ذکر موجود نہیں ہی جو پچھلے دو تین سال میں افسانہ نگاری میں پیدا ہوے ہیں۔ اور نہ اُن افسانہ نگاروں ہی کا تذکرہ ہی جن کا فن اسی عرصے میں پروان چڑھا ہی۔ مثلاً اس مضمون میں کرشن چندر، فیاض محمود، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، اپندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی اور ان بےشمار بالکل نوجوان لکھنے والوں کا ذرا بھی ذکر نہیں ہی جو بہت ہی تھوڑے عرصے میں ہمارے افسانوی ادب پر چھاگئے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہی کہ مجنوں صاحب نے یہ مضمون اس وقت لکھا ہی جب ان سب کے فنوں میں کوئی خاص سنبھلی ہوئی کیفیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے شاید انھوں نے ان کا تذکرہ مناسب نہیں سمجھا۔ بہرحال جو کچھ انھوں نے اُردو افسانوں کے جدید میلانات پر لکھا ہی وہ گہری سوچ کا نتیجہ ہی۔

ان کے علاوہ اس مجموعے میں جو دوسرے مضامین شامل ہیں وہ بھی کسی کم اہمیت کے مالک نہیں یہ ادب

اور زندگی"، "مبادیاتِ تنقید"، "زندگی اور ادب کا بحرانی دور"، "ادب اور ترقی"، "ہندستانی ناٹک"، "نظیر اکبر آبادی" اور "حالی کا مرتبہ اُردو ادب میں" ــــ یہ سب کے سب نہ صرف اپنے موضوعات کے اعتبار سے اہم ہیں بلکہ اپنے اندر سوچ کی وہی بلندی اور تفکر کی گہرائی رکھتے ہیں۔

"ادب اور زندگی"، "مبادیاتِ تنقید"، "زندگی اور ادب کا بحرانی دور"، "ادب اور ترقی" ــــ ان چاروں مضامین میں کچھ ایسی ادبی باتیں سموئی ہوئی ہیں، کچھ ایسے ادبی مباحث کا تذکرہ ہے، کچھ ایسے ادبی مسائل کا بیان ہے، جن پر مختلف ممالک میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اُردو ادب جن سے بہت بڑی حد تک آج بھی تہی دامن ہے ــ وہ ادبی باتیں اور ادبی مسائل یہ ہیں کہ ادب کیا ہے؟۔ادب کے عناصر کیا ہیں؟۔ادب کے لیے کیا چیزیں ضروری ہیں؟۔ ادب کا زندگی سے کیا تعلق ہے؟ ــــ اور آیا کوئی تعلق ہے بھی یا نہیں؟۔ادب کی سماجی اہمیت کیا ہے؟ ادب انسانیت کے لیے کیوں ضروری ہے؟ ادب کا مقصد کیا ہے؟۔کس زمانے میں کیسا ادب پیدا ہونا چاہیے؟ ادب کا کوئی افادی پہلو ہے بھی یا نہیں؟۔ ادب اور جمالیات سے کیا رشتہ ہے؟۔ ادب میں حُسن کاری کی کیا اہمیت ہے؟۔ اور وہ کس حد تک ضروری ہے؟۔ ادب میں مواد اور ہیئت موضوع اور اسلوب کس چیز کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے؟ ــــ غرض یہ کہ کچھ اسی طرح کے موضوعات ہیں جن پر مجنوں صاحب نے نہایت کامیابی کے ساتھ قلم اُٹھایا ہے۔ اور جس نے بڑی حد تک اُردو تنقید کے نظریاتی پہلو کو مضبوط بنانے میں مدد کی ہے۔　　　　(ع - ی)

معاشیات

مطبوعات

ادارۂ معاشیات حیدرآباد دکن

خوشی کی بات ہے کہ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے اساتذہ وطلبہ نے مختلف ادارے علمی اور اصولی مباحث پر کتابیں شائع کرنے کے لیے قائم کیے ہیں جن میں ایک ادارۂ معاشیات بھی ہے جو اس وقت تک مختلف اقتصادی مسائل پر بہت سے رسائل شائع کرچکا ہے اور ان میں سے بعض پر "اُردو" کی سابقہ اشاعتوں میں تبصرہ بھی کیا جاچکا ہے۔ اس ادارے کے نگراں بلکہ روحِ رواں ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی کا نام کسی مزید تعریف و تعارف کا محتاج نہیں ہے۔

ان رسالوں کی عام خصوصیت یہ ہو کہ معاشیات کے ضروری اہم مسائل جن کا روزمرّہ کی زندگی سے تعلق ہو انھی پر بحث کی گئی ہو اور ہر بحث پر ایک الگ رسالہ لکھا گیا ہو جو کم و بیش اسّی صفحات کی مختصر ضخامت میں ہو اور اسی میں تمام کام کی باتیں بیان کردی گئی ہیں۔ ہر مضمون پر مختلف لکھنے والوں نے لکھا ہو اور اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا ہو کہ اندازِ بیان ایسا رہے کہ معمولی درجے کے اُردو خواں کی سمجھ میں آجائے اور اس طرح عامی اور عالم دونوں کے لیے یکساں مفید ہو۔ حال ہی میں اس ادارے نے جو رسائل ہمیں بغرض تبصرہ بھیجے ہیں ان کا حال مختصراً درج ذیل کیا جاتا ہو۔ یہ رسائل ادارۂ معاشیات فاطمہ منزل حمایت نگر حیدرآباد دکن سے مندرجۂ ذیل قیمتوں پر حاصل کیے جا سکتے ہیں :۔

’معاشی لائحۂ عمل‘، حصّہ دوم، مترجمہ سعید احمد مینائی بی اے (عثمانیہ) حجم ۵۸ صفحے قیمت بارہ آنے۔

یہ مشہور و معروف بمبئی پلان کے ترجمے کا دوسرا حصّہ ہو۔ پہلے حصّے پر اس کے پیش تر تبصرہ کیا جا چکا ہو، اس دوسرے حصّے میں تقسیمِ دولت اور حکومت کے فرائض سے بحث کی گئی ہو۔ چوں کہ تعمیرِ بعد از جنگ کے مسائل اس وقت زیرِ بحث ہیں، جن میں بمبئی پلان کو خاص اہمیت حاصل ہو خصوصاً اس لیے بھی کہ اس کے مصنّفین میں سے ایک صاحب یعنی سر اردیشر دلال اس وقت حکومتِ ہند کے ممبر ہیں جن کے سپرد اسی قسم کا کام کیا گیا ہو۔ اس لیے اُردو داں پبلک کو اس پلان کی تفصیلات سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہو اور امید ہو کہ رسالۂ زیرِ نظر کے ہر دو حصّے دل چسپی سے پڑھے جائیں گے۔

’زرعی پیداوار کی فروخت‘۔ از محمد تاج الدّین بی اے (عثمانیہ) و مانک بھٹ صاحب عثمانیہ۔ حجم ۸۰ صفحات قیمت عہ؍

اس رسالے میں اہم زرعی پیداوار اور ان کی فروخت کا موجودہ طریقہ، اس طریقے کے نقائص اور جدید منظم طریقے کی تجاویز پیش کی گئی اور اس کی اصلاح میں حکومت جو کارروائیاں کرسکتی ہو وہ بتائی گئی ہیں حکومت نے کچھ دنوں سے مارکٹنگ کا محکمہ قائم کیا ہو مگر ابھی اس میں اتنی وسعت نہیں ہوئی ہو کہ زرعی پیداوار کی فروخت پر قابو حاصل کرسکے اور حریص بنیوں اور آڑھتیوں سے جنس پیدا کرنے والوں کو جو تکلیفیں اور نقصانات پہنچتے ہیں ان کا تقاضا یہ ہو کہ اس مسئلے پر جلدتر توجّہ کی جائے۔ ہندستان ایک زرعی ملک ہو۔ اور یہاں اگر زرعی

پیداوار کی فروخت کا انتظام بھی معقول نہ ہوا تو ملک کی اقتصادی حالت کس طرح درست ہوسکتی ہی۔ رسالہٗ زیر نظر میں اسی مسئلے سے بحث کی گئی ہی۔

"نظری اور عملی معاشیات" از محمد ناصر علی ایم اے (عثمانیہ)، حجم ۸۲ صفحات قیمت عہ،

اس رسالے میں عام معاشیات اور خصوصاً ہندستانی معاشیات کے بعض مسائل پر اصولی اور عملی حیثیت سے بحث کی گئی ہی۔ خاص کر ہندستان کے اضافۂ آبادی سے پیدا ہونے والے مسائل کا حل بتایا گیا ہی اور ہندستان کی قدیم صنعتیں اور ان کے زوال کے اسباب سے بحث کی ہی۔ اندازِ بیان ادارۂ سیاسیات کے عام معیار کے مطابق عام فہم ہی اور مصطلحات سے حتی الامکان پہلو بچاکر لکھا گیا ہی جس سے عام لوگوں کی معلومات میں بھی اضافہ ہوگا۔

"ہندستان کا مالی نظام"۔ از خواجہ شمس الدین بی اے (عثمانیہ)، حجم ۸۰ صفحات قیمت عہ،۔

اس رسالے میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہی، ہندستان کے نظامِ مالیہ سے بحث کی گئی ہی اور انتظامی اداروں میں مالیات کی اہمیت بتاکر ہندستانی مالیات کی تاریخ اور اہم محاصل کی تاریخ بیان کی گئی ہی جو بہت دل چسپ ہی۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۱۶ء اور سنہ ۱۹۳۵ء کی آئینی اصلاحات اور ان کا ہندستانی مالیے پر اثر دکھایا گیا اور پھر ہندستانی مالیے پر جنگ کے اثرات واضح کرکے عام مالی پالیسی پر بحث و تنقید کی گئی ہی۔ اس طرح ہندستانی مالیے کا مسئلہ عام فہم زبان میں پورے طور پر سمجھانے کی کوشش کی گئی ہی، جو امید ہی کہ مقبول ہوگی۔

"ہندستان کے زرعی مسائل"۔ از شفیق الرحمان بی اے (عثمانیہ) حجم ۸۰ صفحات قیمت عہ،

ہندستان ایک زرعی ملک ہی اور صنعت و حرفت کی یہاں کتنی ہی ترقی ہوجائے اس ملک کی یہ خصوصیت باقی رہے گی اس لیے زراعت کا مسئلہ ہندستان کے لیے تمام اقتصادی مسائل میں سب سے زیادہ اہم ہی اور اس رسالے میں اس مسئلے سے سیر حاصل بحث کی گئی ہی۔ زمین کی زرخیزی، کھاد کا استعمال، ذرائع آب پاشی، تقسیم و انتشارِ اراضی، زرعی آلات، مواشی غرض کہ تمام متعلقہ زرعی مسائل کی وضاحت کرکے زرعی ترقی کے مستقبل پر ماہرانہ بحث کی گئی اور عملی اصلاحی تدابیر بتائی گئی ہیں جو حکومت اور قومی کارکنوں دونوں کے لیے مفید ہوں گی۔

'ہندستان کے صنعتی مسائل'۔ از سعید احمد مینائی، بی اے (عثمانیہ)، حجم ۸۶ صفحات قیمت عہ۔

ہندستان کی صنعتی رفتار کو حکومت کی غیر جانب دارانہ بلکہ غیر ہمدردانہ پالیسی سے جو نقصان پہنچا ہے وہ اس رسالے میں واقعات و اعداد و شمار سے واضح کیا گیا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ کس طرح یہاں کی اکثر عمدہ صنعتیں اس پالیسی کی وجہ سے فنا ہوگئیں۔ اور پھر ان کے دوبارہ زندہ کرنے کی تدابیر بھی بتائی گئی ہیں۔ قدیم صنعتوں کے فنا ہوجانے کی وجہ سے یہاں کے صنعتی کاروبار کو پھر سے اُبھارنے کی ضرورت ہے جو بغیر تامین (پروٹکشن) کے ممکن نہیں ہے لیکن تامین کے سلسلے میں بھی حکومت نے جو قدم اٹھایا ہے وہ بہت ہی ناکافی اور غیر تشفی بخش ہے۔ گھریلو صنعتیں جو ہندستان میں خاص اہمیت رکھتی ہیں؛ حکومت کی توجہ کی محتاج ہیں اور اس بات کی ضرورت ہے کہ انھیں ماہرانہ مشورے اور بازار کے بدلتے ہوئے حالات سے آگاہ کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ ہندستانی حرفتوں کے مالی پہلو سے بھی بحث کی گئی ہے اور موجودہ صورتِ حال کو بہتر بنانے کی تدابیر بتائی گئی ہیں۔

'ہندستان کی تجارت'۔ از محمد معین الدین بلگامی، بی اے (عثمانیہ) حجم ۸۴ صفحات، قیمت عہ۔

اس رسالے میں معاشیات کی اُس اہم شاخ سے بحث کی گئی ہے جو مُلکی تجارت سے متعلق ہے۔ اس میں ہندستان کی اندرونی اور بیرونی تجارت کے مسائل سے تاریخی پس منظر کے پیشِ نظر بحث کی گئی ہے اور تنزل کے اسباب بتاکر اصلاح کی تجاویز بتائی گئی ہیں۔ ہندستان کی تجارت پر جنگ کے اثرات بھی اعداد و شمار سے واضح کیے گئے ہیں اور آیندہ تجارتی ترقی کے لیے جن وسائل کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے اُن کی مدلّل تشریح کی گئی ہے۔ توازنِ تجارت اور توازنِ ادائی کے مسائل ذرا اصولی قسم کے ہیں مگر مُلک کی عام فلاح اور اقتصادی حالت پر ان کا بہت بڑا اثر پڑتا ہے اس لیے ان مسائل پر بھی حتی الامکان عام فہم زبان میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

'ہندستان کی سڑکیں اور ریلیں'۔ از ارجن پرشاد شرما (عثمانیہ) حجم ۸۰ صفحات قیمت عہ۔

ہندستان میں نقل و حمل کا مسئلہ بہت کچھ محتاج اصلاح و ترقی ہے، اور چوں کہ کسی ملک کی اقتصادی حالت کا اندازہ بہت کچھ اسی سے ہوتا ہے اور اس پر دار و مدار ہے اس لیے حکومت اور قومی کارکنوں کو اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنا اور ضروری تدابیر اختیار کرنا چاہیے۔ رسالۂ زیرِ نظر میں اس مسئلے کے ایک پہلو یعنی ریلوں

اور سڑکوں سے بحث کی گئی ہے اور ان کی انتظامی خامیوں کو واضح کرکے اصلاح کی تدابیر بتائی گئی ہیں۔ ریلوں کی ہندستان میں کمی کا مظاہرہ موجودہ جنگ میں نہایت ہی افسوس ناک طریقے پر ہوا جب کہ ضروریاتِ سفر میں زیادتی اور انتظاماتِ نقل وحمل کی کمی کی وجہ سے مسافروں کی تکلیفیں انتہا کو پہنچ گئیں اور خاص کر نیچے درجے کے مسافر توسامانِ باربرداری کی طرح ٹھونس ٹھونس کر ریل کے ڈبّوں میں بھرے جانے لگے اور پٹروں پر لٹک کر ریل پر چلنے والوں کو اکثر ہلاک حادثات پیش آئے۔ اس معاملے میں حالات کو سمجھ کر حکومت پر زور ڈالنے کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہوگی جس میں عام فہم زبان میں مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو سمجھایا گیا ہے۔

"ہندستان میں امدادِ باہمی کی تحریک"۔ از محمد طاہر حامد (عثمانیہ) حجم ۸۷ صفحات قیمت عہ

اس رسالے میں مختلف ممالک میں امدادِ باہمی کے حالات دکھاکر ہندستان میں اس تحریک کی حالت سے مقابلہ کیا گیا ہے اور موجودہ نظام پر تنقید و تبصرہ کرکے آیندہ کے لیے مفید عملی تجاویز بتائی گئی ہیں۔ ہندستان میں مہاجنی کاروبار کی ترقی کی بڑی وجہ امدادِ باہمی کے اداروں کی کمی ہے، اور مہاجنی ذہنیت جو اخلاقی حیثیت سے بہت ہی پست ہوتی ہے اسی خامی کی پیداوار ہے۔ اس لیے امدادِ باہمی کی تحریک کو ہندستان میں بہت ترقی دینے اور پھیلانے کی ضرورت ہے تاکہ حرفتی کاروبار میں لگانے یا اہم ذاتی اخراجات کے رُپے کی ضرورت اسی سے حل ہوسکے اور مہاجنوں سے قرض نہ لینا پڑے جو غریب طبقے کے لیے بہت گراں پڑتا ہے اور اس سے ان کی ساری زندگی پریشانی میں گزرتی ہے۔ زیرِ نظر رسالے میں اِس مسئلے پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، جو حکومت اور عوام الناس دونوں کے لیے مفید ہے۔

"زرعی قرض داری"۔ از سید عبداللہ (عثمانیہ) حجم ۸۰ صفحات قیمت عہ

ہندستانی مزارعین کو سب سے زیادہ پریشانی مہاجنی قرضے کی ہے جس کی وجہ سے اُن کی سخت محنت کی پیداوار پر مہاجن کا قبضہ ہوجاتا ہے اور دیہی مہاجن اتنے حریص ہوتے ہیں کہ وہ مقروض مزارعین کا جونک کی طرح خون چوس لیتے ہیں۔ رسالہ زیرِ نظر میں زرعی قرض داری کا ہول ناک نقشہ اعداد و شمار سے کھینچ کر دکھایا گیا ہے اور حکومت نے صورتِ حال کی اصلاح کے لیے جو قوانین وقتاً فوقتاً بنائے ہیں، ان پر بحث کی گئی ہے۔ پھر ایک باب میں خاص مملکتِ حیدرآباد کے حالات کی وضاحت کرکے زرعی قرض داری کو روکنے کی تدابیر بتائی گئی ہیں

جن پر صوبائی حکومتوں کو غور کرنا چاہیے اور قومی اداروں کو اس معاملے میں حکومت کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔

'ہندستان کی قومی آمدنی': از توفیق محمد خاں بی اے (عثمانیہ) حجم ۸۰ صفحات قیمت عہ

کسی ملک کی قومی آمدنی کا بیشتر وہاں کے باشندوں کے معیارِ زندگی سے اندازہ کیا جاتا ہے اور دوسرے ممالک کے مقابلے میں ہندستان کا معیار اس سلسلے میں بہت ہی پست ہے جسے اُبھارنے کے لیے خطیر رقم سرمایے سے طویل مدت تک کام کرنے کی ضرورت ہے جیسا کہ مشہور 'بمبئی پلان' کے مرتبہ نتائج سے معلوم ہوتا ہے۔ قومی نقطۂ نظر سے یہ مسئلہ نہایت ہی اہم ہے اور اسے پورے طور پر سمجھنے کے لیے کچھ اصولی معلومات کی بھی ضرورت ہے۔ رسالہ زیرِ نظر میں اسی مسئلے سے بحث کی گئی ہے اور جہاں تک عام فہم زبان میں ممکن ہوسکا اس کے ہر پہلو کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آخر میں قومی آمدنی میں اضافہ اور باشندوں کا معیارِ زندگی بلند کرنے کی تدابیر بھی بتائی گئی ہیں اور اس سلسلے میں 'بمبئی پلان' کی تجاویز پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے۔

'ہندستان کے مزدوروں کے مسائل': از حامد محی الدین بی اے (عثمانیہ) حجم ۸۰ صفحات قیمت عہ

کسی ملک کی معاشی زندگی میں مزدور کو جو اہمیت حاصل ہے اُس کا صحیح اندازہ وہ لوگ نہیں کرسکتے جو ان کی محنت کی پیداوار کو قلیل قیمت پر لے کر اپنی آسایشوں میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندستان کی حکومت جو دفتری قسم کی ہے مزدوروں کے مسائل کو پورے طور پر سمجھنے سے قاصر ہے اور اس دفتری راج میں مزدور کی حالت بہت زیادہ ناگفتہ بہ ہوتی جاتی ہے۔ رسالۂ زیرِ نظر میں اس مسئلے کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے اور ہندستانی مزدوروں کے مخصوص مسائل کی تشریح کرکے اُن سرکاری قوانین پر تبصرہ کیا گیا ہے جو مزدوروں کی حالت سدھارنے کے لیے وقتاً فوقتاً بنائے گئے اور جن سے کوئی قابلِ لحاظ اصلاح نہیں ہوئی۔ موجودہ جنگ میں ہندستان کے مزدور طبقے کو جس طرح متاثر کیا ہے اس کی بھی تشریح کی گئی ہے اور تنظیم بعد از جنگ میں مزدوروں کا جو حصہ ہونا چاہیے اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے جس قسم کی تدابیر کی ضرورت ہے ان کی تشریح کی گئی ہے۔

'ہندستان کا نظامِ بنک کاری': از رام اوتار بی اے (عثمانیہ) حجم ۸۰ صفحات قیمت عہ

موجودہ سرمایہ دارانہ نظامِ حکومت میں نظامِ بنک کاری کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور جب تک دُنیا میں

سوُد کا رواج ہو اور قانون اس وسیلۂ آمدنی کو جائز رکھتا ہو اُس وقت تک بنکوں کا قیام ضروری ہو اور ان کے ذریعے سے مہاجنی کاروبار کو بڑی حدتک گھٹایا اور مزارعین اور اہلِ حرفہ کے بارِ قرض کو بہت کچھ ہلکا کیا جاسکتا ہو مگر ہندستان کے موجودہ نظامِ بنک کاری کو عوام الناس سے دوُر کا بھی واسطہ نہیں رکھا گیا ہو اور بنکوں کا سارا کاروبار سرمایے داروں سے رہتا ہو۔ اس نظام کی کایا پلٹ تو بہ حالتِ موجودہ دُشوار ہو لیکن اصلاح و ترقی کی جوگنجایش اس میں ہو وہ بہ روے کار لائی جاسکتی ہو اور اس کے لیے ضرورت اس کی ہو کہ خود اس نظام کی تفصیلات کو سمجھا جائے ۔ زیرِ نظر رسالے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہو اور اس کی اصلاح کی تدابیر بھی بتائی گئی ہیں۔اسی کے ساتھ مبادلے اور تجارتی لین دین کی موجودہ شکل کو مُلکی مفاد کے لحاظ سے بدلنے کی بھی ضرورت بتائی گئی ہو اور یہ کوشش کی گئی ہو کہ تمام متعلقہ مسائل عوام الناس کی سمجھ میں آجائیں ۔

'ہندستان کا معاشرتی نظام'۔ از حسن الدین احمد بی اے (عثمانیہ)، حجم ۸۷ صفحات قیمت عہ۔

عام ملک کی اقتصادی حالت پر وہاں کے نظامِ معاشرت کا بہت بڑا اثر پڑتا ہو اور رہن سہن لباس غذا مکان پانی وغیرہ کی خرابیوں کی وجہ سے نہ صرف صحت متاثر ہوتی ہو بلکہ اقتصادی حالت میں بھی تنزّل ہوتا ہو۔ بہت سی شادی بیاہ وغیرہ کی رسمیں اور برادری کے رواج اسراف کا باعث ہوتے ہیں جس میں لوگ مقروض ہوجاتے ہیں اور یہ قرض محدوُد آمدنی میں ادا نہیں ہو پاتا جس سے ساری عمر پریشانی میں گزرتی ہو اور تمام صلاحیت کارمردہ ہوجاتی ہو ۔اس لیے اقتصادی مسائل کے اس شعبے سے عوام کو آگاہ کرنے کی ضرورت ہو اور رسالۂ زیرِ نظر میں یہ کوشش کی گئی ہو کہ ہندستان کے موجودہ معاشرتی نظام کی خرابیوں کو واضح کرکے ان کی اصلاح کی تدابیر بتائی جائیں اور اس سلسلے میں حکومت اور عوام الناس کا جو فرض ہو اُس پر توجہ دلائی جائے ۔ موجودہ جنگ کا جو اثر ہندستانی معاشرت پر پڑا ہو اور جنگ کے بعد جو مسائل اس سلسلے میں پیدا ہوں گے ان کی بھی تشریح کی گئی ہو اور بعد ازجنگ کی بے روزگاری اور تجارتی کسادبازاری کو قابو میں رکھنے کی ضرورت واضح کی گئی ہو خاص کر حکومت کو اس بارے میں جو تدابیر اختیار کرنی چاہییں وہ بتائی گئی ہیں ۔ (ر۔ع۔ ہ)

رسائل کے خاص نمبر اور سال نامے

'تربیت' (انجمنِ اساتذہ صوبۂ اورنگ آباد دکن کا سہ ماہی رسالہ)

یہ سہ ماہی رسالہ صوبۂ اورنگ آباد دکن کے اساتذہ نے مولوی سید ساجد علی صاحب صدرِ مہتمم تعلیمات صوبۂ اورنگ آباد کی سرپرستی میں جاری کیا ہے۔ اس کا مقصد تعلیم و تربیت ہے۔ جو مضامین اس پہلے نمبر میں درج کیے گئے ہیں وہ مقصد کے اعتبار سے اُستادوں کے لیے بہت مفید ہیں اور ان سے اُن کے علم اور معلومات میں کافی اضافہ ہوگا اور انھیں اپنے تجربوں میں بہت مدد ملے گی۔ اُستاد کے فرائض بہت اہم ہیں اور یہ اسی حالت میں بخوبی انجام دے سکتے ہیں جب کہ ان کی معلومات میں برابر اضافہ ہوتا رہے۔ اس رسالے کے ذریعے اساتذہ اپنے اپنے تجربے دوسروں تک پہنچا سکتے اور تعلیم و تربیت میں آسانیاں بہم پہنچا سکتے ہیں۔

سال نامہ "آج کل" یہ رسالہ جنگ کی پیداوار ہے۔ جنگ کے متعلق تو اس میں دو چار صفحے ہی ہوتے ہیں، باقی سارا رسالہ دل چسپ ادبی مضامین اور فسانوں اور شعر و شاعری کے لیے وقف ہوتا ہے اور اس وجہ سے اسے بہت مقبولیت حاصل ہوگئی۔ یہ سال نامہ ۱۵۲ صفحات پر ہے۔ اس میں بعض بہت اچھے مضمون پڑھنے اور مطالعے کے قابل ہیں۔ مضامین کی نوعیت بھی گوناگوں ہے۔ تاریخی، تنقیدی، علمی، معاشیاتی کے علاوہ دو ڈرامے، پندرہ افسانے اور کوئی اکتیس نظمیں اور غزلیں ہیں اور سولہ تصویریں۔ اس رسالے کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کے قابل اڈیٹر نے اُردو کے اچھے لکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔ یہ سال نامہ اس کا شاہد ہے۔ اس میں ہر ذوق کے لیے دل چسپی اور غور و فکر کا سامان موجود ہے۔ ہم اس کے اڈیٹروں کو اس کام یابی پر مبارک باد دیتے ہیں۔

"شاہ کار" یہ "شاہ کار" کا "ترقی پسند ادب" نمبر ہے۔ اس میں آپ کو ترقی پسند ادب اور اس کے کارناموں کے جانچنے کا بہت اچھا موقع ملے گا۔ اس میں نثر بھی ہے اور نظم بھی۔ ادب بھی اور اس کی تنقید بھی۔ خوبیاں بھی اور خامیاں بھی۔ لکھنے والے زیادہ تر ترقی پسند ہیں اور ایک دوسرے کو سراہتے ہیں، یہ قابلِ تعریف بات ہے۔ منظومات میں بے قافیے اور قافیے دار دونوں طرح کی نظمیں ہیں۔ فسانے مختلف رنگ کے ہیں، بعض ترجمے ہیں بعض طبع زاد، لیکن سب میں جدت اور ترقی پسندی کی جھلک پائی جاتی ہے۔

سال نامہ "عالم گیر" اس میں زیادہ تر شعر و شاعری اور فسانے ہیں۔ ادبی مضمون صرف تین ہیں۔ ایک معمولی تنقیدی دوسرا ترقی پسند ادب کی تائید میں، تیسرا "روایات اور جدید تخیلِ شعری"

پر۔ نظموں میں ترقّی پسند شاعر نہیں ہیں۔ فسانوں کا حصّہ سب سے زیادہ ہے۔

"نئی زندگی" اس رسالے نے اگست ۱۹۴۵ء میں فرانسسکو نمبر شائع کیا ہے، اس نمبر میں مختلف لکھنے والوں نے اس کانفرنس کے مختلف پہلوؤں پر اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ اسے چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں بین الاقوامی تنظیم اور جمعیت الاقوام کی تاریخ و واقعات۔ دوسرے باب میں ڈمبرٹن اوکس کے منصوبے اور اُن کی تجویزوں اور بین الاقوامی مجلسِ امن کی تنقید ہے۔ تیسرے باب میں کانفرنس کے فیصلے اور چوتھے میں نیا نظامِ عالم اور ہندستان اور آخر میں اخبارات کی رائیں ہیں۔

اڈیٹر نے ٹھیک لکھا ہے کہ "سان فرانسسکو کانفرنس میں جو سب سے بڑی کمی نظر آتی ہے وہ باہمی اخلاص کی کمی ہے"۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اور کون سی ایسی جمعیت ہے جس میں یہ کمی نہیں۔

مجموعہ مقالاتِ علمیہ حیدرآباد اکادمی کا ساتواں رسالہ ہے جو 'اُردو' کی تقطیع اور گنجان خط کے ۱۳۴ صفحات پر، اکادمی کی مجلسِ ادارت نے شائع کیا ہے۔ مجلس کے ارکان، اور اس مجموعے کی قیمت وغیرہ کی تفصیل رسالے میں تحریر نہیں ہے۔ مجموعہ پانچ مضامین پر مشتمل ہے:- (۱) "حقائقِ حیاتِ انسانی" جس میں سابق پرنسپل کلیۂ عثمانیہ مولوی عبدالرحمان خاں صاحب نے انسان کے دُنیا میں ظہور کرنے کے وقت سے موجودہ زمانے تک کے حقائق پر ایک تبصرہ کیا ہے۔ ابتدائی حصّے میں سائنس کے دقیق مسائل و قیاسات کی بحث کی ہے تو آخر میں گھریلو زندگی اور اجتماعی اور انفرادی اخلاق کے مباحث بھی زیرِ نظر آگئے ہیں۔ (۲) مولوی عبدالقادر صاحب نے "ادارۂ جنگ کی معاشی توجیہ" کے عنوان سے جنگ کے تجارتی اور مالی اسباب کے بعض جدید نظریات پر نظر ڈالی ہے۔ 'ادارہ'، غالباً انسٹی ٹیوشن کا ترجمہ ہے لیکن اس موقع پر دستور یا آئینِ جنگ ہمارے محاورے کے مطابق ہوتا۔ 'ادارہ' ایک جماعتی نظام کو کہتے ہیں جو کسی خاص مقصد کے لیے قائم اور عمل میں مصروف ہو۔ ایک مقالے میں ڈاکٹر کلیم اللہ صاحب قادری نے کوئی تین جُز کے اندر "فارسی شاعری کا آغاز اور اس کی تاریخ" سمیٹ لینے کی کوشش کی ہے۔ اس پامال مضمون کے لکھنے میں متداول تذکروں کے علاوہ تاریخِ سیستان سے بھی مدد لی گئی ہے۔ یہ تاریخ قرنِ سابع میں تالیف ہوئی لیکن صدیوں سے گم نام رہی اور حال میں منظرِ عام پر آئی ہے۔ اس میں بعض حالات یا قیاسات نئے ہیں اگرچہ ضرور نہیں کہ دوسرے اقوال کے مقابلے میں انھیں زیادہ صحیح مانا جائے۔ ڈاکٹر میر ولی الدین

صاحب نے اپنے خاص انداز میں اقبال کے نظریۂ عقل وعشق پر بہت دل چسپ بحث لکھی ہی۔ آخری مقالے میں مولوی یوسف الدین صاحب نے تعلیمی تنظیم بعد از جنگ کے مسئلے پر قلم اُٹھایا ہی۔ اور سارجنٹ صاحب کی تجاویز پر اجمالی نظر ڈالی ہی۔ حال آں کہ مفید عام ہونے کے اعتبار سے یہ مضمون زیادہ سلاست و وضاحت چاہتا تھا۔ بہرحال خوشی کی بات ہی کہ حیدرآباد اکادمی عالمانہ قسم کے مضامین چھاپنے میں کوشاں ہی اور زبانِ اُردو کی قابلِ قدر خدمت انجام دے رہی ہی۔

اعلان

ہندستانی اکادمی یوپی الہ آباد کی مجلسِ عاملہ نے اُردو کی مطبوعہ کتابوں پر پانسو رُپے سالانہ انعام دینے کے لیے یہ فیصلہ کیا ہی کہ

۱ــــ ہر سال مندرجۂ ذیل مضمونوں میں سے ایک پر سلسلے وار انعام دیا جایا کرے گا:۔

(الف) شعر اور ڈراما
(ب) ناول اور مختصر افسانے
(ج) مضامین (عام اور انتقادی)
(د) تاریخ اور حیات نگاری
(ہ) فلسفہ
(و) نیچرل سائنس

۲ــــ انعام سنہ ۱۹۴۵ء میں شعر اور ڈرامے کی کتابوں پر دیا جائے گا۔

۳ــــ شعر اور ڈرامے کی صرف اُن کتابوں پر غور کیا جائے گا جو ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۴۴ء کے بعد شائع کی گئی ہیں۔

پبلک، اہلِ علم حضرات اور طابعین وناشرین سے درخواست ہی کہ ہندستانی اکادمی کو مندرجۂ بالا تاریخ کے بعد شائع شدہ شعر اور ڈرامے کی کتابوں کے متعلق تفصیلات سے مطلع فرمائیں تاکہ ابتدائی انتخاب کے وقت اُن پر غور کیا جاسکے اور منتخب کتابوں کے متعلق ججوں کی کمیٹی فیصلہ کرسکے۔